انتساب

عظیم سرجن، عظیم انسان

ڈاکٹر آئی ایچ بھٹی

کے نام

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں
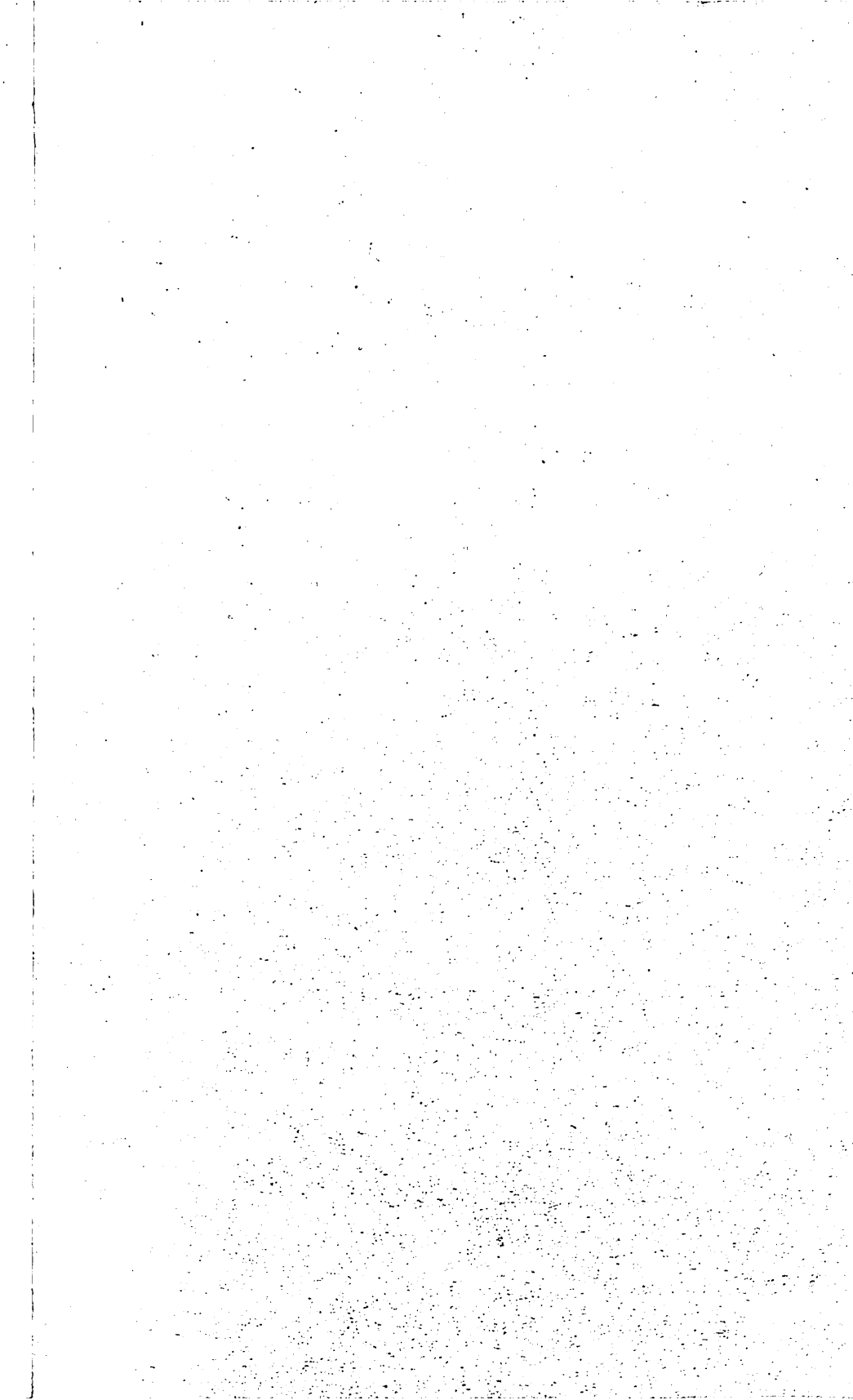
آئینہ خانہ

حمید کاشمیری کا نیا ناول کشکول، ان کی پہلی تخلیقات کی طرح، عالمی ترقی پسند حقیقت نگاری کی روایت سے ہم آہنگ ہے۔

قطرے میں دجلہ دکھانا، حمید کاشمیری کو خوب آتا ہے۔ ان کے پاس وہ چشم بینا ہے، جس کے بارے میں میر نے کہا ہے۔

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

کشکول بولتی ہوئی تصویروں کا ایک دم بخود کر دینے والا سلسلہ ہے جو سب مل کر ہمارے عہد کے سچ کی تشکیل کرتی ہیں۔

یہ سچ کوئی تجریدی چیز نہیں کہ اسے چند جملوں میں بیان کیا جائے۔ یہ سچ پڑھنے والے پر کہانی کے مجموعی تاثر کی شکل میں آشکار ہوتا ہے۔ اس کیلئے حمید کاشمیری نے درجنوں کردار تخلیق کئے ہیں۔ جو باری باری جھرمٹوں کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کرداروں کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ اس ڈرامائی صورت حال کو جنم دیتا ہے جو حمید کاشمیری کے فن کا خاصہ ہے۔

روشو کا کردار کہانی کا بنیادی حوالہ ہے۔ بھک منگوں میں پیدا ہونے والا یہ انسان تقدیس

محنت کا علمبردار ہے۔ وہ اپنے بھک منگے باپ کی اقدار کو رد کرتا ہے۔ یہ اقدار شرف انسانیت کی نفی کرتی ہیں اور روشو کیلئے ایک طویل سفر کیلئے تازیانے کا کام کرتی ہیں لیکن اس سفر کی ہر منزل اسے ایسے لوگوں کے مقابل لے آتی ہے جو بظاہر بھک منگے تو نہیں لیکن روشو کے فقیر باپ کی طرح اخلاقی طور پر دیوالیہ ہیں۔ وہ بڑے عالی شان مکانوں میں رہتے ہیں مگر ان کی زندگی اتنی ہی کھوکھلی ہے جتنی کہ ان لوگوں کی جنہیں رد کر کے روشو ان کے درمیان آیا ہے۔ ان لوگوں کے پاس اگر پیسہ ہے تو یہ دوسرے انسانوں کو خریدنے اور انہیں پابند کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور اگر پیسہ نہیں ہے تو یہ لوگ اپنے آپ کو بیچ کر اپنی کھوکھلاہٹ کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس میں انہیں مایوسی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور پھر خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن انہیں زندگی میں کوئی مثبت چیز میسر نہیں آتی۔

اسی سالہ چوھدری کرم الہی سمجھتے ہیں کہ زندگی میں جس پیار کی انہیں تلاش ہے وہ ایک خوبصورت جوان بیوی خرید کر انہیں مل جائے گا لیکن اپنے جسم کو ان کے ہاتھ بیچ کر ان کی منکوحہ اپنی روح کا سودا بلیک میلر پاشا سے کرتی ہے اور مایوس ہو کر اپنے آپ کو ختم کر لیتی ہے۔ اس طرح خریدنے والے اور بکنے والے سبھی اپنے ہاتھ میں خالی کشکول لئے ہمارے سامنے آتے ہیں اور پس پردہ چلے جاتے ہیں ان میں صرف روشو ہی تنہا ایک ایسا فرد ہے جو نظر میں رات اور دل میں آفتاب لئے محو سفر نظر آتا ہے۔ منزلیں سراب بن کے اس کے سامنے آتی ہیں لیکن وہ پیچھے نہیں مڑتا۔ شاہینہ، راحیلہ، فرحانہ اپنی تمام دلکشی کے باوجود سراب ہی ہیں اور حقیقت جب طوائف بن کے اس کے سامنے آتی ہے تو وہ اسے رد نہیں کرتا اپنا لیتا ہے۔

"کشکول" میں حمید کاشمیری نے ایک آئینہ خانہ تخلیق کیا ہے۔ ہمیں اس میں اپنے ہی کئی روپ نظر آتے ہیں۔ ہمیں اپنی کمزوریاں، اپنی ریاکاری اپنا کھوکھلا پن بار بار نظر آتا ہے۔ ہم کبھی اپنے آپ کو ظالم کی حیثیت میں دیکھتے ہیں کبھی مظلوم کی۔ کبھی خریدار کی شکل میں تو کبھی بکاؤ مال کی، کبھی دانہ کی شکل میں تو کبھی دام کی۔ حمید کاشمیری کا وصف یہ ہے کہ وہ ہم پر مایوسی نہیں طاری ہونے دیتے۔ روشو، روشنی کی ایک کرن کی طرح ہمارے اندھیروں میں اجالا کرتا رہتا ہے۔ اس کا سفر ہمیں حوصلہ دیتا ہے۔ زندہ رہنے کا اور مایوسیوں کی گدلاہٹ کو امیدوں کی رنگا رنگی میں تبدیل کرنے کا حوصلہ۔

اس ناول میں حمید کاشمیری کی حقیقت نگاری، ترقی پسند ادب کے ان اعلیٰ ترین مقاصد کو چھو لینے کی کوشش کرتی ہے جس کا مطالبہ عظیم نقاد لوکاچ (LUCACKS) نے لکھنے والوں سے

کیا ہے۔ یہ حقیقت نگاری زولا(ZOLA) اور موپساں(MAUPASSANT) کی "فطرت نگاری" سے ممتاز اور بلند ہے اور اسے سماجی حقیقت نگاری(Social Realision) کہنا زیادہ مناسب ہوگا جو ڈکنز(Dickens) اور گورکی(Gorky) کے فن پاروں کی یاد دلاتی ہے۔

ایک بات جو حمید کاشمیری کو اردو کے صف اول کے ناول نگاروں میں شامل کرتی ہے یہ ہے کہ ان کا فن نظریاتی بیان بازی کا محتاج نہیں۔ وہ پہلے ناول نگار ہیں اور بعد میں کچھ اور۔ ان کے ہاں کہانی اور نظریہ الگ الگ چیزیں نہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں ایک سچے فنکار کی طرح وہ کہانی کے "تقدس" کو نظریاتی بیان بازی سے مجروح نہیں کرتے۔ انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں وہ ایک مشاق قصہ گو کی طرح پڑھنے والے کے تخیل پر کہانی کی گرفت کو انتہائی مضبوطی سے قائم رکھتے ہیں۔ کہانی ہی ان کے سماجی تناظر اور ترقی پسند نظریات کا Vehicle ہے نہ کہ اس کے برعکس یہ ایک ایسا وصف ہے جو ہمارے لکھنے والوں میں بہت عام نہیں۔ اس طرح حمید کاشمیری کا فن نئے لکھنے والوں کیلئے ایک ایسی راہ منور کرتا ہے جس پر چل کر وہ ان مغالطوں سے بچ سکتے ہیں جن کی نشاندھی اینجلز(Engels) نے مینا کانسکی(Mina Kantsky) کے نام اپنے خط میں کی ہے۔ ناول نگاری کا فن سیکھنے والوں کو حمید کاشمیری کی تکنیک کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہ بات صرف "غالب کی طرفداری" میں نہیں کہی جا رہی۔ اپنے ہم عصروں میں، حمید کاشمیری نے ٹیلی وژن کے میڈیم کو بڑی کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ اس کامیابی کی بنیادی وجہ ان کا تخیل ہے جو اپنا اظہار سمعی بصری(audio- visual) امیجز کی شکل میں بڑی کامیابی سے کر سکتا ہے اور ہر قسم کی تجرید سے پہلو بچا کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر، ساتھ ہی ساتھ، اپنی نظریاتی اساس کا تقدس بھی مجروح نہیں کرتا۔

بقدر حوصلہ شوق جلوہ ریزی ہے
وگر نہ آئینہ خانہ کی انتہا معلوم

صدیق ارشد
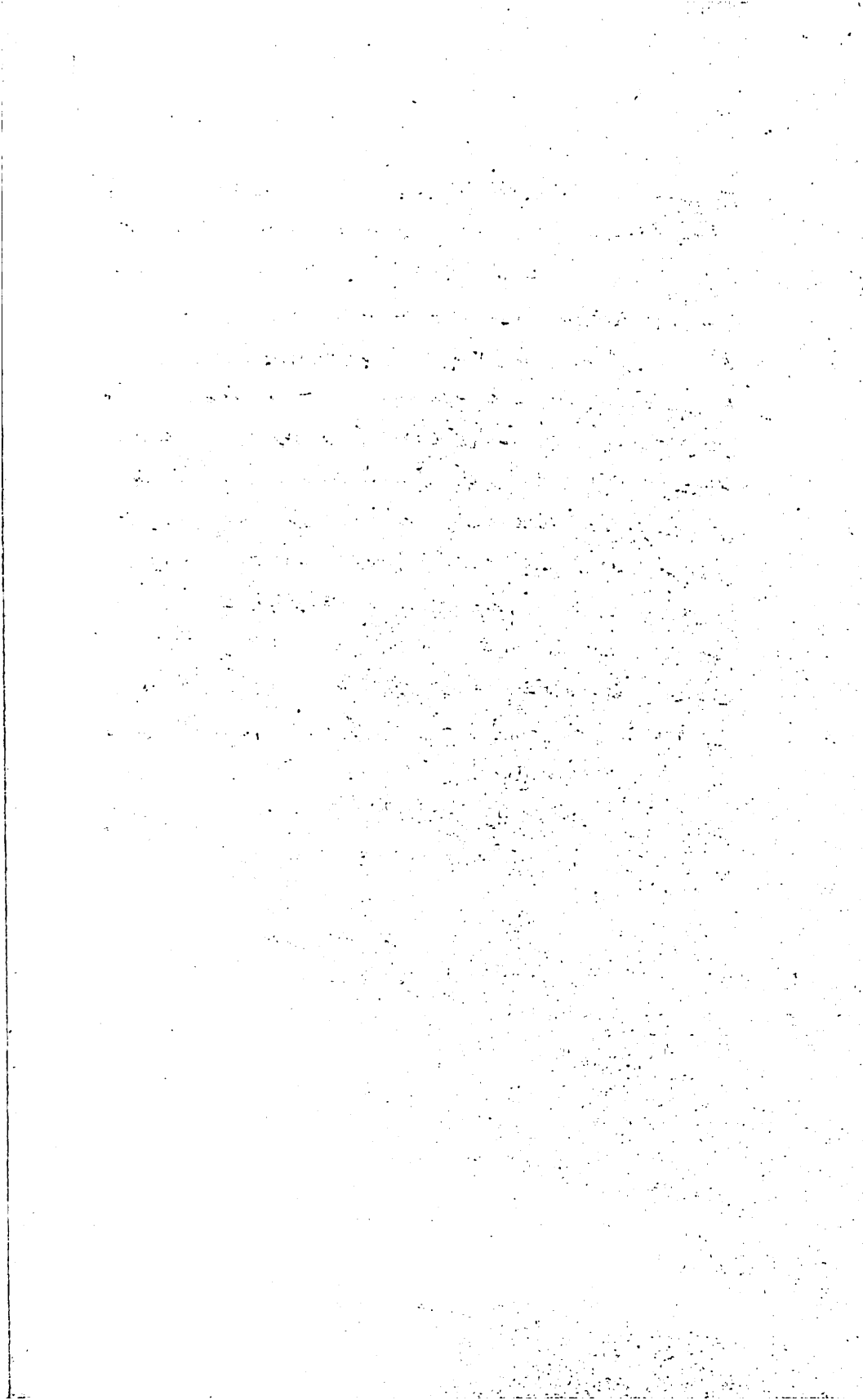
عرض مصنف

"کشکول" اخبار جہاں میں قسط وار شائع ہونے کے بعد پہلی مرتبہ کتابی صورت میں پیش ہورہا ہے۔ میں جس زمانے میں کل وقتی افسانہ نگار تھا تو میری یہ خواہش تھی کہ میں اپنے کرداروں کو تصویری شکل میں دیکھ سکوں اس کیلئے فلم کا میدان موجود تھا لیکن فلم میں جو کچھ ہورہا تھا وہ لکھنا میرے بس میں نہیں تھا اور جو میں لکھتا تھا اسے فارمولا فلم انڈسٹری قبول کرنے کو تیار نہیں تھی لہذا جب ملک میں ٹیلی وژن قائم ہوا تو میرے افسانوی کردار متحرک ہونے اور مجھے اپنی منشا اور خواہش کے مطابق اپنے کرداروں کو VISUAL دیکھنے کا موقع ملا اور یوں میری افسانہ نگاری نے ڈرامہ نگاری کا روپ دھار لیا۔ لہذا تقریباً دو عشروں تک میرے مکان پر ڈرامہ پروڈیوسروں کی جانب سے یکے بعد دیگرے دستک ہوتی رہی اور میں ٹیلی وژن اسکرین پر اس قدر مصروف ہوگیا کہ میرے اندر کا افسانہ نگار وقتی طور پر منظر سے او جھل ہوگیا اور ٹیلی وژن ڈرامہ میری شناخت بن گیا۔ قدرتی سی بات ہے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا کہ افسانے کے قارئین کے مقابلے میں ڈرامہ کے ناظرین کی تعداد زیادہ تھی اور ہے۔ لہذا میں ایک اعتبار سے فل ٹائم ٹیلی پلے رائٹ بن گیا اور جتنے تجربات میرے بس میں تھے اپنی صلاحیت کے مطابق میں نے ان کا مظاہرہ ٹیلی وژن پر کیا۔

"اخبار جہاں" کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے میرے لئے ناول نگاری کا ایک نیا چینل کھولا۔ "شکست آرزو" میرا پہلا ناول تھا جو اخبار جہاں کے اندر طویل اقساط میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا اور میری توقع سے کہیں زیادہ اس کی پذیرائی ہوئی بعد میں ٹیلی وژن سیریل کی شکل میں اس ناول کو ناظرین نے انتہائی شوق سے دیکھا اور پسندیدگی کی سند بخشی۔ پھر "ادھورے خواب" قسط وار چھپا اور اب "کشکول" ایک مقبول سلسلے کے طور پر پچیس اقساط میں شائع ہونے کے بعد پہلی مرتبہ کتابی شکل میں یکجا کر کے نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔ میں بحثیت ایک مصنف کے ناول کے مندرجات پر خود کچھ کہنا یا رائے دینا مناسب نہیں سمجھتا اس لئے کہ مجھے جو کچھ لکھنا تھا وہ میں نے لکھ دیا ہے رائے زنی قارئین اور ناقدین کا کام ہے میں صرف ایک فنی نکتہ بیان کرنے کی جسارت کروں گا وہ یہ کہ ایک ناول تو صرف کتابی شکل میں شائع ہونے کیلئے لکھا جاتا ہے لیکن ایک ناول ہوتا جسے کسی مقبول رسالے میں قسط وار شائع کرنے کیلئے تحریر کیا جاتا ہے۔ اور جسے لکھتے وقت لاکھوں قارئین کی دلچسپی اور تجسس کو بھی پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔

"کشکول" لکھتے وقت بھی میرے سامنے وہ لاکھوں قارئین تھے۔ جنہیں اس طرح گرفت میں رکھنا مقصود تھا کہ ہر قسط کے بعد پڑھنے والے کو اگلی قسط کا انتظار رہے۔ لہذا کشکول کی ہر قسط کو میں نے ایک تجسس اور انتظار کی کیفیت میں افسانوی طرز کے کلائمکس کے ساتھ ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں "کشکول" پچیس اقساط پر مشتمل جہاں ایک ناول تشکیل ہوا وہاں ایک ناول کے اندر الگ الگ کئی افسانوں کی کڑیاں بھی ایک دوسرے سے گتھ گئی ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ کشکول ایک ایسا ناول ہے جس میں کئی افسانے موجود ہیں۔

بہر حال یہ تو میری ایک رائے ہے۔ اصل رائے آپ کی ہوگی۔

حمید کاشمیری

①

اسٹیڈیم میں تماشائیوں کا ایک اژدہام تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر امڈ کے آگیا ہے۔ ٹیلی ویژن کی دو او بی وینز میچ کو کور کر رہی تھیں اور متعدد کیمرے ہمہ سمت شاٹس لینے میں مصروف تھے۔ کبھی کبھار کوئی کیمرہ تماشائیوں کی طرف پین کر کے جاتا تو سروں کا ایک سمندر لہر میں آجاتا لیکن فوراً ہی بیٹسمین کا کوئی زوردار شاٹ کیمرے کے شاٹ کو کاٹ دیتا اور پورے گراؤنڈ میں ایک سنسنی پھیل جاتی۔ پاکستانی بیٹسمین جم کے وکٹ پر کھڑا بڑے اعتماد سے چوکوں کی مدد سے اسکور کو آگے بڑھا رہا تھا اور ساتھ ہی اس کا کوئی ذاتی ریکارڈ بھی قائم ہونے والا تھا جس کی وجہ سے میچ میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ میچ کے کلائمکس کی طرف بڑھنے کی وجہ سے شہر کی سڑکوں پر بھی ٹریفک نسبتاً کم تھا ایسا لگتا تھا کہ لوگ اسٹیڈیم میں ہیں یا پھر اپنے گھروں کے اندر جم کر بیٹھ گئے ہیں۔ سڑکوں پر چلنے والے راہگیروں نے بھی کانوں کے ساتھ ٹرانسسٹر لگا رکھے تھے۔ گاڑیوں کے ریڈیو سیٹس پر بھی کمنٹری جوبن پر تھی کبھی کبھی کمنٹیٹر کھلاڑی کے کسی شاٹ یا حرکت پر اس طرح چلا اٹھتا جیسے کسی نے اچانک اسے برچھا مار دیا ہو اور تماشائی بھی اپنی سیٹوں سے بے اختیار اٹھ کھڑے ہوتے۔ چکن تکے کے ایک اسنیک بار کے باہر کھڑی چند گاڑیوں کے اندر بھی کاروں کے ریڈیو بول رہے تھے اور سڑک کے کونے کی طرف تنہائی میں پارک کی ہوئی مرسڈیز کار کے اندر ایک جوڑا بیٹھا چکن تکے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی کار کے اندر لگے ہوئے چھوٹے پورٹ ایبل ٹیلی ویژن سیٹ پر کرکٹ میچ دیکھنے میں منہمک تھا۔ میچ میں انہماک کی بدولت چکن کو وہ بہت آہستہ آہستہ کھا رہے تھے۔ اور گاڑی کے باہر دو بچے اور ایک کتا اس انتظار میں بے چین تھے کہ اندر سے بچوڑی ہوئی ہڈی باہر پھینکی جائے تو وہ کچھ کریں۔ اس کے علاوہ ایک فقیر کا بیٹا روشو کار کے اندر لگے ٹیلی ویژن پر میچ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس وقت ٹی وی کے اسکرین پر ایک

شاٹ میں عوام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دکھایا جارہا تھا جو تجسس کا جوار بھاٹا بنا ہوا تھا اور دوسرے شاٹ میں وکٹ پر کھڑا بیٹسمین دکھایا گیا جس کا بیٹ مستعدی سے زمین کو چھو رہا تھا اور آنکھیں اس طرح باؤلر کی طرف لگی ہوئی تھیں جیسے چیتا اپنے شکار کو تاک رہا ہو۔ معاً ٹیلی وژن کا کیمرہ بدلا فاسٹ باؤلر نے اپنے پورے وجود کے زور سے گیند پھینکی کیمرہ پھر تبدیل ہوا جس زور اور قوت سے گیند آئی تھی اسی قوت سے بیٹسمین نے شاٹ لگایا۔

"چھکا۔۔۔۔" کمنٹیٹر چلایا۔ گیند تیزی سے ہوا میں گئی کیمرہ بڑی چابکدستی سے گیند کے ساتھ گیا۔ شائقین میں ہلچل مچی۔ کار میں بیٹھی خاتون نے مرد کے بازو کو گرفت میں لے لیا۔

کیمرہ کٹ کر کے باؤنڈری لائن پر فیلڈر پر جاتا ہے جس نے کسی بازی گر کی طرح ہوا میں چھلانگ لگا کے گیند کو باؤنڈری لائن عبور کرنے سے قبل پکڑ لیا۔

"اور یہ کیچ۔۔۔۔" کمنٹیٹر پھر دھڑکتے دل سے دھاڑا۔ فیلڈر نے ایک نعرہ لگا کر پکڑی ہوئی گیند کو دوبارہ ہوا میں اچھال کر پھر کیچ کیا۔ اور رقص کرنے لگا۔ مجمع پر سناٹا طاری ہو گیا۔ کار میں بیٹھی خاتون کو جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا۔ چکن کی بوٹی خود بخود اس کے ہاتھ سے اچھل کر کار کے دروازے سے باہر گئی۔ دونوں بچے ایک ساتھ بوٹی کو کیچ کرنے کیلئے لپکے لیکن کتے کی فیلڈنگ جیسے زیادہ تیز تھی۔ وہ پھرتی سے ہوا میں اچھلا اور بچوں کے ہاتھوں سے بلند ہو کر ہڈی کو کیچ کرنے میں سبقت حاصل کر لی۔ روشو دیکھتا رہ گیا۔

"در فٹے منہ۔۔۔۔" دونوں نے اپنے مشترکہ رقیب کتے کو ٹھوکریں مارنی شروع کیں جس نے ان کے چکن پر قبضہ کر لیا تھا کتا ٹھوکروں سے بے نیاز ہو کر ہڈی چچوڑتا رہا۔ اور کار میں بیٹھی خاتون اپنے مایہ ناز بیٹسمین کے آؤٹ ہونے کے پر کف افسوس ملنے لگی۔ اس کی زبان کا سارا چٹخارا ختم ہو گیا تھا۔ مرد بھی اپ سیٹ ہو گیا تھا۔

ٹی وی پر یکے بعد دیگرے بیٹسمین کے کیچ ہونے کا منظر مختلف زاویوں سے دکھایا جارہا تھا۔ پھر آؤٹ ہونے والے بیٹسمین کو کیمرے نے جب میدان سے پویلین کی طرف جاتے دکھایا تو اسٹیڈیم میں موجود تماشائیوں نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں اور بیٹسمین کو خراج تحسین پیش کیا۔

روشو جو کار کے عقبی دروازے کے پاس کھڑا مسلسل ٹیلی وژن دیکھ رہا تھا سب کی دیکھا دیکھی تالیاں بجانے لگا۔ حالانکہ اسے کرکٹ کی ابجد بھی نہیں آتی تھی اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کون کس کے خلاف کھیل رہا ہے۔ کس کی وکٹ گری کون نیا بیٹسمین آیا ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ تو بس گراؤنڈ میں بیٹھے تماشائیوں کی دیکھا دیکھی تالیاں بجا رہا تھا۔ وہ تالیاں بجا ہی رہا تھا کہ

اچانک اس کی گردن کو عقب سے کسی مضبوط ہاتھ کی انگلیوں نے گرفت میں لے لیا۔ اسے یوں لگا جیسے شکنجے میں کسا گیا ہو۔ پھر لگاتار دو تین زوردار تھپڑ اس کی گردن پر پڑے تو جیسے اسے تارے نظر آگئے۔ وہ ساری کرکٹ بھول گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو اس کا باپ تھا۔

"اوہ بابا۔۔۔۔ وہ درد سے تڑپا۔

" بد بخت۔۔۔۔ تو اتنی دیر سے کہاں تھا۔۔۔۔ باپ نے ایک اور الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ اور اس کے کان کی لو کو انگلیوں سے پکڑ کے مروڑنے لگا۔

"وہ بابا۔۔ روشو کسمسایا" میں کرکٹ دیکھ رہا تھا۔۔

"کرکٹ دیکھ رہا تھا۔۔ روشو کا باپ غصے سے بے قابو ہو گیا۔

" دھپ، دھپ، دھپ۔۔ اس نے اوپر نیچے روشو کو تھپڑ مارنے شروع کئے۔ "ابے کم بخت کبھی فقیروں کے بچوں نے بھی کرکٹ دیکھی ہے۔ آج تو کرکٹ دیکھ رہا ہے کل پھٹ بال بھی دیکھنے لگے گا۔۔۔۔ ہیں۔۔۔۔ اس نے دو چار ہاتھ جڑ دیئے۔

"او نہیں بابا۔۔۔۔ اب نہیں دیکھوں گا۔۔۔ روشو نے کان پکڑے۔

"تو چل پھر آگے ہو۔۔۔۔ روشو کے باپ نے روشو کا کندھا تھاما اور ایک ہاتھ اور پاؤں سے مفلوج بن کر روشو کا سہارا لئے آگے چوک کی طرف روانہ ہو گیا۔

" لا نکال کتنی کمائی کی۔۔ اس نے قدرے آگے بڑھ کر ایک تنہا سی جگہ پہنچ کر قدم روکے اور ہاتھ آگے بڑھایا۔

"کمائی نہیں کی بابا۔ بتایا نا ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔۔ وہ بے بسی سے بولا اور مار کھانے کے لئے گردن جھکا دی۔ باپ نے ہاتھ اٹھایا اور پھر روک لیا۔ کیونکہ ایک خیر قسم کا آدمی قریب سے گزر رہا تھا۔

" اللہ کے نام پر سخی بابا۔۔۔۔۔ اس نے روشو کا ہاتھ پکڑ آگے بڑھایا۔ " معذور ہوں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میرے۔۔۔۔ اللہ کے نام پر۔ راہگیر کے قدم رکے اس نے ایک سرسری سی نگاہ بھکاری کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ایک روپے کا نوٹ روشو کی ہتھیلی پر تھا۔ روشو کی ہتھیلی سے روپیہ اٹھا کے باپ نے جلدی سے کھیسے میں ڈالا اور ملامت کرتے ہوئے روشو سے بولا۔ " بد بخت دیکھ کچھ آ ہی گیا ہے نا۔ کتنا ٹیم تو نے کرکٹ دیکھنے میں ضائع کر دیا۔۔

" غلطی ہو گئی بابا۔۔۔۔ وہ ازراہ تاسف بولا۔

"آئندہ خیال رکھنا۔۔۔۔ باپ نے معاف کرنے کے انداز میں کہا۔ اور کھمبے کا سہارا لے

کر کھڑا ہو گیا۔

"اللہ کے نام پر۔" اس نے صدا لگائی اور پھر چپ ہو گیا۔

"بابا ---" باپ خاموش ہوا تو بیٹا بولا۔

"کیا ہے ----" باپ نے پوچھا۔

"بابا --- فقیر کے بچے کرکٹ نہیں کھیل سکتے ہیں کیا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ناں یہ ہمارے کام نہیں ---" روشو کے باپ نے نفی میں گردن ہلائی۔ اور نرمی سے جواب دیا۔ باپ کے نرم رویے سے روشو کی حوصلہ افزائی ہوئی اس نے مزید پوچھا "ہاکی پھٹ بال؟"

"دھپ دھپ دھپ"۔ جیسے اچانک باپ کا پارہ چڑھ گیا اس نے لگاتار تین ہاتھ روشو کی گردن پر مارے۔ "او بد بخت تیری کھوپڑی میں الٹی سیدھی باتیں کیوں آنے لگی ہیں ----" اس نے تنبیہ کی۔ "نکال یہ گند اندر سے --- تیرے باپ دادا نے بھی کبھی ہاکی پھٹ بال اور کرکٹ کھیلی تھی --- ہیں؟"

بابا نے پھر ہاتھ اٹھایا اور روشو کی جھکی ہوئی مار کھانے کیلئے تیار گردن پر پڑنے لگا کہ اچانک ایک بڑی سی کار قریب آن رکی جس میں ایک بڑی ماڈرن فیملی بیٹھی تھی۔ مرد، عورتیں، خوبصورت لڑکیاں، چاق و چوبند بچے۔ لڑکیوں اور لڑکوں نے سروں پر کسی اشتہاری کمپنی کی رنگ برنگی کاغذی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ یہ لوگ اسٹیڈیم سے آرہے تھے۔ میچ غالباً ختم ہو گیا تھا اور سڑکوں پر واپسی کی ٹریفک رواں دواں ہو گئی تھی۔

روشو کے قریب رکنے والی کار کا دروازہ ابھی نہیں کھلا تھا کہ روشو کا باپ روشو کا سہارا لے کر معذور ٹانگ اور مفلوج ہاتھ کے ساتھ آگے بڑھا۔

"اللہ کے نام پر سخی بابا --- معذور ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ----"

مرد نے روشو کے باپ کے سوال پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ لڑکیاں چیونگم چباتے ہوئے اپنے دہانوں کی ایکسر سائز میں مصروف رہیں۔ بچے دروازہ کھول کر اسٹور کی طرف گئے اور روشو کی گردن کسی خود کار مشین کی طرح دھیرے دھیرے مڑتی ہوئی بچوں کے ساتھ ساتھ اسٹور کی طرف گئی۔

خوش پوش اور صاف ستھرے بچے اسٹور سے اپنی اپنی پسند کی ٹافیاں اور جوس وغیرہ لینے میں مصروف ہو گئے اور روشو بچوں کی جانب اس طرح متجسس نظروں سے دیکھنے لگا جیسے ایک سیارے کی مخلوق دوسرے سیارے کی مخلوق کو دیکھتی ہے۔ وہ مسلسل بچوں کی طرف حسرت سے دیکھے جارہا تھا جو آپس میں انگریزی بولتے ہوئے آئس کریم جوس اور مشروبات سے لطف اندوز

سو رہے تھے۔ کار کے ریڈیو پر بچوں کے بارے میں کوئی تقریر ہو رہی تھی اور روشو کے کان ریڈیو پر لگے ہوئے تھے۔

" اللہ کے نام پر سخی بابا۔۔۔ معذور ہوں۔ چھوٹے بچے۔۔۔ " اس کے کان میں باپ کی آواز گونجی جو اس کے ہاتھ کو تھامے کار کے دروازے سے اندر کی جانب بڑھا رہا تھا۔

" معاف کرو بابا۔۔۔ " ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے مرد نے اس کی طرف دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔

" اللہ کے نام پر۔۔۔ دل کی مرادیں پوری ہوں "۔ روشو کا باپ مرد کو چھوڑ کر اس کے برابر میں بیٹھی خاتون سے مخاطب ہوا کہ خواتین زیادہ نرم دل اور حساس ہوتی ہیں اور سوالی کا ہاتھ کبھی خالی نہیں جانے دیتیں۔ اس نے اپنا اور روشو کا مشترکہ ہاتھ کار کے شیشے کے پاس خاتون کی طرف بڑھائے رکھا لیکن خاتون کار کی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر شوہر کے ساتھ کسی راز داری میں مصروف تھی اور دونوں میاں بیوی روشو اور اس کے باپ کی موجودگی کے احساس سے بے خبر تھے اور روشو کے باپ کیلئے یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے گاہکوں کی نفسیات سے واقف تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فقیروں کی موجودگی کو کبھی لوگ " موجودگی " نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کے سامنے اپنی پرائیویٹ باتیں کرتے رہتے ہیں جیسے فقیروں کے کان نہ ہوں لیکن وہ پیشہ ور فقیروں کی طرح یہ بات بھی جانتا تھا کہ آدمی کی جیب سے پیسہ نکالنے کیلئے کیا کیا طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ گاہک کے بار بار انکار اور " معاف کرو " کی تکرار کے باوجود اس سے بار بار اتنا مانگو کہ وہ زچ ہو کر جان چھڑانے کیلئے پیسے دے ہی دے۔ یا پھر کوئی ایسا فقرہ پھینکو کہ ٹھاہ کر کے اس کی کمزور رگ پر لگے۔ اگر میاں بیوی ہیں تو بیوی کو میاں کی سلامتی کی دعا دو۔ بچہ گود میں ہے تو اس کے بچے کے حوالے سے اور واسطے سے اپنے چھوٹے بچوں کا ہاتھ آگے بڑھا دو۔ بچوں کے سر کا صدقہ مانگو۔ جوڑی سلامت رہنے کی دعا دو، اقبال کی بلندی، بیماریوں سے نجات۔ کسی کا محتاج نہ ہونا۔ عزت و آبرو کے ساتھ جینا اور درازی عمر وغیرہ کی پیشہ وارانہ دعائیں اسے ازبر تھیں جو وہ درخت پر لگے پھل پر پتھر کی طرح پھینکتا تھا کہ شاید کوئی نہ کوئی پتھر نشانے پر لگے اور پھل گر جائے۔ یہ سب کچھ اس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا اور اب وہ اپنی تمام تربیت اور صلاحیت اپنے بیٹے روشو کو منتقل کر دینا چاہتا تھا۔

" تیرے سر کا سائیں سلامت رہے۔۔۔ " اس نے اپنا بوجھ روشو کے کندھے پر ڈال کے روشو کا دست سوال آگے بڑھایا۔ عورت ٹس سے مس نہ ہوئی حالانکہ روشو کے باپ نے دکھتی رگ پکڑی تھی لیکن معلوم ہوتا تھا دونوں میاں بیوی ابھی تک کسی گھمبیر گھریلو مسئلے کی گہرائی میں

ڈوبے ہوئے تھے۔ کار کے ریڈیو پر کوئی گیت نشر ہو رہا تھا جسے میاں بیوی میں سے کوئی بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ اپنی باتوں میں مگن تھے پھر گیت ختم ہوا تو کوئی اخلاقی قسم کا پیغام بہت پر اثر لہجے میں ریڈیو پر سنائی دیا۔ روشو کے کان ابھی تک ریڈیو سے وابستہ تھے وہ ایک ایک لفظ غور اور توجہ سے سن رہا تھا۔

"بچے قوم کی امانت ہوتے ہیں۔ آج کے یہ ننھے منے پھول سے بچے جو اسکول کے کلاس روموں میں بیٹھے ہیں۔۔۔ جو اسمبلی میں دعا کیلئے جمع ہیں۔۔۔ جو گراؤنڈ میں ہاکی فٹ بال یا کرکٹ کھیل رہے ہیں۔۔۔۔ جو بسوں میں لٹکے ہوئے ہیں۔ کاروں میں بیٹھے ہیں۔ بائیسکل چلا رہے ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے بظاہر شرارتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی بچے کل قوم کی تقدیر کے مالک ہوں گے۔ انہی بچوں میں سے کل کوئی ڈاکٹر بنے گا۔ کوئی انجینئر، کوئی سائنس دان، کوئی وکیل، کوئی پروفیسر، کوئی افسر اور کوئی سیاستدان بن کے قوم کی تقدیر کی باگ ڈور سنبھالے گا۔۔۔ ان بچوں کی صحیح تربیت اور نشو نما ہم سب کا فرض ہے۔۔۔۔"

یہ ساری اخلاقی تقریر کار میں بیٹھے میاں بیوی کے سر سے جیسے گذر گئی۔ وہ اپنی باتوں میں مگن تھے۔ روشو کا باپ بھی وقفے وقفے سے ایک کے بعد ایک سوال پھینک رہا تھا لیکن روشو کا پورا دھیان ریڈیو پر نشر ہونے والی تقریر پر لگا ہوا تھا اور وہ اپنے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آیا اس تقریر میں سے کوئی بات اس کے اوپر بھی لاگو ہو رہی ہے کہ نہیں۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ ریڈیو نے فقیر بچوں کا نام کیوں نہیں لیا۔

"آجاؤ بچو۔۔۔۔" باپ نے اسٹور پر کھڑے مشروبات سے فارغ ہونے والے بچوں کو آواز دی۔ بچے فر فر انگریزی بولتے تیزی سے کار میں آن بیٹھے۔ بچوں کے باپ نے کار اسٹارٹ کی اور روشو کا باپ سوالی ہاتھ کے ساتھ تقریباً سارا اندر جھک گیا اور حرکت کرتی ہوئی کار میں آخری جملہ پھینکا۔

"اے بچیاں والی اپنے بچوں کے صدقے غریب کے بچوں پر ترس کھا۔۔۔۔" کار آگے نکل گئی اور روشو کے باپ کا وار خالی گیا۔

اسے افسوس ہوا کیونکہ کافی دیر سے وہ اسی کار کے اطراف منڈلا رہا تھا اس نے اپنے جملوں کا بہت سا اثاثہ ضائع کیا تھا لیکن اس کی تمام محنت اکارت چلی گئی تھی۔۔۔ تاہم روشو نے باپ کے فقروں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں اجلی یونیفارم اور پی کیپ پہنے بچے تھے اور کان میں ریڈیو کی آواز گونج رہی تھی۔

"انہی بچوں میں سے کل کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، کوئی پروفیسر۔۔۔۔"

" بابا میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا۔۔۔؟"۔ روشو نے اپنے کان میں گونجنے والے پیغام کے تسلسل کو توڑ کر اچانک اپنے باپ سے پوچھا۔

" تو بنے گا کھوتی کا سر"۔ روشو کے باپ نے برہم ہو کر دھپ دھپ دو تین تھپڑ روشو کی گردن میں مارے۔ ایک تو اسے اپنے وار کے ضائع ہونے کا غصہ تھا پھر کار والوں کی کنجوسی اور بے نیازی پر اسے قہر آ رہا تھا اوپر سے روشو نے ایسی بات پوچھ لی جو اس کے لئے بکواس اور چاقو کے ضرب سے کم نہ تھی۔

" کم بخت بے عزت، بے حیا، یہ ایک دم سے گند تیرے دماغ میں کہاں سے آجاتا ہے؟" اس نے تابڑ توڑ روشو کے گردن پر گھونسے برسائے۔

" بابا ریڈیو بول رہا تھا"۔ روشو نے اپنی مار کھائی گردن بچاتے ہوئے کہا۔

" جھوٹ بولتا ہے ریڈیو"۔ روشو کا باپ گرجا لیکن اس دفعہ اس نے تھپڑ روک دیا تھا۔

" اور ٹیلی ویژن؟"۔۔۔ روشو نے بے اختیار پوچھا۔

" سب جھوٹ بولتے ہیں"۔ روشو کے باپ نے بھی فوراً جواب دیا۔ " یہ ریڈیو، ٹی بی، اسکول ماشٹر، ڈاکٹر، حکیم، یہ لچھے دار تقریریں جھاڑنے والے لیڈر سب جھوٹ بولتے ہیں"۔ وہ فلسفیانہ انداز میں اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

" سچ صرف فقیر بولتے ہیں کہ جو کہتے وہ کرتے ہیں"۔۔۔ وہ اپنے فلسفے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

" میں تجھے بار بار کہہ رہا ہوں کہ تو فقیر کا بیٹا ہے فقیر بنے گا لیکن یہ بات تیری کھوپڑی میں نہیں آتی ریڈیو اور ٹی کا گند تیری سمجھ میں آجاتا ہے"۔

" لیکن بابا۔۔۔"۔ روشو نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا اور اس نے دیکھا کہ ساتھ ہی اس کے باپ کا ہاتھ اس کی گردن پر پڑنے کیلئے اوپر اٹھا تو اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

" اللہ کے نام پر معاً ایک اور کار اسٹور کے آگے آن رکی تو روشو کا باپ وقت ضائع کئے بغیر تیزی سے کار کی جانب بڑھا اور روشو کا ہاتھ تھام کر کار کے آگے بڑھا دیا۔ کار والا شاید اخبار کیلئے رکا تھا اس نے سڑک کے کنارے کھڑے لڑکے کو اشارہ کیا اور شام کے اخبارات کا ایک سیٹ خرید کر کار آگے سرکائی تو روشو کا باپ روشو کے ہاتھ سمیت کار کی کھڑکی سے جیسے لٹک گیا۔

" اللہ کے نام پر"۔

" مزدوری کیوں نہیں کرتے؟"۔ صاحب کار نے کار کی بریک کو ہلکا سا دباتے ہوئے جھڑکنے

کے انداز میں پوچھا۔

"معذور ہوں سخی بابا"۔۔۔۔روشو کے بابا نے اپنے مصنوعی ٹنڈے ہاتھ اور بناوٹی لنگڑی ٹانگ کو اوپر کی طرف جنبش دیتے ہوئے بے بسی سے جواب دیا۔

"کس قدر جھوٹ"۔۔۔۔روشو نے سوچا لیکن اسے حیرت نہیں ہوئی کہ یہ جھوٹ اس کا باپ صبح سے شام تک اس طرح بولتا ہے جیسے یہ اس کی بولی ہو۔

"یہ لو پکڑو"۔۔۔۔کار والے صاحب نے پانچ کا نوٹ آگے بڑھایا اور روشو کی بجائے اس کے باپ کے ہاتھ میں نوٹ پکڑا کر جاتے جاتے نصیحت کے انداز میں بولا۔"اور یاد رکھو بھیک مانگنی ہے تو خود مانگو اس معصوم بچے کو بھکاری مت بناؤ بچہ بڑا ہو کر"۔۔۔۔

"ہش ش ش ش"۔۔۔۔روشو کا باپ کار والے کی بات بیچ میں کاٹ کر بولا "اپنی نصیحت اور اپنا نوٹ اپنے پاس رکھو"۔۔۔۔

اس نے نوٹ کو گول کر کے بتی سی بنائی اور کار والے کے منہ پر دے ماری کار والا آگ بگولا ہو گیا اور اسے پیشتر کہ وہ دروازہ کھول کر نیچے اترتا روشو کے باپ نے روشو کا کندھا دبایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا، سڑک عبور کر کے اس پار والے فٹ پاتھ پر چلا گیا۔

"کیوں بابا تم نے ایسا کیوں کیا؟"۔اس پار پہنچ کر روشو نے ازراہ حیرت باپ سے دریافت کیا، پانچ کا نوٹ تم نے واپس کیوں کیا؟"۔

"میں نے واپس نہیں کیا پانچ کا نوٹ اس کے منہ پر دے مارا"۔روشو کا باپ فخریہ بولا۔

"کیوں"۔۔۔۔روشو نے مزید حیرت ظاہر کی۔"اتنا غصہ کیوں؟"۔

"اس لئے کہ اس نے میرے پیشے پر حملہ کیا تھا۔۔۔ تم کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ روشو کا باپ تن کر بولا۔"میں نے اسے سبق پڑھا دیا ہے اب وہ دوبارہ کسی کو لکچر دینے سے پہلے دس دفعہ سوچے گا"۔

"ہنہ"۔۔۔۔روشو خیالات میں ڈوبا باپ کا منہ تکنے لگا۔

"ابے تو مجھے کیا تک رہا ہے؟ چل آگے چل"۔اس نے روشو کے کندھے کو دبا کے ایک جھٹکا دیا۔"تم ان تلنگوں کی باتوں میں نہ آنا"۔

لیکن اسے شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ روشو کے معصوم دماغ کی زرخیز زمین میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کا ایک نرم رو بیج بویا جا چکا تھا جس کی اندر ہی اندر آہستہ آہستہ نشو نما ہو رہی تھی

رات کا تیسرا پہر تھا جب مرغ سحری نے کہیں دور اذان دی تو روشو نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور کروٹ لینے کی کوشش کی لیکن وہ اس طرح پھنسا ہوا لیٹا تھا جیسے کریٹ میں بوتلیں ہوتیں ہیں یہ وہ وقت ہوتا ہے جب فقیر رات کی خرمستیوں سے تھک کر مکمل طور پر سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس وقت ہلکی ہلکی چاندنی چھن کر اندر جھونپڑی میں آرہی تھی روشو نے آہستہ سے سر اٹھایا اور چاندنی کی ملگجی روشنی میں جھونپڑی میں سوئے فقیروں کا جائزہ لیا اسے یوں لگا جیسے ایک دوسرے پر گرے ہوئے انسان نہ ہوں لاشیں ہوں سب کے خراٹوں کی مختلف آوازیں یکجا ہو کر جھونپڑی کے اندر ایک عجیب ہولناک منظر پیش کر رہی تھیں اس نے اپنے باپ کا ہلکا سا جائزہ لیا جو بالکل اس کے ساتھ لگا سو رہا تھا اور باپ کے ساتھ ہی اس کی ماں تھی۔

اس نے بے خبر سوئی ہوئی ماں کا جائزہ لیا تو اسے یہ دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ وہ اس کی ماں نہیں ایک اور فقیرنی شاداں تھی جو ایک اور فقیر لڑکے شاموں کی ماں تھی لیکن یہ بات بھی اس کیلئے کوئی نئی نہیں تھی یہ آئے دن کا معمول تھا بھکاری اور بھکارنیں جب بھیک مانگ کر سر شام جھونپڑیوں میں لوٹتے تو پھر کسی ایک جھونپڑی میں یکجا ہو جاتے اور نشہ پی کر جوا کھیلنے لگ جاتے۔ عورتیں الگ اور مرد الگ اودھم مچاتے اور پھر وہ سب گڈ مڈ ہو جاتے نشہ بھی گڈ مڈ ہو جاتا اور خرمستیوں میں وہ اس قدر بدمست ہوتے کہ پچھلی رات کو جب نڈھال ہو کے سوتے تو کسی کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کون کس کی جھونپڑی میں ہے۔

بے حیائی کا یہ مظاہرہ روشو کم و بیش ہر رات دیکھتا تھا اور اسے یہ سب قطعی اچھا نہیں لگتا تھا لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کا وہ عادی ہو گیا تھا۔

اس بستی میں پیدا ہونے اور پرورش پانے کے باوجود معلوم نہیں روشو کا ذہن کیوں اس قسم کی بے راہ روی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ لیکن یہ ایک ثانوی بات تھی اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے اندر پیدا ہونے والے پیدائشی فقیر کو ختم کرنا چاہتا تھا اور اس کے خاتمے کی یہی راہ تھی کہ وہ فقیروں کی بستی سے راہ فرار اختیار کرلے اور اپنے فقیر باپ سے نجات حاصل کرنے کیلئے رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلے اور آج اس نے صحیح موقع تلاش کیا تھا فقیر نشے میں بدمست ہو رہے تھے اور وہ اس وقت چاندنی رات میں نکل کر بڑی آسانی سے بھاگتا ہوا شہر کی بھول بھلیوں میں گم ہو سکتا تھا۔

وہ دبے قدموں اٹھا اور سوئے ہوئے فقیروں کو پھلانگنے کیلئے ایک جست لگانے ہی لگا

تھا کہ اچانک جھونپڑی کے ایک کونے میں پڑے سونے اس کے چھوٹے بھائی خیرو نے چیخم دھاڑ مچادی۔ سب لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اس کا باپ بھی باہر کہیں اور سونے ہونے تھا اٹھ بیٹھا دوسرے سب فقیر بھی بیدار ہوگئے۔ خیرو چیختا رہا۔ اس کے باپ نے جلدی کونے میں ٹارچ کی روشنی ڈالی تو دیکھا۔ کہ ایک بڑا ہیبت ناک چوہا خیرو کے چہرے کی کھال اپنے دانتوں سے ادھیڑ رہا ہے۔ روشنی پڑتے ہی چوہا دھب دھب کرتا جھونپڑی میں بنے اپنے بل میں غائب ہوگیا اور ننھا خیرو خون میں لتھڑ گیا۔

"میں مر گئی۔۔۔۔ایک عورت نے جلدی سے خیرو کو گلے لگالیا اس کی ماں کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کونسی جھگی میں ہے۔ روشو بھائی کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہوگیا۔ سارے فقیر بچے اس کے آس پاس جمع ہوگئے۔ کوئی فقیر بچے کو اٹھا کر چاند کی کھلی روشنی میں لے آیا۔ بچہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی کھال کئی جگہ سے ادھڑ گئی تھی اور چہرہ مسخ ہوگیا تھا۔

"شیرو۔۔۔اسے ہسپتال لے چلو۔" جھونپڑی کے باہر جمع ہونے والے فقیروں میں سے کسی نے رائے دی۔

"ہاں ہاں ہسپتال لے چلو۔۔۔۔" دو چار آوازیں اور بلند ہوئیں۔

"ارے کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ خون صاف کر کے مٹی لگادو۔۔۔۔" کسی نے مشورہ دیا۔

روشو کا باپ کچھ دیر چاند کی روشنی میں بچے کے مسخ شدہ چہرے کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتا رہا پھر معنی خیز انداز میں بولا۔

"ارے کسی چیز کی ضرورت نہیں اسے۔ یہ چوہے کا حملہ نہیں مولا کا کرم ہے۔" اس نے بچے کو فقیر کی گود سے چھینا اور روشنی کی طرف منہ کر کے اچھی طرح ادھڑا ہوا لہو لہان چہرہ دیکھتے ہوئے مزید بولا۔

"یہ اب سونے کی کان ہوگیا ہے۔ اسے اسی طرح گود میں اٹھا کے گاہکوں کے آگے ہاتھ پھیلاؤں گا۔"

"کیا۔۔۔؟" اچانک شیرو کی بیوی خمار آلود کیفیت میں اونگھتی اور ڈگمگاتی ہوئی کہیں سے وارد ہوئی لیکن وہ ابھی تک خمار میں تھی۔

"ہاں ٹھیک کہتا ہوں۔۔۔۔۔" وہ فخر کے ساتھ بولا۔ "کون کم بخت ہوگا جو اسے دیکھ کر خیرات نہیں دے گا۔"

"شیرو ٹھیک کہتا ہے۔۔۔۔۔دو چار فقیروں نے شیرو کے دماغ کی داد دیتے ہوئے کہا اور یہ منظر دیکھ کر روشو کی روح فنا ہو گئی۔ "ارے اسے تو فقیروں کا چوہدری ہونا چاہئے تھا۔۔۔۔۔ باہر لیٹی ہوئی ایک اور فقیرنی نشے میں کروٹ لے کر بولی

"چوہدری تو میں ہوں۔ تم مانو یا نہ مانو۔۔۔۔۔روشو کا باپ تن کر بولا۔ پھر اچانک اس نے ادھر ادھر اندر جھونپڑی میں نگاہ ڈالی جہاں روشو سویا ہوا تھا اور پھر قدرے تشویش سے بولا۔

"یہ روشو نظر نہیں آتا۔۔۔کہاں گیا ہے۔۔لیکن پھر خود ہی مطمئن ہو گیا یہ سمجھ کر کہ ضرورتاً کہیں ادھر ادھر جھاڑیوں میں گیا ہو گا روشو کی ماں بھی روشو سے بے خبر تھی وہ بوجھل آنکھوں کو زبردستی کھولنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ خیرو کے خون آلود چہرے کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ روشو اس وقت چٹکی ہوئی چاندنی میں درختوں کی قطار کے سائے کے نیچے شہر جانے والی سڑک پر سرپٹ بھاگتا جا رہا تھا۔

چاند پوری گولائی پر تھا اور چٹکی ہوئی چاندنی میں طویل تنہا سڑک کسی نہر کی طرح سے لگ رہی تھی جس کے کنارے درختوں کی قطار کے گہرے سایوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور روشو انہیں سایوں کے بیچوں بیچ چھپتا چھپاتا شہر کی جانب دوڑتا چلا جا رہا تھا پھر یکایک اچانک رات کی خاموش اور تنہا سڑک میں ارتعاش سا پیدا ہوا جیسے عقب سے کوئی تیز رفتار گاڑی روشو کے تعاقب میں آرہی ہو۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ دور سے آتی کار کی روشنی درختوں کے سائے پر پڑنے لگی ہے۔ وہ گھبرایا جیسے پکڑا جانے لگا ہو۔ اسے بائیں جانب ترائی کی جانب سے کچی سڑک جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف جاتی دکھائی دی وہ بے اختیار کچی سڑک کی طرف مڑ گیا اور تھوڑی دور جا کر جھاڑیوں کے عقب میں کسی خرگوش کی طرح دبک کے بیٹھ گیا تاکہ گاڑی پکی سڑک سے نکل جائے تو وہ دوبارہ سڑک پر آجائے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیرت اور خوف کی عجیب کیفیت میں مبتلا ہو گیا کہ کار بھی سیدھی سڑک پر جانے کی بجائے کچی سڑک پر اتر آئی اور عین اس جگہ آ کے ایک سمت کھڑی ہو گئی جہاں وہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔

گاڑی بالکل اس کے اتنے قریب آکر رکی کہ اس کے زور سے سانس لینے کی آواز بھی گاڑی تک جا سکتی تھی۔ وہ سانس روک کر بیٹھ گیا۔ اس نے غور سے دیکھا تو گاڑی میں چار سخت جان قسم کے بندے بیٹھے تھے دو آگے اور دو پیچھے کی سیٹ پر چاروں جوان اور کم و بیش ایک ہی عمر کے تھے

"آگے راستہ بند ہے۔۔۔۔۔ ڈرائیور گاڑی روک کر پریشانی اور مایوسی کے عالم میں بولا۔

روشو نے محسوس کیا کہ چاروں نوجوان انتہائی اضطرابی کیفیت میں تھے جیسے وہ روشو کے پیچھے نہ ہوں بلکہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہو۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں چاروں کے چہرے صاف اور واضح دکھائی دے رہے تھے۔

"لائٹس بند کر دو۔۔۔۔۔۔" ڈرائیور کے برابر والا نوجوان بولا اور ڈرائیور نے لائٹوں کے ساتھ گاڑی بھی بند کر دی۔

"میرا خیال ہے گاڑی نکل جائے گی"۔۔۔۔ گاڑی کی عقبی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے امید افزا لہجے میں دیکھا۔

"مشکل ہے" ڈرائیور سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پگڈنڈی کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "اور پھر معلوم نہیں آگے سڑک جاتی بھی ہے کہ نہیں۔"

"آگے تو سڑک ہے۔" وہ پرامید لہجے میں بولا۔ "کسی طرح یہاں سے نکال لو۔"

"ہش ش ش۔۔۔۔۔۔" چوتھے نوجوان نے شَشکارا تو روشو کی روح فنا ہو گئی۔ وہ یہ سمجھا کہ شاید انہوں نے روشو کی آہٹ سن لی ہے لیکن وہ سڑک پر چلنے والی کسی گاڑی کی آواز پر ہوشیار ہوئے تھے۔ گاڑی جب فرانے بھرتی مین روڈ سے گزری تو چاروں سر جھکائے اپنی کار میں دبک گئے تھے۔

"پولیس وین ہے۔۔۔۔۔۔" گاڑی کے نکل جانے کے بعد ایک نوجوان نے شبہ ظاہر کیا۔

"ہاں۔۔۔۔۔" دوسرے نے یقین کے ساتھ کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ پولیس کو اطلاع مل گئی ہے۔" تیسرے نے تشویش ظاہر کی اور اس کے ساتھ ہی پولیس کی تین چار گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی ہوئی سائرن بجاتی گزر گئیں۔

"مائی گاڈ۔۔۔۔۔" پچھلی سیٹ پر دبکا ہوا نوجوان گھبرایا۔ پھر قدرے توقف سے بولا۔ "کچھ بھی ہو ہمیں روڈ پر نہیں آنا چاہئے تھا۔ اگر شناخت ہو گئی تو مارے جائیں گے۔۔۔۔۔"

"پھر۔۔۔۔۔؟"

"گاڑی نکل جائے گی۔۔۔۔۔۔" اس نے بند راستے کا جائزہ لیتے ہوئے یقین کے لہجے میں کہا اور نیچے اتر کر راستے کی رکاوٹ دور کر کے واپس کار کی جانب مڑا تو اچانک اس کی نگاہ سرکنڈوں کے پیچھے چھپے بیٹھے روشو پر پڑی جو ڈرا سہما اسے دیکھ رہا تھا۔ جونہی دونوں کی نظریں ٹکرائیں تو روشو جال میں پھنسے کسی پرندے کی طرح پھڑ پھڑایا اور ایک جست لگا کر بھاگنے لگا لیکن اس سے پیشتر ہی ایک بھاری بھر کم ہاتھ نے فولادی شکنجے کی طرح اس کی گردن پکڑی انگلیوں کی گرفت اتنی مضبوط اور اندر کی طرف دبانے والی تھی کہ روشو کے حلق میں پھنسی سانس گھٹ گئی اور آنکھیں پھٹ کر باہر نکل آئیں۔

۴

صبح جب فقیر میک اپ کر کے اور اپنے اپنے حلیے بگاڑ کر جھگیوں سے باہر نکلے تو شیرو بھی جھگی کے باہر تیار کھڑا تھا اور خیرو کو اس نے گود میں اٹھا رکھا تھا جس کے چہرے کی کھال کرم خوردہ گرم کپڑے کی طرح ادھڑی ہوئی تھی اور خون ٹپک رہا تھا اور ٹپک ٹپک کر جم گیا تھا جسے صاف کرنے کی ضرورت شیرو نے محسوس نہیں کی تھی بلکہ وہ بہت مطمئن تھا کہ جن چہروں کو وہ بہت محنت سے بگاڑتے ہیں وہ مولا نے خود ہی ایک چوہے کے وسیلے سے بگاڑ دیا تھا اور اسے یقین تھا کہ آج خیرو جب اس قابل رحم اور مسخ شدہ چہرے کے ساتھ اس کی گود میں ہوگا تو خیر اور رحم دل گاہکوں کی طرف سے روپے کی برسات ہو جانے گی لیکن اسے تشویش روشو کے بارے میں تھی کہ وہ سحری کے وقت سے غائب تھا پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ ادھر ادھر جھاڑیوں میں کہیں ضرور رتا گیا ہوگا پھر اس نے سوچا کہ شاید خیرو کے مسخ شدہ چہرے کی حالت دیکھ کر اور شور شرابے سے گھبرا کر کسی اور جھونپڑی میں جا کے سو گیا ہو کسی اور کی جھونپڑی میں سو جانا فقیروں کے رہن سہن کے مطابق کوئی انوکھی بات نہ تھی۔

اس وقت شیرو کے لئے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ روشو کی کوئی خبر نہیں تھی تو دوسری طرف اسے خوشی ملی تھی کہ خیرو کا زخمی خون سے لتھڑا اور ادھڑا ہوا چہرہ اس کے لئے روپے کی مشین بن گیا تھا۔ یہ غم اور خوشی کی ملی جلی کیفیت تھی جس سے شیرو اس وقت دوچار تھا وہ ویسے بھی روشو کی باتوں اور اس کے خیالات سے پریشان رہتا تھا وہ بڑا آدمی بننے کے ارادے ظاہر کرتا رہتا محنت سے کما کر کھانے کی باتیں کرتا تھا، فقیروں سے نفرت اور اس پیشے کو حقارت سے دیکھتا تھا اور شیرو کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ روشو کہیں فرار نہ ہو جائے اور آج اسے روشو کے فرار ہونے میں کوئی شبہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کچھ پتہ چلا روشو کا-----اس کی بیوی جو سحری کے وقت بیدار ہو کر کہیں اور جا کے سو گئی تھی غنودگی میں او نگھتی ہوئی آئی اور قدرے تشویش سے پوچھا اب وہ غالباً خمار کی گرفت سے مکمل طور پر باہر آگئی تھی۔

"نہیں-----"اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔"اس کا کیا حال ہے" بیوی روشو کے بارے میں مزید کچھ پوچھنے کی بجائے خیرو کے چہرے پر جھک گئی جو خون میں لتھڑا شیرو کی گود میں سو رہا تھا اور جس کے بارے میں سحری کے وقت صحیح توجہ نہیں دے سکی تھی۔

"یہ ٹھیک ہے، اس کو میں نے افیم کھلادی ہے۔" وہ خیرو کی طرف سے مطمئن ہو کر بولا اور پھر ایک دم سے سب کچھ بھول بھال کے جیسے اسے اچانک کوئی اہم بات یاد آگئی۔

"تم نے کل کے پیسے نہیں دیئے۔" وہ بیوی سے مخاطب ہوا۔

"کب دیتی" اس نے نیفے میں ہاتھ ڈال کر ربر بینڈ میں بندھے ہوئے نوٹ نکالے۔

"رات تم سے ملاقات ہی کہاں ہوئی۔"

"صحیح-----" شیرو نے بیوی کے ہاتھ سے نوٹ دبوچ کر اثبات میں سر ہلایا اور سوچا کہ واقعی رات کو دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

"اچھا ہی ہوا نہیں دیئے تھے رات۔ تم یہ بھی ہار گئے ہوتے۔" بیوی نے کہا۔ "تم سے کس نے کہا میں ہارا ہوں-----" شیرو نے پوچھا۔ "شاداں کے آدمی نے-----" اس نے شیرو کے برابر میں کھڑی شاداں کی طرف اشارہ کر کے کہا جو رات شیرو ہی کی جھونپڑی میں شیرو ہی کے پاس تھی!

"یہ جوا ہے۔ اس میں ہار جیت تو لگی رہتی ہے۔" اس نے کن انکھیوں سے شاداں کو دیکھا اور پھر بیوی کی طرف دیکھ کر اور قدرے جھک کر بولا۔ اچانک اسے بیوی کے پاس سے بہت تیز خوشبو کا جھونکا آتا محسوس ہوا۔

"یہ خوشبو تم نے لگا رکھی ہے؟" شیرو نے گہرا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہونہہ-----کل وہ مل گیا تھا گٹ پٹ بولنے والا گراہک۔ اس نے چھڑکی ہے۔" وہ ایسے لہجے میں بولی جیسے کوئی معمولی بات ہو لیکن ساتھ ہی اس نے شاداں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اسے جلا کر کباب کرنا چاہتی ہو۔

"خوشبو پہلے چھڑکی تھی یا بعد میں" شاداں نے بے اختیار جملہ چست کیا اور شیرو کی بیوی

جیسے ادھار کھائے بیٹھی تھی وہ جنگلی بلی کی طرح شاداں پر حملہ آور ہو گئی "کتی کمینی" پھر ایک تماشا بن گیا دونوں گتھم گتھا ہو گئیں ایک دوسرے کا منہ اور بال نوچنے لگیں لڑتے لڑتے زمین پر گر گئیں کبھی ایک اوپر اور دوسری نیچے اور کبھی یہ اوپر اور وہ نیچے۔ بہت سے فقیر اور فقیرنیاں اس طرح جمع ہو کر تماشا دیکھنے لگیں جیسے مرغیاں لڑ رہی ہوں پھر شیرو نے دونوں کو ٹھوکریں مار کر چھڑایا بھی اس طرح جیسے وہ جانور ہوں۔

"ٹیم ضائع مت کرو"۔۔۔۔۔اس نے بیوی کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ "اسے سنبھالو۔" اس نے افیم کے نشے میں سوئے ہوئے مسخ چہرے والے خیرو کو بیوی کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا

"اسے لے کر اپنے راستے جاؤ"۔۔۔۔۔وہ تحکمانہ انداز میں بیوی سے پھر مخاطب ہوا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟ بیوی نے پوچھا۔"

"میں اپنے علاقے میں جارہا ہوں ظہر کے بعد تمہیں سگنل پر مل جاؤں گا۔" شیرو نے جواب دیا پھر وہ چپ ہو گیا اور کچھ دیر چپ رہ کر پریشانی کے عالم میں بولا۔

مجھے اس وقت سب سے زیادہ فکر روشو کی ہے اسے ڈھونڈوں گا۔" پھر اس نے آس پاس کھڑے فقیروں سے مخاطب ہو کر کہا" جس کسی کو بھی کہیں روشو نظر آجائے پکڑ لینا اسے کسی قیمت پر جانے نہ دینا اگر آج روشو چلا گیا تو کل دوسرے چھوکروں کو بھی ہوا لگ جائے گی یہ صرف میرا نہیں سب کا معاملہ ہے۔"

"شیرو صحیح کہتا ہے۔" ایک فقیر نے کہا اور پھر کم و بیش سارے فقیر اپنے اپنے بچوں کے مستقبل کی طرف سے پریشان ہو گئے۔

O

"کون ہے یہ۔۔۔۔۔" دوسرا آدمی بھی فوراً کار سے باہر نکل آیا پہلے والے نے ابھی تک روشو کی گردن اپنے آہنی پنجے کی گرفت میں دبا رکھی تھی اور لحظہ بہ لحظہ روشو کے دیدے پھٹ کر باہر آرہے تھے جیسے جاں کنی طاری ہو۔

"پتہ نہیں۔۔۔۔۔ جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔" پہلے آدمی نے لاعلمی ظاہر کی۔

"اڑا دو اسے۔۔۔۔۔" تیسرا بھی کار سے باہر آگیا اور پستول نکال کے بہت پھرتی کے ساتھ نشانہ لیا۔

"کیا کرنے لگے ہو۔۔۔۔۔" پہلے نے مدافعت کی اور پستول کی نال دوسری طرف گھما دی۔

"اسے مار کے جھاڑیوں میں پھینک دو۔۔۔۔۔" تیسرا بولا۔

"پاگل ہو گئے ہو؟" وہ بحث میں الجھ گئے۔ "جب اتنی بڑی واردات بغیر خون خرابے کے ہو گئی تو اس کو کیوں مار رہے ہو۔۔۔۔۔" پہلے نے پھر مدافعت کی۔ "ابھی رک جاؤ اس جگہ پر فائر کرنا درست نہیں ہے۔"

"اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے یہ شناخت بن گیا ہے ہماری۔" تیسرے نے شبہ ظاہر کیا۔

"لیکن ہے کون۔۔۔۔۔؟" دوسرے نے پوچھا۔

"کون ہو تم۔۔۔۔۔؟" پہلے آدمی نے آہنی گرفت سے اس کی گردن آزاد کر کے ایک زور دار تھپڑ مارا۔ "اور یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔ جلدی بتادو نہیں تو گولی مار دیں گے۔" روشو تھر تھر کانپنے لگا جیسے اس کی زبان بند ہو گئی ہو۔ اتنے میں ایک بھاری بھر کم ٹرک زمین کو ہلاتا ہوا مین روڈ سے گزر گیا اور جیسے پگڈنڈی بھی کانپ گئی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی گھبراہٹ میں باہر آگیا۔

"وقت ضائع مت کرو گاڑی میں بیٹھ جاؤ یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔" وہ پریشانی اور گھبراہٹ میں بولا۔

"اس کا کیا کریں۔۔۔۔۔؟ دوسرے نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

"یہ کسی منگتے کا بچہ لگتا ہے مجھے۔۔۔۔۔ اسے گاڑی میں بٹھالو اور ساتھ لے چلو۔" چوتھے نے مشورہ دیا اور پھر دو آدمیوں نے پکڑ کر اسے گاڑی میں بٹھایا اور ایک بڑی چادر اس کی آنکھوں کے گرد لپیٹ کر گاڑی نیچے کی طرف موڑ دی۔

گھنٹے پونے گھنٹے کے بعد جب روشو کی آنکھوں سے پٹی کھلی تو اس نے خود کو کسی بنگلے کے ایک تنہا کمرے میں پایا جو چاروں طرف سے مکمل طور پر بند تھا تاہم روشندان کی طرف سے آنے والی پرندوں کی ہلکی ہلکی اور نامعلوم سی آواز صبح کے نمودار ہونے کا پتہ دے رہی تھی وہ لوگ ابھی ابھی روشو کو اس کمرے میں بند کر کے باہر نکلے تھے تاہم ان کی آوازوں سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ ابھی بنگلے کے اندر موجود ہیں بمشکل تمام روشو کو ایک دروازے کی جھری سے دوسرے کمرے کا تھوڑا سا منظر دکھائی دیا جہاں ایک تھیلے میں نوٹوں کی گڈیاں اور سونے کے زیورات کا ڈھیر نکالا جا رہا تھا روشو نے آنکھ جھری سے لگالی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے بس اتنا ہی سمجھ سکا کہ یہ لوگ ڈاکو ہیں جو واردات کر کے آرہے ہیں۔

اس نقب زنی کی کارروائی نصف رات کے قریب شروع کی گئی تھی جو صبح ہونے سے کچھ دیر قبل مکمل ہوئی۔ واردات شہر کے مشہور صراف کی دکان میں ہوئی تھی۔ اس وقت پولیس کی ایک وین سڑک کے نکڑ پر کھڑی تھی اور اور چاق و چوبند مسلح گارڈز جوہری کی دکان کے باہر پہرہ دے رہے تھے اور دکان کے دروازے پر اتنے بھاری بھرکم تالے لگے ہوئے تھے کہ جن کو بم سے اڑانا بھی دشوار معلوم ہوتا تھا اور دکان کے مالکان میں سے ایک جو سب سے بڑا تھا دکان کو مقفل کرنے کے بعد بہت دیر تک کچھ پڑھ کر پھونکتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی پھونک کے بعد ان تالوں کو کھولنا یا توڑنا کسی چور ڈاکو کے بس کا نہیں ہے لیکن نقب زنوں نے تو ان تالوں کو چھوا تک نہیں تھا۔ وہ ٹرک سے عقبی دیوار کود کر آئے تھے اور دکان کے پچھلے حصے کی دیوار میں جدید ہتھیاروں کے ساتھ بے آواز طریقے سے سوراخ کر کے اندر داخل ہوئے تھے اور گیس کٹر مشین سے تجوری کاٹ کر زیورات اور سونے کی ڈلیوں کا ڈھیر سمیٹ کر عقب سے فرار ہو گئے جبکہ چوکیدار اور پولیس کے لوگ باہر پہرہ دیتے رہ گئے۔

"کتنی مالیت کا سونا ہو گا۔۔۔۔۔" سونے کی الماری میں رکھنے کے بعد ایک نے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہہ سکتے۔۔۔۔۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"اندازاً۔۔۔۔۔" اس نے پوچھا۔

"سونے کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔۔۔۔۔ یہ تو رتی ماشے کا حساب ہوتا ہے۔" زرد سب کو ڈھال کے ایک ساتھ وزن کرا لیں گے۔" تاہم رقم چاروں نے گن لی تھی جو بارہ لاکھ سے مریب بنتی تھی اور چاروں نے تقریباً تین لاکھ روپے بانٹ کے اپنے اپنے قبضے میں کر لئے تھے۔ سونے کو ڈھالنے اور فروخت کرنے کا ان کے پاس مکمل انتظام تھا۔ یہ ان کی تیسری واردات تھی اس کے علاوہ دو کامیاب ڈکیتیاں کر چکے تھے اور ابھی تک پولیس کی دست برد سے محفوظ تھے اور انہیں یقین تھا جب تک "صاحب" کی پشت پناہی انہیں حاصل ہے پولیس آسانی سے ان تک نہیں پہنچ سکتی۔

"اخبارات دیکھ لیں۔۔۔۔۔" ایک نے اچانک پوچھا۔ "آ گئے ہوں گے۔"

"اخبارات میں ابھی کچھ نہیں آیا ہو گا۔ ابھی تو واردات کی خبر بھی نہیں بنی ہو گی۔" دوسرا بولا۔

"دکان کھلے گی تو پھر انکشاف کا بم پھٹے گا۔"

تمہارا کیا مطلب ہے پولیس کو ابھی اطلاع نہیں ملی۔۔۔۔؟" ایک نے ازراہ تجسس پوچھا

"قطعی نہیں۔۔۔۔۔" دوسرے نے اطمینان ظاہر کیا۔

"اور یہ جو پولیس کی گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔۔۔۔۔۔؟" تیسرے نے پوچھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو شہر میں صرف ہم ہی چار ڈاکو ہیں۔ بھائی پورا ملک۔۔۔۔۔"

"ہش ش ش۔۔۔۔۔" کسی نے شش کارا۔ باہر کوئی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔

"کچھ نہیں کتا ہے۔" ایک نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔ اور پھر انہیں روشو کا خیال آیا کسی نے اچانک کہا "اس اندر والے کتے کی تو خبر لو۔"

اس وقت روشو نڈھال سا ہو کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا دروازے پر آہٹ سن کر اس نے گردن موڑی تو ایک ڈاکو دروازہ کھول کر اندر آیا۔

"آجاؤ باہر ہمارے ساتھ ناشتہ کر لو۔" ڈاکو کے لہجے میں بہت نرمی اور ہمدردی تھی۔ "نہانا چاہتے ہو تو غسل خانے میں تولیہ صابن موجود ہے" اس نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا اور جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔ "جلد آجاؤ"۔

روشو غسل خانے کی طرف گیا۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ ہاتھ منہ دھویا لیکن نہایا نہیں۔ نہانے کے خیال ہی سے اسے عجیب سا لگا۔ فقیروں کی بستی میں نہانے کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ نہ صرف یہ فقیروں میں نہانے کی عادت نہیں ہوتی بلکہ نہانے کو معیوب اور برا سمجھا جاتا تھا۔ ان کی بستی میں ایک بوڑھا فقیر سیدو چاچا تھا جو مردوں کو غسل دیتا تھا اور فقیروں کی زندگی میں نہانے کا یہی ایک موقع آتا تھا۔ مرنے کے بعد۔ روشو نے ایک مرتبہ مرنے کے بعد ایک فقیر کے غسل کے بہتے پانی کو دیکھا تو اسے یوں لگا تھا جیسے گٹر کا پانی بہہ رہا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ جو فقیر جتنا میلا جتنا گندا اور جتنا غلیظ ہو گا وہ اتنا ہی اچھا فقیر ہو گا۔ اسے معلوم تھا کہ فقیروں نے اپنی گندگی، غلاظت اور میل میں اضافہ کرنے کے لئے بہت سارا سامان اپنی جھونپڑیوں میں رکھا ہوا ہے کتنے ہی فقیر تھے جو ہر روز اپنے چہرے پر مٹی مل کے اور جسم پر کھرنڈ لگا کے نکلتے تھے تاکہ وہ رستے ہوئے زخم اور

ناسور معلوم ہوں اور اس کے باپ نے بھی کئی مرتبہ اسے اپنے ساتھ لیجانے سے پہلے اس کے چہرے اور جسم پر غلاظت تھوپ کر اس کے چہرے کو مظلوم بنانے کی کوشش کی تھی۔ اور اب ڈاکو نے اسے نہانے کے لئے کہا تھا۔ اس نے غسل خانہ کا جائزہ لیا بہت خوبصورت غسل خانہ تھا۔ ٹائلیں، آئینہ، تولیہ، کھلا پانی، فوارہ لیکن اسے نہانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ غسل خانے کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور سوچتا ہی رہ گیا۔

"آجاؤ بھئی جلدی آجاؤ ۔۔۔۔" ایک آواز باہر سے آئی۔ اس نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا اور صاف تولیہ کو چھوئے بغیر گیلے گیلے ہاتھ لے کر باہر چلا گیا۔

دیکھو ہم جانتے ہیں تم ایک بے ضرر بچے ہو۔" جب وہ ناشتہ کر چکا تو ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے چار ڈاکوؤں میں سے ایک نے بولنا شروع کیا باقی تینوں چپ چاپ رہے۔" ہمارا تمہارے ساتھ کوئی تنازع بھی نہیں لیکن تم ایک پراسرار حالت میں پکڑے گئے ہو اور تمہارا وجود ہمارے لئے خطرہ بن گیا ہے۔"

لہذا۔۔۔۔" دوسرے نے لقمہ دیا۔ اور خاموش ہو گیا۔

" لہذا ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم تمہیں ہلاک کر دیں" اس نے پستول کی نال درست کرتے ہوئے کہا اور روشو پر کپکپی سی چھا گئی۔" ڈرو نہیں ہم یہاں نہیں ماریں گے۔" اس نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔" مارنے کے لئے ہم تمہیں وہاں بھی مار سکتے تھے جہاں تم پکڑے گئے تھے لیکن رات کے سناٹے میں ہم فائر کی آواز پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے اور یہاں اس لئے نہیں ماریں گے کہ لاش کو بھی ٹھکانے لگانا ہے۔"

"لہذا۔۔۔۔" دوسرے نے لقمہ دیا۔

" لہذا ہم تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کے دور کسی تنہا جگہ لے جائیں گے اور وہیں تمہارا خاتمہ کر دیں گے۔" ڈاکو نے بات پوری کی۔

" تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔" دوسرے ڈاکو نے روشو سے پوچھا، جو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا تھا اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

" کچھ تو کہو۔۔۔۔" دوسرے نے پھر پوچھا۔" تاکہ پتہ تو چلے کہ اتنی رات گئے تم جھاڑیوں میں کیوں چھپے بیٹھے تھے۔"

میں کار دیکھ کر ڈر گیا تھا۔۔۔۔" وہ جلدی سے بولا

" بھاگے کیوں تھے۔۔۔۔؟" پہلے نے پوچھا وہ آگے کچھ نہ بولا تو دوسرے نے دلاسہ دیتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔

"شاباش بتاؤ۔۔۔۔" کیوں بھاگے تھے؟"

" سنا دو اسٹوری اپنی۔۔۔۔ تیسرا بھی بول پڑا۔" ہو سکتا ہے تمہاری اسٹوری سے ہی تمہاری جان بچ جائے۔"

" بابا کہتا تھا فقیر کا بچہ صرف فقیر ہو سکتا ہے"۔ روشو ڈر ڈر کے بولا۔

"توکیا پھر فقیر کا بچہ بادشاہ بنتا ہے ہاہاہا------" تینوں نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔
"میں فقیر نہیں بننا چاہتا-----" اس نے تینوں کے قہقہے کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے مصمم ارادے سے کہا۔
"تم فقیر نہیں بننا چاہتے؟" پہلے نے دہرایا۔
"نہیں-----" وہ پھر یقین سے بولا۔
"تو پھر کیا بننا چاہتے ہو-----" دوسرے نے پوچھا۔
"میں لکھنا پڑھنا چاہتا ہوں-----" روشو نے خواہش ظاہر کی۔
"کیا کرو گے لکھ پڑھ کر-----" تیسرے نے ازراہ تمسخر پوچھا۔
بڑا آدمی بنوں گا-----" اس نے پر عزم لہجے میں کہا۔
بڑا آدمی تو وہ بھی ہوتا ہے جو ہیروئن بیچتا ہے اور بڑا آدمی وہ بھی ہے جو-----"
"ہش ش ش-----" پہلے نے شٹشکار کر تیسرے کی بات کاٹ دی۔" اسے بولنے دو یار شاباش بچے بولو، بول"۔
"بچے قوم کی امانت ہوتے ہیں-----" روشو معصوم فلسفی کی طرح بولا۔
"کیا، کیا، کیا-----" پہلا ڈاکو چونکا اور باقی تین بھی حیران رہ گئے۔
"بچے قوم کی دولت ہوتے ہیں"۔ وہ پھر سنجیدگی سے بولا" مستقبل"۔
"ارے ارے-----فقیر کا بچہ فلسفہ بول رہا ہے"۔" کسی نے کہا یہ تو قیامت کے آثار ہیں۔---" ایک ڈاکو ہنسا۔
"بابا بھی یہی کہتا تھا قیامت آنے والی ہے"۔ روشو بولا۔
"بالکل آنے والی ہے قیامت"۔ پہلا ڈاکو بولا۔" دجال آ چکا ہے۔" بس اب قیامت باقی ہے

"۔رے بھئی اس کی تو بات سن لو پہلے۔" دوسرے نے پھر ٹوکا اور پھر روشو سے مخاطب ہو کر بولا۔" یہ سب کچھ تمہیں کس نے بتایا کہ بچے قوم کی امانت ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ-----
"میں نے ریڈیو پر سنا ہے" روشو نے کہا۔" ٹی بی بول رہا تھا۔
"ریڈیو ٹی وی ہاہاہاہا ایک نے قہقہہ لگایا۔
تو گویا تم بڑے آدمی بنو گے-----؟ پہلے نے پھر تصدیق چاہی۔ اور روشو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کیسے -----!" دوسرے نے پوچھا۔
" ڈاکٹر اور انجی آر بن کر " ۔ وہ پُرزم لہجے میں بولا۔ اس پر چاروں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔
" اور ظاہر ہے ڈاکٹر اور انجینئر بن کر قوم کی خدمت بھی کرو گے " ۔ دوسرے نے طنزیہ پوچھا تو روشو نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔
" ظاہر ہے یہ بھی تم نے ریڈیو اور ٹی وی پر سنا ہوگا۔" پہلے نے کہا۔ روشو نے اثبات میں سر ہلایا اور چاروں نے ایک بار پھر زور دار قہقہہ لگایا اور پھر پہلا ڈاکو ایک دم قہقہہ روک کر انتہائی غصے کے عالم میں روشو کی جانب مڑا اور اس کا گریبان پکڑ کر درشت لہجے میں مخاطب ہوا۔
" نادان لڑکے میری طرف غور سے دیکھ۔ میں تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہوں"۔
روشو نے دھیرے دھیرے گردن گھمائی اور ڈرے ہوئے انداز میں سہمی سہمی نظروں سے وہ پہلے ڈاکو کو دیکھنے لگا۔
" ہاں ہاں دیکھ لے اچھی طرح۔ میں ڈاکٹر ہوں" ۔ وہ دیوانگی کے عالم میں بولا۔ " قوم کی امانت اور مستقبل "۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
" ڈاکٹر؟؟؟" روشو چونکا۔
" ہاں دس سال لگے مجھے ڈاکٹری مکمل کرنے میں اور اب-----"
" اور میں انجی آر ہوں-----انجینئر----- سمجھے " ۔ دوسرا گرجا میں بھی قوم کا مستقبل ہوں انجینئر"۔
" انجینئر؟؟؟" روشو کے سر پر جیسے دوسرا ہتھوڑا لگا۔ اور یہ دونوں گریجویٹس ہیں۔ ایک نے بی اے اور ایک نے ایم اے کر رکھا ہے " ۔ پہلے ڈاکو نے اپنے دوسرے ساتھیوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔
" اور ان ڈگریوں نے ہمارے ہاتھوں میں یہ تھمادی ہیں-----" پہلے نے اپنی کلاشنکوف کو غصے کے عالم میں گھماتے ہوئے کہا جیسے وہ ابھی کوئی برسٹ مارنا چاہتا ہو۔
" اور ہم قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہاہاہا" ۔ وہ پاگل سا ہو رہا تھا۔ " کوئی قوم کی خدمت نہیں کرتا ہے سمجھے سب کے پیٹ کا مسئلہ ہے۔ وہ جو کہتا ہے کہو زندہ باد، وہ بھی پیٹ کے لئے کہتا ہے۔ اور جو پیچھے نعرہ لگاتے ہیں وہ بھی پیٹ کے لئے لگاتے ہیں۔ بس کسی کا پیٹ بھرا ہوا ہے اور کسی کا خالی ہے۔ جس کا بھرا ہوا ہے وہ اس کو پھلا کے پھاڑ دینا چاہتا ہے اور جس کا خالی ہے۔ وہ اسے بھرنا چاہتا ہے۔ جتنا بڑا نعرہ اتنا بڑا پیسہ۔"

"بند کرو یہ بکواس ۔۔۔۔" دوسرے ڈاکو نے بات کاٹی "اس کی سمجھ میں یہ سب کچھ کیا آئے گا؟"

"اس کی سمجھ میں سب کچھ آرہا ہے ۔" پہلا ڈاکو غصے میں کانپ رہا تھا جیسے اس کی کوئی دکھتی رگ پھڑک گئی ہو۔ اور اگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے تو اسے بھی سمجھادو۔۔۔ "سنو لڑکے "۔ اس نے روشو کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"اگر بڑا آدمی بننا ہے نا۔۔۔۔ تو دماغ سے یہ خناس نکال دو۔ ڈاکٹر، انجینئر، استاد، وکیل، ادیب، شاعر، صحافی، مفکر، دانشور سب بکواس ہے ۔۔۔۔ اسمگلنگ کرو، ڈاکے ڈالو، رشوتیں لو، ہیروئن بیچو، اور کم عمری میں اگر کچھ نہیں کر سکتے تو تو جیب کاٹنے کا فن سیکھ لو۔"

"حسن ۔۔۔۔" دوسرا ڈاکو انتہائی خشم آلود لہجے میں چلایا اور پھر ایک دم سے خوف زدہ ہوگیا جیسے زبان پھسل گئی ہو۔ چاروں سناٹے میں آگئے ۔ پہلی دفعہ ان میں سے کسی نے دوسرے کو نام سے پکارا تھا اور وہ بھی ایک گواہ کے سامنے سب دم بخود ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور روشو بھی ان کی اچانک سراسیمگی پر حیران اور پریشان ہوگیا۔

"کوئی بات نہیں ۔۔۔۔ یہ تمہارا اصلی نام نہیں ہے" ۔ دوسرے ڈاکو نے اپنی کوتاہی کا مداوا کرتے ہوئے سناٹا توڑا۔

"شکر ہے تمہیں اس قدر ہوش تو تھا" ۔ پہلے نے ازارہ طنز کہا۔

"اس سے پیشتر مزید غلطیاں کرو ۔۔۔۔ اس لڑکے کے بارے میں فیصلہ کرلو" ۔ تیسرا ڈاکو حرف مدعا پر آیا۔

"اس کو کسی صورت بھی زندہ نہیں رکھا جاسکتا ۔ اسے ماردو" ۔ "تیسرا ڈاکو جو کافی دیر سے خاموش تھا فیصلہ کن انداز میں بولا اور پھر روشو کی جانب مڑکر کہنے لگا ۔ "مجھے افسوس ہے لڑکے تمہارا بڑا آدمی بننے کا خواب پورا نہیں ہوسکے گا ۔ جیو اور جینے دو کی پالیسی اپنی جگہ لیکن خود زندہ رہنے کے لئے دوسرے کو مار دینے کا اصول بھی یہاں رائج ہے اور ہم نے چونکہ زندہ رہنا ہے اس لئے تمہیں مار دینا ضروری ہوگیا ہے ۔ اور یہی یہاں ہو رہا ہے ۔"

"لیکن ۔۔۔۔" پہلے نے کچھ کہنا چاہا "لیکن ویکن کچھ نہیں ۔۔۔۔" چوتھے نے پھر بات کاٹی "یہ بھی گواہ بن گیا ہے ۔ اس کا خاتمہ بہت ضروری ہے ۔ اور اسے آج ہی اسی وقت ٹھکانے لگادو ۔۔۔"

"ٹھیک کہتے ہو ۔ لیکن ایسی جلدی بھی کیا ہے ۔" پہلے نے تحمل سے کہا۔

"ڈاکٹر ہونا۔۔۔۔" چوتھے نے جواب دیا۔ "تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتے ہو بندے کو لائف سیونگ ڈرگز اور انجکشن لگا لگا کے پلازمے چڑھا کے، آکسیجن دے کے۔ نہیں کچھ فائدہ نہیں"۔ وہ مضطرب لہجے میں بولتا گیا۔ "جب مرنا ہے تو مرنا ہے سانسیں بڑھانے کا کیا فائدہ"۔

"دیکھو یار جذباتی مت بنو۔" تیسرے نے مداخلت کی۔ "یہ درست ہے کہ اس کو مارنا ضروری ہو گیا ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اتنی جلدی نہیں۔ یہ کہیں بھاگا نہیں جا رہا ہمارے قبضے میں ہے اور رات بھر کے ہم سب لوگ جاگے ہوئے اور تھکے ہوئے ہیں۔ اس وقت آرام کرو سو جاؤ۔ اسے بھی کمرے میں بند کر دو۔ شام کو فریش ہو کر اٹھیں گے، رات کو کسی وقت اس کا کام تمام کر دینا"۔

اس کی اس رائے پر سب خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر ماحول پر سناٹا طاری رہا۔ جیسے سب سوچ رہے ہوں روشو چپ چاپ تھا اس پر ایک خوف اور سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے دن گزر جانے دو۔" چوتھے نے خاموشی توڑ دی۔

"جاؤ آرام کرو۔" پہلے نے دروازہ کھول کر روشو کو اندر دھکیل دیا۔ اور باہر سے دروازہ بند ہو گیا۔

O

بجلی کے بغیر بھی کمرے میں ٹھیک ٹھاک روشنی تھی جو اونچے روشن دانوں سے چھن کر آ رہی تھی۔ دور پرے سے کبھی کبھار کوئی ہارن بھی سنائی دیتا تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی سڑک چل رہی ہے۔ لیکن روشو صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ گنجان آبادی کا علاقہ ہے یا ویرانہ ہے۔ ہر چند کہ وہ بھی رات بھر کا جاگا ہوا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں میں بالکل نہیں تھی اس کے کان باہر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ جہاں چاروں کے درمیان گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ بات صحیح طور پر روشو کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن اتنا اسے ضرور معلوم ہو رہا تھا کہ موضوع سخن روشو کی ذات ہے۔ اسے بحث کے رخ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ چاروں کی رائے تقسیم ہو گئی تھی۔ تین جیسے اس کے مارنے کے حق میں تھے لیکن ڈاکٹر نہیں چاہتا تھا کہ اسے مارا جائے۔۔

"ڈاکٹر۔۔۔۔ اف اللہ"۔ وہ اس تصور سے کانپ گیا کہ ڈاکٹر اتنا بڑا ظالم ہو سکتا ہے۔ اور پھر "انجی آر" یہ سب کچھ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کے دماغ میں کیڑے سے رینگنے لگے۔ اور جیسے ان کیڑوں نے اسے جگائے رکھنے کی بجائے مکمل طور پر سلا دیا۔ اسے کچھ پتہ نہیں اس کی کس وقت آنکھ لگی۔ وہ جاگا اس وقت جب اسے خواب میں اپنے چھوٹے بھائی خیرو کی ادھڑی ہوئی کھال والا

چہرہ دکھائی دیا۔ وہ ایک جھر جھری سی لے کر بیدار ہو گیا۔ اس نے کروٹ لے کر کمرے کا جائزہ لیا تو اسے کمرے کی مٹیالی روشنی میں یوں لگا جیسے دن کافی ڈھل چکا ہے۔ اور باہر کے کمرے میں بھی مکمل خاموشی تھی جیسے اس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہو وہ ہڑبڑا کر چارپائی سے نیچے اترا ٹیبل پر اخبار ڈھکا اس کے لئے کھانا رکھا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت گہری نیند اور بہت دیر تک سویا ہے اسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ کون کس وقت کھانا رکھ کر چلا گیا ہے۔ اسے بھوک لگی ہوئی تھی اس نے ہبڑ بڑ کر کے کھانا کھالیا۔ اور یہ خیال اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں کہ ہو سکتا ہے یہ اس کی زندگی کا آخری دن اور آخری کھانا ہو۔

بنگلے کی فضاء میں مکمل خاموشی اور سناٹا تھا۔ کہ ڈاکو گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ روشو کو اپنے سوا کسی ذی روح کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا تھا روشن دانوں سے چھن کر آنے والی روشنی بھی غائب ہو گئی تھی۔ اور روشو نے بجلی کا بٹن دبا دیا تھا۔ وہ وقت گزاری کے لئے کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے غسل خانہ میں چلا گیا۔ بتی روشن کی آئینہ دیکھا بیسن کی ٹونٹی کھولی پھر کسی اور ٹونٹی کو گھمایا تو ایک دم سے شاور کھل گیا۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا۔ لیکن اس نے غسل خانہ کے اندر برسات کا موسم دیکھا تو اسے نہانے کا خیال آگیا۔ اس نے اپنے میلے چیکٹ کپڑے اتار پھینکے اور فوارے کی برسات کے نیچے کھڑا ہو کر لطف اندوز ہونے لگا اسے بہت مزا آرہا تھا لیکن جب اس نے اپنے میلے جسم سے اترنے والے گدلے پانی کو موری کی جانب جاتے دیکھا تو وہ کانپ سا گیا۔ اسے ایسے لگا کہ جیسے اس کے جسم کا نہیں گٹر کا پانی ہو۔ یہ اس پانی کی رنگت سے ملتا جلتا تھا جو اس نے ایک فقیر کی میت سے غسل کے وقت بہتے دیکھا تھا۔ جسے چاچا سید و غسل دے رہا تھا۔ کیا یہ بھی اسی کی میت کا غسل ہے۔۔۔۔ فوارے کے نیچے کھڑے اسے ایک لمحے کے لئے خیال آیا۔ اور اس کے جسم پر کپکپی سی چھا گئی۔ اچانک غسل خانے کے دروازے پر دستک ہوئی اور وہ جلدی سے کپڑے پہن کر باہر نکل آیا۔

"کھانا کھاؤ گے۔۔۔۔" اپنا تعارف ڈاکٹر کی حیثیت سے کرانے والا ڈاکو کمرے میں اس کا منتظر تھا۔

"نہیں۔۔۔۔ کھانا میں نے ابھی کھایا ہے"۔ روشو نے جواب دیا۔

"وہ تو دن کا کھانا تھا اب رات ہو گئی ہے۔ ویسے بھی فقیر روٹی سے کبھی انکار نہیں کرتے۔ ڈاکو نے ازراہ تمسخر کہا۔

روشو نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا تو ڈاکو بولا۔ "او مد ھدا، ہی گیا سوں کہ تم

فقیروں کو مسترد کر کے ان سے بھاگے ہوئے ہو۔"

"چلو بھئی جلدی کرو۔۔۔۔۔ دوسرے ڈاکو نے دروازے سے اندر جھانکا اور کہہ کر باہر چلا گیا۔ پہلے ڈاکو نے ایک ملائم سی کالی چادر کھول کر روشو کی آنکھوں پر باندھی اور ازراہ تاسف کہنے لگا

"لڑکے کاش تم فقیر ہی رہتے ۔۔۔۔۔" جواب میں روشو نے آنکھوں پر پٹی بندھا سر بے بسی کے عالم میں اوپر کیا جیسے بے زبان بکری ہو۔ "کم از کم زندہ تو رہتے۔"

"تم خواہ مخواہ بھیک کو برا سمجھ رہے ہو۔" ڈاکو نے کہا۔ "یہاں سب بھکاری ہیں سب کے ہاتھوں میں کشکول ہیں بس مانگنے کے طریقے جدا جدا ہیں لوگ مانگ کر کھا رہے ہیں یا چھین کر۔۔۔"

"اور محنت مزدوری۔۔۔۔۔" روشو کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ جیسے ڈر گیا ہو۔

محنت میں اور محنت کے معاوضے میں بڑا فاصلہ حائل ہے لڑکے۔ محنت کر کے روٹی تو کھا سکتا ہے آدمی لیکن پیسہ نہیں کما سکتا ہے۔" ڈاکو نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔ "اور جس نے پیسہ نہیں کمایا دولت نہیں حاصل کی وہ ذلیل و خوار ہو گیا۔ رسوا ہو گیا بغیر عزت والا بغیر علاج کے مر جاتا ہے۔"

"اور علم کی دولت۔" روشو پھر کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"علم کی دولت صرف کتابوں میں ہے۔" ڈاکو جیسے دور افق پر کسی سے مخاطب **ہو** لیکن وہ پھر ایک دم سے چونک پڑا اور روشو کو زوردار جھٹکا دے کر انتہائی اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کمبخت فقیر کی اولاد تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھی ہیں۔ کس نے کی ہے تمہاری تربیت۔

وہ برہم ہوا۔

ٹھک ٹھک" دستک ہوئی اور ساتھ ہی پکار ہوئی "ارے یار جلدی کر دو لے آؤ اسے۔"

"کاش تم زندہ رہ سکتے ۔۔۔۔۔" ڈاکو نے اسے بازو سے پکڑا اور دھکیلتا ہوا باہر لے آیا اور بنگلے کے مختلف حصوں سے گزارتے ہوئے اسے ایک کار میں بٹھا دیا۔ اس نے قدموں کی چاپ سے محسوس کیا کہ تین ڈاکو اس کے ساتھ ہیں چوتھا بنگلے ہی میں رہ گیا ہے کار کے اندر ایک ڈاکو جو ڈاکٹر تھا اس کے دائیں جانب تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر صرف ایک ہی آدمی معلوم ہو رہا تھا ممکن ہے وہاں دو ہوں لیکن وہ کچھ ٹھیک سے اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ باہر گھپ اندھیری رات تھی اور روشو کیلئے تو رات زیادہ گہری اور ہولناک تھی کہ اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی کا اضافہ بھی تھا۔ اسے کچھ محسوس نہیں ہو سکا تھا کہ بنگلے کا محل وقوع کیا ہے وہ کس طرف سے آیا ہے اور کس طرف جا رہا ہے کار رات کے سناٹے میں ارتعاش پیدا کرتی تیزی کے ساتھ کسی کھلی تنہا اور ویران سڑک پر فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔
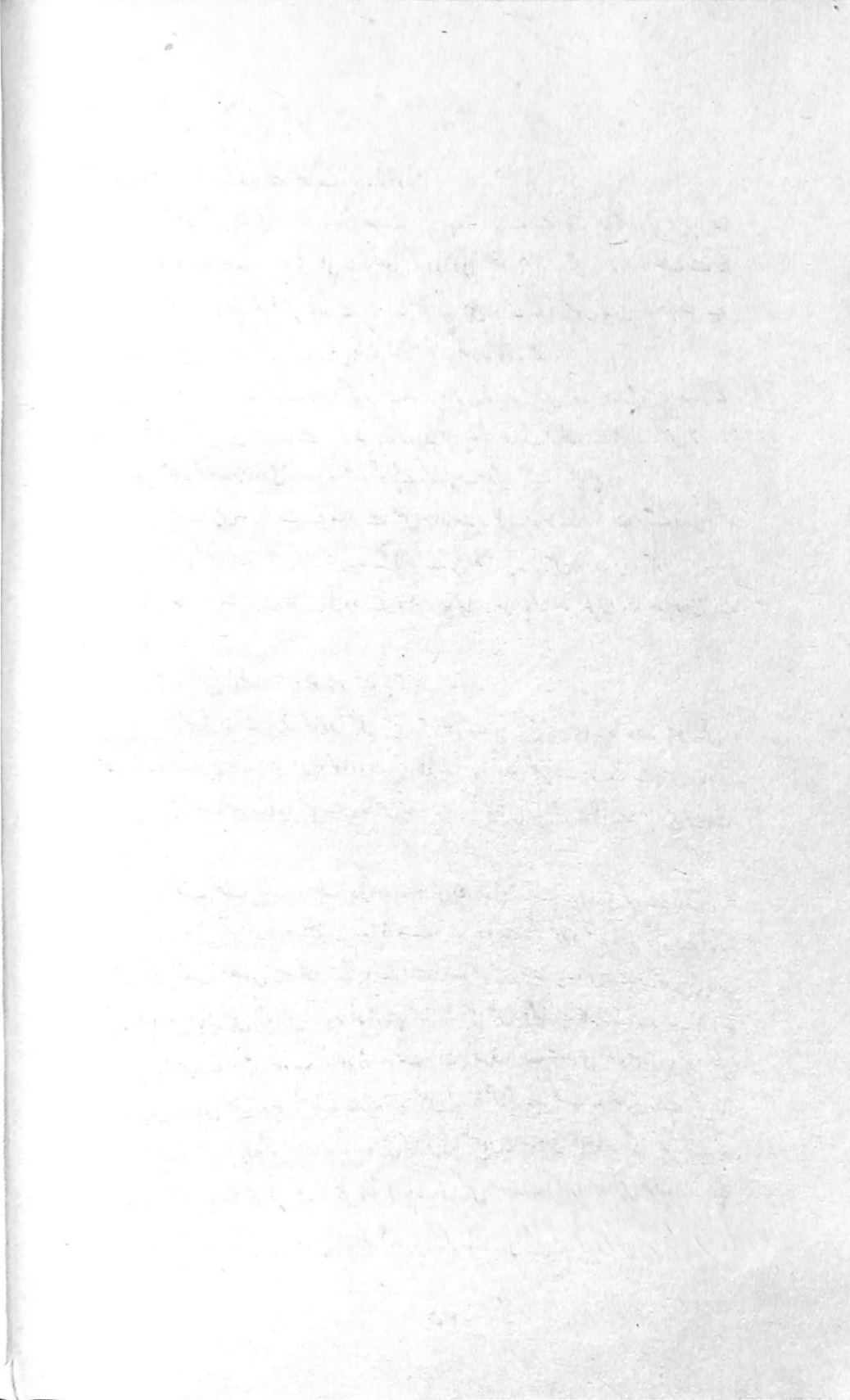
گاڑی کی رفتار تیز ہونے کے باوجود قابل اعتراض حد تک تیز نہیں تھی کہ ٹریفک پولیس کے تعاقب کا اندیشہ ہوتا۔ تاہم ایک انجانا اندیشہ تینوں کے اندر موجود تھا اور کار کے اندر پراسرار خاموشی سے اندازہ ہوتا تھا کہ تینوں ڈاکوؤں کو ایک دھڑکا ضرور لگا ہوا ہے کہ گاڑی کسی جگہ بھی روکی اور چیک کی جا سکتی ہے۔

وہ بالکل خاموش تھے اور راستے بھر انہوں نے، نہ تو آپس میں کوئی بات کی اور نہ ہی روشو سے کلام کیا اور کار جوں جوں آگے بڑھتی گئی روشو کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہر آنے والا لمحہ اس کی موت کو قریب تر کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر اس نے کار کی رفتار میں کچھ بے ہنگم سی تبدیلیاں دیکھیں جیسے وہ پکی سڑک سے اچانک اندر کی طرف کسی کچی سڑک پر مڑ گئی ہو۔ روشو نے محسوس کیا کہ کوئی چھوٹی سی تنگ سی سڑک ہے جو ہموار بھی نہیں اونچی نیچی ہے۔ جس میں گڑھے بھی کافی لگ رہے تھے رفتار ایک دم سست ہو گئی تھی اور روشو اس طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا جیسے گدھا گاڑی پر بیٹھا ہو۔

پکی سڑک پر جب کار دوڑ رہی تھی تو کبھی کبھار کوئی دوسری گاڑی پاس سے گزرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی لیکن اب روشو کو لگ رہا تھا کہ کوئی بالکل ہی تنہا اور ویران کچی سڑک ہے جس پر کار بڑی مشکل سے چل رہی ہے اور جہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں معلوم ہوتے تھے

" میرا خیال ہے آگے راستہ نہیں ہے "۔ ڈرائیور نے اچانک کہا اور گھنٹے پون گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد یہ پہلی بات تھی جس نے کار کے اندر کی خاموشی کو توڑا تھا۔

" بس یہیں کہیں روک دو۔ " روشو کے دائیں جانب بیٹھا ڈاکو بولا۔ جس نے اپنا تعارف بحیثیت ڈاکٹر کے کرایا تھا۔ کار رک گئی تو بائیں جانب والے نے دروازہ کھولا۔

"آجاؤ نیچے۔" بائیں جانب والا روشو سے مخاطب ہوا۔

"میں اسے ادھر سے اتارتا ہوں ----" بائیں جانب والے نے کہا۔ "تم ادھر سے گھوم کر پیچھے آجاؤ۔" اس نے دوسرے ڈاکو سے کہا۔

"آجاؤ۔" پھر اس نے روشو کا بازو پکڑ کر نیچے اتارا اور ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم بیٹھے رہو ----"

ڈرائیور بیٹھا رہا اور دونوں روشو کو درمیان میں رکھ کر بہت سنبھل سنبھل کے اور دھیرے دھیرے کسی نچے راستے پر چلنے لگے جیسے کسی منڈیر پر یا کسی شہتیر پر چل رہے ہوں۔

"میرا کندھا پکڑ کے رکھو۔" روشو کے قدم ڈگمگائے تو آگے والے نے سہارا دے کر کہا۔

روشو نے جلدی سے کندھے کا سہارا لے لیا ورنہ اس کے پاؤں اکھڑنے لگے تھے اور عین ممکن تھا وہ نیچے کسی کھائی وغیرہ میں لڑھک جاتا۔ یہ اس کا اپنا اندازہ تھا کہ نیچے کوئی کھائی ہے ورنہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس راستے پر چل رہا ہے اور پھر اس نے سوچا کہ اگر وہ لڑھک بھی جاتا ہے تو کیا فرق پڑتا۔ موت تو ویسے بھی اس کے قریب بلکہ سر پر منڈلا رہی ہے۔ اس پر اندر ہی اندر ایک کپکپی سی طاری تھی۔

"بس ----یہاں رک جاؤ"۔ پچھلے والے نے آہستہ سے کہا اور آگے والے کے قدم رک گئے روشو بھی درمیان میں ٹھہر گیا۔

"کیا خیال ہے۔" اس نے آگے والے سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے یہ مناسب جگہ ہے۔" آگے والے نے کہا اور پھر روشو کا ہاتھ پکڑ کر بہت احتیاط سے چند قدم پیچھے کی طرف لے گیا اور اسے آڑا آڑا سر کا کر اس کی پشت ایک بڑے درخت کے تنے کے ساتھ لگا دی۔

"بس یہاں رک جاؤ۔" وہ روشو سے مخاطب ہوا۔

"رسی دے دو۔" اس نے دوسرے ساتھی سے کہا دوسرا جیسے پہلے ہی سے رسی پکڑے تیار تھا۔ اس نے کھٹ سے رسی پھینکی اور پہلے نے رسی کو روشو کے اردگرد لپیٹ کر اسے درخت سے باندھا اور روشو کسی مدافعت کے بغیر پورے درخت سے جکڑ گیا۔ پھر پہلے ڈاکو نے روشو کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر بندھی پٹی کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

"کہاں تک گنتی آتی ہے تمہیں ---" قدرے دور ہٹ کر پہلے نے روشو سے پوچھا۔

"بیس تک ---" روشو لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔
"ٹھیک ہے۔" پہلے نے کہا۔ "میں تین تک گنوں گا آگے چار سے تم شروع کرو گے ----
ٹھیک۔"
روشو نے کوئی جواب نہیں دیا وہ خوفزدہ ہوگیا تھا۔
"لیکن زور سے اور بلند آواز میں گنو کے ٹھیک بیس کے بعد گولی چل جائے گی ----- سمجھ
گئے"۔ پہلے نے پھر رعب دار لہجے میں کہا۔ "بندوق پھینکو۔" اسنے دوسرے ڈاکو کو پکارا
"ٹیک اٹ۔" دوسرا پکارا
اور روشو نے بندوق پھینکنے اور اسے کیچ کرنے کی آواز کو محسوس کیا۔
"اگر تم نے گنتی شروع نہ کی تو گولی تین کے بعد ہی چلادی جائے گی۔ یہاں تمہارے سینے
پر۔" اس نے روشو کے دل پر ہاتھ لگایا۔ "تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ تم پورے بیس گنو اس طرح
تمہاری زندگی کے کچھ سانس بڑھ جائیں گے۔" دوسرے نے تنہہ کی اور چھلانگ لگا کر دور چلا گیا۔
"شروع ہو جاؤ"۔ اس نے دوسرے سے کہا۔
"ریڈی ---- تیار ہو جاؤ۔" کچھ فاصلے سے پہلے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی اس نے گننا شروع
کیا۔ ایک ---- دو ------ تین ----- وہ وقفے وقفے سے تین تک گن کر چپ ہوا تو روشو کپکپاتی
آواز میں گنتی کو آگے شروع کرتے ہوئے پھٹ پڑا۔
"چار --- پانچ ---- چھ ---- سات ---- آٹھ ----- نو ----- دس ---"
روشو کی آواز میں خوف وہراس سے شدید لرزہ طاری تھا۔ اس کا جسم اور زبان کانپ رہی
تھی لیکن اس نے گنتی نہیں روکی۔ پندرہ تک پہنچتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی لیکن وہ رکا نہیں گنتا رہا

"پندرہ --- سولہ --- سترہ --- اٹھارہ --- انیس ----"
انیس پر وہ ایک لمحے کو رکا اور رقت آمیز آواز میں آہستہ سے "بیس" کہا۔
آنکھوں پر پہلے ہی پٹی بندھی ہوئی تھی اس نے پٹی کے اندر ہی اندر آنکھیں اور میچ لیں اور
دھائیں سے اپنے سینے پر لگنے والے فائر کا انتظار کرنے لگا لیکن فائر کی آواز نہیں آئی۔ اس نے کچھ دیر
انتظار کیا۔
"شاید نشانہ باندھ رہے ہوں۔" اس نے سوچا لیکن چند لحات مزید گزر جانے پر بھی گولی
نہیں چلی۔

"کیوں نہیں چلی؟" روشو کو حیرت ہو رہی تھی۔

"دونوں کھڑے کیا سوچ رہے ہیں۔۔۔۔" روشو نے سوچا اور پھر سوچنے لگا کہ آیا دونوں کھڑے بھی ہیں کہ نہیں کیونکہ ان کے قدموں کی آہٹ یا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی جب کچھ مزید وقت گزر گیا اور کوئی آہٹ نہیں ہوئی تو اسے محسوس ہوا کہ دونوں اسے بندھا چھوڑ کر چلے گئے ہیں!

"ڈاکٹر صاحب۔۔۔" اس نے آواز دی

"انچی آر صاحب۔۔۔۔" اس نے اطمینان کیلئے دونوں کو آہستہ سے پکارا اور جب سامنے سے کوئی آواز کوئی آہٹ نہیں آئی تو روشو کو یقین ہو گیا کہ وہ لوگ اسے گولی مارے بغیر واپس چلے گئے ہیں شاید ان کا یہی فیصلہ تھا جس سے انہوں نے روشو کو بے خبر رکھا۔ ابھی رات کا آغاز ہی ہوا تھا اور مینڈکوں نے روشو کے چاروں طرف ٹرانا شروع کر دیا تھا۔ جھینگر بھی بول رہے تھے اور کبھی کبھار اسے ادھر ادھر جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوتی تھی جس سے وہ اندازہ لگاتا کہ چوہے یا سانپ ہوں گے۔ یہی بتایا تھا ڈاکوؤں نے کہ اس کے آگے پیچھے جھاڑیاں اور عقب کی طرف گہرا نالہ ہے۔ اب اسے اس بات کا مکمل طور پر یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکوؤں نے اس کی جان بخشی تو کردی ہے لیکن اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور اب وہ اس ویرانے میں زندہ بھی رہ سکے گا یا نہیں اس کا اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ تاہم یہ تصور اس کیلئے کافی اطمینان بخش تھا کہ وہ کم از کم گولی کھانے سے بچ گیا ہے اب رات کیسے کٹے گی اس کا انحصار آنے والے حالات اور واقعات پر تھا۔ پہلے تو اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر حالات کے سپرد کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا لیکن پھر نجانے اسے کیوں خیال آیا کہ خود کو رسیوں سے آزاد کرانے کیلئے جدوجہد کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ لہذا اس نے محض طبع آزمائی کیلئے ہاتھ پاؤں پھیلا کر زور جو لگایا تو رسیاں ڈھیلی پڑ گئیں اس نے بڑی آسانی سے ایک بازو اور پھر دوسرا بازو رسیوں کی گرفت سے باہر نکال لیا۔ اسی وقت اسے محسوس ہوا کہ ڈاکوؤں نے دراصل اسے باندھا ہی نہیں تھا محض رسیاں لپیٹ کر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ وہ ایک دم سے جیسے ایک نئی اور دوسری دنیا میں آگیا۔ تقریباً پوری گولائی کا چاندا بھی ابھی افق سے نمودار ہوا تھا اس کے عقب میں کوئی گہرا نالہ نہیں تھا اور نہ ہی سامنے خطرناک جھاڑیاں تھیں۔ کھلے کھیت تھے۔ کھیتوں میں چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنی ہوئی تھیں فاصلے پر ناریل کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پیڑ وہ بھی تھا جس کے ساتھ روشو کو باندھا گیا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں بھی رسیوں سے باہر نکالیں اور کھڑے

کھڑے آزادی سے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پھر اس نے کھڑے کھڑے ماحول کا جائزہ لیا تو اسے کافی دور کچھ فاصلے پر بتیاں سی دوڑتی دکھائی دیں جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ دور پکی سڑک ہے جس پر اکا دکا ٹریفک چل رہی ہے وہ جست بھر کے کیاریاں پھلانگتا پگڈنڈی پر آگیا۔ پگڈنڈی عبور کر کے ایک کچے راستے پر پہنچا جہاں بڑے بڑے گڑھے تھے غالباً یہ وہی راستہ تھا جس راستے سے اسے لایا گیا تھا پھر وہ اسی راستے پر سرپٹ جو دوڑا تو تین چار کتے کہیں سے نکل کر اس کے تعاقب میں دوڑ پڑے اس نے کتوں کو بہت دھتکارا۔ پتھر پھینکے لکڑی ماری لیکن وہ بھونکتے ہوئے اس کے تعاقب میں دوڑتے رہے۔ روشو پاؤں سر پر رکھ کر بھاگا اور تقریباً دس منٹ کی دوڑ کے بعد وہ پکی سڑک پر پہنچ گیا تو کتے اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ کتوں نے اس کی شلوار کے میلے چیکٹ پائنچوں کو نوچ کر مزید تار تار کر دیا تھا۔ کتوں کا ڈر اسے ضرور تھا لیکن کتوں کی وجہ سے وہ بہت زیادہ پریشان نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آوارہ کتے اکثر دن کی روشنی میں بھی فقیروں پر بھونکتے اور ان تعاقب کرتے ہیں اور کبھی کبھی وہ سوچا بھی کرتا تھا کہ فقیر اتنی قابل نفرت چیز کیوں ہے کہ کتے بھی دس آدمیوں کو چھوڑ کر صرف فقیر پر غراتے اور بھونکتے ہیں اور اس وقت وہ تنہا تھا اور ظاہر ہے کہ کتوں نے اس کا تعاقب نہیں چھوڑنا تھا۔ دوڑتے دوڑتے جب وہ سڑک پر پہنچا تو کتوں نے اسے اطراف سے گھیر لیا اور اچھل اچھل کر مسلسل بھونکتے رہے اور وہ بھی "در" "در" دھتکارتے ہوئے مسلسل ایک لکڑی مارتا رہا جو اس نے پگڈنڈی سے اٹھالی تھی۔

معاً سڑک پر ایک روشنی پڑی اور کار کی دو بتیاں اسے قریب آتی دکھائی دیں ایک دن پہلے وہ ایسی ہی کار دیکھ کر پگڈنڈی کی طرف اتر گیا تھا اور ڈاکوؤں کے قبضے میں آگیا تھا۔ اب وہ پگڈنڈی سے سڑک پر آیا ہے تو پھر ایک کار آتی دکھائی دی تھی اس وقت بھی خطرہ تھا اب بھی خطرہ ہے۔

"شاید یہ کار اسے خطروں سے بچالے۔" اس نے ایک لمحے کیلئے سوچا اور دوسرے ہی لمحے کار بالکل سر پر آگئی اور کتوں نے اسے ابھی تک گھیر رکھا تھا اور بھونکتے ہوئے بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ لہٰذا روشو تیسرے لمحے کا انتظار کئے بغیر ایک چھلانگ لگا کے کار کے آگے کود گیا۔ بیگم مکرم نے پوری قوت سے اس طرح ایمرجنسی بریک لگایا کہ فضا لرز گئی اور بیگم کے برابر میں بیٹھی ہوئی اس کی بیٹی کا سر ڈش بورڈ سے ٹکرا گیا۔

O

بیگم چوہدری مکرم کی آٹھ نو سالہ بیٹی شاہینہ دوپہری سے بیقرار اور مضمحل سی تھی اسے ہلکا

ہلکا بخار تھا جس کیلئے بیگم نے اسے کچھ گولیاں وغیرہ دے دی تھیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا بلکہ شام کو شاہینہ کی طبیعت اچانک بہت زیادہ بگڑ گئی اس کی گردن میں شدید تناؤ سا پیدا ہوگیا اور ہاتھ اکڑ کر پیچھے کی طرف مڑ گئے جیسے وہ لکڑی کی بنی ہو۔ گھر میں کوئی مرد ملازم نہیں تھا، نہ ہی چوہدری صاحب نے مرد ملازم رکھنے کی کبھی اجازت دی تھی۔ ایک بوڑھا خانساماں تھا اس کے بس کی بات نہیں تھی خود مکرم صاحب گھر میں موجود تھے لیکن وہ سر شام ہی سے اپنی نئی نویلی دلہن شمسہ کو لے کر بیڈ روم میں داخل ہوگئے تھے اور دروازے کا سرخ بلب روشن کر دیا تھا اور چوہدری صاحب کا یہ ہمیشہ سے حکم تھا کہ جب وہ تخلیے میں ہوں اور ان کے دروازے پر سرخ بلب جل جائے تو پھر چاہے گھر میں آگ لگ جائے۔ آندھی آئے۔ کوئی جئے یا مرے ان کے دروازے پر نہ تو دستک ہو اور نہ کوئی اندر داخل ہو یہ پابندی ان کی پہلی بیگم سمیت سب پر عائد تھی۔

بیگم مکرم بیٹی کی حالت دیکھ کر کئی بار بے چینی سے بیڈ روم کے دروازے کی طرف لپکیں لیکن دستک دینے کی ہمت نہ ہوئی وہ جانتی تھیں چوہدری پر بڑھاپے میں عشق سوار ہوا ہے اور اگر انہوں نے دروازے پر دستک دی تو وہ خبط میں کوئی بھی رد عمل ظاہر کر دے گا۔ لہذا بیگم نے پہلے تو سوچا کہ فیملی ڈاکٹر کو فون کر کے گھر بلا لے لیکن بیٹی کی حالت خراب دیکھ کر زیادہ انتظار نہ کر سکیں جلدی سے بیٹی کو گود میں اٹھایا اور گاڑی میں ڈالا اور جاتے جاتے ماسی کو بتا گئیں۔

"اگر چوہدری صاحب کے بیڈ روم کا سرخ بلب بجھ جائے اور سبز جل جائے تو تو دستک دے کر چوہدری صاحب کو بتا دینا کہ شاہینہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ میں اسپتال لے جا رہی ہوں اور یہ بھی کہہ دینا کہ فی الحال مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کس اسپتال میں ہوں گی"۔

بیگم مکرم شاہینہ کو ایک قریبی اسپتال کی ایمر جنسی میں لے گئیں۔ ایمر جنسی والوں نے معائنہ کرنے کے بعد ٹیٹنس کا مرض تشخیص کیا اور مشورہ دیا کہ بچی کو فوراً متعدی امراض کے اسپتال میں لے جایا جائے جہاں اس کا علاج ممکن ہو سکتا ہے۔ بیگم بہت پریشانی میں مبتلا ہو گئیں

دھن دولت جائیداد، روپیہ پیسے کی ریل پیل، نام نہاد شوہر اور سب کچھ ہونے کے باوجود اس وقت بیگم نے بہت تنہائی اور بے بسی محسوس کی۔ اپیڈیمک اسپتال کا کچھ اتا پتا بھی معلوم نہیں تھا۔ انتہائی گھبراہٹ اور مایوسی کے عالم میں بچی کو پھر کار میں ڈالا اور پتہ پوچھتی ایک طویل فاصلہ طے کر کے شہر سے دور متعدی امراض کے ایک اسپتال میں بچی کو پہنچایا۔ جہاں اسپتال والوں نے دو تین گھنٹے تک بچی کو نگرانی میں رکھنے کے بعد ٹیٹنس کے مرض کو خارج از امکان قرار دیا۔ ڈاکٹروں

کا خیال تھا کہ کچھ اعصابی دباؤ کی وجہ سے ایسا ہوگیا ہے اس وقت تک بچی کی طبیعت بھی سنبھل گئی تھی۔ لہذا کچھ تھوڑی بہت طبی امداد دے کر اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

بچی ویسے بھی اسپتال سے کافی بیزار ہو چکی تھی اور گھر چلنے کی ضد کر رہی تھی ماں بھی پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے بچی کو خطرے سے محفوظ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور بچی کو کار میں بیٹھا کر واپس گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بجے کا عمل تھا معلوم نہیں کیوں اس نے کار کی رفتار معمول سے زیادہ تیز رکھی ہوئی تھی شاید وہ گھر جلد از جلد پہنچنا چاہتی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ شاید چوہدری صاحب کے بوڑھے عشق کا تسلسل ٹوٹا ہو اور انہوں نے سبز بتی جلا دی ہو اور ماسی نے شاہینہ کی بیماری کے بارے میں بتا دیا ہو۔ کچھ بھی سہی، ہے تو باپ۔ سن کر پریشان ہو گیا ہو گا اور پھر گھر میں کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شاہینہ کونسے اسپتال میں ہے۔ اسے جلدی گھر پہنچنا چاہئے۔

کھلی اور خالی سڑک تھی لہذا بیگم مکرم نے اپنی گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اس نے کھڑکی کے شیشے اتار دیئے تھے اور شاہینہ بھی ٹھنڈی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہونے لگی تھی۔ شاہینہ کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ کر ماں کے چہرے پر تمازت سی آگئی۔ اس نے ممتا بھری ہلکی سی ترچھی نگاہ بیٹی کے چہرے پر ڈالی اور ریڈیو لگا دیا جس پر ایک خوبصورت سا گیت نشر ہو رہا تھا۔ بیگم مکرم بہت پرسکون تھیں اور ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کوئی چیز اس طرح اچانک ان کی گاڑی کے سامنے آسکتی ہے جس طرح روشو آگیا۔

کتوں میں گھرا ہوا روشو زمین پر لگے گیند کی طرح کتوں کے بیچ میں اچھلا اور بیگم مکرم کی گاڑی کے آگے کود گیا۔ ایک ایمر جنسی بریک نے رات کی خاموشی میں شگاف پیدا کر دئیے اور روشو گیند ہی کی طرح ٹپا کھا کے دور جا گرا شاہینہ سامنے ٹکرا گئی اور پھر پیچھے جا لگی

"اوہ مائی گاڈ ـــــ" بیگم مکرم کی روح فنا ہو گئی۔ سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا ہو گیا ہے۔ ہر چند کے گاڑی اپنی جگہ پر جام ہو گئی تھی لیکن روشو بھی لب سڑک ساکت پڑا تھا۔ شاہینہ جس کی طبیعت تھوڑی دیر پہلے بہت خوشگوار ہو گئی تھی تھر تھر کانپنے لگی۔ بیگم کے اسٹیئرنگ پر رکھے ہاتھوں پر بھی رعشہ طاری تھا۔ بیگم نے اپنے ذہن کو جھٹک کر اپنے جواب دیتے ہوئے حواس کو قابو میں کیا۔ کھلی آنکھوں سے پورے ماحول کا جائزہ لیا پھر آئینے میں پیچھے سڑک کا جائزہ لیا۔ سامنے نگاہ ڈالی۔ کوئی گاڑی آتی جاتی دکھائی نہیں دی۔ کوئی گواہ نہیں کوئی نگاہ نہیں جو اسے دیکھ رہی ہو۔

"کیا وہ فرار ہو جائے ----" ایک لمحے کیلئے اپنی جان بچانے کی خاطر ایک منفی سوال اس کے ذہن میں پیدا ہوا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر لڑکا مر گیا ہے تو ایک لمبی مصیبت ہو گی اور پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس حادثے میں اس کا رتی برابر قصور نہیں تھا۔ لڑکا خود ہی اچھل کر اس کے سامنے آ گیا تھا لیکن اپنے اس موقف کو وہ ثابت کیسے کرے گی۔

"یہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر ہے۔" دوبارہ اس کے ذہن میں خیال آیا لیکن اس خیال کے ساتھ ہی جیسے ایک جھٹکا اسے اور لگا یہ اس کی مامتا کا جھٹکا تھا۔ کوئی اندر سے اسے کہہ رہا تھا کہ اپنی بچی کیلئے تو تم شام سے بن جل مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہو لیکن دوسرے کے بچے کو سڑک پر مرا ہوا یا مرتا ہوا یا مرتا چھوڑ کر بھاگنا چاہتی ہو۔ "تف ہے تم پر" اس کے اپنے ضمیر نے اسے سرزنش کی اور وہ ایک لمحے میں کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی تھی۔ روشو بے سدھ پڑا تھا لیکن کہیں خون کا کوئی دھبہ یا نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کیا یہ مر گیا ہے امی۔" شاہینہ عقب سے بولی جو ماں کے ساتھ ہی گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی

"نہیں بیٹے نہیں ----" ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے روشو کی طرف اور پھر شاہینہ کی جانب دیکھ کر بولی۔ "یہ ابھی زندہ ہے ہم اسے اسپتال لے جائیں گے۔"

اس نے اپنی پوری قوت لگا کے روشو کو گود میں اٹھایا۔ شاہینہ نے بھی حسب استطاعت اس کی مدد کی اور اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ گاڑی روانہ ہوئی تو روشو بالکل بے ہوش، بے خبر اور بے سدھ پڑا تھا اور بیگم مکرم کا رخ اب گھر کی بجائے پھر جنرل اسپتال کی طرف تھا اور اس کے ذہن میں نئے اندیشے اور وسوسے کیڑوں کی طرح رینگنے لگے تھے۔

پتہ نہیں بچہ مر جائے گا یا زندہ رہے گا۔ پولیس کی تفتیش کیا رخ اختیار کرے گی اور سب سے بڑھ کر چوہدری مکرم کی دہشت اس پر سوار ہو رہی تھی وہ جانتی تھی کہ چوہدری ایک ظالم اور اذیت پسند شوہر ہے کوئی عذر آسانی سے نہیں مانے گا۔ وہ اسی طرح کے پریشان کن خیالات میں کھوئی گاڑی اسپتال کی طرف بھگا رہی تھی کہ اچانک اس کے برابر بیٹھی شاہینہ نے پلٹ کے پیچھے دیکھا اور چونک پڑی۔

"امی امی ---- وہ تو بیٹھا ہے۔" شاہینہ نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

بیگم نے گاڑی کی رفتار سست کی۔ اور شیشے میں دیکھا تو روشو اس طرح نارمل طریقے سے بیٹھا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ بیگم مکرم کی جان میں جان آ گئی انہیں اچانک سڑک کے کنارے ایک کولڈ ڈرنک اسپاٹ کی بتیاں روشن دکھائی دیں۔ انہوں نے گاڑی اسٹور کے کنارے روک دی اور

مشروبات منگوانے۔ خوشی سے وہ آبدیدہ ہوگئیں تھیں
"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی ہے نا۔" انہوں نے اتنی تاخیر سے روشو کی خیریت دریافت کی اور ہنسنے لگیں۔

○

"اب کہاں جاؤ گے ----؟" جب گاڑی کولڈ رنک سا پاٹ سے چلی تو روشو رو رو کے اپنی داستان سنا چکا تھا اور بیگم مکرم محسوس کر رہی تھیں کہ روشو کے سامنے فی الحال کوئی مستقبل اور ٹھکانہ نہیں ہے۔ روشو بیگم کے سوال کے جواب میں کچھ نہ بولا اور کندھے اچکا کر رہ گیا۔
"نوکری کرو گے -----؟" بیگم نے نگاہ سڑک پر اور کان پیچھے روشو کی طرف لگاتے ہوئے پوچھا۔
"پیسے ملیں گے!" اب کے شاہینہ نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔
"پیسے ----؟" روشو چونکا اسے وہ پیسے یاد آگئے جو بابا کے ہمراہ ہاتھ پھیلا کے اسے بھیک میں ملتے تھے اور پھر وہ پیسے یاد آگئے جو اس نے ڈاکوؤں کے پاس گڈیوں کی شکل میں دیکھے تھے اور اس کے نزدیک یہ دونوں پیسے ناجائز تھے۔ بھیک والے بھی چوری ڈاکے والے بھی۔ اس کا بابا تو صرف محنت مزدوری کے پیسوں سے چڑتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ بابا ہر اچھی چیز سے چڑتا ہے، ہر عزت والی چیز سے۔
"محنت مزدوری -----" وہ کہتے کہتے رکا۔ بابا کے سامنے اگر محنت مزدوری کا نام لیتا تو نصف درجن کے قریب تھپڑ اس کی گردن پر پڑتے۔
"ہاں ہاں ---کیوں نہیں۔" بیگم مکرم نے ڈھارس دی۔ "تم نوکری کرو گے، کام کرو گے یہ تمہاری محنت مزدوری کے پیسے ہوں گے۔ کوئی خیرات نہیں ہوگی"۔
"میں پڑھوں گا کیسے جی -----" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا کیونکہ لکھنے پڑھنے کی آرزو تو اس کی روح میں رچی بسی تھی۔
"تم فالتو وقت میں پڑھ بھی سکتے ہو۔" بیگم مکرم نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔
"ٹھیک ہے جی ----" وہ ارادہ باندھتے ہوئے بولا۔ میں نوکری کروں گا ---اور پھر -- --" وہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔
بیگم مکرم جب گھر پہنچیں تو رات کے بارہ بج چکے تھے اور انہیں تشویش تھی کہ اگر

چوہدری صاحب سے آمنا سامنا ہوگیا تو معلوم نہیں کتنی وضاحتیں کرنی پڑیں گی لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی کہ ان کے بیڈ روم کی لال بتی ابھی تک جل رہی تھی!

O

سگنل والے چوک پر ٹریفک جام ہوگیا تھا۔ بتیاں آٹو میٹک طریقے سے جلتی بجھتی تھیں لیکن گاڑیاں پھنسی ہوئی تھیں۔ کوئی ڈرائیور کسی کو راستہ نہیں دے رہا تھا جس کو جہاں سے راہ ملتی آگے نکلنے اور گھسنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ روشو کا باپ شیرو کافی دیر سے سگنل کے اس طرف کھڑا اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ظہر کی اذان کے بعد بیوی سے اس جگہ ملنے کو کہا تھا۔ اذان کب کی ہو چکی تھی لیکن بیوی کی آمد کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ غصے میں اس کا خون کھولنے لگا تھا اور تو کوئی بات نہیں تھی۔ اسے بیوی کے دیر سے آنے کی پریشانی نہیں تھی۔ اس کی طرف سے جائے جہنم میں آئے نہ آئے لیکن وہ ذہنی طور پر آج بہت پریشان تھا۔ اس نے آج صبح روشو کو ڈھونڈنے میں گزار دی تھی اور اسے تلاش کرتے کرتے اب دوپہر ہو چکی تھی جو جو ٹھکانے ہو سکتے تھے وہاں دیکھا۔ فقیروں سے پوچھا لیکن کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب یہاں اس نے بیوی سے ملنے کیلئے کہا تھا کیونکہ خیرو کو صبح اس نے بیوی کے حوالے کیا تھا وہ جانتا تھا کہ خیرو کا چہرہ آج ہن برسانے والا چہرہ ہے عام حالات میں وہ کبھی خیرو کو اپنی حرام خور بیوی کے سپرد نہ کرتا لیکن آج اسے روشو کی فکر کھائے جارہی تھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ جوں جوں وقت گزر رہا ہے روشو کی گمشدگی کا یقین پکا ہوتا جارہا ہے۔ اس کے لوٹ آنے کے آثار کم ہوتے جارہے تھے۔ وہ گمشدگی کی رپورٹ بھی درج نہیں کروا سکتا تھا کہ الٹا دھر لیا جائے گا اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ روشو کو ہر قیمت پر تلاش کر کے رہے گا ورنہ اس کا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا اور اس کی فقیری بھی خطرے میں پڑ جائے گی وہ زچ ہو کر چوراہے سے جانے ہی لگا تھا کہ اچانک اسے بیوی دکھائی دی۔ وہ خیرو کو کندھے سے لگائے گاڑیوں کے اژدھام سے نکلتی ہوئی بچتی بچاتی اس کی طرف آرہی تھی۔

کہاں موت آگئی تھی تجھے ۔۔۔۔۔" جب بیوی پاس آئی تو وہ اس پر برسا۔ "گھنٹے بھر سے انتظار کر رہا ہوں۔"

"یہ، میری جان کھا رہا تھا مد بختا۔۔۔۔۔" اس نے کندھے سے لگے بے خبر سوئے ہوئے خیرو کی جانب اشارہ کیا جس کی زخم سے ادھڑی ہوئی کھال پر مکھیوں کا ایک جال بھنبھنا رہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہا تھا تجھے ----" اس نے خیرو کی طرف دیکھا۔ "یہ تو بے خبر سو رہا ہے۔"

تڑفات مچار کھی تھی -----" بیوی بولی۔ "ابھی تڑف تڑف کے سویا ہے۔"

"کیوں ----اور افیم نہیں دی تھی اسے۔" شیرو نے پوچھا۔

"اور افیم نہیں تھی میرے پاس" ۔وہ بولی۔ "ابھی زینو ملی ہے تو اس سے چٹکی لے کر کھلائی تو جب سویا"۔

"درفٹے منہ -----" شیرو نے ایک موٹی سی گالی دی"۔ بد بختی تجھے دس دفعہ بولا تھا اس کے زخم تازے ہیں یہ تڑنے گا۔ افیم اپنے پاس رکھنا۔"

"بھول گئی تھی نا۔" اس نے معذرت کی۔

"اللہ کے نام------ معذور ہوں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں غریب کے۔" شیرو نے ایک مخیر راہ گیر کو جیب میں ہاتھ ڈالے دیکھا تو اچانک آواز لگائی راہ گیر نے غالباً جیب سے سگریٹ نکالا اور سلگا کر آگے بڑھ گیا۔

"دھت تیرے کی------" اس نے بڑبڑا کر راہ گیر کو زیر لب ایک گالی دی پھر حرف مدعا پر آتے ہوئے بیوی سے مخاطب ہوا۔ "لو ٹیں نکال کدھر ہیں"۔

"میرے کھیسے میں ہاتھ ڈال۔" اس نے کرتے کی سائیڈ جیب قریب کی تو شیرو نے ہاتھ ڈال کے نوٹ باہر نکالے ڈھیر سارے نوٹ تھے۔ شیرو نے بکھرے ہوئے تڑے مڑے چرمارے ہوئے نوٹوں کو جوڑنا شروع کیا۔

"گھر جا کے جوڑ لینا ابھی اندر ڈالو" ۔وہ کن انکھیوں سے نوٹوں کو دیکھتی ہوئی بولی۔ "آج اللہ کا کرم ہوا ہے"۔

"میں نہ کہتا تھا کہ چوہے کی شکل میں مولا نے روزی بھیجی ہے۔" اس نے اتراتے ہوئے کہا اور نوٹ سمیٹ کر گدڑی کے اندر بنی تھیلا نما جیب میں ڈال دیئے اس دوران دو چار راہ گیروں نے گزرتے ہوئے ازراہ ترحم خیرو کے مکھیوں سے پٹے ہوئے زخمی چہرہ کو دیکھا اور اس کی ہتھیلی پر روپیہ دو روپے رکھ کر گزر گئے جو شیرو اچک کر جیب میں ڈالتا گیا۔ ہر چند کے خیرو کے اعصاب پر افیم کے نشے کی گہری تہہ چڑھی ہوئی تھی لیکن پھر بھی مکھیوں کے جال نے جب اندر کی طرف دباؤ ڈالا تو خیرو بے چینی میں کسمسایا اور ہاتھ پاؤں ہلانے لگا۔

"ذرا مکھیاں تو اس کے منہ سے اڑاؤ" ۔شیرو کی بیوی نے خیرو کو بے چین دیکھ کر کہا۔

"مت اڑاؤ مکھیاں پگلی"۔ شیرو نے جواب دیا۔ "یہ مکھیاں رزق ہیں ہمارا۔۔۔۔ وہ فلسفے کے لہجے میں بولا۔ "مکھی زخم پر پڑتی ہے اور گراہک مکھی پر پڑتا ہے۔ اس کے چہرے سے مکھی اڑ جانے گی تو آدھے نوٹ اڑ جائیں گے۔" وہ بولتا چلا گیا۔ "مکھیاں گندگی، میل چیتھڑے یہ سب کچھ ہماری روزی کے ذریعے ہیں۔۔۔۔ اللہ کے نام پر سخی بابا۔۔۔" وہ بیوی سے باتیں کرتے ہوئے ایک دم گرجا اور دو تین نوٹ خیرو کے مظلوم چہرے پر مزید گر گئے۔

"ش ش شی شی۔۔۔۔۔" ایک نوجوان جو دو تین بار سامنے سے گزرا تھا شیرو کی بیوی کی طرف دیکھ کر شتکارا اور پھر سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا نامعلوم اشارہ دینے لگا۔

"یہ جنٹر مین تم سے کچھ کہہ رہا ہے؟" شیرو نے بیوی سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ وہ راز داری سے بولی۔ "یہ میرے کو اپنے ساتھ سلیماں لے جارہا ہے؟" بیوی کے لہجے میں بہت تجسس تھا۔

۔ "یہ تجھے سلیماں لے جارہا ہے؟" شیرو نے ازراہ حیرت کہا۔ اس نے صحت مند لیکن میلی کچیلی بیوی کے سراپے کا بھرپور جائزہ لیا

"ہاں۔۔۔۔ کہتا ہے بڑی اچھی فلم دکھاؤں گا۔۔۔۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"تو پاگل ہے یا وہ پاگل ہے۔۔۔۔" شیرو مزید حیران ہوا۔ "وہ تجھے اس حلیئے میں کیسے اپنے ساتھ سلیماں لے جانے گا؟"

"اس حلیئے میں تھوڑی لے جانے گا۔" بیوی بولی۔ "وہ کہہ رہا ہے فلیٹ میں تیرے لئے نئے کپڑے رکھے ہوئے ہیں نہا دھو کے نئے کپڑے پہن لینا نئے کپڑے پہنا کے ساتھ لے جانے گا میم صاحب۔"

"لعنت تجھ پر۔۔۔۔" وہ غصّے میں برسا۔ "اب تو فلیٹ جانے گی اور اس کے ساتھ میل اتارنے گی۔"

"پھر کیا ہوا۔ میل پھر چڑھ جانے گا۔ میل چڑھنے میں کتنی دیر لگتی ہے"۔ وہ لجاجت کے ساتھ بولی۔

"بک بک بند کر بد بختی"۔ شیرو نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ "تیرے لچھن زیادہ خراب ہوتے جارہے ہیں۔"

"یہ جو باؤ ہے نان شیرے۔ بس صرف سلیماں لے جاتا ہے"۔ اس نے وضاحت کی۔

"بک بک مت کر۔۔۔" اس نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "سلیماں شلیماں نہیں جانے گی تو اس

کے ساتھ آج۔"

"پچاس روپیہ سلیماں سے پہلے دیتا ہے اور پچاس بعد میں"۔ بیوی نے دانہ پھینکا"۔ ابھی میرے کھیسے سے جو تم نے نوٹ نکالے ہیں ان میں جو پچاس کا نوٹ تھا وہ اسی نے دیا ہے پچاس بعد میں دے گا"۔

"نہ نہ نہیں چاہئے اس کا پچاس کا نوٹ ہمیں"۔ وہ صاف منع کرتے ہوئے بولا۔ "تیرے پاس سونے کی کان ہے آج، تین گھنٹے فلم میں بیٹھے گی تو صرف پچاس ملیں گے اور تین گھنٹے خیرو کو گھماؤ تو کئی پچاس کے لوٹ تیرے کھیسے میں آئیں گے۔"

"آدھا دن میں نے گھمایا ہے۔ اب آدھا دن تو گھما لے اسے"۔ وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

"اور تو آدھا دن گلچھرے اڑائے۔۔۔۔" وہ برہم ہو کر بولا۔

"مجھے فلم کا بہت شوق ہو رہا ہے آج"۔

"تیرے تو بہت سارے شوق ہیں"۔ وہ غصے میں بولا۔ "لیکن وہ تیرا کمینہ جو بھاگا ہوا ہے اسے کون ڈھونڈے گا وہ بہت ضروری ہے میں جا رہا ہوں اس بد بخت کی تلاش میں خیرو کو آج نہیں چھوڑنا پانچ منٹ کیلئے بھی۔ پائی پائی کا حساب لوں گا۔ رات کو۔۔۔۔۔ جا۔۔۔۔۔ جا اب اپنے علاقے میں"۔ اس نے بیوی کو کسی بھیڑ کی طرح ہنکایا۔ ادھر وہ نوجوان ایک چکر لگا کر پھر گھوم کے سامنے آگیا تھا۔

"شش شش۔۔۔۔ گھڑی دیکھ کر ایک دفعہ پھر اس نے شیرو کی بیوی کو اشارہ کیا لیکن جواب میں بیوی کی بجائے شیرو نوجوان کی طرف لپکا اور چلانے لگا۔

"بھگ بے بھگ یہاں سے کیا شکار رہا ہے فقیروں کی لگائیوں کو۔۔۔ ہیں شرم نہیں آتی ہے ٹچا کہیں کا۔۔۔" وہ زور زور سے بولنے لگا۔ یہاں تک کے لوگ جمع ہو گئے اور نوجوان اپنی عزت بچاتا دبے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔

"کیا ہو گیا بابا"۔ کسی راہ گیر نے ازراہ ہمدردی پوچھا۔

"ارے لفنگے ہیں بھائی۔۔۔۔ فقیروں کی لگائیوں کو بھی چھیڑتے ہیں۔" شیرو کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

"چلو جانے دو دفع کرو۔" کسی راہ گیر نے شیرو کو تھپکا کر کہا اور شیرو نے جیسے ایک منٹ میں غصہ تھوک دیا۔

"حق ہو۔۔۔۔" وہ کسی راہ گیر کو دیکھ کر بولا۔ "خیر ہو سخی بابا کی۔ معذور کو کچھ دیتا جا۔" کسی نے ایک روپیہ تھمایا جو اس نے تھیلے میں ڈالا اور پھر ناک منہ چڑھائی بیوی کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولا۔

"ارے تیرے منہ پر کیوں پھٹکار برسنے لگی ہے۔ پھر کبھی سلیماں دیکھ لینا۔ آج خیرو کو گھما۔ میں شیرو کی خبر لے کر آؤں۔ شاباشے ناراض نہ ہو"۔ اس نے لہجے میں قدرے نرمی اختیار کی۔

اور زخم خوردہ ادھڑی کھال والے افیم کے نشے میں بے ہوش خیرو کو بیوی کی گود میں چھوڑ کر خود روشو کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

روشو ابھی تک اپنے کمرے میں تھا جو انیکسی میں خانسامے کے کمرے سے ملحق تھا اور چوہدری مکرم سے ابھی روشو کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔

صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی جب چوہدری مکرم کے بیڈروم کے دروازے کی سرخ بتی بجھی اور سبز روشن ہوئی۔ تقریباً اٹھارہ گھنٹے کے بعد یہ سگنل تبدیل ہوا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اب اگر کوئی خاص بات ہو یا گھر کے کسی فرد نے رابطہ قائم کرنا ہو تو دروازہ کھٹکھٹا کے چوہدری صاحب سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ رعایت بھی صرف بوڑھے خانسامہ، گھر کی نوکرانی، ماسی اور پہلی بیگم مکرم کو حاصل تھی لیکن چوہدری صاحب کی دہشت کے سبب اس رعایت سے بھی بہت کم کوئی فائدہ اٹھاتا تھا۔

رات جس وقت شاہ وسنہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اس وقت بیگم مکرم بے اختیار کئی مرتبہ بیڈروم کی طرف لپکی تھیں لیکن لال بتی نے ہر بار ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ لئے تھے ان میں دستک دینے یا سگنل توڑنے کی ہمت نہ ہو سکتی تھی۔ اب جبکہ اٹھارہ گھنٹے کے بعد یہ سگنل بدلا تو چوہدری صاحب بنفس نفیس خود دروازے پر نمودار ہوئے۔ تقریباً اسی برس کی عمر دبلا پتلا رعشہ زدہ منحنی سا جسم، سر پر صحرا میں اگنے والی دور دور اور مرجھائی ہوئی گھاس کی طرح ہلکے ہلکے سفید بالوں کا ایک بے روح سا جال جس سے چمکتی کھال صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بے جان بازؤں اور نحیف ہاتھوں پر اس طرح پتلی ہلکی کپکپی طاری تھی جیسے ڈیزل سے چلنے والی کسی مشین کے متحرک پرزے ہوں۔ چوہدری صاحب کے باتھ روم میں اس وقت شاور چلنے کی آواز آرہی تھی اور چوہدری صاحب کی سینئر بیوی بیگم مکرم ڈرائنگ روم میں بیٹھی صبح کی چائے کے گھونٹ حلق سے اتار رہی تھیں پہلے وہ اکثر ناشتہ صبح چوہدری صاحب کے ساتھ کیا کرتی تھیں اور صبح نہار منہ کی چائے بھی خود ہی اپنے

ہاتھ سے بنا کے چوہدری صاحب کے لئے لے جایا کرتی تھیں لیکن تقریباً ایک ماہ سے یعنی جب سے چوہدری صاحب شمسہ کو نکاح میں لائے تھے بیگم ساجدہ مکرم کے معمولات بدل گئے تھے اور چوہدری صاحب نے اپنا سارا وقت نئی نویلی بیگم کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ بیڈ روم سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ بہت کم وقت کے لئے ان کے دروازے کی لال بتی بجھتی تھی۔ اس دوران تھوڑا سا وقت بھی انہوں نے سینئر بیوی کو نہیں دیا تھا، نہ ہی بچی کی خبر لی اس تمام عرصے وہ دفتر بھی نہیں گئے۔ وہ ساری ہدایات ٹیلیفون پر ہی دیتے رہے تھے۔ بس دو تین مرتبہ گھر کے لان میں کیشئیر سے ملاقات کی۔ وہ بھی اس لئے کہ وہ بلیک کا روپیہ لے کر گھر آیا تھا۔

بیگم ساجدہ مکرم ایک صابر اور قناعت پسند خاتون تھیں۔ انہوں نے چوہدری صاحب کی بیوی کی حیثیت سے جو وقت ان کے ساتھ گزارا وہ بھی ایک صابر عورت کی حیثیت سے گزارا اور اب جب کہ سوت گھر میں آئی تھی تو بھی انہوں نے صبر اور شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور یہ بات ان کے لئے اس لئے بھی زیادہ اہم نہیں تھی کہ وہ خود بھی اس گھر میں سوکن بن کر آئی تھیں اور وہ خوشی سے نہیں آئی تھیں ان کی مجبوری اور غربت نے انہیں چوہدری مکرم کے پیسے کی بھٹی میں جھونکا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ شمسہ بھی غربت کا ایندھن بن کے چوہدری کی دولت کے تنور میں جل رہی ہے۔ انہیں کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ قسمت کا گلہ کسی سے کیا کرنا چوہدری صاحب نہ پہلے ان کا مستقبل تھے نہ اب ہیں۔ لیکن اب ان کی پوری کائنات شاہینہ بن گئی تھی جو بیگم مکرم کا مستقبل بھی تھی اور جس کی خاطر اب انہیں اس گھر کی چار دیواری کا تمام سرد گرم برداشت کرنا تھا۔

"تم آج اسکول نہیں گئیں"۔ چوہدری صاحب نے بیڈ روم سے نکلتے ہوئے جب اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے گھر کا ایک جائزہ لیا تو انہیں شاہینہ اپنے کمرے سے نکلتی دکھائی دی۔ وہ نیند سے بوجھل آنکھیں ملتی ہوئی ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی کہ چوہدری صاحب کی لرزتی ہوئی لیکن کرخت آواز اسے سنائی دی۔

"وہ ابو۔۔۔۔ وہ" شاہینہ نے آنکھیں ملتے ہوئے نحیف آواز میں کچھ کہنا چاہا لیکن ابھی وہ اسکول نہ جانے کا جواز بتا ہی نہیں پائی تھی کہ بیگم ساجدہ مکرم آواز سن کر آگئیں۔

"شاہینہ رات کو بہت زیادہ بیمار ہو گئی تھی"۔ بیگم ساجدہ مکرم نے دھیمی آواز میں جواز پیش کیا۔ چوہدری صاحب کچھ نہ بولے سوالیہ انداز میں بیگم کی جانب دیکھا تو بیگم نے مزید کہا

"رات بارہ بجے اسپتال سے واپس لائی ہوں۔"

چوہدری صاحب نے ایک ترچھی نظر شاہینہ پر ڈالی اور پھر بیوی کی جانب اس طرح دیکھا جیسے مزید کچھ جاننا چاہتے ہوں۔ بیگم مزید بولیں۔

"پہلے جنرل اسپتال لے گئی تھی۔۔۔۔انہوں نے شبہ ظاہر کیا کہ شاید اسے تشنج ہو گیا ہے۔ لہذا انہوں نے متعدی امراض کے اسپتال میں بھیج دیا۔۔۔۔ بارہ بجے تک اپنی ڈیمک اسپتال والوں نے اسے اپنی نگہداشت میں رکھا پھر ڈسچارج کر دیا خدا کا شکر ہے ٹیٹنس نہیں تھا۔۔۔" وہ ابھی بول ہی رہی تھیں کہ چوہدری صاحب بات کاٹ کر بولے۔

"تو پھر اسکول کیوں نہیں گئی یہ۔"

اف میرے خدایا کیسا وحشی انسان ہے۔ یہ ابھی تک بیڈ روم کے خمار سے باہر نہیں آیا۔ بیگم ساجدہ مکرم نے نفرت انگیز انداز میں چوہدری صاحب کے بارے میں سوچا اور پھر بڑی نرمی سے جواب دیتے ہوئے بولیں۔

"چوہدری صاحب اس کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ اسکول جا سکتی۔ رات بھر بخار رہا۔ اب بھی ٹمپریچر ہو گا۔" اس نے آہستگی سے شاہینہ کی کلائی چھو کر کہا۔

"ہونہہ۔۔۔" وہ کچھ سوچ کر پلٹے تو راہداری میں روشو کھڑا تھا۔ صاف ستھرا نہا دھو کے وہ انیکسی سے ابھی ابھی نکلا تھا۔ بیگم نے رات ہی ایک ٹھیک ٹھاک جوڑا پہننے کو دے دیا تھا جو اس کے سائز کا گھر کے اندر سے برآمد ہوا تھا۔ پھر اسے بوڑھے خانسامے کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ اس کے لئے انیکسی کے کونے والا کمرہ کھلوا دے۔ یہ رات روشو کی زندگی کی پہلی خوبصورت ترین رات تھی جو اس نے صاف ستھرے کپڑے پہن کر نہا دھو کر اچھا کھانا کھا کے انتہائی آزادی کے ساتھ کھلے ہوا دار کمرے میں پلنگ پر سو کے گزاری تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کھلی آنکھوں سے ایک سنہرا خواب دیکھ رہا ہے۔ کہاں وہ جھگی میں بدمست فقیروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ سب کی ایک ساتھ چلتی اور آپس میں ٹکراتی سانسیں، اندرونی گیس سے پیدا شدہ دھماکوں کی آوازیں ہولناک خراٹے، ڈکار، ابکائیاں، تعفن، گھٹن اور بے خوابی۔ اور کہاں یہ کھلا ہوا دار کمرہ جس کے اندر وہ تنہا دراز تھا۔ جس کے اندر ہی ایک ملحق غسل خانہ تھا۔ جس کا دروازہ اس نے خود اندر سے بند کیا تھا اور جس کے تالے کی چابی اس کے اپنے قبضے میں تھی اور وہ کسی کی قید میں نہیں بلکہ مکمل آزاد تھا۔ وہ کس قدر سکون کے ساتھ بے خبر سویا تھا جیسے وہ کسی طلسماتی کہانی کا شہزادہ ہو۔

طلسماتی کہانی ہی تو تھی یہ کہ کہاں اس کی اپنی ماں جسے بچوں کی کبھی خبر ہی نہیں رہی کہ انہیں کیا دکھ اور کیا تکلیف ہے اور اس کا باپ جو اپنے بیٹے کے چہرے کی کھال ادھڑ جانے پر خوش اور چوہے کا ممنون تھا اور بیٹے کے زخموں کا علاج نہیں کراتا کہ زخم اس کی آمدنی کا ذریعہ تھے اور کہاں یہ بیگم کہ جس کی گاڑی کے سامنے وہ خود جان بوجھ کر کودا تھا اور اسے ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی تھی لیکن پھر بھی بیگم نے اس کے جسم کے ایک ایک حصے کو دیکھا تھا کہ کہیں چوٹ نہ لگی ہو اور درد کے لئے گولیاں کھانے کو دی تھیں اور پینے کو دودھ کا گرم گرم گلاس دیا تھا اور اس میں کچھ بھورا بھورا پاؤڈر ملا دیا تھا جس کے ڈالنے سے دودھ کا مزا چاکلیٹ کا سا ہو گیا تھا اور بڑی شفقت کے ساتھ سر پر ہاتھ پھیر کے خانساماں کو ہدایت کی کہ بچے کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے اور وہ رات اتنا بے خبر اور پرسکون سویا تھا کہ اگر بوڑھا خانساماں دروازہ کھٹکھٹا کر اسے صبح بیدار نہ کرتا تو وہ غالباً شام تک سویا رہتا۔ اس نے صبح نہا دھو کے خانساماں کے ہمراہ ہی کوٹھری میں ناشتہ کیا اور پھر بیگم صاحبہ کو سلام کرنے کے لئے جب کوٹھی میں داخل ہوا تو راہداری سے گزرتے ہوئے نگاہ چوہدری صاحب پر پڑی جن کے بارے میں ابھی تک وہ کچھ نہیں جانتا تھا لیکن چوہدری صاحب کا انداز دیکھ کر وہ کانپ سا گیا۔

"کون ہو تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟" چوہدری صاحب نے اسے ترچھی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اپنی نحیف لیکن سوئی کی طرح باریک اور چبھ جانے والی آواز میں پوچھا۔ ان کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی اور سیارے کا آدمی کسی اور سیارے پر آگیا ہو۔ جیسے وہ کوئی چھوٹا سا بچہ نہیں کوئی ہیبت ناک دیو چار دیواری سے کود کر اندر زنان خانے میں آگیا ہو۔ چوہدری صاحب کا رعب و دبدبہ اور کپکپاتے ہاتھ دیکھ کر روشو پر بھی کپکپی طاری ہو گئی وہ منہ سے کچھ نہ بول پایا لیکن بیگم ساجدہ مکرم آگے بڑھیں اور کہنے لگیں۔

"میں بتاتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔" اور پھر انہوں نے روشو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا کہ کس طرح رات گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا ہے۔ اور اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کیا کہ انہوں نے اسے گھریلو کام کاج کے کیلئے ملازم رکھ لیا ہے۔

"گاڑی اناڑیوں کی طرح چلانے کا یہ مطلب نہیں کہ جو گاڑی کے آگے آئے اسے گھر لے آؤ۔ کچھ دیر انہوں نے توقف کیا اور پھر سر جھٹک کر بولے۔ "میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ گھر میں کوئی ملازم نہیں رکھا جائے گا۔"

"میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ گھر میں ایک ملازم کی سخت ضرورت ہے۔" وہ قدرے بے خوفی سے بولیں۔

"کیا ماسی موجود نہیں گھر میں.....خانساماں ہے؟" وہ نوکر نہ رکھنے کا جواز پیدا کرتے ہوئے بولے۔

"ماسی تو گھر کے اندر کا کام کرتی ہے اور خانساماں کچن میں مصروف رہتا ہے۔" بیگم بولیں "اور پھر وہ اتنا ضعیف ہے کہ اپنا رعشہ زدہ وجود ہی نہیں سنبھال سکتا..." وہ کہتے کہتے خوفزدہ سی ہو گئیں کیونکہ چوہدری صاحب نے اپنے رعشہ زدہ وجود اور ہاتھوں کو اس طرح دیکھا جیسے بیگم نے ان پر طنز کیا ہو حالانکہ یہ بات بیگم کے منہ سے بے دھیانی میں نکل گئی تھی اور روئے سخن قطعی طور پر چوہدری صاحب کی طرف نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس طرح کی جراءت کر سکتی تھیں لیکن چوہدری صاحب کے تاثرات سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے بات کو اپنے اوپر لے لیا ہے۔

"میرا مطلب ہے کہ....." وہ کھسیانی سی ہو کے بولیں "خانساماں بازار کے چکر نہیں لگا سکتا۔ کوئی مرد ملازم ہم رکھ نہیں سکتے....."

چوہدری صاحب اس بات پر چونکے کیونکہ یہ ان کی دکھتی رگ تھی

"اس لئے یہ بچہ سا ہے میں نے سوچا بازار کی بھاگ دوڑ کے لئے ٹھیک رہے گا"۔ وہ مزید بولیں اور چوہدری صاحب بھی جیسے پچھلی بات کو پی سے گئے اور روشو پر شبہ ظاہر کرتے ہوئے بولے۔

"پتہ نہیں کون چور اچکا ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ کس نیت سے آیا ہے اسے ملازم رکھنے کی بجائے پولیس کے حوالے کرنا چاہئے"۔

"نہیں صاحب جی نہیں۔ میں چور نہیں ہوں۔ میں چور نہیں ہوں۔ میں نے کبھی چوری"..
۔ ڈرا سہما روشو کانپتے ہوئے بولا۔

"تم ڈرو نہیں تم چور نہیں ہو....." بیگم بہت ہمت کا مظاہرہ کر کے روشو کے پاس گئیں اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اعتماد سے بولیں۔ "تمہیں یہاں ملازم رکھ لیا گیا ہے۔"

یہ بات پتہ نہیں وہ کیوں اور کیسے کہہ گئیں اور ایک معمولی لڑکے کے لئے کس طرح انہوں نے جراءت اور فیصلے کا مظاہرہ کیا۔ یہ بات خود بیگم کی سمجھ میں نہیں آئی اور چوہدری صاحب حیرت زدہ رہ گئے!

"دیکھا جائے گا۔۔۔۔۔!" وہ جلال میں بولے اور واپس بیڈ روم میں چلے گئے ان کے بیڈ روم میں جاتے ہی سبز بتی بجھی اور لال بتی روشن ہو گئی۔

روشو ٹکر ٹکر بیگم صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی خاموش کھڑی کچھ دیر سوچتی ہوئی جیسے کہیں کھو سی گئیں پھر اچانک روشو کی آواز نے انہیں چونکایا۔

"بیگم جی۔۔۔۔" روشو معصومیت سے بولا۔ "یہ آپ کے بابا ہیں!"

بیگم چند لمحے خاموشی سے روشو کے معصومیت بھرے چہرے کو دیکھتی رہیں اور پھر بولیں۔

"نہیں بیٹے۔۔۔۔۔ یہ شاہینہ کے بابا ہیں۔۔۔۔۔" بیگم کے اس جواب پر روشو حیرت زدہ سا رہ گیا۔

"آجاؤ میرے ساتھ میں تمہیں کام بتاتی ہوں" ۔ روشو کی توجہ ہٹانے کیلئے انہوں نے روشو کا ہاتھ تھاما اور کوٹھی کی اوپری منزل کی طرف لے گئیں۔

O

اس رات خیرو اس طرح تڑپ رہا تھا جیسے ذبح ہونے کے بعد بکرا جانکنی کے عالم میں تڑپتا ہے اور پاؤں مارتا ہے۔ افیم کی دوسری چٹکی بھی درد کش ثابت نہیں ہو سکی تھی۔ پورے دن کے گرد و غبار اور بھنبھناتی مکھیوں کے زہر نے اس کے زخموں میں اتر اتر کر ایک ہی دن میں چہرے پر خون اور مٹی کے کھرنڈ بنا دیئے تھے اب درد کی شدت سے بے اختیار تڑپ رہا تھا۔ تکلیف لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی اور وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے واویلا مچا رہا تھا۔

"میں مر جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا"۔

خیرو دن بھر روشو کو تلاش کرتا رہا تھا اور ماں بختی خیرو کو بے دلی سے شہر میں گھماتی رہی لیکن پھر بھی ٹھیک ٹھاک نوٹ جمع ہو گئے تھے۔ بے دلی سے اس لئے گھماتی رہی کہ آج باؤ کے ساتھ سینما دیکھنے کا پکا موڈ اس نے بنایا تھا وہ کئی دنوں سے سینما ہاؤس کے باہر لگی تصویروں اور پوسٹروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اس کے پسندیدہ اداکار اس فلم میں کام کر رہے تھے اور ہیرو ہیروئین کے بڑے دلچسپ اور دلکش مناظر کی تصویریں سینما والوں نے اپنے نمائشی بورڈوں پر لگا رکھی تھیں جہاں بختو مانگنے کے بہانے روز ان تصویروں کو دیکھنے سینما کے اندر چلی جایا کرتی تھی۔ ایک دن باؤ بھی اسے یہیں ٹکرا گیا تھا اور جب اس نے اسے فلم دکھانے کی پیشکش کی تو وہ

فوراً آمادہ ہوگئی جیسے پہلے ہی سے تیار بیٹھی ہو اور پھر اگلے دن کا پروگرام بنا کے باڑ سے وعدہ کر کے چلی گئی تھی۔

صبح اس نے میل چڑھے بدن اور میلے چکٹ کپڑوں کے باوجود آنکھوں میں سرمہ لگایا ہونٹوں پر دنداسہ مل کے لبوں کی رنگت بدلی، باقی صفائی ستھرائی کا پروگرام اس نے باڑ کے فلیٹ پر بنایا تھا اور باڑ کے ساتھ فلم کا پروگرام بھی اس نے پہلی مرتبہ نہیں بنایا تھا وہ اس پہلے چار پانچ فلمیں باڑ کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔ شیرے کو بھی پیسے چاہئے تھے اسے بختو کے باڑ کے ساتھ سینما جانے پر کوئی خاص اعتراض بھی نہیں ہو سکتا تھا وہ بس تھوڑی سی رقابت ظاہر کرتا تھوڑی سی کشمکش کوئی چوٹ کوئی طنز کرتا اور پھر اجازت تھی اور شیرے کی بیوی جانتی تھی کہ اس طرح کی باتوں سے وہ شیرے کی نظروں میں گرتی نہیں بلکہ اس کا بھاؤ بڑھ جاتا ہے اور وہ زیادہ شیر ہو کر شیرے کو نخرے دکھاتی۔ لیکن آج شیرے نے اس کی بات نہیں مانی کیونکہ خیرو کا زخم خوردہ چہرہ اس کی کمزوری بن گیا تھا جس کو ہر حال میں لوگوں کے سامنے پیش کر کے وہ رقم کھری کرنا چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی روشو بھی اس کی کمزوری تھا اس کے بڑھاپے کا سہارا تھا وہ اسے بھی ہر صورت میں تلاش کرنا چاہتا تھا اور اس نے پورا دن روشو کی ناکام تلاش میں صرف کر دیا تھا اور خیرو کو بیوی کے سپرد کر رکھا تھا جس نے اچھی کمائی کی تھی لیکن اب خیرو درد کی شدت سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا اور چلا چلا کے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔

"یہ مر جائے گا شیرو ۔۔۔۔" ماں پھر ماں تھی بیٹے کو تڑپتا دیکھ کر رحم کے جذبے سے بولی۔

"فقیر کا بیٹا اتنی آسانی سے نہیں مرتا ہے نیک بختو ۔۔۔۔" وہ اطمینان سے بولا "ہمت پکڑ۔ ۔۔۔ اس کو تڑپنے دے دو چار دن میں اس کے چہرے کا کھرنڈ پکا ہو جائے گا پھر ہاتھ سے پکڑ کر پپڑی اتار دینا۔" وہ بے رحم انداز میں بولا۔

"پپڑی اترے گی تو چہرہ خراب نہیں ہو جائے گا۔" ماں نے تشویش ظاہر کی۔

"پھر وہی بک بک ۔۔۔ ارے تو تو کسی طرح فقیرنی لگتی ہی نہیں۔" وہ بیوی کو سرزنش کرتے ہوئے بولا۔

"داغ پڑ جائیں تو شہزادوں کے چہرے خراب ہو جاتے ہیں۔ شہزادیوں کے خراب ہو جاتے ہیں فقیروں کے نہیں۔ فقیروں کے چہرے جتنے خراب ہوں گے اتنی برکت ہوگی رزق ملے گا پیسہ آئے گا۔ ڈھیلے بدن، بیماریاں، لاغرپن، مظلوم چہرے، نحوست پھٹکار، بدبو، سڑاند، میل

کچیل یہ سب برکتیں ہیں فقیروں کی۔ لیکن تو بد بختی نہیں سمجھے گی ان باتوں کو۔ وہ ایک دم لہجہ بدل کے بولا۔ تیرے لچھن شہزادیوں والے ہیں تو آنکھوں میں سرمہ اور ہونٹوں پر مسی لگا کے نکلتی ہے تو میلے کچیلے بدن اور چیتھڑوں کے پیچھے سے بھی اپنا جوان بدن ظاہر کرتی ہے تاکہ گاہک تیری غریبی کو چھوڑ کر تیرے بدن کے پیچھے لگ جائے لعنت ہے تجھ پر۔ اس نے برہم ہو کر نفرت اور حقارت سے تھوک دیا۔

"تو خواہ مخواہ جل بھن کر کباب ہو رہا ہے۔" وہ اٹھلاتی ہوئی بولی۔ "جانا اپنی شاداں کو بول وہ کیوں چیتھڑوں میں اپنا بدن نکالے پھرتی ہے۔ اس کو بھی منع کرنا"۔ بیوی نے شیرو کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور شیرو گرجا۔

"بک بک مت کر۔" اس نے ہاتھ بلند کر کے کہا جیسے تھپڑ مارنے لگا ہو۔ "وہ میری بیوی نہیں ہے تو بیوی ہے میری۔"

"ہونہہ۔۔۔۔ بیوی" اس نے کندھوں کو جھٹکا دیا۔ "بیوی۔۔۔ ہونہہ" اس نے آنکھیں مچکا کہ پھر کندھوں کو جھٹکا دیا۔

"اب کھانے گی کچھ مجھ سے۔۔۔۔" اس نے پھر ہاتھ ہوا میں گھمایا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ بختو پر پڑتا جھونپڑیوں کے باہر ایک دم شور بلند ہوا۔ کوئی عورت پکار رہی تھی "بچاؤ، بچاؤ، میں لٹ گئی، ماری گئی۔۔۔۔"

"یہ کیسا شور ہے۔" شیرو چونکا۔

"پتہ نہیں" بیوی نے حیرت ظاہر کی اور دونوں خیرو کو تڑپتا چھوڑ کر باہر کی طرف دوڑے۔ باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور ایک نئی نویلی دلہن کسی جھگی سے باہر نکل آئی تھی اور اس کا شوہر عبداللہ فقیر جو آج ہی اسے گاؤں سے بیاہ کر اسٹیشن سے سیدھا ادھر لے آیا تھا دلہن کو پکڑ پکڑ کے اندر جانے کی کوشش کر رہا تھا اور دلہن ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے فریاد کر رہی تھی۔

"میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے اس نے میرے بابا کو بتایا کہ کراچی میں ٹیکسیاں چلتی ہیں اس کی، بزنس ہے۔ بابا کو نہیں پتہ تھا کہ یہ فقیر ہے۔ میں لٹ گئی تباہ ہو گئی برباد ہو گئی مجھے دھوکے میں فقیر کے پلے باندھ دیا گیا۔ مجھے بچاؤ بچاؤ۔۔۔۔" وہ چیختی چلاتی رہی اور اس کا شور سن کے فقیروں کی ساری بستی اپنی اپنی جھگیوں جھونپڑیوں سے باہر نکل آئی اور دلہن کی آہ و بکا سن کر سب قہقہے لگانے لگے۔

"اسے افیم کی ایک چٹکی کھلادے عبداللہ۔۔۔۔۔" کسی نے پکار لگائی اور پھر سب زور زور سے ہنسنے لگے۔ ہنسنے والوں میں شیرو بھی تھا اور اس کی بیوی بھی تھی۔ سب آہ و بکا کرتی دلہن کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن مجمع کے پیچھے کھڑے خیرو کی طرف کوئی نہیں دیکھ رہا تھا جو اپنا زخمی جھلسا ہوا اور رستا چہرہ لئے درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔۔۔۔۔!

O

بیگم مکرم روشو کو ناشتے کے بعد اوپر والی منزل میں لے گئیں اور ایک کمرے کی صفائی پر مامور کر دیا۔

چوہدری صاحب کا یہ ایک جہاز نما مکان تھا جس کے دس بارہ کمرے نیچے اور دس بارہ اوپر تھے۔ اوپر والی منزل تو تقریباً بند ہی رہتی تھی چار بیڈ روم سیٹ کئے ہوئے تھے شاید کبھی آباد رہے ہوں لیکن فی الوقت چاروں خالی تھے۔ بیگم ساجدہ کو جب چوہدری صاحب نکاح میں لائے تھے تو اس وقت اوپر والا ایک بیڈ روم چوہدری صاحب اور بیگم صاحبہ کے استعمال میں آتا تھا لیکن چوہدری صاحب کو یہ مختصر سا زینہ طے کرنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی وہ ویسے بھی معمولی حرکت سے ہانپتے تھے۔ زینہ چڑھتے ہوئے ہانپنے لگے تو پھر ڈاکٹر نے بھی ہدایت کی اور خود بھی انہوں نے اپنی بہتری اسی میں سمجھی کہ زینے کا استعمال ہی ترک کر دیں اُس طرح اس کوٹھی کا اوپر والا حصہ ان کے لئے تقریباً ممنوع ہی ہو گیا اور یوں تو نچلی منزل بھی انسانوں کی کمی کی وجہ سے اور دلوں میں فاصلوں کے سبب ویران ہی دکھائی دیتی تھی لیکن اوپری منزل تو بالکل ہی آسیب زدہ ہو گئی۔ حالانکہ کوٹھی کا باہر ہی باہر سے راستہ بھی تھا اور بہت اچھے کرائے پر اوپر والا حصہ اٹھایا جاسکتا تھا لیکن چوہدری صاحب کے پاس پیسے کی اتنی فراوانی تھی کہ وہ کرایہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر مرد کا وجود تو اس احاطے میں ان کے لئے بالکل ہی ناقابل برداشت تھا جس کی وجہ سے کوٹھی کے دونوں حصے غیر آباد سنسان اور آسیب زدہ ہو گئے تھے۔

شمسہ کے ساتھ شادی کے بعد بھی چوہدری صاحب کو اوپر کے بیڈ روم میں شفٹ ہونے کا خیال آیا تھا لیکن جب دو ہی زینے چڑھنے سے ہانپنے لگے تو ارادہ منسوخ کر دیا اور اب تقریباً ایک ماہ سے نیچے والے بیڈ روم میں ایک خود ساختہ قیدی کی حیثیت سے بند تھے تھی شاید گزشتہ رات اسی ٹینشن سے شاہینہ کی گردن میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے بیگم ساجدہ مکرم کو پوری شام اور نصف رات تک اسپتالوں میں خوار ہونا پڑا تھا اور جس کے نتیجے میں روشو ایک نئے کردار کی

حیثیت سے اس کوٹھی میں وارد ہوا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ چوہدری صاحب حسبِ معمول ابھی تک اپنے بیڈروم میں تھے اور دوپہر کا کھانا منگوانے کے لئے انہوں نے ابھی تک گھنٹی نہیں بجائی تھی تاہم خانساماں کچن میں کھانا تیار کر کے حکم کا منتظر تھا ماسی نچلی منزل کی جھاڑ پونچھ کر کے اور کمروں کی سیٹنگ وغیرہ میں بیگم مکرم کا ہاتھ بٹا کے فارغ ہو چکی تھی کوٹھی کے آس پاس جمعدارنی کے جھاڑو دینے کی آواز بند ہو چکی تھی پونچھا لگانے والی اماں پونچھا لگا کر واپس جا چکی تھی شاہینہ چونکہ اسکول نہیں گئی تھی اس لئے طبیعت سنبھل جانے پر وہ اپنا اسکول کا بیگ کھول کے راہداری میں بیٹھی ورق گردانی کرنے میں مصروف تھی اور بیگم ساجدہ مکرم اپنے ہلکے پھلکے کام سے فارغ ہو کر ڈارئنگ روم کے اندر خیالوں میں مگن بیٹھی شدید قسم کے اعصابی دباؤ کے حملے کو روکنے میں مصروف تھی پھر انہیں اچانک خیال آیا کہ روشو کافی دیر سے اوپر گیا ہوا ہے نیا لڑکا ہے چوہدری صاحب کی منشا کے خلاف گھر میں رکھا گیا ہے کہیں کوئی ایسی ویسی بات ہی نہ ہو جائے۔

ایک وسوسہ سا ان کے دل میں پیدا ہوا اور اندر والا زینہ طے کر کے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اوپر چلی گئیں اور جب اس کمرے میں داخل ہوئیں جہاں روشو تھا تو دنگ رہ گئیں روشو نے ہفتوں کے گرد آلود کمرے کو شیشے کی طرح روشن کر دیا تھا اور گرد و غبار کی ایک ہلکی سی تہہ بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی اور اب الماری کے اوپر چڑھا کارنس کی اوپری سطح پر جمی ہوئی گرد صاف کرنے میں مصروف تھا۔ گرد جھاڑنے سے اس کے اپنے کپڑے دوبارہ گرد آلود ہو چکے تھے اور اس کے دانتوں پر بھی گرد کی ہلکی سی تہہ جم گئی تھی۔

"کمال ہے روشو۔۔۔۔ تم نے تو چمکا دیا ہے کمرہ۔" بیگم نے حیرت سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"بس بیگم جی۔۔۔۔ یہ الماری رہ گئی ہے۔" وہ الماری کے اوپر ہی بلی کی طرح بیٹھے بیٹھے بولا۔

"بس فارغ ہو کے اب نیچے آجاؤ۔ شاباش" بیگم نے بالکل اپنے بچے کی طرح روشو کو چمکارا اور ایک خوشگوار مسکراہٹ اس کی طرف بکھیر کے نیچے چلی گئیں۔

بیگم جب نیچے آئیں تو ایک غیر متوقع بات ہو گئی اچانک چوہدری صاحب کے دفتر کی گاڑی کمپاؤنڈ میں آرکی اور چوہدری صاحب کے بیڈروم کی سرخ بتی بجھی، سبز روشن ہوئی اور ساتھ ہی

چوہدری صاحب لباس تبدیل کر کے کمرے سے باہر نکلے ان کے پیچھے پیچھے شمسہ بھی برآمد ہوئی۔ چوہدری صاحب راہداری سے نکلے دھیرے دھیرے اترے کار کی طرف گئے ڈرائیور نے دروازہ کھولا کار میں بیٹھتے بیٹھتے گھوم کر شمسہ کی طرف دیکھا جو کھڑکی کے عقب سے انہیں دکھائی دے رہی تھی چوہدری صاحب نے کپکپاتا الوداعی ہاتھ شمسہ کو دیکھ کر ہلایا شمسہ نے بھی آہستہ سے ہاتھ لہرایا شمسہ کے عقب ہی میں ساجدہ مکرم بھی کھڑی تھیں دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں لیکن شمسہ نے فوراً پلکیں جھکا دیں، اور سر نیچا کر لیا جیسے کوئی دشمن بغیر کسی دفاع اور کوشش کے اپنے حریف کے سامنے ہتھیار پھینک دے۔ اس کی آنکھوں میں اور جھکی ہوئی گردن میں ایک احساس ندامت بہت نمایاں طور پر جھلک رہا تھا۔

شمسہ کو اس گھر میں آئے ہوئے تقریباً تیس دن ہو گئے تھے تیس دن میں کوئی باقاعدہ ملاقات بیگم ساجدہ اور شمسہ کے درمیان نہیں ہوئی تھی نکاح کے بعد بحیثیت دلہن کے پہلے دن جب وہ کار میں بیٹھ کر اس گھر میں وارد ہوئی تھی تو سوائے چوہدری صاحب کے اور کوئی ہمراہ نہیں تھا اس دن راہداری میں جب آمنا سامنا ہوا تو چوہدری صاحب نے ساجدہ بیگم کے ساتھ کھڑے کھڑے سرسری سا تعارف کرایا اور پھر دونوں بیڈ روم میں چلے گئے تھے اس کے بعد ایک دو دفعہ شمسہ چند لمحوں کے لئے کسی ضرورت کے تحت باہر نکلی ہوگی۔ لیکن بیگم سے آمنا سامنا نہیں ہوا پھر اس دوران دو تین مرتبہ چوہدری صاحب کے ساتھ شام کے وقت کمرے سے باہر آئی کچھ دیر دونوں گارڈن میں بیٹھے چہل قدمی کی اور پھر کمرے میں چلے گئے لیکن آج یہ پہلا موقع تھا کہ نکاح کے بعد چوہدری صاحب شمسہ سے جدا ہوئے تھے۔ اور اس طرح شمسہ کو تھوڑی سی تنہائی میسر آئی اور جب بیگم ساجدہ سے نگاہیں چار ہوئیں تو وہ ان کا سامنا کرنے کی جراءت اپنے اندر نہیں پا رہی تھی وہ چند لمحے خاموش سر جھکائے بیگم ساجدہ کے سامنے کھڑی رہی پھر دھیرے دھیرے سے اٹھایا دوبارہ آنکھیں ملائیں اور اپنے لہجے میں جراءت پیدا کرتے ہوئے آہستہ سے کہنے لگی۔

"یقین کیجئے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا"

"کیا.....؟" بیگم ساجدہ نے پوچھا۔

"کہ مجھے کسی دوسری عورت پر سوت بن کے آنا پڑے گا۔" شمسہ نے ندامت سے کہا۔

"کیا تم نے کبھی یہ سوچا تھا کہ تمہیں ایک اسی سالہ بوڑھے کی بیوی بننا پڑے گا۔" بیگم ساجدہ نے کھٹ سے سوال کیا اور جواب میں شمسہ نے نہایت مجبوری اور بے بسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کبھی نہیں۔۔۔۔"

"تم نے یقیناً خوشی کے ساتھ یہ سب کچھ قبول نہیں کیا ہوگا" بیگم ساجدہ نے جیسے شمسہ کو بری قرار دیتے ہوئے کہا۔

"آپ نے بھی خوشی کے ساتھ چوہدری صاحب کو نئی شادی کی اجازت نہیں دی ہوگی۔"

"اجازت۔۔۔۔ ہونہہ" بیگم زہر خند طریقے سے ہنسی۔ "مجھے تو اس گھر میں تمہاری آمد سے پہلے تمہاری آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔"

"لیکن مجھ سے انہوں نے کہا تھا کہ۔۔۔۔"

"چھوڑو ہٹاؤ۔۔۔۔" بیگم ساجدہ نے بات کاٹ کے ختم کرنے کے انداز میں کہا بیگم کو یاد آیا کہ ایک دن چوہدری نے ان سے کہا تھا کہ وہ نئی شادی کرنا چاہتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی وہ اپنی ناکامیوں کو چھپانے کے لئے اکثر نئی شادی کا تذکرہ کر دیا کرتے تھے اس دن بھی چوہدری نے کہا۔

"میں نئی شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔"

بیگم ساجدہ خاموش رہیں تو چوہدری ان کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تمہاری خاموشی نیم رضامندی کے برابر ہے۔" بیگم نے ایک چپ سادھ لی اور خاموشی سے چوہدری کی طرف دیکھنے لگی۔ جس پر چوہدری نے اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مزید خاموشی کا مطلب مکمل رضامندی ہے۔"

بیگم ساجدہ کا خیال تھا کہ بات آئی گئی ہو گئی لیکن تیسرے ہی دن چوہدری صاحب کی گاڑی رکی تو ان کی نئی منکوحہ شمسہ بیگم ہمراہ تھی جس کا سرسری اور رسمی تعارف کرا کے چوہدری صاحب کمرے میں چلے گئے تھے اور اب دونوں سوکنیں روبرو تھیں۔

"آپ یقین کیجئے۔۔۔۔" شمسہ نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہنا چاہا تو بیگم نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری مجبوری کو سمجھتی ہوں۔ یہ سب پیسے کا کھیل ہے۔"

"لیکن میں اس کھیل میں شامل نہیں ہوں ساجدہ بیگم۔" وہ نہایت بے بسی سے بولی۔

"کھیل میں کچھ کھلاڑی ہوتے ہیں اور کچھ مہرے۔" ساجدہ بیگم بولیں۔ "مہرے لاکھ کہیں کہ وہ کھیل میں شامل نہیں لیکن بساط پر وہی ہوتے ہیں۔"

شمسہ چونکی اور ازراہ حیرت کہا "آپ تو کہہ رہی تھیں کہ آپ میرے بارے میں کچھ نہیں

جانتیں۔"

کیا میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی جس سے تمہاری شناخت ہوتی ہے۔" بیگم ساجدہ نے ایک تجربہ کار عورت کی طرح شمسہ کے چہرے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

میری کوئی شناخت نہیں میں ہار اور جیت کا فیصلہ ہوں۔" شمسہ آبدیدہ ہوگئی پھر اس سے ضبط نہ ہوسکا ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور وہ بیگم ساجدہ کے آگے اس طرح جھک گئی جیسے وہ ہمدرد بہن یا ماں ہو۔

"کس نے کرائی ہے تمہاری شادی۔" بیگم ساجدہ نے شمسہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"پاشا کو جانتی ہیں آپ۔۔۔۔" شمسہ بولی۔

"پاشا۔۔۔۔۔!!" بیگم مکرم چونکی۔

"کیا آپ جانتی ہیں اسے۔۔۔۔۔" شمسہ نے دوبارہ پوچھا۔

"پاشا کو کون نہیں جانتا۔۔۔۔ہاہاہا۔"

"اچانک ایک اوباش نوجوان پاشا راہداری سے نمودار ہوا اور قہقہہ لگا کر پکارا اس وقت اس نے روشو کو ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا اور وہ ڈیٹوں کی طرح ہنستے ہوئے بولا۔" اس گھر کے اندر ایک ہی مرد ہے جسے جانتے ہیں لوگ۔۔۔۔ہاہاہا۔۔۔۔ چل اوئے بلونگڑے۔" اس نے روشو کو باہر کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ دونوں خواتین پر جیسے سکتہ سا طاری ہوگیا روشو اس کے بازوؤں میں کسمسا رہا تھا۔

"پاشا۔۔۔۔" بیگم چوہدری نے رعب دار آواز میں پکارا پاشا ایک لمحے کے لئے رکا "کہاں لے جارہا ہے اسے" بیگم نے پوچھا۔

"تھانے۔۔۔۔۔!" پاشا نے جواب دیا۔

"تم اسے تھانے نہیں لے جاسکتے۔۔۔۔۔" بیگم چوہدری نے جیسے حکم دیتے ہوئے کہا

"یہ چوہدری صاحب کا حکم ہے۔" پاشا نے جواب دیا اور روشو گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔

۵

پاشا جب روشو کو بغل میں دبوچ کر باہر کی طرف لپکا تو بیگم نے ایک بار پھر جیسے اسے آخری تنبیہ کے انداز میں پکارا۔

"پاشا۔۔۔۔۔؟"

"پاشار کا اور ایک بار پلٹ کے سوالیہ انداز میں بیگم کو دیکھنے لگا۔

"میں آخری بار تم سے کہہ رہی ہوں کہ اس بچے کو چھوڑ دو۔۔۔۔" وہ للکار کر بولیں۔

"اور اگر میں نے نہ چھوڑا تو۔۔۔۔۔۔؟" اس نے دھمکی کو مسترد کرنے کے لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر مجھے زبردستی کرنی پڑے گی"۔

"زبردستی بھی کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"ہاں۔۔۔۔۔" وہ اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں اور پھر راہداری میں رکھے ہوئے انٹر کام کی طرف بے اختیار لپکیں اور بغیر کسی تامل کے ریسیور اٹھا کے گیٹ کے باہر پہرہ دینے والے بوڑھے چوکیدار سے تحکمانہ لہجے میں مخاطب ہوئیں۔

"بابا۔۔۔ گیٹ باہر سے بند کر دو اور کسی کو اندر سے نکلنے نہیں دینا" ۔۔۔۔ انہوں نے قدرے توقف کیا اور پھر کہنے لگیں "ہاں، ہاں اس کو بھی کسی کو رعایت نہیں دینی اور خاص کر اس بچے کی حفاظت کرنا روشو کی۔ وہی جو نیا آیا ہے اس گھر میں"۔ یہ کہہ کر بیگم نے ریسیور رکھا اور معنی خیز انداز میں پاشا کی طرف دیکھنے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ "اگر ہمت ہے اب گیٹ سے باہر نکل کر دکھاؤ"۔

پاشا سناٹے میں آگیا اسے غالباً بیگم ساجدہ سے ایسے انتہائی اقدام کی توقع نہیں تھی کچھ سوچ

کر اس نے روشو کو نیچے پٹک دیا اور قدرے تیز ہو کر چوہدری صاحب کی نئی نویلی دلہن شمسہ کی طرف دیکھنے لگا۔ شمسہ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو وہ بیگم ساجدہ اور پاشا کو ان کے حال پر چھوڑ کر دبے قدموں بیڈ روم میں چلی گئی۔ پاشا دھیرے دھیرے، میڑھا میڑھا چلتا ہوا، بیگم کے قریب آیا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر انتہائی غنڈوں والے انداز میں بولا۔

"دیکھو پھڈا مت کرو میرے ساتھ"۔

"اپنی زبان درست کرو۔ بیگم نے سخت گیر لہجے میں کہا۔

"سنیئے بیگم صاحبہ-----" پاشا اپنی زبان اور لہجہ درست کرتے ہوئے مہذب انداز میں بولا۔ "میرا مقصد اس لڑکے کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ چوہدری صاحب کا حکم ہے کہ اس کی تصویر بنا کر مکمل کوائف کے ساتھ تھانے کے ریکارڈ میں رکھی جائے اور یہ کوئی بری بات نہیں اور نہ ہی اس پر آپ کو اعتراض ہونا چاہئے۔ اس میں آپ کا بھلا ہے کہ کل کلاں"------

"اگر یہ بات ہے تو یہ رہی تصویر"۔ انہوں نے اپنے پرس سے ایک تصویر نکال کر پاشا کو دی۔ یہ میں نے صبح ہی اپنے پولورائڈ کیمرے سے بنائی ہے کوائف کی ضرورت نہیں، یہ تصویر تم تھانے کے ریکارڈ میں رکھوا سکتے ہو"۔

"اتنی سی تو بات تھی ساری------" وہ تصویر اپنے قبضے میں کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ اور پھر ہاتھ کا اشارہ کر کے مسخروں کے انداز میں گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ بیگم انٹر کام کی طرف گئیں اور چوکیدار کو نیا حکم دیتے ہوئے بولیں۔

"بابا----گیٹ کھول دو-------"

"شکریہ------ پاشا مسکرا کر بولا۔ اور لفنگوں کی طرح بیگم کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔

بیگم ساجدہ اس کی اس حرکت کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے روشو کی طرف بڑھیں اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر لے آئیں۔ "آجاؤ بیٹے---"

○

صبح صبح تیاری کا وقت تھا۔ کشکول جھونپڑی کے اندر سب سے اونچا لٹک رہا تھا۔ شیرو کو جدی پشتی فقیر ہونے کے ناتے اس خاندانی کشکول سے کچھ زیادہ ہی انس اور عقیدت تھی اور وہ ہر روز صبح گھر سے نکلنے سے قبل اسے بڑے احترام سے اتارتا، چھوتا، چومتا، آنکھوں سے لگاتا اور پھر واپس اپنی اونچی جگہ پر ڈوری کے ساتھ لٹکا دیتا۔

"تم اسے گلے میں کیوں نہیں ڈال لیتے ہو۔۔۔۔۔۔؟" بختو پوچھتی۔

"پاگل ہو تم یہ تبرک ہے آج کل کون گلے میں ڈالتا ہے کشکول"۔ شیرو جواب دیتا۔

"پہلے تو ڈالتے تھے۔۔۔۔۔" بختو بولی۔ "تمہارا خاندانی کشکول ہے"۔

"پہلے کی اور بات تھی۔ اب پہلے والی کونسی بات رہ گئی ہے۔" شیرو ازراہ تاسف کہتا۔۔۔۔

۔" پہلے ایک ایک پائی پھینکتے تھے لوگ کشکول میں اور ہر پائی کے ساتھ ٹھاہ کر کے آواز آتی تھی چھنکایا کرتے تھے ہمارے بزرگ ریز گاری۔" شیرو اپنے بزرگوں کو یاد کر کے کہتا"۔ کیا مجال تھی کہ چھنکار سن کر کسی گراہک کے قدم آگے بڑھیں بھر جاتا تھا کشکول لیکن کل دو تین روپے کی ریز گاری بنتی تھی۔۔ ۔۔۔ بس اتنی ہی سماتی تھی اس میں"۔

"دو تین روپے سے کیا ہوتا ہے آج کل"۔ بختو حیرت ظاہر کرتی۔

"کچھ نہیں ہوتا دو تین روپے سے۔ لیکن اس زمانے میں بڑی برکت تھی پیسے میں سچ سچ"۔ وہ افسوس کرنے لگا۔

"اب پیسے میں برکت نہیں رہی۔ اب ریز گاری نہ کوئی لیتا ہے نہ دیتا ہے۔ روپے دو روپے تو کوئی چیز نہیں رہے۔ ڈھیروں پیسے ہیں فقیروں کے پاس لیکن برکت بالکل نہیں رہی پیسے میں"۔

"ہاں یہ تو ہے۔۔۔۔!" بختو اتفاق کرتی۔ "اب برکت بالکل نہیں رہی پیسے میں"۔

"یہ سب کشکول چھوڑنے کا نتیجہ ہے۔" وہ عقیدتاً کہتا "کشکول چھوٹا، برکت بھی گئی۔ ہمارے بڑے اشرفیاں تک لے کے آتے تھے"۔

"کہتے ہیں تیرا دادا گلے میں ڈالتا تھا اسے۔۔۔۔" بختو نے شیرو کے ماضی کو کھنگالا۔

"دادا نہیں پر دادا۔" شیرو بولا۔ "اور اسے گلے میں ڈال کے اکبر بادشاہ کے دربار جایا کرتا تھا پر دادا میرا"۔

"اکبر بادشاہ کے دربار میں؟ وہ چونکی" پھر تو تم شاہی فقیر ہوئے شیرے"۔

"اور کیا سمجھتی ہو تم۔۔۔۔" وہ تن کر بولا۔ "تجھ جیسی کم نسلی سے بیاہ کر لیا تو کیا میرا حسب نسب بھی خراب ہو گیا کیا؟"

"اب لگے بک بک کرنے۔۔۔۔" وہ اکھڑتی۔ "جانتی ہوں تیرے سارے حسب نسب کو۔

"اچھا چل چل، جلدی جلدی تیار ہو جا۔۔۔۔" شیرو کہتا اور دونوں تیاری میں لگ جاتے۔

اشارے، کنائے، چھیڑ چھاڑ ہنسنا بولنا ایک دوسرے کو گالیاں دینا کبھی غصے سے کبھی پیار سے۔ یہ ان کا معمول تھا دونوں نے ایک دوسرے کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔

اس دن بھی حسب معمول صبح صبح کشکول کے سامنے میں گھر کے فقیر تیاری میں مصروف تھے۔ شیرو تو خیر سدا بہار فقیر تھا ہر وقت تیار رہنے والا۔ اس نے دو چار بیٹھکیں نکالیں، دو چار مرتبہ اپنی ٹانگ کو لنگڑانے اور بازو کو ٹنڈا کرنے کی معمول کے مطابق ریہرسل کی جس میں اسے بہت مہارت ہو گئی تھی پھر اس نے خیرو کی طرف دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا۔ خیرو بھی بالکل تیار تھا۔ ہر چند کہ رات بھر وہ درد کے مارے روتا رہا تھا۔ اس کا زخموں سے بھرا چہرہ بری طرح رس رہا تھا لیکن شیرو نے جان بوجھ کر اسے تڑپنے اور رونے دیا تاکہ وہ دن میں ٹھیک سے سو سکے۔ پھر اس نے سحری کے قریب اسے افیم کی ایک چٹکی کھلا دی اور خیرو صبح کی پہلی کرن کے طلوع ہوتے ہی بے خبر سو گیا تھا تب شیرو نے معمول کے مطابق کشکول کو احترام کے ساتھ اتارا، چھوا، چوما اور آنکھوں سے لگا کے واپس اپنی جگہ لٹکا دیا۔

"ہاں بھئی تیار ہو جاؤ۔۔۔۔۔۔"۔ اس نے ایک زور سے دھپ بختو کے کولھے پر مارتے ہوئے کہا۔

"میں تیار ہوں۔۔۔۔۔" وہ تن کر بولی۔

"یہ تیار ہو تم۔۔۔۔۔؟" شیرو نے بیوی کے سراپے کا بھرپور جائزہ لیا۔ اور بیل کی طرح نتھنے پھیلاتے ہوئے بولا۔

"او بد بختی تیری گوری چمڑی چاندنی کی طرح چمک رہی ہے اپنی سنہری کلائیاں دیکھ چہرہ کیسے دمک رہا ہے اور تو کہتی ہے کہ میں تیار ہوں"۔

"تو میں کیا کروں، چمڑی میری ہے ہی ایسی۔۔۔۔۔" وہ بے بسی سے لیکن اپنے گورے جسم پر ناز کرنے کے انداز میں بولی۔

"ارے چمڑی سب فقیرنیوں کی ایسی ہی ہوتی ہے۔ تیرے سے زیادہ چمکدار ہے شاداں"۔ وہ طنزیہ انداز سے بولا۔

"دھت۔۔۔۔" وہ نفرت سے بولی

"دھت کیا۔۔۔۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ "تو غسل بہت زیادہ کرنے لگی ہے آج کل رگڑ رگڑ کے اتارتی ہے میل بدن سے تاکہ تیری چمڑی گوری ہو جائے شاداں سے زیادہ گوری نہیں ہے تو۔۔۔۔ رگڑتی رہتی ہے"۔

"اوے کھا خسماں کا سر-----" وہ بگڑنے لگی۔ "کہاں رگڑتی ہوں صبح سے یہ وقت آگیا ہے میل لگانے -------- میرے اندر کیڑے دکھائی دیتے ہیں۔ شاداں کی تجھے نہ میل نظر آتی ہے نہ ستھرائی------" وہ شاداں کے نام پر ایک دم اکھڑ سی گئی تھی------ "شاداں، شاداں، شاداں، خبردار جو اس کا نام لیا میرے سامنے"۔

"اچھا اچھا ناراض نہ ہو-----" وہ صلح صفائی کرتے ہوئے بولا۔ "بس تھوڑا سا اور منہ کالا کر لے"۔

"اس نے مٹی ملے تیل میں انگلیاں ڈبوئیں اور بختو کے دمکتے چہرے پر لگادیں۔ "بس اب ٹھیک ہے۔ وہ مطمئن ہو کر بولا۔ بختو کے چہرے کو مٹی اور تیل کے نشانات نے ٹھیک ٹھاک مسخ کر دیا تھا۔

"ہونہہ----- ٹھیک ہے"۔ اس نے طاق پر پڑا آئینے کا چھوٹا سا ٹوٹا ہوا ٹکڑا اٹھا کے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھوبصورتی کا تو دشمن ہے تو"۔ وہ شیرے کو گھورنے لگی۔

"ارے مولا قسم اب تو پہلے سے زیادہ کھوبصورت لگ رہی ہے۔ ہی ہی ہی------" وہ خیرو کو بختو کی گود میں ڈال کر بولا۔ "لے سنبھال"۔

"میں دو بجے تک اٹھاؤں گی اسے-----" بختو خیرو کو کندھے سے لگاتے ہوئے بولی۔ "اس کے بعد تو لے لینا"۔

"اس کے بعد سلیماں دیکھے گی کیا-----" شیرو اس کی دکھتی رگ پکڑتے بولا اور جواب میں بختو نے ایسی غصیلی نظروں سے دیکھا کہ جیسے وہ خیرو کو بھی زمین پر پٹک دینا چاہتی ہو۔ "ہاں ہاں دیکھوں گی سلیماں کیا کرے گا تو وہ بگڑی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے"۔ وہ معاملے کو بگڑنے سے بچاتے ہوئے صلح کن لہجے میں بولا۔ "میں دو بجے تجھے سگنل پر مل جاؤں گا"۔

"اب کہاں جارہے ہو------؟" بیوی نے پوچھا۔

"اسی کام پر جارہا ہوں۔ تیرے لخت جگر کو ڈھونڈنے-----۔ ایک دفعہ مل جائے مجھے چمڑی نہ ادھیڑ دوں تو شیرو نام نہیں"۔ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ اور تینوں جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔

صبح صبح کا وقت تھا تمام فقیر حلیے بگاڑے اپنی اپنی جھونپڑیوں اور کواڑوں سے باہر نکل رہے تھے۔ ہر عمر کے فقیر، بچے، بوڑھے، جوان، ادھیڑ عمر عورتیں، مرد ایک مچھلی بازار بنا ہوا تھا دھکم پیل ہو رہی تھی جیسے کسی بڑے طویلے سے بھینس بھینسے، گائے، بیل، کٹے کٹیاں، بچھڑے بچھڑیاں، بھیڑ بکریاں نکل رہی ہوں!

○

آج چوہدری صاحب پھر کچھ دیر کیلئے باہر چلے گئے تھے اور شمسہ پھر بیگم ساحدہ کے پاس آن بیٹھی، اس دن بھی وہ ساحدہ بیگم سے بات چیت کرنے کے موڈ میں تھی لیکن پاشا کی آمد سے ایک دم ماحول میں تلخی پیدا ہو گئی اور بیگم کا موڈ بھی خراب ہو گیا تھا۔

"ایک بات بتائیے-----" شمسہ نے بیگم کو اعتماد میں لیتے ہوئے سنجیدگی پوچھا۔ "آپ چوہدری صاحب سے بھی اڑ گئیں ہیں پاشا کو بھی ڈانٹ پلادی------ یہ آپ نے واقعی اس لڑکے روشو کیلئے کیا تھا یا پھر مجھ پر غصہ تھا وہ اتارا تھا"۔

"ہونہہ-----پاگل ہو"۔ بیگم ہنسی۔ "تم پر مجھے کوئی غصہ نہیں بلکہ تم پر مجھے ترس آرہا ہے"۔

ٹھیک کہتی ہیں آپ------" شمسہ مغموم ہو گئی۔ "مجھ پر ترس ہی آنا چاہئے۔ میں ترس ہی کے نتیجے میں آج یہاں ہوں۔"

وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی تو بیگم ساحدہ ہمہ تن گوش ہو گئیں جیسے وہ شمسہ سے بہت کچھ سننا چاہتی ہوں۔

"ہاں بولو-----کیا ہوا؟" بیگم ساحدہ نے شمسہ کی خاموشی کو توڑنا چاہا۔ "کیسے ملاقات ہوئی تھی"۔

"بس قسمت گھیر گھار کے لے آئی-----" شمسہ بولی۔ "جس طرح ہانکے والے شکار گھیر گھار کے شکاری کے آگے پھینکتے ہیں مجھے اسی طرح راتب بنا کے چوہدری کے آگے ڈالا گیا"۔

"اف میرے اللہ"-----بیگم ساحدہ اندر ہی اندر شمسہ کے لہجے پر چونکی۔ "راتب----"

"ماں باپ مر گئے تو میں آوارہ بھائی کے رحم و کرم پر رہ گئی-------" شمسہ نے کہنا شروع کیا۔ "والدین نے پیچھے ٹھیک ٹھاک رقم اور چھوٹا موٹا کاروبار چھوڑا تھا لیکن میرے

بھائی نے سب کچھ نشے جوئے اور عیاشی میں پھونک ڈالا۔ رقم خرچ کر ڈالی کاروبار تباہ کر دیا پھر مکان کے اندر جوئے کا اڈہ بنا لیا۔ یہی اڈہ اس کا ذریعہ معاش تھا جہاں شہر کے لوگ آتے اور کئی کئی راتیں طویل بیٹھک چلتی ......"

"چوہدری صاحب تمہارے ہی گھر جوا کھیلنے جاتے تھے ...." بیگم نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں ...." شمسہ بولی۔ "لیکن میرا چوہدری صاحب یا کسی اور سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ میں تو صرف اپنے بھائی سے واسطہ رکھتی تھی جس نے مجھے پناہ دے رکھی تھی اور جو مجھے کھانے کو دیتا تھا لیکن جس نے مجھے بہن سمجھ کے بہنوں کی طرح رخصت کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں وہ ایک جواری تھا لیکن ایسا جواری جس کی قسمت میں ہار ہی لکھی تھی جیت نہیں"۔

"جوئے میں ہار ہی ہار ہوتی ہے شمسہ جیت کسی کی نہیں ہوتی"۔ بیگم ساجدہ نے فلسفہ بولا

"کیوں نہیں ......؟" شمسہ نے اختلاف کیا۔ "چوہدری صاحب نے مجھے چاہا اور پیسے کے زور سے خرید لیا یہ جیت نہیں ہے کیا"۔

"نہیں ....." بیگم ساجدہ فوراً بولیں۔ "کیا چوہدری صاحب نے تمہیں فتح کر لیا ہے؟" بیگم ساجدہ نے پوچھا اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولیں۔ "نہیں ہرگز نہیں۔ وہ تمہیں جیت کر بھی ہارا ہے۔ وہ اس وقت عمر کے جس حصے میں ہے وہاں عورت اس کے لئے کسی پہاڑ کی چوٹی کی طرح ہے جس پر وہ اپنی کامیابی کا جھنڈا کبھی نہیں گاڑ سکتا وہ اس پہاڑ کے دامن میں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتے مارتے کسی دن مر جائیگا"۔

"پھر وہ دوسروں کی زندگی برباد کرتا ہے۔ کیوں کس لئے کی ہے شادی اس نے"۔ شمسہ چڑ کر بولی۔

"ہونہہ ......" ساجدہ بیگم ہنس دیں۔ "پتہ نہیں تمہیں شاعری سے دلچسپی ہے یا نہیں لیکن غالب کا یہ شعر ضرور سنا ہوگا۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ پیسے کی دنیا ہے۔ یہاں لوگ چیزیں اپنی ضرورت کے تحت حاصل کرتے ہیں"۔
شمسہ شعر سن کر زہر خند طریقے سے ہنس دی۔ کہنے لگی "شعروں سے مجھے دلچسپی نہیں لیکن

میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ چوہدری صاحب کے صرف ہاتھ میں ہی جنبش رہ گئی ہے۔ آنکھ میں دم نہیں ہے قریب کی چیزوں کو بھی وہ ٹٹول کر دیکھتا ہے۔"

"شادی کیسے ہوئی------" بیگم ساجدہ پھر حرف مدعا پر آگئی۔

"جیسا کہ میں نے بتایا ہمارے مکان پر جوا لگتا تھا قالین اور ہنڈی کرافٹ کے بزنس میں،

کسٹم اور ایکسائز کے افسر اور دوسرے بڑے بڑے کاروباری لوگ جمع ہوتے تھے ان میں چوہدری صاحب بھی تھے"۔ شمسہ بولنے لگی------

"جوا چلتا گیا اور میرا بھائی ہارتا چلا گیا،۔ جو رقم پلے تھی وہ ہار گیا۔ ماں کے جو زیورات تھے وہ دے بیٹھا میرا گہنا اتارا پھر مکان رہ گیا وہ گروی رکھا۔ اور جب کچھ نہیں رہا تو ادھار مانگنے لگا جیتنے والے نے کہا کہ جوئے میں ادھار نہیں چلتا نقد کی بات کرو کپڑے جھاڑ کے کہنے لگا اب میرے پاس نقد کچھ نہیں ہے لیکن جیتنے والے نے کہا تیرے پاس بہت بڑا کیش-----اب بھی-----ہے تیری بہن"۔ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"تمہارے بھائی نے یہ بات خاموشی سے سن لی" بیگم ساجدہ نے پوچھا۔

"نہ صرف خاموشی سے سن لی بلکہ خاموشی سے مجھے داؤ پر بھی لگا دیا۔" شمسہ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "اس کا خیال تھا کہ اگر داؤ وہ جیت گیا تو میں بھی گھر میں رہ جاؤں گی۔ قرض بھی اتر جائے گا مکان بھی واپس مل جائے گا لیکن وہ بد نصیب آخری داؤ بھی ہار گیا-----" وہ کہتے کہتے رکی تو ساجدہ بیگم نے پوچھا۔

"جیتنے والا چوہدری مکرم تھا کیا-----"

"نہیں-----" شمسہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "آغا صفدر-----نوادرات کا مشہور تاجر"۔

"تو پھر چوہدری کے قبضے میں کس طرح آئی ہو تم---" ساجدہ بیگم نے تجسس سے پوچھا اس سے پیشتر کہ شمسہ جواب دیتی اچانک گیٹ پر آہٹ ہوئی۔

"آگیا------"۔ شمسہ گاڑی کی آواز سن کر ایک دم چونکی۔ چوہدری کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ جو پورچ کے قریب آکر رک گئی ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ چوہدری گاڑی سے باہر آیا اور کوٹھی کی کھڑکیوں کی طرف نگاہ دوڑا کر اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کی اور پھر مرکزی دروازے کی طرف آگے قدم اٹھایا۔ بوڑھے گیٹ کیپر نے گیٹ کھلا رکھا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی ریورس لے

کر باہر نکالی تو گیٹ بند ہو گیا۔ شمسہ ڈرائنگ روم کا پردہ تھوڑا سا سرکا کے دیکھ رہی تھی۔ چوہدری مرکزی دروازے سے داخل ہو کر سیدھا اپنے بیڈ روم کی طرف گیا اور پھر بغیر کسی تامل کے اس نے گھنٹی بجادی۔ ظاہر ہے یہ اس کا اپنی نئی نویلی دلہن شمسہ کیلئے بلاوا تھا۔

"میں چلوں-----" وہ بیڈ روم کی طرف جانے کیلئے بڑھی۔

بات ادھوری رہ گئی-------" ساجدہ بیگم نے تشنگی سے کہا۔

" پھر سہی-------" شمسہ بولی۔" ذرا دیر ہو گئی تو غرانے لگے گا"۔ وہ انتہائی نفرت سے بولی اور اس کے چہرے پر ایک بیوہ کے سے چہرے کی اداسی اور پژمردگی چھا گئی وہ اس طرح بیڈ روم کی طرف جا رہی تھی جیسے کوئی قیدی پھانسی گھاٹ کی طرف جا رہا ہو۔

○

روشو کیلئے کوٹھی کا اب کوئی بھی حصہ ممنوع یا اجنبی نہیں رہا تھا۔ سوائے ایک چوہدری صاحب کے بیڈ روم کے. جہاں چوہدری صاحب نے نہ کبھی اسے بلایا اور نہ اسے وہاں جانے کی نوبت آئی۔ پہلے دن کے بعد تو اس کا چوہدری صاحب سے آمنا سامنا ہی نہیں ہوا۔ ویسے بھی وہ ذہین لڑکا تھا اس نے روز اول ہی کو جب محسوس کیا کہ چوہدری صاحب اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے چوہدری اور بیگم میں مزید ٹھن بھی گئی ہے تو وہ خود بھی بچ بچا کے رہنے لگا۔

تاہم اب وہ اتنا فعال ہو گیا تھا کہ اس نے گھر کو مسخر کر لیا بیگم کے سارے کام بیٹھے بٹھائے کر دیتا تھا۔ دو ہی دن میں اس نے کپڑوں میں استری کرنا سیکھ لی تھی اور وہ بیگم کے کہے بغیر شاہینہ کے کپڑوں میں استری کر کے ہینگر پر لٹکا دیتا تھا۔ صبح جب شاہینہ اسکول جانے کی تیاری کرنے لگتی تو روشو نے اس کے جوتوں پر پالش کر رکھی ہوتی اور یونیفارم استری شدہ ہوتی اس نے کوٹھی کے اوپر والے تمام کمرے جھاڑ پونچھ کے اپنے نام کی طرح روشن اور صاف کر دیئے تھے اور بیگم جب کمروں سے تھوڑی دیر کیلئے پردے ہٹا دیتی تو کمرے روشنی سے جھلمل جھلمل کرنے لگتے اور دیکھنے والے کو یقین نہیں آسکتا تھا کہ یہ صفائی گندے رہنے والے فقیروں کے خاندان سے آئے ہوئے کسی لڑکے نے کی ہے۔ چوہدری صاحب کو چھوڑ کر اس نے گھر کے تمام افراد کو اپنی محنت، کام کاج، لگن اور خلوص کے ذریعے گرویدہ بنا لیا تھا اور سب کا ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ وہ کچن میں جا کے خانساماں کا ہاتھ بٹاتا۔ وقت ملتا تو لپک کے آتا اور کمروں کے پردے اور بستر ٹھیک کرتی

ماسی کی مدد کرتا اور اس کے ساتھ مل کر بیڈ سیٹ تبدیل کراتا۔ بوڑھے چوکیدار کی نسوار یا بیڑی ختم ہو جاتی تو لپک کے اسے سامنے گلی والے اسٹور سے لا دیتا۔ مالن جب پودوں کے کتر بیونت کرتی یا پانی دے رہی ہوتی تو وہ اس کے ساتھ مل کے کام کرتا یہاں تک کہ کوٹھی کے آس پاس جھاڑو لگانے والی بھنگن کی بھی جتنی مدد ہو سکتی تھی وہ کرتا۔ اور جب دوپہر کو آرام کرنے کا وقت ہوتا وہ آرام کرنے کی بجائے کسی بندر کی طرح کوٹھی میں لگے ناریل کے درختوں کی چوٹی پر چڑھ جاتا اور بیگم ساجدہ کیلئے ناریل توڑ کے لاتا۔ بیگم ساجدہ اور شاہینہ دونوں کو کچے ناریل بہت اچھے لگتے تھے اور شاہینہ خاص طور پر ناریل کا پانی بہت شوق سے پیتی تھی۔ یہ ناریل درختوں پر لگے رہتے لیکن ان کو اتارنے والا کوئی نہیں تھا ناریل بیچنے والے کئی دکاندار کوٹھی کی چار دیواری سے باہر کھڑے ہو کر ان ناریلوں کو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے اور بوڑھے چوکیدار کے ذریعے پندرہ سے بیس بیس روپے تک فی ناریل کی پیشکش کرتے لیکن چوہدری صاحب کے یہاں پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی بوڑھے چوکیدار میں اتنی ہمت تھی کہ وہ پیشکش اندر پہنچاتا تاہم روشو کے آنے کے بعد ناریل گھر میں بہت عام ہو گئے تھے بھنگن بھی کبھار ہی تھی مالن بھی، چوکیدار بابا بھی، ماسی خود بھی کھاتی اور اپنے پیچھے والوں کو بھی بھجواتی۔ پھر بھی روشو اتار کے اتنے سارے لے آتا کہ آٹھ دس دانے گودام میں پڑے ہی رہتے ہفتہ دس دن کے اندر روشو کی ہیبت بدل گئی تھی بیگم ساجدہ اس کے اکھٹے چار چھ جوڑے کپڑوں کے لے آتی تھی اور ہدایت کی تھی کہ صاف ستھرا رہا کرے فقیر کا بیٹا ہونے کے باوجود وہ خود بھی صفائی پسند تھا۔ ہر روز نہاتا بلکہ وقت ملنے پر بعض اوقات دن میں دو مرتبہ بھی نہا لیتا۔ روزانہ کپڑے تبدیل کرتا صاف ستھرے کپڑے، جوتوں پہ پالش اور بالوں میں کنگھی کر کے رکھتا۔ کھانے کو بھی اسے اچھے سے اچھا ملتا۔ بیگم کا رویہ اس کے ساتھ اپنے بچوں کا سا تھا وہ اسے اپنے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا کے کھلاتی۔ بلکہ روشو خود ہی کچن سے کھانے کی ڈشیں لے کر آتا اور سب کو سرو کرنے کے بعد اپنے لئے بھی خود ہی کھانا نکالتا۔ یہ سب کچھ اس کے لئے اس کی توقع سے زیادہ تھا اس کی امیدوں سے زیادہ اس کو ایسا گھر ملا تھا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا جیسے ایک خیال اور خواب کی دنیا ہو لیکن یہ سب کچھ اس کیلئے کافی نہیں تھا۔ اس نے اپنے ظالم اور بے حس اور بے رحم باپ کو اور اپنی ممتا سے خالی ماں کو اس لئے نہیں چھوڑا تھا کہ وہ جھوٹی روٹی کی جگہ پکی روٹی کھانے لگ جائے بلکہ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا کچھ بننا چاہتا تھا پڑھ کے کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا کہ آگے چل کر وہ ان لڑکوں کی طرح ہو جو بڑے ہو کر کچھ بن جاتے ہیں اور جن کے بارے میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کہتا کہ بچے قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں اور قوم کا مستقبل ہوتے ہیں

اور انہی میں سے کوئی وزیر، کوئی سفیر، کوئی انجینئر، کوئی ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔" وہ چونکا۔۔۔اسے وہ ڈاکو یاد آ گئے جن کے قبضے میں اس نے رات گزاری تھی اور جو ڈاکٹر بھی تھے اور انجینئر بھی تھے۔

"یا اللہ یہ کیسی دنیا ہے۔۔۔۔۔۔" وہ سوچنے لگا۔ "فقیروں کی بستی کے اندر رہ کر تو اس دنیا کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ یہاں کیا کیا ہو رہا ہے کیسے کیسے لوگ کیا کیا کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔"

"کیا سوچ رہے ہو۔۔۔۔۔؟" اچانک بیگم کی آواز اس کے کان میں پڑی تو وہ چونکا۔ "اتنی گہری سوچ جیسے کوئی فلاسفر ہوتا۔۔۔۔۔۔کیا بات ہے بیٹے۔۔۔۔۔" بیگم نے ازراہ محبت ممتا بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا میں پڑھوں گا نہیں جی۔۔۔۔۔۔۔؟؟" اس نے قدرے ہچکچاہٹ سے پوچھا اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اگر زندگی میں کوئی بڑا کام کرنا ہے تو وہ پڑھے بغیر نہیں کر سکتا۔

"کیوں نہیں پڑھو گے تم۔۔۔۔۔۔۔؟" بیگم نے ہمت افزاء لہجے میں جواب دیا"۔ ابھی تو تمہیں آئے ہوئے ہی مشکل سے دس بارہ دن ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔" وہ کچھ نہ بولا۔ اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ایسا کرو"۔ بیگم بولی۔ "تم فی الحال شاہینہ کے پاس شروع کے قاعدے پڑھنے شروع کر دو تا کہ جب تمہیں کسی اسکول میں داخل کریں تو کم از کم اے بی سی تو آتی ہو۔۔۔۔"

"ٹھیک۔۔۔۔۔!" بیگم نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"ٹھیک۔۔۔۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اگلے دن وہ شاہینہ کے پاس اے بی سی پڑھ رہا تھا۔ جو اس نے دو ہی دن میں ساری زبانی یاد کر لی تھی اور شاہینہ اسے پکا کرا رہی تھی۔

"پڑھو اے۔۔۔۔۔" شاہینہ نے کہا۔

"بی۔۔۔۔" روشو نے اس سے آگے کہا۔

"کہو اے، بی۔۔۔۔" شاہینہ نے کہا۔

روشو بولا۔ "سی ڈی"۔

شاہینہ ہنس دی کہنے لگی اچھا کہو۔۔۔۔۔ "اے بی سی ڈی"۔

"ای ایف جی ایچ۔۔۔۔۔" روشو جھٹ بولا۔ شاہینہ کا قہقہہ نکل گیا بیگم بھی ہنسی نہ روک سکیں

"کہو اے بی سی ڈی ای ایف جی ایچ۔۔۔۔۔" شاہینہ نے پوری پٹی دہرائی اور روشو کھٹ

سے جواب دیتے ہوئے بولا۔

"آئی، جے، کے، ایل، ایم، این، او، پی۔۔۔۔۔

بیگم بہت خوش ہوئیں اور شاہینہ بھی سراہتے ہوئے بولی۔

"اب جو آگے ہے وہ بھی پڑھ دو"۔ اور باقی ماندہ حروف بھی روشو نے فر فر سناتے ہوئے ایک ہی سانس میں کہا۔

"کیو، آر، ایس، ٹی، یو، وی، ڈبلیو، ایکس، وائی، زیڈ۔۔۔۔۔۔" اور پھر "زیڈ" کہہ کر اس نے اس طرح بری الذمہ ہو کے دامن جھاڑ دیا جیسے ایک بہت بڑا مرحلہ طے کر لیا ہو۔

اس دن وہ بہت خوش تھا اور رات اسے بڑی خوشگوار لگ رہی تھی اور بڑی پر سکون نیند اسے آئی تھی لیکن اس رات کو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے اس کے سارے خواب، امیدیں اور سکون کو ملیامیٹ کر دیا۔ وہ انیکسی کے اسی کمرے میں سوتا تھا جو خانساماں کے کمرے کے ساتھ ملحق تھا اور اس کی عقبی کھڑکی بنگلے کی چار دیواری کی طرف کھلتی تھی جہاں گھنے درختوں کے نیچے باہر کی طرف دن کے وقت بھی خاصی تنہائی سناٹا اور کسی حد تک آسیب زدگی کا سا عالم رہتا تھا۔ بیگم نے پہلے ہی دن اس سے کہہ دیا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے تمام کھڑکیاں، دروازے اچھی طرح بند کر کے چیک کر لیا کرے۔ لیکن پتہ نہیں اس رات وہ عقبی کھڑکی کس طرح کھلی رہ گئی روشو اس وقت کچھ نیم خوابی کے عالم میں تھا جب اس نے اچانک کھڑکی کی جانب آہٹ محسوس کی اس نے نیند سے بوجھل ہوتے پپوٹے کھولے تو دیکھا کھڑکی کا پٹ دھیرے دھیرے کھل رہا ہے اور ایک ہیبت ناک سایہ اس میں سے نمودار ہوا۔ گندا، غلیظ، قوی ہیکل انسان، میلے کچیلے کپڑے، مٹی اور میل سے الجھے سر اور داڑھی کے بال گلے میں مالا اور بازوؤں میں جوگیوں کی طرح کڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور ایک کان میں بڑی سی بالی دکھائی دے رہی تھی۔ روشو نے محسوس کیا کہ یہ ہیبت ناک انسان جیسے دیکھا بھالا ہو۔ جیسے فقیروں کے اندر کا کوئی آدمی ہو۔ اس کے نمودار ہوتے ہی روشو نے بدبو کا بھبکا سا بھی محسوس کیا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اور ایک چیخ مارنے کیلئے اس نے منہ کھولا لیکن اس سے پیشتر کہ اس کی آواز بلند ہوتی سائے نے بھیڑیئے کی طرح ایک چھلانگ لگا کے روشو کو اس طرح دبوچ لیا کہ اس کی آواز حلق کے اندر ہی رہ گئی اور دہانے پر بھاری بھر کم ہاتھ کی وجہ سے سانس گھٹنے لگی۔

"تمہارے باپ نے کہا تھا کہ تمہیں زندہ پکڑ کے لاؤں۔ اگر زندہ نہیں چلو گے تو پھر تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔" ہیبت ناک آدمی نے روشو کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔ اسی وقت روشو کو یقین

ہو گیا کہ بندہ فقیروں میں سے ہے اور اس کے باپ نے اسے تلاش کر لیا پھر اس آدمی نے ایک لمحہ کے لئے روشو کے دہانے سے ہاتھ اٹھا کے اس کی گھٹتی سانس کو چھوڑا اور ایک موقع دیتے ہوئے پوچھا۔

"بتاؤ چلتے ہو میرے ساتھ، یا مار ڈالوں"۔

لیکن روشو نے اس لمحے کی آزادی کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کے "بچاؤ بچاؤ۔۔۔۔" چلانا شروع کیا۔ ہیبت ناک آدمی نے دوبارہ روشو کا منہ بند کرنا چاہا لیکن روشو نے بڑے زور سے اس کے ہاتھ کو کاٹا اور چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا لیا پھر اسے اس وقت ہوش آیا جب کوٹھڑی کے دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی اور ساتھ ہی خانساماں کی آواز آئی۔ بیگم نے بھی پکارنا شروع کیا بیگم کی زور زور کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

"روشو روشو۔۔۔۔ دروازہ کھولو روشو۔۔۔۔" آوازیں سن کر روشو نے ہاتھ پاؤں مارے تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے جال میں جکڑا ہوا ہے بمشکل آنکھیں کھولیں تو ایک ڈراؤنے خواب سے نیم بیدار ہوا اس کے کمرے کی کھڑکیاں دروازے مکمل طور پر بند تھے اور اندر سوائے روشو کے کوئی اور موجود نہیں تھا باہر دروازے پر ابھی تک دستک ہو رہی تھی۔ دروازے پر ہاتھ مارتے ہوئے بیگم اس کا نام لے لے پکار رہی تھی۔ ساتھ ہی خانسامے کی آواز بھی آ رہی تھی۔

"روشو دروازہ کھولو۔۔۔۔ دروازہ کھولو روشو۔۔۔۔" روشو نے اپنے حواس قابو میں کئے۔ بوجھل آنکھیں کھول کر اٹھا اور تھر تھراتے ہاتھوں کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ بیگم ساجدہ خانساماں کے ہمراہ دروازے پر پریشان کھڑی تھی!

"کیا بات ہے روشو۔۔۔۔" وہ روشو کی طرف لپکی۔ اور روشو بے اختیار بیگم ساجدہ سے لپٹ کر ہچکیوں سے رونے لگا۔

"بس، بس، بس۔۔۔۔ بس میرے بیٹے"۔ بیگم نے اسے دلاسہ دیا سہارا دے کر پلنگ پر لے گئی اور ساری صورتحال سمجھ گئی

"سو جا میرے بیٹے"۔ وہ ممتا بھری انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ "کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے تم نے کروٹ بدل کے اور کلمہ پڑھ کے سویا کرو۔۔۔۔ شاباش سو جاؤ"۔ بیگم اس کے سر کو کافی دیر تک سہلاتی رہیں اور روشو بیگم کے ممتا بھرے ہاتھوں کے سائے کی پناہ میں ایک بار پھر نیند کی پرسکون وادیوں میں لہرانے لگا۔

"کتنا فرق ہے۔ میری اپنی ماں میں اور بیگم جی میں۔" اس نے غنودگی کے سمندر میں

غوطہ زن ہوتے ہوئے سوچا۔

"اس کی ماں نے کبھی اس کے بالوں میں کنگھی نہیں کی۔۔۔۔ کبھی سوتے میں بھی پیار نہیں کیا۔ اسے تو خیرو پر بھی ترس نہیں آیا تھا۔ اف خیرو کا چہرہ"۔ وہ خیرو کے چہرے کے تصور کپکپا گیا۔

"سو جا میرے بیٹے سو جا۔۔۔۔ ڈر نہیں"۔ بیگم نے کپکپاتے روشو کو تھپکی دی اور تھپکی جیسے روشو کیلئے لوری کی طرح ثابت ہوئی۔ وہ دوسرے ہی لمحے گہری نیند سو گیا ممتا کے ٹھنڈے اور پرسکون سائے میں۔

○

صبح کوٹھی کے اندر روشو کے رات والے شور شرابے کا خاصا چرچا تھا شاید شور کی آواز چوہدری صاحب کے بیڈ روم کے اندر بھی گئی ہوگی کیونکہ چوہدری صاحب نے رات تھوڑی دیر کیلئے بیڈ روم کا سگنل کھولا تھا اور شاید موقع دیا تھا کہ کے گھر کسی فرد نے اگر رابطہ کرنا ہے تو کر لے لیکن جب کسی نے ان کو بے آرام نہیں کیا تو تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے سگنل پھر بند کر دیا تھا۔ بیگم ساجدہ نے بھی صبح روشو کے شور شرابے کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور ملازموں کو بھی منع کر دیا کہ وہ اب اس کا تذکرہ نہ کریں شاید وہ محتاط تھیں کہ چوہدری صاحب جو پہلے ہی روشو کو پسند نہیں کرتے تھے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے چلتا کر دینے کا حکم صادر نہ کر دیں اور پھر وہ روشو کو بھی زیادہ خفت میں نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔

"چلو آج تمہیں مارکیٹ لے چلوں"۔ صبح صبح بیگم نے روشو سے کہا۔ شاہینہ کو اسکول روانہ کرنے کے بعد وہ اکثر سودا سلف لینے مارکیٹ جایا کرتی تھیں اور اپنی مرضی کا پھل فروٹ، سبزی ترکاری، مرغی، انڈا، مچھلی، گوشت وغیرہ خرید کر لایا کرتی تھیں وہ عام طور سے اکیلی ہی جایا کرتیں یا پھر کبھی کبھار چھٹی کے دن شاہینہ ان کے ہمراہ ہوتی لیکن آج انہوں نے پہلی مرتبہ روشو کو ساتھ چلنے کیلئے کہا روشو بے انتہا خوش ہوا بیگم کے ساتھ جانا اسے بہت اچھا لگتا۔

"کپڑے بدل لوں بیگم جی"۔ وہ چہک کر بولا۔

"اوں ں، آں ں، ٹھیک ہیں"۔ بیگم نے روشو کے کپڑوں کا ایک سرسری سا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ایسے ہی چلے چلو"۔

"ٹھیک۔۔۔۔" اس نے اچک کر بیگم کے ہاتھ سے ٹوکری لے لی۔ اور کار میں بیگم کے

ساتھ جا بیٹھا وہ پیچھے بیٹھنے لگا تھا لیکن بیگم نے اسے آگے بیٹھنے کو کہا لہذا اس نے ٹوکری کار کی عقبی سیٹ پر رکھی اور خود بت بن کے آگے بیٹھ گیا۔ بوڑھے چوکیدار نے گیٹ کھولا اور کار فر سے باہر نکلی۔

"بابا-----" اس نے بوڑھے چوکیدار کو دیکھ کر مسرت سے ہاتھ ہلایا۔ وہ بیگم ساجدہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے ساری دنیا اسی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ خوش باش ترو تازہ وہ منہ کھڑکی کی طرف کر کے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے اپنے منہ پر کھاتا اور لطف اندوز ہونے کے بعد پر تجسس نظروں سے بیگم کی طرف دیکھتا جیسے وہ اپنی خوشی بیگم کے ساتھ بانٹنا چاہتا ہو۔ اور بیگم بھی اس کا دل خوش کرنے کے لئے کبھی کبھار ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر دیتی۔

صبح کا وقت تھا ٹریفک تیز لیکن کم تھی۔ سڑکیں کھلی اور رواں تھیں کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور روشو کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ پھر اچانک ایک جگہ چوک کے قریب پہنچ کر کار کی رفتار میں تھوڑا سا فرق آیا کار آہستہ ہو گئی کیونکہ سامنے سگنل بند تھا۔ بیگم ساجدہ نے آگے کھڑی ہوئی کاروں کے پیچھے آہستہ سے اپنی کار لگا دی سرخ سگنل دیکھ کر روشو کو ایسے لگا جیسے چوک کا بند سگنل نہیں، چوہدری صاحب کے بیڈ روم کا دروازہ ہو غالباً بیگم نے بھی اسی وقت یہی بات سوچی ہو گی کیونکہ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا۔ پھر اچانک ایک عجیب بات ہوئی کار کے رکتے ہی ایک ہٹا کٹا مسٹنڈا گندا غلیظ لیکن ٹنڈا اور لنگڑا فقیر ایک مسخ شدہ چہرے والے بچے کو گلے سے لگائے "حق ہو" کا نعرہ بلند کرتا کار کے قریب آیا اور پیشہ ورانہ انداز میں فریاد کرتے ہوئے بیگم سے مخاطب ہوا۔

"حق ہو-----خیر ہو سخی کی۔ معذور ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ یہ بچہ میرا بیمار ہے تیرے بچے کے صدقے------" فقیر نے روشو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ بیگم ساجدہ جز بز ہو کر بٹوہ کھولنے لگی۔ لیکن روشو فقیر کی آواز سن کر دہل سا گیا۔

"یہ تو اس کے باپ کی آواز تھی"۔ وہ چونک کر کھڑکی کی طرف مڑا تو جیسے اس کی روح فنا ہو گئی۔ اس کا باپ خیرو کو گلے سے لگائے اور اپنا معذور ہاتھ بیگم کی طرف بڑھائے گڑگڑا رہا تھا۔ تیرا سائیں جئے، تیرے بچے کی خیر ہو، تجھے کبھی کوئی دکھ------"

بولتے بولتے شیرو کی آواز ایک دم جیسے حلق میں اٹک گئی۔

"روشو" - اس نے اندر ہی اندر پکارا اور جیسے اس کا ہاتھ اور پورا بدن لکڑی کا بن گیا - وہ کسی مجسمے کی طرح منجمد اور ساکت ہو گیا تھا اور روشو اور شیرو دونوں کی نگاہیں مقناطیسی انداز میں ایک دوسرے سے ٹکرا گئی تھیں -

(۶)

سب کچھ چند لمحوں میں ہوگیا۔ یہ ٹھاٹھ باٹ اور طمطراق شیرو نے روشو کا دیکھا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ خوبصورت سفید بڑی کار جو صاحب لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ اور اندر بیٹھی لیشن ایبل بیگم خود گاڑی چلا رہی تھی اور اس وقت سگنل بند ہونے پر اسٹیرنگ کے اوپر لگا شیشہ اپنی طرف گھما کے چہرہ دیکھ رہی تھی اس نے اپنے بال درست کئے اور ہونٹوں پر سرخی کی ایک تہہ جمائی۔ اس کے برابر میں بیٹھا ہوا روشو ایسے ہی لگ رہا تھا جیسے بیگم کا اپنا بچہ ہو۔ صاف ستھرا نہایا دھویا، امریکن وضع کی عالیشان قمیص، نیچے نیکر، صاف ستھرا چہرہ، اجلی گردن، کنگھی کئے ہوئے بال، شیرو تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ روشو ایسا ہوگا۔ وہ تو روشو کو گندے علاقوں میں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کہیں گندی نالیوں، گلیوں، گٹروں اور کوڑے کے ڈھیروں پر خوار ہو رہا ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ مانگنے کی اس میں تمیز نہیں ہے اور اس لئے روٹی کے ٹکڑوں کو کہیں ترس رہا ہوگا۔ اس لئے اس نے بیگم سے اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے بچے کے سر کا صدقہ مانگا تھا اسے کیا معلوم تھا کہ وہ بچہ اس کا اپنا ہے اور جب روشو کے کان میں باپ کی آواز پڑی تو وہ چونکا۔ اس نے گھوم کر شیرو کی طرف دیکھا اور جب شیرو کی نگاہ روشو پر پڑی تو وہ دم بخود ہوگیا۔ حیران، پریشان، کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دونوں جیسے پتھر کے ہوگئے۔

"روشو۔۔۔۔۔" اس نے اندر ہی اندر پکارا لیکن آواز حلق میں اٹک گئی۔ لفظ ہونٹوں سے نہیں پھسل سکا۔ کچھ دیر تک وہ ایسے ہی محو حیرت ہوگیا ایک سکتے کی کیفیت میں رہا۔ روشو پر بھی کم و بیش وہی کیفیت طاری تھی۔ حیرانگی اور اچنبھے کے ساتھ ساتھ اس پر ایک خوف بھی چھا گیا تھا۔ وہ ڈر سہم کے سکڑ سا گیا۔ اس کا جی چاہا کہ سمٹ کر بیگم کے دامن میں چھپ جائے جیسے چوزہ گدھ کو دیکھ کر مرغی کے پروں میں پناہ لیتا ہے لیکن اتنے میں سگنل کی لال بتی بجھی اور سبز جل گئی۔ بیگم

نے گاڑی کو گیئر میں ڈال کے آگے بڑھایا اور ساتھ ہی لال بتی کے بجھنے اور سبز کے جلنے پر زیر لب معنی خیز انداز میں مسکرا دی اور ذرا سی گردن گھما کے روشو کی جانب دیکھا لیکن ایک دم سے دنگ رہ گئی۔ روشو سخت خوفزدہ تھا اور فقیر کار کی کھڑکی سے اندر کی طرف جھکا روشو پر جھپٹ سا پڑا تھا جیسے چیل چوزے پر جھپٹتی ہے۔

"کیا بات ہے ---- کون ہے یہ"۔ بیگم نے تجسس سے پوچھا۔

"یہ ---- وہ ---- فقیر"۔ روشو ڈر سے ہکلانے لگا۔

"کیا رشتہ دار ہے تمہارا ----"۔ بیگم نے گاڑی کی رفتار قدرے سست کرتے ہوئے اور گاڑی کو ایک سائیڈ کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں رشتہ دار ہے سب کچھ بتا دوں گا بیگم جی آپ گاڑی بھگائیں"۔ روشو نے پلٹ کر دیکھا تو شیرو اپنے زخمی اور مسخ شدہ بچے خیرو کو کندھے سے لگائے ہانپتا کانپتا دوڑتا ہوا آرہا تھا اور گاڑی کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔

"میں اسے پولیس کے حوالے ------"۔ بیگم نے اسے ڈھارس دینی چاہی۔

"نہیں بیگم جی گاڑی بھگائیں"۔ اس نے بلی کی زد میں آتے چوہے کی طرح سہم کر التجا کی اور بیگم نے گاڑی کو دوسرے گیئر میں ڈال کر گاڑی آگے نکال لی۔

شیرو اس وقت تقریباً گاڑی کی ڈکی کے اوپر آن گرا تھا۔ لیکن گاڑی رکنے کی بجائے تیز رفتاری سے نکل گئی اور شیرو خیرو کو کندھے سے لگائے ہاتھ ملتا اور واویلا مچاتا رہ گیا۔

"ہائے ہائے ہائے ---- میں لٹ گیا تباہ ہو گیا ---- میرا بچہ ------ ہائے ہائے ہائے۔

اس کی بھاگ دوڑ، جل جل اور شور شرابے سے خیرو بھی بے آرام ہو گیا اور افیون کی ترنگ سے باہر آ کر چلانے لگا۔ ادھر خیرو زور زور سے رونے اور چلانے لگا۔ ادھر شیرو نے روشو کے لئے واویلا مچا دیا جس کی وجہ سے راہ گیروں کا اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ اور کسی نے اسے خیرو کیلئے تڑپتا سمجھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"حوصلہ رکھو۔ حوصلہ رکھو۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے اسپتال لے جاؤ ---- یہ لو پیسے"۔ راہ گیر نے اس کی مٹھی میں دس کا نوٹ تھما دیا۔ پھر ایک نے پانچ روپے دیئے ---- کسی نے دو تھمائے پھر ایک ایک کے کئی نوٹ اوپر نیچے اس کی مٹھی میں آ گئے اس نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنا شور شرابا اور بلند کر دیا اور زور زور سے پکارنے لگا۔ "ہائے میرا بچہ ---- میرا بچہ"۔

"ہمت رکھ..... ٹھیک ہو جائے گا"۔ کسی اور راہ گیر نے تھپکی دی۔ "چپ ہو جا.....
چل میرے ساتھ میں اسپتال لے چلتا ہوں"۔ راہ گیر نے اس کی مٹھی گرم کرتے ہوئے کہا۔
اسپتال کے نام پر شیرو دہلا اور ایک دم سے چپ سادھ کر بولا۔
"اس کی ماں کا انتظار ہے۔ وہ آجائے تو اسپتال چلوں گا"۔ وہ چپ ہو گیا پھر ڈھیرے سے
ایک چٹکی خیرو کو اور چٹادی اور جیب میں ہاتھ ڈال کے حاصل ہونے والے نوٹوں کا جائزہ لیا اور ایک
جھٹکے سے دور ہو جانے والے روشو کو یاد کرتے ہوئے بولا۔
"واہ مولا تو چھینتا بھی ہے اور دیتا بھی ہے"۔

○

"کیسی لگی فلم.....؟" جب انٹرول ہوا۔ روشنیاں جلیں۔ لوگ ٹانگیں سیدھی کرنے اور
کھانے پینے بیٹے سینما ہاؤس سے باہر نکلنے لگے تو باڈ نے بختو سے فلم کے بارے میں پوچھا۔
اس دن باڈ نے بالکونی میں سب سے پیچھے والی قطار میں کونے کی دو سیٹیں بک کرائی تھیں
فلم کا آخری ہفتہ تھا اور وہ تھی بھی واجبی سی فلم۔ شائقین کا سارا زور ٹوٹ چکا تھا اور وہ بالکونی تقریباً
خالی پڑی تھی۔ بس اکا دکا دور دور کچھ لوگ یا کچھ جوڑے بیٹھے تھے اور باڈ نے بھی دانستہ طور پر غالباً
ایسی فلم کا انتخاب کیا تھا جس میں ہجوم اور بھیڑ بھاڑ نہ ہو۔
"کیسی لگی فلم.....؟" اس نے انٹرول کے دوران بختو کی طرف جھک کر آہستہ سے پوچھا
"چھائی تے مٹی لگی"۔ وہ اجڈ پن سے بولی۔ "تم دیکھنے دو فلم تو پتہ لگے کیسی ہے"۔
"میں نے کیا کیا.....؟" باڈ معصوم سا ہو کر بولا۔
"تیرے کو ایک منٹ آرام نہیں.....نہ تو دیکھتا ہے فلم، نہ دیکھنے دیتا ہے۔ ابھی میں
تیرے ساتھ کبھی سنیما نہیں آؤں گی"۔ وہ باڈ کو ادا دکھاتے ہوئے جھوٹ موٹ کی بیزاری سے بولی
"ارے ناراض ہو گئی"۔ اس نے بختو کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
"معاف کر دو"۔ باڈ کے معافی مانگنے پر وہ بے اختیار کھکھلا کر ہنسی۔
"ہنستی کیوں ہو؟" باڈ نے جھوٹ موٹ کا غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "ہنسنے کی کیا بات ہے
اس میں"۔
"ایک بات سمجھ میں نہیں آتی ہے"۔ بختو فقیرنی نے تجسس سے پوچھا۔
"کیا بات.....؟"

"یہ جو تم لوگ ہو۔۔۔۔۔۔" بختو بولی۔ "مطلب اوپر کے ہاتھ والے، جو خیرات دیتے ہو۔ صدقہ اور زکوٰۃ دینے والے لوگ"۔

"ہاں ہاں سمجھ گیا ہوں مطلب تمہارا۔۔۔۔۔۔" باڈ بولا۔ "تم بات کرو"۔

"یہ تم لوگ معافیاں کیوں مانگتے ہو"۔ بختو نے قدرے حیرانگی ظاہر کی۔

"معافیاں۔۔۔؟" باڈ بھی حیران ہوا۔ "کیسی معافیاں"۔

"صبح سے شام تک جدھر جاتے ہیں ہم لوگ ایک ہی آواز کان میں پڑتی ہے۔ بابا معاف کرو۔ مائی معاف کرو۔ معافی معافی معلوم ہوتا ہے۔ معافی مانگنے کے سوا تم لوگوں کو کوئی کام ہی نہیں ہے"۔ وہ ازراہ طنز بولی اور بولتی رہی۔ "ابھی تو یہاں بھی میرے ہاتھ پکڑ کے معافی مانگ رہا ہے۔ معافی معافی کتنی گناہ گار مخلوق ہے خیرات دینے والوں کی"۔

"اہو ہو ہو۔۔۔۔۔" ایکے باڈ کھلکھلا کے ہنسا اور بختو کے ہاتھ چھوڑتے ہوئے بولا۔ "ارے یہ معافی اور ہے بختو اور یہ میں تیرے سے دن میں دس دفعہ مانگنے کو تیار ہوں"۔ اس نے ایکے اپنے ہاتھ ازراہ شرارت جوڑ دیئے اس دوران نشستوں کے درمیان ٹھنڈی بوتل اور گرم چائے فروخت کرنے والے آواز لگا کے گزرے۔

"ٹھنڈا یا گرم۔۔۔۔" اس نے بختو سے پوچھا۔

"ٹھنڈا بختو بولی۔

"بھئی دو ٹھنڈے دے دو"۔ باڈ نے ٹھنڈے بیچنے والے کو آواز دی۔ ٹھنڈے والے نے دو بوتلیں ٹھاہ ٹھاہ کر کے کھولیں ایک باڈ کو دی اور دوسری بوتل بختو کو تھماتے ہوئے عجیب ٹھہری ہوئی، جمی ہوئی، رکی ہوئی، ترچھی اور گھورتی ہوئی مشکوک نگاہ سے معنی خیز انداز میں بختو کا جائزہ لیا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں کچھ شک و شبہ اور کچھ حقارت سی بھی تھی۔ ہرچند کہ بختو نے سینما گھر میں آنے سے پہلے صفائی ستھرائی کی تھی نئے دھلے استری شدہ کپڑے پہنے تھے اور باڈ کی مرضی کے مطابق کنگھی کر کے لبوں پر سرخی کا پوپرا لگایا تھا لیکن پھر بھی اس کا اجڈ پن غائب نہیں ہوا تھا اور دیکھنے میں لگتی تھی کہ جیسے بھکارن ہو یا کہیں سے پکڑ کر لائی گئی بازاری عورت ہو۔

"ورفٹے منہ"۔ وہ مشروبات والے کی طرف دیکھ کر بولی۔ "کس طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے" اور فلم کا دوسرا نصف شروع ہو گیا۔ فلم ختم ہوئی تو وہ ایک بار پھر باڈ کے فلیٹ میں گئی۔ دھلے کپڑوں کی جگہ دوبارہ اپنے میلے کچیلے، پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے اور حلیے کو کچھ اس طرح بگاڑنے بیٹھ گئی کہ شیرو کیلئے قابل قبول ہو جائے۔ اس دوران باڈ خود جلدی جلدی اپنے ہاتھ

سے بختو کیلئے چائے بنا کے لایا۔

"چائے پیو ------" اس نے چمچ چلاتے ہوئے، چائے کا کپ بختو کو پیش کیا۔ چائے کی پیالی پکڑ کر بختو نے بہت ممنونیت سے باؤ کو دیکھا اور کہنے لگی۔

"ایک بات بتاؤ باؤ"۔ باؤ سراپا گوش بن گیا۔ "تم میرا اتنا کھیال کیوں رکھتے ہو"۔

تم مجھے اچھی جو لگتی ہو"۔ باؤ سنجیدگی سے بولا اور بختو پر بھی ایک گھمبیر تا سی چھا گئی۔

"تمہارا دنیا میں کوئی نہیں ہے کیا"۔ بختو نے جذباتی انداز میں سوال کیا۔

"یہ کیسے کہا تم نے ؟"۔ بظاہر باؤ نفی کے انداز میں بے نیازی سے بولا لیکن اس کی آنکھ نم ہو گئی تھی۔

"ظاہر ہے تیرا کوئی نہیں ہوگا جبھی تو فقیرنی سے دل لگا بیٹھا ہے تو"۔ بختو بھی آبدیدہ سی ہو گئی۔

"کیا فقیر انسان نہیں ہوتے"۔ اس نے ٹکر ٹکر بختو کو دیکھتے پوچھا۔

"پتہ نہیں------ بختو نے جلدی جلدی چائے حلق سے نیچے انڈیلی۔ "میں چلوں گی۔ دیر ہو گئی ہے شیرو گرمی کھائے گا"۔

"یہ لو-----" باؤ نے سو کا نوٹ جیب سے نکال کے بختو کو دیا۔ "تم نے دن بھر کوئی بھیک نہیں مانگی آج"۔

"یکی بات بتاؤں باؤ"۔ بختو نے نوٹ مٹھی میں دباتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "میں تیرے سے پیسے کبھی نہ لیتی۔ پر سارا دن میں نے تیرے ساتھ گزارا ہے۔ خالی ہاتھ جاؤں گی تو شیرو پیٹے گا۔ وہ میرے سے ایک ایک ملٹ کا حساب لیتا ہے"۔

"میں جانتا ہوں۔ اسی لئے میں تجھے دے رہا ہوں پیسے ------ رکھ لو"۔ باؤ نے ازراہ ہمدردی کہا۔

"اس کی جان ہے پیسے میں"۔ وہ اس طرح بولی جیسے وہ واقعی باؤ کے مقابلے میں شیرو سے نفرت کرتی ہو۔

"صرف اسی کی جان نہیں ہے پیسے میں بختو"۔ باؤ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ "یہ پیسے کی دنیا ہے سب کی جانیں پیسے میں ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی، میاں بیوی، یار دوست، عاشق معشوق، سب کی جان پیسے میں ہے سارے رشتے اسی پیسے سے بنتے، پیسے سے ٹوٹتے ہیں۔ یہی پیسہ محبت

ہے۔ مجھی پیسہ نفرت ہے۔۔۔۔۔"

"میں چلوں گی"۔ وہ اس کی بات کاٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جب تو اس طرح کی باتیں کرتا ہے نا پھر تیری بات لمبی ہو جاتی ہے"۔ وہ باڈ کے فلسفے کو نظرانداز کر کے دروازے کی طرف بڑھی

"ایک منٹ۔۔۔۔" باڈ نے آہستہ سے پکارا۔ وہ دروازے کے پاس جا کر رکی۔ پلٹی، باڈ اس کے قریب آیا۔ "خدا حافظ۔۔۔۔" اس نے گرمجوشی سے الوداع کہا۔ وہ پھر آبدیدہ ہو گیا تھا۔

"تو پاگل ہے"۔ بختو جاتے جاتے از راہ ترحم بولی۔ "تیرا سچ مچ دنیا میں کوئی نہیں ہے"۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اور پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔

شام جب وہ بستی میں پہنچی تو کم و بیش تمام فقیر دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر لوٹ چکے تھے اور جھونپڑیوں کے باہر ہی ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ شیرو بختو کو جھونپڑی کے باہر ہی مل گیا۔ خیرو نشے میں سویا اس کے کندھے سے لگا ہوا تھا۔ شیرو بھی شاید ابھی ابھی باہر سے آیا تھا اور غصے میں بھنایا ہوا تھا۔ روزگار تو خیرو کی وجہ سے ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا لیکن مجموعی طور پر اس کا دن بہت برا گزرا تھا۔ ایک تو وہ خیرو کو اٹھانے اٹھانے تھک گیا تھا۔ دوسرے بختو اسے غچہ دے گئی تھی۔ نہ دوپہر کو سگنل کے پاس ملی نہ گارڈن میں اور نہ مسجد کے باہر۔ شیرو جانتا تھا کہ وہ دن بھر باڈ کے ساتھ گلچھرے اڑاتی رہی ہو گی۔ دوسرا خفقان اسے روشو کا تھا کہ اس کے ہاتھ میں آیا ہوا شکار اس طرح نکل گیا جیسے شیر کے منہ سے نوالہ نکل جائے اور پھر جب لوٹ کر گھر آیا تو بختو ابھی نہیں پہنچی تھی بختو کچھ تاخیر سے آئی۔ ہر چند کے اس نے اجلے اتار کر میلا جوڑا پہن لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ شیرے کو "لش لش" کرتی نظر آئی۔ بختو کو دیکھتے ہی اس پر جنون سوار ہو گیا۔

"پتہ چلا روشو کا۔۔۔۔" بختو نے آتے ہی پوچھا جیسے وہ خود بھی روشو کے بارے میں فکر مند رہی ہو۔

"ہاں پتہ چلا۔۔۔۔اور ابھی بتاتا ہوں تمہیں۔۔۔۔" وہ غصے سے کھول گیا اس نے گلے سے لگے ہوئے خیرو کو جھونپڑی کے باہر پڑے ہوئے کھٹولے پر پھینکا اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ دھائیں دھائیں بختو کو مارنا شروع کر دیا۔

اس نے دو ہتڑ مار کر ایک موٹی سی گالی دی اور گندی گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ لاتوں مکوں کی برسات شروع کر دی۔ "بڑی بنی پھرتی ہے۔۔۔۔۔۔لش لش کرتی۔۔۔۔ دوسرا کام ہی کوئی نہیں ہے تجھے۔۔۔۔۔آج خیرو تیرے پاس ہوتا تو شیرو نہیں بھاگ سکتا تھا۔ میں اسے بیگماں سمیت موٹر سے نیچے اتار لیتا۔۔۔۔پر تو بدبختی۔۔۔۔فاحشہ۔۔۔۔" وہ مارتے مارتے بالکل جنون میں آ

گیا۔

"بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔۔ میں مر گئی بچاؤ۔۔۔ کوئی بچاؤ، فقیرو، کوئی بچاؤ"۔ بختو مار کھاتی، واویلا مچاتی رہی فقیر جو جھونپڑیوں کے اندر تھے وہ بھی باہر نکل آئے اور گھیرا ڈال کے تماشا دیکھنے لگے ۔۔۔۔۔۔ تماشا دیکھنے والوں میں شاداں بھی تھی۔۔۔ عورت پھر عورت کی ہمدرد ہوتی ہے اور تو کوئی چھڑانے کیلئے آگے نہ بڑھا لیکن شاداں آگے بڑھی اور شیرو کا ہاتھ روکتے ہوئے منت سماجت سے بولی۔ "مت مار بیچاری کو شیرو۔۔۔۔ مت مار"۔ شاداں نے پھر خوشامد کی۔ "تجھے میری قسم شیرو"۔ وہ مدافعت کی دیوار بن گئی۔ اور شیرو کا فضا میں اٹھا ہوا ہاتھ جیسے فضا میں معلق ہو گیا۔ مجمع دم بخود ہو گیا۔ عورتیں حیرت زدہ ہو گئیں بختو بھی شاداں کی جراءت پر ششدر رہ گئی۔

اس وقت ایک بھپرا ہوا فقیر آگے بڑھا۔

"تیری قسم۔۔۔۔؟" اس نے غصے میں دانت پیستے ہوئے کہا۔۔۔۔ "تیرا کیا رشتہ ہے شیرو سے جو اپنی قسم دے رہی ہے"۔

"پوچھ پوچھ۔۔۔۔ پوچھ اسی سے۔۔۔۔ شیرو پھر جنبش میں آیا۔

"میں منہ سے نہیں جوتوں سے پوچھوں گا اس سے۔۔۔۔ فقیر نے اپنا ٹائر سول کا بھاری بھر کم چپل پاؤں سے نکالا اور دھڑا دھڑ شاداں کے سر پر مارنے لگا۔ "کیا لگتی ہے تو اسکی کہ اپنی قسم دیتی ہے۔۔۔۔ ہیں۔۔۔ اس نے دھائیں دھائیں مارنا شروع کیا۔

"مار مار اس کو۔۔۔۔" شیرو نے فقیر کو شاباشی دی اور پھر اپنے وجود کو حرکت میں لا کے بختو کو پیٹتے ہوئے بولا۔ "یہ عورت ذات ہے ہی جوتے کی"۔ وہ بختو کو دھڑا دھڑ مارنے لگا اور دوسرے نے شاداں جو شاداں کا شوہر تھا بڑھ بڑھ کر شاداں پر حملے شروع کر دیئے۔۔۔۔۔۔ دونوں عورتیں اپنے ہاتھوں سے سر، منہ ناک اور آنکھ کا دفاع کرتے ہوئے "بچاؤ بچاؤ چلانے لگیں اور اطراف میں مجمع فقیر لوگ اس طرح مزے لے رہے تھے جیسے بازی گروں کا تماشا ہو رہا ہو۔

مارکیٹ سے واپس آنے کے بعد روشو ایک دم چپ چاپ اور اداس سا ہو گیا تھا۔۔۔ وہ معمولی سی آواز اور آہٹ پر چونک جاتا تھا۔

"اب پریشان کیوں ہو۔۔۔" بیگم نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔۔۔ "اگر تم نے اس وقت مجھے روکا نہ ہوتا تو میں اس فقیر کو پولیس کے حوالے کر دیتی۔۔۔۔۔" روشو پھر چپ رہا اور بیگم کو خالی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"آخر ایک فقیر میں ہمت کیسے ہوئی۔۔۔۔۔۔ میری گاڑی سے تمہیں پکڑنے کی"۔ بیگم بولتی چلی گئی۔ "کون تھا وہ۔۔۔ بولتے کیوں نہیں۔۔۔۔ بولو کون تھا"۔

"میرا باپ۔۔۔۔۔۔" روشو نے انکشاف کیا۔

"باپ۔۔۔۔!" بیگم چونکی۔۔۔ "وہ تمھارا باپ تھا؟" بیگم کے حیرت کی انتہا نہیں رہی۔

"اور اس کی گود میں جو بچہ تھا وہ خیرو تھا"۔ روشو نے کہا۔

"خیرو۔۔۔۔۔ کون؟"

خیرو میرا بھائی ہے۔۔۔۔۔ "روشو بولا۔

"اس کے چہرے کو کیا ہوا تھا"۔ بیگم کو یاد آیا کہ فقیر کی گود میں جو بچہ تھا اس کا چہرہ بہت مخدوش تھا۔

"چوہا کھا گیا ہے اس کے منہ لو"۔ روشو نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"چوہا۔۔۔" بیگم حیران ہوئی۔ "یہ اتنا بڑا زخم چوہے کا تھا؟ کیا اس کا علاج نہیں کرایا کسی نے؟"

"نہیں۔۔۔" روشو بولا۔ "بابا کہتا ہے علاج کرانے سے اس کا منہ ٹھیک ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہوجائے گا تو کیا ہوگا۔۔۔۔ ٹھیک ہونے کی کیلئے ہی تو علاج کراتا ہے آدمی۔۔۔۔۔" بیگم بولی۔

"بابا کہتا ہے کہ اگر خیرو ٹھیک ہوگیا تو پھر خیرات نہیں ملے گی۔۔۔" روشو نے وضاحت کی۔۔۔۔ "وہ اس کے زخم دکھا کے لوگوں سے خیرات مانگتا ہے"۔

"بڑا ظالم آدمی ہے۔۔۔۔۔" بیگم غصے سے بولی۔۔۔۔ "بہت بڑا فراڈ ہے وہ"۔

"وہ مجھے پکڑ لے گا۔۔۔۔۔" روشو نے سہم کر کہا۔۔۔۔ "زبردستی بھیک منگوائے گا مجھ سے۔۔۔۔ میں بھیک نہیں مانگوں گا جی۔۔۔۔ میں بھیک نہیں مانگوں گا۔۔۔۔۔" وہ التجا کرتے ہوئے بولا۔

"کس نے کہا تم سے کہ تم بھیک مانگو گے۔۔۔۔" بیگم نے اسے تسلی دی۔ "کتنی خوشی کی بات ہے کہ تم بھکاریوں میں سے ہو اور بھیک کو برا سمجھتے ہو۔۔۔۔" بیگم ساجدہ بولی۔۔۔۔۔ "بھیک مانگنا واقعی بہت بڑی برائی ہے۔۔۔۔ لعنت ہے یہ صرف ایک انسان کیلئے نہیں پوری قوم کیلئے لعنت ہے۔۔۔۔۔ یہ پورے ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔۔۔۔۔ جس قوم میں بھکاری بستے ہوں وہ کبھی بڑی قوم نہیں ہوسکتی ہے۔"

بیگم روشو کی ذہنی سطح کا خیال کئے بغیر اپنی رائے کا اظہار فلسفیانہ انداز میں کرنے لگی لیکن روشو بھی ایسا انجان نہیں تھا وہ ان باتوں کو سمجھ رہا تھا اور بھیک کو ایک بہت بڑی لعنت سمجھنا ہی اپنے گھر اور فقیروں کی بستی سے اس کے فرار کا جواز بنا تھا۔

"لیکن بابا بھیک کو اچھا سمجھتا ہے"۔ روشو نے باپ کے بارے میں رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"پھر کبھی ملا تو اسے۔" بیگم ازراہ ہمدردی بولی۔

"نا، نا بیگم جی نا۔۔۔۔" وہ چونکا۔۔۔۔ "بابا سے کبھی نہ ملیں اور اس کو کبھی نہ سمجھائیں۔ ۔۔۔" روشو نے تنبیہہ کی۔ "وہ بھیک کو برا کہنے والے کو گالیاں دیتا ہے۔۔۔۔۔ چھرا بھی مار دیتا ہے"۔ روشو نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"چھرا مار دیتا ہے۔۔۔۔۔" بیگم حیرانگی سے گویا ہوئی۔

"ہاں بیگم جی۔۔۔۔ روشو نے جواب دیا۔۔۔۔ "ایک دفعہ بابا نے ایک آدمی کو چھرا مار دیا تھا کیونکہ وہ آدمی بھیک کو برا بول رہا تھا"۔

"پھر تو تمہارے باپ کو واقعی پولیس کے حوالے کرنا چاہئے"۔ بیگم سخت گیر لہجے میں بولیں۔

"پولیس نے بابا کو پکڑا تھا۔۔۔۔" روشو نے انکشاف کیا۔

"کب۔۔۔۔" بیگم نے پوچھا۔

"کتنی دفعہ۔۔۔۔۔" روشو نے کہا۔۔۔۔ "سب فقیروں کو لے جاتی ہے پولیس۔۔۔۔۔ پکڑتی ہے۔۔۔۔۔ مارتی ہے۔۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے چپ ہوا۔

"پھر کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔" بیگم بولیں۔

"پھر فقیر پیسے دیتے ہیں پولیس کو اور پولیس چھوڑ دیتی ہے۔۔۔۔" روشو نے جواب دیا۔

"ہونہہ۔۔۔۔" بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔۔۔۔۔ "اگر تیرے باپ نے دوبارہ تجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو پھر اس کا کچھ علاج کرنا پڑے گا۔۔۔۔"

روشو بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ لیکن اتنے میں شلوینہ اپنے کمرے سے نکلی اور راہداری طے کر کے ڈرائنگ روم کے دروازے پر آن رکی جہاں روشو اور بیگم باتیں کر رہے تھے۔

"اے روشو کے بچے۔۔۔۔۔" شلوینہ نے پکارا۔۔۔۔ "پڑھنا ہے تو آجاؤ۔۔۔۔ پھر

میرے پڑھنے کا وقت ہو جائے گا"۔

جاؤ تمہارے پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے ------ بیگم نے روشو کو تسلی دی اور روشو شاہینہ کے ساتھ پڑھنے چلا گیا۔

○

تین چار روز کے وقفے کے بعد بیگم اور شمسہ کی پھر مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ چوہدری صاحب کے بیڈروم کا سگنل جلدی جلدی کھلنے اور بند ہونے لگا تھا تھوڑی دیر پہلے وہ پاشا کے ہمراہ گھر سے نکلے تھے اور اب وہ گاہے گاہے باہر جانے لگے تھے۔ اور شمسہ کو کچھ کچھ آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع میسر آ رہا تھا اور دونوں سوکنیں جلد اور انتہائی کم وقت میں برائے نام سوکنیں رہ گئیں تھیں۔ دو تین ملاقاتوں میں ہی ان کا آپس میں تعلق دو گہری ہمراز، ہم خیال اور ہمدرد سہیلیوں کا سا ہو گیا تھا۔

"ساجدہ بیگم آو گارڈن میں چل کر بیٹھیں-------" چوہدری کے جانے کے بعد شمسہ بیڈروم سے جب نکلی تو ساجدہ بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی یگانگت اور اپنائیت سے کہنے لگی۔

"اندر آجاؤ میرے کمرے میں-----" بیگم نے مشورہ دیا----"وہاں بیٹھیں گے"۔

"میرا اس اے سی سے دم گھٹ رہا ساجدہ جی-----" وہ حقارت آمیز لہجے میں بولیں---

--"میرے بدن پر کیکڑے چل رہے ہیں"۔

"میں جانتی ہوں------" بیگم ساجدہ بے ساختہ بولیں۔

"تھوڑی دیر کے لئے باہر آجاؤ پلیز----- کھلی فضا میں-------" شمسہ نے ساجدہ بیگم کا ہاتھ تھاما۔

چوہدری نے دیکھ لیا تو اسے ہمارا میل جول زیادہ پسند نہیں آئے گا" بیگم ساجدہ نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"نہ آئے"۔ شمسہ بے نیازی سے بولی-----" پھر کیا کرے گا------ زیادہ سے زیادہ طلاق دے دے گا------ دے دے-----"

ساجدہ بیگم حیرت سے شمسہ کو دیکھنے لگی اور پھر چپ چاپ باہر جا کے لان میں بیٹھ گئیں------ اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ساجدہ بیگم نے پھر وہی بات چھیڑی جو پچھلی ملاقات میں ادھوری رہ گئی تھی۔

"جب جیتنے والا اور تھا تو پھر چوہدری کے قبضے میں کس طرح آئیں تم ------" ساجدہ بیگم نے براہ راست سوال کیا۔

"جیتنے والا مجھے جیت کر خود پریشان ہوگیا تھا----" شمسہ نے جواب دیا۔ "وہ سوسائٹی کا ایک کھاتا پیتا باعزت آدمی تھا-----شادی شدہ تھا، بیوی بچے تھے اس کے-----اچھی خوشحال زندگی گزارتا تھا"۔ شمسہ بولتی چلی گئی۔ "وہ کچھ وقت کیلئے تو میرے ساتھ کھیل سکتا تھا لیکن ہمیشہ اپنے پاس رکھنا اس کے لئے مشکل تھا-----اس نے محسوس کیا کہ جیسے مجھے جیت کر وہ خود پھنس گیا ہے -------اس مشکل کو بھانپ کر پاشا نے مداخلت کی اور مڈل مین کا کردار ادا کر کے میرا سودا چوہدری سے کرا دیا"۔

شمسہ نے تھوڑا سا توقف کیا بیگم ساجدہ مکرم سراپا گوش بنی ہوئی تھیں۔-----شمسہ پھر بولنے لگی۔ "اس بندے سے جتنا قرض میرے بھائی نے لیا تھا----وہ چوہدری نے چکایا---میری قیمت ادا کی-----میرے بھائی کا مکان جو گروی تھا وہ آزاد کرایا---کچھ رقم نقد ادا کی اور یوں میں پر قینچ کبوتری کی طرح چوہدری کی دولت کے پنجرے میں بند ہوگئی"۔ شمسہ نے ایک ٹھنڈی سرد آہ بھر کر بات مکمل کی۔------اور خاموش ہوگئی۔

"اور یہ سب کچھ پاشا کے ذریعے ہوا-----؟" بیگم نے خاموشی توڑ دی۔

"ہونہہ-----نکاح کا سارا بندوبست اسی نے کیا"۔

"اسے کیا ملا------" بیگم نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا اور شمسہ سوچ میں پڑ گئی جیسے اس نے اس سوال کی نوعیت پر غور ہی نہیں کیا تھا۔

"میرا خیال ہے اس کو سارے کام کا ٹھیک ٹھاک کمیشن مل گیا ہوگا۔" وہ کافی غور و خوض کے بعد بولی اور پھر کچھ دیر کیلئے دونوں خاموش ہوگئیں۔

O

آج چوہدری صاحب گھر سے باہر گئے ہوئے تھے پاشا ان کی غیر موجودگی میں شمسہ کے بیڈ روم کے اندر چلا آیا تھا۔ معلوم نہیں اسے پہلے سے چوہدری صاحب کی عدم موجودگی کا علم تھا یا وہ اچانک آگیا لیکن جب وہ آیا تو اس سے تقریباً نصف گھنٹے قبل چوہدری صاحب نے ٹیلی فون پر کسی سے بات کی-----دفتر سے گاڑی منگوائی اور چلے گئے-----ظاہر ہے جب وہ گئے تو بیڈ روم کا سگنل بند رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بیگم نے بلب کا بٹن آف کر دیا تھا-----اس وقت ان کا جی

چاہ رہا تھا کہ وہ تنہائی اور موقع کا فائدہ اٹھا کر ساجدہ بیگم کے پاس چلی جائے لیکن دوپہر کا وقت تھا ساجدہ بیگم اس وقت کھانے کے بعد آرام کرتی تھیں۔ شمسہ نے انہیں بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا۔

دوپہر کی گرمی اور دھوپ کی وجہ سے وہ گارڈن میں بھی نہیں گئی اور اس نے اندر سے دروازہ مقفل کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ چوہدری کے سوا بیڈ روم میں بغیر اجازت کے کبھی کوئی آتا ہی نہیں تھا لہٰذا شمسہ نے چوہدری کے جانے کے بعد شاور لیا اور وقت گزاری کیلئے لیٹے لیٹے ایک رسالے کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔ کہ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی جیسے کوئی پرندہ چونچ سے ٹھک ٹھک کرتا ہے۔

ساجدہ بیگم تو کبھی شمسہ کے بیڈ روم میں نہیں آتی تھیں لیکن شمسہ سمجھی کہ شاید بیگم نے روشو کو اسے بلوانے کیلئے بھیجا ہے یا ماسی کسی کام سے آنا چاہتی ہو---- خانساماں کے دخل دینے کا وقت نہیں تھا------ چوہدری ابھی ابھی گیا تھا۔ وہ اتنی جلدی نہیں لوٹ سکتا تھا----- ہو سکتا ہے لوٹ آیا ہو ایسے نفسیاتی مریض کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی----- لہٰذا دروازے کی آہٹ سن کر وہ آہستہ سے پکاری۔

"کون----؟" اور جواب میں غیر مقفل دروازے کی نوب میں ہلکی سی جنبش ہوئی دروازہ آہستہ سے کھلا اور پاشا چہرے پر ایک خبیث مسکراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

"تم----" شمسہ چونکی اس نے لباس درست کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"حیران کیوں ہو رہی ہو------ کیا مجھے پہلی دفعہ دیکھا ہے----" اس نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"چوہدری صاحب موجود نہیں ہیں اس وقت-------" اس نے اپنے وجود کو مزید سمیٹا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"مجھے معلوم ہے-----" وہ آہستہ سے بولا۔

"تو پھر کیوں آئے ہو یہاں-----" شمسہ نے پوچھا۔

"تم سے ملنے------" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"مجھ سے ملنے-----" وہ برہم لہجے میں بولی---- "مجھ سے اب کیا چاہتے ہو تم"۔

"پہلے میں نے کیا تم سے لے لیا ہے-----" وہ انتہائی محروم لہجے میں بولا۔

"تم نے جو کچھ لینا تھا لے لیا ہے----" شمسہ بولی۔ "تم اس سودے کی قیمت وصول

کر چکے ہو۔۔۔۔۔ تم نے اپنا کمیشن۔۔۔۔۔۔"

"تمھارا خیال غلط ہے شمسہ۔۔۔۔۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے زیادہ کھلے الفاظ میں کہا۔ "میں نے اس سودے کا کوئی کمیشن وصول نہیں کیا"۔

اب کے شمسہ قدرے خاموش ہو گئی اور پھر سوچ کر توقف سے بولی۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر تمہارا کیا مفاد تھا"۔

"میرا مفاد تم تھیں۔۔۔۔ تم۔" وہ لفظ تم پر زور دے کر بولا وہ پاشا کے اس بے باک لہجے پر چونکی لیکن کچھ بولی نہیں اور پاشا مزید کہنے لگا۔

"میں تمہیں اس جہنم سے نکالنا چاہتا تھا۔"

"جہنم سے جہنم تک۔۔۔۔۔" شمسہ بے ساختہ کہہ گئی۔۔۔۔۔ "یک جہنم سے نکال کر دوسرے جہنم میں پھینکنا چاہتے تھے۔"

"یہ جہنم عارضی ہے شمسہ۔۔۔۔۔ یہ آگ کسی وقت بھی بجھ سکتی ہے۔ یا جب ہم چاہیں اسے ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔۔۔۔ پھر آگے جنت ہی جنت ہے۔۔۔۔۔۔ جس میں تم اور میں۔۔۔۔"

"پاشا۔۔۔۔۔" شمسہ نے لہجے میں ایک تیز چنگاری پیدا کرتے ہوئے پاشا کی زبان روکی۔۔۔ "تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔۔۔ اگر چوہدری صاحب آ گئے تو تمہاری تکابوٹی کر دیں گے"۔

"اوں ہوں۔۔۔۔۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔۔۔۔۔۔ "چوہدری صاحب ایک ایسے قصائی ہیں جن کے بازوؤں میں تکابوٹی کرنے کی اب سکت نہیں ہے"۔ وہ ہنسا۔

شمسہ غصے میں دانت پیس کر بولی۔ "تم نکل جاؤ یہاں سے ورنہ۔۔۔۔۔"

وہ ایک دم خاموش ہو گئی دروازے پر کوئی آہٹ تھی۔۔۔ پاشا بھی چونکا۔

۶

ظاہر ہے دروازے کے باہر چوہدری نہیں ہو سکتا تھا۔

چوہدری ہوتا تو دھڑلے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا لیکن یوں لگتا تھا جیسے باہر کوئی کنسویاں لے رہا ہے۔ شمسہ اور پاشا دونوں چوکنا ہو گئے۔ اور شمسہ خوفزدہ بھی ہو گئی کہ وہ پاشا کی موجودگی میں کمرے کے اندر موجود تھی۔ ہر چند کہ وہ قصوروار نہیں تھی۔ پاشا خود ہی اندر آیا تھا۔ پاشا پہلے بھی آتا رہتا تھا لیکن چوہدری کی موجودگی میں چوہدری کے کسی دفتری یا نجی کام سے آتا دونوں کچھ دیر کے لئے دور صوفے پر بیٹھتے کچھ بات چیت ہوتی۔ کبھی رازداری کے ساتھ، کبھی دھیمے لہجے میں اور کبھی واضح طور پر اور پھر بہت مختصر وقت پاشا چوہدری کے ساتھ گزارتا اور اجازت لے کر شمسہ کو کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا کمرے سے چلا جاتا۔ شمسہ نے پاشا کے کاروبار کے بارے میں کبھی کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی وہ بس اتنا جانتی تھی کہ پاشا ایک منفی سوچ رکھنے والا اوباش قسم کا آدمی ہے۔ اور اس کی وساطت سے چوہدری جتنے بھی دفتری اور نجی کام کراتا ہے وہ کم و بیش سب غلط اور ناجائز ہوتے ہیں۔ یہ چوہدری کا ذاتی معاملہ تھا اور شمسہ نے اس مسئلے کو کبھی اپنا دردِ سر نہیں بنایا تھا لیکن آج صورتِ حال ہی مختلف ہو گئی تھی۔ اور اس نے آج اپنی شخصیت کا بالکل مختلف روپ شمسہ کے سامنے ظاہر کیا تھا اور اب جب کہ پاشا اندر موجود تھا تو اس کی موجودگی میں باہر بیڈ روم کے دروازے پر پراسرار آہٹ محسوس ہو رہی تھی اور اس معاملے میں قطعی طور پر بے قصور ہونے کے باوجود ایک انجانا خوف شمسہ کے وجود پر طاری ہو گیا تھا۔

"تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے"۔ پاشا نے شمسہ سے کہا اور یہ بات شمسہ کیلئے حیران کن تھی کہ وہ قدرے چوکنا ہونے کے باوجود خوفزدہ یا پریشان نہیں تھا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کے ہینڈل کو دبا کر ایک جھٹکے کے ساتھ پٹ کو

اندر کی طرف کھول دیا۔ دروازہ زور سے اندر آیا اور اس کے ساتھ ہی روشو اس طرح اندر آن گرا جیسے وہ باہر دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہو لیکن روشو نے مستعدی سے اپنے آپ کو سنبھالا اور نیچے گرنے سے بچالیا اور پھر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ "کیوں بے۔۔۔کیا کر رہا تھا باہر"۔ پاشا نے اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ جی۔۔۔۔۔صفائی"۔ روشو نے ہاتھ میں پکڑا ڈسٹر دکھاتے ہوئے گھبراہٹ میں کہا۔

"صفائی کر رہا تھا جی"۔

"ہونہہ۔۔۔۔صفائی"۔ کس نے لگائی تھی یہاں ڈیوٹی تمہاری"۔ اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"روشو" اچانک باہر سے بیگم ساجدہ کی ایک تیز اور نوکیلی آواز ہوا کے دوش پر آئی اور بجلی کی لہر کی طرح پاشا کو چھو گئی۔

"مالکن بلا رہی ہے تمہیں"۔ پاشا نے آہستہ سے روشو سے کہا اتنے میں بیگم نمودار ہوئیں

"کام ختم کرو اور پڑھائی کیلئے جاؤ۔ تمہارا پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے۔" بیگم ساجدہ عین دروازے کے سامنے آن کے روشو سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوئیں اور انہوں نے اس طرح پاشا کو نظر انداز کیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ روشو ڈسٹر جھاڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ شمسہ اوٹ میں ہی کھڑی رہی پھر ساجدہ بیگم ذرا سامنے آئیں تو اچانک پاشا کو ساجدہ بیگم کی غصیلی تیکھی اور تیز نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔ دونوں کی نظریں ایک لمحے کے لئے سرعت سے ٹکرائیں۔ جیسے بجلی کی دو لہریں ہوں۔ ایک بے آواز سا شعلہ لپکا ایک ان دیکھی ان لکھی داستان سمندر کی موج کی طرح ابھری اور اس کے ساتھ ہی ایک خبیث مسکراہٹ پاشا کے ہونٹوں پر بکھر گئی جواب میں ساجدہ بیگم نے ایک نفرت بھری شکن پیشانی پر ڈالی اور۔۔۔ حقارت سے اپنے وجود کو جھٹک کر روشو کے پیچھے چلی گئیں۔ پھر ایک لمحہ مزید خاموشی اور تجسس کا گزرا اور پاشا نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا۔ اس کی نگاہیں پھر شمسہ پر تھیں۔

"میں باہر جاؤں گی۔۔۔؟ شمسہ ایک دم آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے لگی وہ پریشانی میں تھی

"اوں ہو۔۔۔۔۔۔" پاشا نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر شمسہ کا راستہ روکا۔ "میں یہاں دیواروں کے پاس تو نہیں آیا ہوں"۔

"دیکھو پاشا۔۔۔۔" وہ بھپری لیکن اس کی بات کٹ گئی۔

"سنو شمسہ۔۔۔۔۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ "میری بات غور سے سن لو پھر جو مرضی آنے کہنا جو مرضی سو کرنا"۔

شمسہ خاموش ہو گئی لیکن اس نے قدرے تشویش سے دروازے کی طرف دیکھا

"دروازے کی طرف مت دیکھو۔ اس وقت یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ چوہدری کا مجھے پتہ ہے کہ اس وقت کہاں ہے میں لینے جاؤں گا تو پھر وہ آسکنے کے قابل ہو گا۔ وہ محتاج ہے میرا"۔ اس نے بد تمیزی کے انداز میں پہلی مرتبہ شمسہ کے سامنے چوہدری کے بارے میں صیغہ واحد متکلم استعمال کیا اور شمسہ پاشا کے اس لہجے پر حیران سی ہو گئی۔

"رہ گئی ساجدہ بیگم"۔ پاشا نے شمسہ کی باقیماندہ تشویش دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تو ساجدہ کی تم فکر نہ کرو۔ یہ سمجھ لو کہ وہ اندھی بہری اور گونگی ہے وہ چوہدری یا کسی سے بھی کچھ میرے یا تمھارے بارے میں نہیں کہے گی۔ میں نے اس کی زبان پر مہر لگا رکھی ہے۔ وہ زیادہ سے ز۔ا۔ مجھے گالی دے گی۔ اور بس۔۔۔۔"

وہ کہتے کہتے اچانک چپ ہوا اور شمسہ اس کی باتیں سن کر دنگ رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے اور ساجدہ بیگم کے درمیان کس قسم کے تعلقات کی نوعیت بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تاہم وہ محسوس کر رہی تھی کہ پاشا اور بیگم ساجدہ کے درمیان بہت سی پر اسرار اور راز داری کی باتیں ہو سکتی ہیں۔ تاہم اس نے اپنے ذہن کو جھٹک دیا۔

"تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ"۔ شمسہ نے اپنی قوت ارادی کو مجتمع کر کے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا

"یقین کرو میں تمہیں کوئی نقصان پہنچائے بغیر یہاں سے چلا جاؤں گا۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "لیکن پہلے میری بات غور سے سن لو شاید دوبارہ تمہارے اور میرے درمیان یہ گفتگو نہ ہو سکے"۔

اس نے ایک لمحہ خاموشی اختیار کر کے شمسہ کو سوچنے کا موقع دیا۔ شمسہ بھی جیسے ایک لمحے کے لئے سوچ کی لہروں میں غوطہ لگا گئی۔ پاشا اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں شمسہ۔۔۔۔۔۔"

شمسہ چونکی۔۔۔ لیکن وہ بولتا چلا گیا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ میں ایک جوان آدمی ہوں تم ایک جوان اور خوبصورت

عورت ہو جس سے محبت کرنا کوئی حیران کن بات نہیں یقین کرنا میں تمہارے بھائی کے پاس جوا کھیلنے یا چوہدری کا سہارا بننے نہیں بلکہ صرف تمہارے لئے جاتا تھا تمہیں چھپ چھپ کے دروازے کی جھریوں اور کھڑکیوں سے دیکھنا میرا معمول تھا اور تم نے بھی یقیناً اس بات کا نوٹس لیا ہوگا"۔

شمسہ دم بخود اسے دیکھنے لگی اور پاشا نے اپنی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ "تمہارا بھائی لالچی آدمی تھا اس سے جب بھی میں نے تمہاری بات کی تو اس نے مجھے میرا منہ توڑ دینے کی دھمکی دی اور پھر وہ تمہیں جوئے میں ہار گیا۔ جس شخص نے تمہیں جیتا تھا اس سے آزاد کرانے میں کردار ادا کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تمہیں چوہدری جیسے بوڑھے اور قریب المرگ آدمی کے پلے باندھ کر جیتے جی بیوہ بنا دیا جائے-----"۔

"خاموش ش ش------" شمسہ نے اپنے جذبات کو کنٹرول کرتے ہوئے سسکی کے انداز میں پاشا کو ٹوکا۔

"بولنے دو مجھے ------ فاڑ آر نیور----" اس نے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر کہا۔ "جس آدمی نے تمہیں جیتا تھا وہ آگے لے جا کے تمہیں جوئے میں ہار دیتا۔ تباہ ہو جاتی تمہاری زندگی--- اس لئے میں نے تمہیں اس کے چنگل سے نکلوایا"۔

"تم نے آباد کرا دیا مجھے اب جاؤ"۔ وہ معنی خیز انداز میں ازراہ طنز بولی۔

"نہیں--- تمہیں آباد نہیں کرایا ہے لیکن تم برباد بھی نہیں ہوئی ہو"۔ پاشا وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے کچھ پتہ نہیں کس نے پہلے اور کس نے بعد میں مرنا ہے لیکن قانون قدرت کے مطابق اگر چوہدری ہفتوں کا نہیں تو مہینوں کا مہمان ہے۔ اس کی جان اٹکی ہوئی ہے وہ مخالف ہوا کا جھونکا بھی اب برداشت نہیں کر سکتا اور کسی بھی لمحے--- پاشا نے ہتھیلی پر ایک چڑیا سی بنا کر پھر سے اڑا دی۔ "فررررر۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو----" شمسہ تدبر اور بظاہر برہمی کے ساتھ بولی۔

"میں بتاتا ہوں-----" پاشا اور سنجیدہ ہو گیا۔ "چوہدری کی موت کے بعد تمہیں دھکے دے کے یہاں سے نکال دیا جائے گا"۔

"کون نکالے گا؟" وہ کھٹ سے بولی۔

"کوئی بھی نکال سکتا ہے"۔ پاشا نے کہا۔ "پہلے تو ساجدہ کے بھائی ہی نکال دیں گے جو چوہدری کی موت کے انتظار میں منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ تم تو یہ بھی ثابت نہیں کر سکو گی کہ تم اس کی

بیوی ہو۔ وہ ثبوت بھی صرف میں ہوں"۔

"کیا یہ بلیک میل ہے۔۔۔۔؟" شمسہ بولی۔

"نہیں۔۔۔۔۔!" پاشا نے بہت ملائمت سے جواب دیا۔ "یہ محبت ہے تمہیں اس وقت بھی ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ لیکن چوہدری کی موت کے بعد یہ ضرورت اور شدید ہو جائے گی اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہم ایک دن ضائع کئے بغیر شادی کر لیں گے"۔

"تم بکواس۔۔۔۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"سن لو میری بکواس غور سے۔۔۔۔" پاشا نے نہایت نرمی سے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے بولتے ہونٹ بند کئے۔ "چوہدری کی جو دولت بظاہر نظر آ رہی ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے ایک بٹا دس بھی نہیں کروڑوں روپے اس نے ادھر ادھر ملکی اور غیر ملکی بینکوں میں خفیہ طور پر رکھے ہوئے ہیں جن کا میرے سوا کسی کو علم نہیں اور چوہدری کی موت کے بعد یہ ساری رقم ڈمپ ہو جائے گی اسے تم حاصل کر سکتی ہو، میری مدد کے ذریعے۔۔۔۔" پاشا کہتے کہتے چپ ہو گیا اور شمسہ سوچ میں پڑ گئی۔

"زیادہ مت سوچو شمسہ"۔ وہ پیار بھرے لہجے میں مخاطب ہوا۔ "میں تم سے ایسی کوئی چیز نہیں مانگ رہا ہوں جو تمہارے بس میں نہ ہو۔ تمہیں کوئی ایسی چیز نہیں دے رہا ہوں جس کی تمہیں ضرورت نہ ہو۔ محبت کے بدلے میں مجھے تمہاری محبت چاہئے۔ ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی بن سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کا مستقبل بن سکتے ہیں۔ زندگی بھی صرف ایک بار ملتی ہے جوانی بھی صرف ایک بار ملتی ہے اور صرف ایک بار ملنے والی چیز کو ضائع نہیں کر دینا چاہئے۔ تمہاری مثال تیل سے لبالب ایک ایسے چراغ کی ہے میں بھی تمہاری طرح ایک چراغ ہوں۔ لیکن روشن چراغ۔۔۔۔ آؤ چراغ سے چراغ جلائیں شمسی۔ اور جوانی کی اس گھپ اندھیری رات کو روشن کر دیں"

پاشا پھر خاموش ہوا شمسہ بھی چپ چاپ دم بخود تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ پاشا کی لچھے دار باتوں کے طلسم میں الجھ گئی ہے۔ اس دوران ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ لیکن شمسہ گھنٹی کی آواز سے بے خبر سوچ میں ڈوبی رہی اور پاشا بھی ٹیلی فون سے بے نیاز بڑی یگانگت اور انہماک سے شمسہ کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ تین چار گھنٹیاں بجنے پر شمسہ نے ٹیلیفون کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ ریسیور کی جانب بڑھایا لیکن پاشا نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کو دبا کر ریسیور سے الگ کر دیا اور فاصلے سمیٹ کر بڑی یگانگت سے بولا۔

"اوں ہوں، بجنے دو گھنٹی" ۔اور گھنٹی بجتی رہی۔۔۔۔!

روشو نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک کے بعد ایک سبق یاد کرلیا۔ پہلی کا قاعدہ، دوسری کی اردو کتاب، انگریزی ورک بک، گنتی، ٹیبلز، انگلش ریڈر، پھر تیسری جماعت کی کتابیں پکڑلیں اور اس طرح فر فر پڑھنے اور یاد کرنے لگا جیسے اس کا دماغ نہیں کمپیوٹر ہو۔ شاہینہ تو اپنے طے شدہ وقت کے مطابق اسے پابندی سے پڑھاتی ہی تھی لیکن وہ خود بھی اسباق کو ہر وقت ذہن میں رکھتا۔ جب بھی کام کاج سے فرصت ملتی وہ کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں اٹھالیتا۔ کتابوں کے علاوہ وہ جنرل نالج کے اکثر اور اپنی عمر سے بڑے سوال پوچھتا رہتا اگر کسی سوال کا جواب شاہینہ کے پاس نہیں ہوتا تو بیگم سے مدد حاصل کرتا۔ یہاں تک کہ خانساماں سے پوچھتا گیٹ کے بوڑھے چوکیدار سے، اس کے تجربے اور علم کے مطابق سوالات کرتا۔ بلکہ ماسی، بھنگن اور مالن سے بھی جو باتیں پوچھنے کی ہوتیں بغیر پوچھے نہ رہتا۔ تاہم چوہدری صاحب سے وہ ہمیشہ خوف زدہ رہتا اور کم سے کم ان کے قریب جانے کی کوشش کرتا اور اسی وجہ سے شمسہ اور روشو کے درمیان بھی ایک فاصلہ سا قائم رہا۔ تاہم بیگم ساجدہ نے روشو اور شاہینہ کو ایک نگاہ سے دیکھا، روشو کو ممتا بھری محبت دی اور ماں ہی کی طرح اسے آداب سکھائے اور تربیت دینے کی کوشش کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیگم ساجدہ نے ایک مشن بنالیا تھا کہ اس بچے کو اس قابل بنا دینا ہے کہ زندگی میں آگے جاکر کوئی بہت اہم اور بڑا کردار ادا کرے۔

اس رات تو ایک بڑے آدمی کو ٹی وی پر دیکھ کر روشو بہت ہی زیادہ متجسس جذباتی اور پر عزم ہوگیا۔ کچھ دیر پہلے ملازمین فارغ ہوکر اپنے سرونٹ کواٹرز میں چلے گئے تھے۔ چوہدری صاحب کے بیڈ روم پر سرخ لائٹ تھی اور ٹی لاؤنج میں بیگم ساجدہ، شاہینہ، اور روشو بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے کہ ٹی وی پر ایک رنگا رنگ تقریب شروع ہوئی۔ امریکہ کا نیا صدر افتتاحی تقریب کا آغاز کر رہا تھا اوسٹرم پر متعدد مائیکروفون نصب تھے۔ عوام کا ایک بڑا منظم ہجوم صدر کے اطراف تھا ٹیلی ویژن کے کیمرے متحرک تھے اور پریس فوٹو گرافروں کے کیمروں کی چمک نے گہرے بادلوں کے اندر مسلسل چمکنے اور چھب دکھلانے والی بجلیوں کا سا سماں پیدا کر رکھا تھا۔

"امی۔۔۔۔" روشو ایک طلسماتی کیفیت میں کھویا ہوا آہستہ سے پکارا۔ اس نے بیگم ساجدہ نہیں، "بیگم جی" کی بجائے "امی" کہنا شروع کر دیا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔۔۔۔ بیگم ساجدہ بھی ٹی وی میں کھوئی ہوئی تھیں" یہ دنیا کا سب سے بڑا آدمی ہے۔۔۔۔۔۔۔؟" روشو نے پوچھا۔

"ہوں۔" بیگم سوچ میں پڑ گئی اور پھر بولی۔ "کہہ سکتے ہو۔۔۔۔۔ کم از کم اپنے ملک کا تو سب سے بڑا آدمی ہے۔"

"صدر سب سے بڑا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔؟" روشو نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔۔۔صدر جو ہوتا ہے۔" بیگم نے جواب دیا۔

"کیا میں صدر بن سکتا ہوں۔۔۔۔۔؟" روشو نے اچانک سوال کیا۔ روشو کے اس طرح کے سوالات بیگم ساجدہ کیلئے نئے اور انوکھے نہیں تھے۔ وہ اکثر اپنے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔ کبھی ڈاکٹر بننے کی خواہش ظاہر کرتا، کبھی انجینئر بننے کی، کبھی وکیل، کبھی پائلٹ، کبھی افسر، کبھی فوجی، کبھی کھلاڑی لیکن صدر بننے کی آرزو اس نے پہلی مرتبہ ظاہر کی تھی۔

"نہیں بن سکتا ہوں نا؟" بیگم ساجدہ کو خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی جواب دیا۔ "میرا مطلب ہے اپنے ملک کا۔"

"کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔" بیگم نے قدرے وضاحت کے ساتھ جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے۔۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے چپ ہوا تو شاہینہ کھٹ سے روشو پر برسی۔

"پاگل ہے تو۔۔۔۔۔"

"شاہینہ" بیگم نے شاہینہ کو ٹوکا۔

"امی یہ ہر وقت خوابوں اور خیالوں میں اڑتا رہتا ہے" شاہینہ نے طنز کیا۔

"امی اس کو بتائیں کہ خواب حقیقت بھی ہو سکتا ہے۔" وہ پر عزم لہجے میں بولا اور پھر امی سے مخاطب ہوا۔ "ہو سکتا ہے نا امی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" بیگم نے پھر حوصلہ افزائی کی۔ اور واقعی جیسے دیکھتے دیکھتے اس کا خواب ایک حقیقت بن گیا۔ اس کے شبانہ روز محنت کے سفر کے لانگ مارچ نے اس کے جذبہ شوق کی لگن نے اور مطالعہ علم اور آگہی کی جستجو نے اسے جہالت گمنامی اور ذلت کی کھائیوں سے نکال کر عزت و وقار کی بلند و بالا رفعتوں پر بٹھادیا۔ اس نے بچپن کی وادیوں کو پیچھے چھوڑا۔ جوانی کی چند بہاریں عبور کیں اور درمیانی عمر کی دہلیز پر جب پہنچا تو عالی مرتبت مرتبے کا تاج اس کے سر پر تھا۔ اس نے وکالت کی، استاد بنا، پولیس میں گیا، افسر ہوا، تجارت کا پیشہ اختیار کیا، پیسہ کمایا پوری دنیا

گھوم کے دیکھی، جہازوں کا سفر، کاریں، بنگلے، باغ باغیچے، سب کچھ اس نے حاصل کر لیا اور شہر والوں نے مل کر اسے عزت دی۔ الیکشن میں کھڑا کیا اور مسند صدارت پر بٹھا دیا۔ اور جب پہلی مرتبہ اس نے اپنے اطراف عوام کا ایک ہجوم دیکھا، اپنے سامنے لگے اسٹروم پر مائیکروفونوں کا جمگھٹا دیکھا اور پریس فوٹو گرافروں کے کیمروں کی بجلیاں ایک ساتھ اس کے چہرے پر چمکیں تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا اور اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی اس کی زندگی کی ساتھی شاہینہ نے اگر آہستہ سے اس کا ہاتھ نہ دبا دیا ہوتا تو وہ وفور جذبات سے اتنے سارے لوگوں کے سامنے شاید رو پڑتا۔ اس نے ایک پھسلتی سی نگاہ شاہینہ کے چہرے پر ڈالی۔ وہ آج اسے زیادہ بردبار اور پر وقار دکھائی دے رہی تھی اور اس کے کانوں کے بالوں کی ایک لٹ پوری سفید ہو جانے کے باوجود خوبصورت لگ رہی تھی اور ساتھ ہی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ شاہینہ کی جوانی ڈھل گئی ہے لیکن جوانی صرف شاہینہ کی نہیں ڈھلی تھی روشو عرف محمد روشن کی جوانی کی دہلیز پر بھی بڑھاپے نے دستک دے دی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اپنے سر کے بال بھی کھچڑی ہو گئے ہیں۔ لیکن اسے رتبہ بھی تو ملا ہے۔ اتنا بڑا رتبہ انسان کو عنفوان شباب میں تو نہیں ملتا ہے۔ اس نے اپنی سوچ کا تسلسل توڑا اور مائیک کی طرف متوجہ ہوا۔

"خواتین و حضرات۔۔۔۔" اس نے مائیکروفون پر تقریر شروع کی۔ لیکن اسے غالباً نہیں معلوم تھا کہ مائیکروفونوں کا تعلق ادھر ادھر لگے ہوئے ان گنت لاؤڈ اسپیکروں سے ہے۔ اس کی آواز شش جہت گھوم گئی۔ گنبد کی آواز کی طرح پلٹ پلٹ کر آنے لگی۔ اس نے اردو بولتے بولتے انگریزی شروع کر دی پھر انگریزی بولتے بولتے اردو بولنے لگا۔ اردو انگریزی، انگریزی اردو سب آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئیں لاؤڈ اسپیکر سے لاؤڈ اسپیکر کی صدا ٹکرانے لگی۔ لوگوں کی داد تحسین، تالیاں، ہنگامہ، شور شرابا اور روشن روشن کے نعروں کے درمیان وہ بولتا جا رہا تھا۔ اسے خود اپنی انگریزی پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کس طرح اتنی روانی سے بول رہا ہے۔ شاہینہ حیرت سے اس کا منہ تک رہی تھی اور فخر سے اس کے چہرے پر سرخی آگئی تھی۔ یہ وہی شاہینہ تھی جو کبھی بچپن میں اس کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور شکستہ جملوں پر مضحکہ خیز طریقے سے قہقہے لگایا کرتی تھی لیکن وقت وقت کی بات ہے۔ وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ شاہینہ حوصلہ افزائی کیلئے اس کے پہلو میں تھی۔ عوام کا جم غفیر اس کے سامنے اور اطراف میں تھا۔ مائیکروفونوں کا جمگھٹا تھا، کیمروں کا اژدہام تھا، فلیش گنوں کی بجلیاں، پھلجھڑیوں کی طرح چمک رہی تھیں پھر کیا ہوا کہ ایک کیمرہ مین کیمرہ لے کر اس کے سامنے آیا۔ تصویر لینے کیلئے شست باندھی اپنے کیمرے کی فلیش گن کو کھولا تو ایک شعاع

کیمرے کے اندر سے نکلی اور بجلی کے کرنٹ کی طرح اس کے چہرے پر ساکت ہوگئی۔ وہ بولتے بولتے رکا۔ بے چینی محسوس کی، کسمسایا لیکن کیمرے کی شعاع اس کے چہرے پر منجمد ہوگئی تھی۔ وہ بہت گڑبڑایا۔ کیمرہ سامنے سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ شعاع اس کے چہرے کو جلا رہی تھی۔ ایک ہی مرکز پر۔ ہٹاؤ اس کو سامنے سے ----- "وہ فوٹوگرافر پر چلایا، "ہٹاؤ"۔

"ہٹاؤ، ہٹاؤ، ہٹاؤ ------ لاؤڈ اسپیکر پر چاروں طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں اور پھر ایک بے ہنگم شور بپا ہوگیا ہر جانب افراتفری کا عالم پیدا ہوگیا۔ شعاع کسی چنگاری کی طرح اس کی جلد کو جلا رہی تھی۔ اس سے برداشت نہ ہوسکا اور اس نے ایک زور دار چیخ ماری۔ اور بیدار ہوگیا وہ پھر ایک بچہ تھا ----- معصوم بے ضرر سا بڑے آدمی کا خواب دیکھنے والا بچہ، اس نے نیند سے بوجھل آنکھ کھولی تو روشن دان سے آنے والی سورج کی کرن براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی جو خواب میں کیمرے کی شعاع بن گئی تھی اور حبس کی وجہ سے وہ کافی دیر سے بے چین ہو رہا تھا اس نے جلدی سے اٹھ کے دروازہ کھولا اور کوٹھی کے باہر لان میں ایک نگاہ ڈالی۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ کوٹھی میں سناٹا تھا غالباً سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں مصروف تھے۔ وہ بھی تھوڑی ہی دیر پہلے کام کاج سے فارغ ہوکر انیکسی میں آن سویا تھا اور کچی کچی نیند میں ایک سہانے خواب کا محل تعمیر کر رہا تھا جو پلک کی جنبش کے ساتھ ریت کی دیوار طرح مسمار ہوگیا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے سوچا خواب خواب ہے، حقیقت حقیقت ہوتی ہے۔ جو بات خواب میں نہیں ہوسکی وہ میں حقیقت میں پوری کروں گا۔" اس نے دل ہی دل میں ارادہ کیا اور نیند کا بوجھل پن دور کرنے کی خاطر نہانے کیلئے باتھ روم میں چلا گیا۔

نہا دھو کر جب وہ تازہ دم ہوکر باتھ روم سے نکلا تو اس نے محسوس کیا کہ کوٹھی میں ابھی جانا قبل از وقت ہوگا۔ اس نے پڑھنے کا موڈ بھی نہیں بنایا۔ کہ تھوڑی دیر بعد شاہینہ کے پاس جا کے اس نے پڑھنا ہی تو ہے۔ لہٰذا وہ وقت گزاری کیلئے کمرے کی دیوار میں نصب ایک بڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے چہرے کو بہت قریب سے اور غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے کیمرے کا سنگل کلوز شاٹ ہو۔ وہ بڑے انہماک سے اپنا چہرہ دیکھ ہی رہا تھا کہ اسے اچانک اپنے عقب میں کسی کے قدموں کی نرم رو آہٹ سنائی دی جیسے کوئی دبے پاؤں اندر آیا ہو۔ اس سے پیشتر کہ وہ پلٹ کر پیچھے دیکھتا کسی نے آہستہ سے ہلکا سا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔

"اوں ہوں۔ مڑنا نہیں۔" یہ شاہینہ کی آواز تھی اور اب آئینے میں روشو کے چہرے کے کلوز کے ساتھ شاہینہ کا چہرہ بھی شامل تھا۔ جیسے ٹی وی کے کیمرے کے فریم میں دو کرداروں کے

چہرے کا ایک ساتھ ایک شاٹ لیا جاتا ہے۔ دونوں آئینے ہی کے اندر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے روشو شاہینہ کو دیکھ رہا تھا اور شاہینہ روشو کی جانب نظریں مرکوز کئے تھی۔۔

"بتاؤ۔ کون زیادہ خوبصورت ہے۔" شاہینہ نے روشو کی نیلی آنکھوں میں اپنی بھوری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تم بتاؤ۔۔۔۔۔" شاہینہ بھی آئینے ہی میں بولی۔

"میں بتاؤں۔۔۔۔؟" روشو نے ایک بھرپور لیکر، معصوم نظر سے آئینے ہی کے اندر شاہینہ کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "نہیں تم زیادہ خوبصورت ہو۔۔۔" شاہینہ نے فوراً تردید کر دی۔ روشو واقعی بہت خوبصورت اور وجیہہ لگ رہا تھا لیکن شاہینہ بھی دلکشی میں کم نہیں تھی۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" روشو نے ایک معصوم ضد کی۔ "میں تم سے خوبصورت ہو ہی نہیں سکتا۔"

"کیوں۔۔۔۔" شاہینہ نے ازراہ حیرت پوچھا۔

"نوکر مالک سے زیادہ خوبصورت کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔؟" روشو بے ساختہ بولا اور شاہینہ اس جواب سے سناٹے میں آگئی جیسے روشو نے ایک گالی دے دی ہو۔ دوسرے ہی لمحے اس پر غصے کی وجہ سے کپکپی سی چھا گئی وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکی اور لرزیدہ آواز میں چلانے لگی۔

"تم کمینے ہو۔۔۔۔ گھٹیا انسان ہو۔۔۔۔ تمہیں جراءت کیسے ہوئی۔۔۔۔۔ یو اسٹوپڈ۔۔۔۔ ایڈیٹ۔۔۔۔۔۔ہاؤ ڈیئر یو۔۔۔۔۔"

"شاہینہ۔۔۔۔۔شاہینہ۔۔۔۔۔ میری بات سنو شاہینہ۔" وہ التجا کرنے لگا۔

"تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہاری بات سنی جائے۔۔۔۔۔۔" شاہینہ نے اپنی آواز پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔

"مجھ سے غلطی ہو گئی۔۔۔۔۔" وہ شاہینہ کا غصہ دیکھ کر ازراہ تاسف بولا۔

"تم نے یہ سوچا کیسے۔ کون سی بات ہے تم میں نوکروں والی اور مجھ میں مالکوں والی۔" وہ آبدیدہ ہو کر بولی۔

"میں نے کہا نا مجھ سے غلطی ہو گئی۔۔۔۔۔" وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں اعتراف کرتے ہوئے بولا۔ "سوری"۔

"پھر ایسی بے وقوفی کی بات نہ کرنا۔۔۔۔" اس نے معاف کر دینے کے انداز میں کہا اور سر جھکا کے واپس دروازے کی طرف مڑی۔

"شاہینہ ----" روشو نے اسے عقب سے پکارا۔ شاہینہ دوبارہ مڑی۔ "ایک اور بات کہوں"۔ روشو نے قدرے ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے کہا۔ شاہینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"برا تو نہیں مانوگی۔" روشو نے دوبارہ پوچھا۔

"کیا بات ہے" شاہینہ نے پوچھا۔ "پہلے بات تو بتاؤ۔"

"یہ وہ والی بات نہیں۔ سچ ہے شاہینہ۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"لیکن بات بتاؤ تو سہی----" شاہینہ نے تجسس سے بولی۔

"تم مجھ سے زیادہ خوبصورت ہو۔" وہ اعتماد سے بولا----" وہ ایک دم سے بولا اور پھر قدرے ڈرے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "یہ مالک نوکر والی بات نہیں سچ ہے شاہینہ----" اس نے حتمی طور پر کہا۔ "یقین کرو تم مجھ سے بہت زیادہ خوبصورت ہو۔"

"سچ---" اب کے شاہینہ کی آنکھوں میں اعتماد اور افتخار کی چمک تھی۔

"ہو نہہ------ یہ بالکل سچ ہے۔ تم بہت خوبصورت ہو۔" وہ اعتماد اور یقین کے ساتھ بولا۔

"اگر میں تم سے بھی خوبصورت ہوں تو اس کا مطلب ہے میں بہت خوبصورت ہوں۔" شاہینہ اترا سی گئی دونوں نے معصوم بچوں نے بڑی گہری نظروں سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور جیسے ایک لمحے میں دونوں کی نگاہوں نے بچپن کی سرحد عبور کر لی ہو۔

O

شیرو ابھی تک روشو کی تلاش میں پاگلوں کی طرح سرگرداں تھا اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کی متاع عزیز کھو گئی ہے' جسے دوبارہ حاصل کرنا اس کی انا کا بھی اور بقا کا بھی مسئلہ تھا۔ وہ ہر اس کار میں دیوانہ وار لپکتا اور جھانکتا جس میں اسے کوئی بچہ یا بچے بیٹھے دکھائی دیتے۔ اب وہ ذہنی طور پر اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ اس کا بھیک میں، خیرو میں، بختو میں بلکہ شاداں میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ اس دن بھی صبح صبح اس نے خیرو کو بختو کے سپرد کیا اور خود حسب معمول شیرو کی تلاش میں نکل پڑا۔ بختو خیرو کو گود میں اٹھا کے دوسری سمت مانگنے کے لئے چلی گئی۔ اس دن خیرو کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ افیون کی دہری خوراک بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی اور وہ بختو کی گود میں مسلسل کلبلا رہا تھا اور خیرو کے چہرے کی کیفیت اور اس کی بے چینی سے اگرچہ ٹھیک ٹھاک پیسہ بختو کو مل رہا تھا لیکن بختو خوش نہیں تھی ہر چند کہ وہ روشو کی طرف سے پریشان نہیں

تھی بلکہ اسے اطمینان تھا کہ بھاگ گیا ہے اور جہاں کہیں بھی ہوگا سکھ کی روٹی کھا رہا ہوگا اور شیرو کی دسترس سے آزاد ہوگا لیکن وہ خیرو کی وجہ سے بہت پریشان تھی اور خیرو کے سڑتے اور رستے ہوئے زخم اور بگڑتی ہوئی حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ مانگتے مانگتے غیر ارادی طور پر ایک جگہ جب اسپتال کے دروازے پر پہنچی تو ایک ڈاکٹر اچانک پاس سے گزرتے ہوئے رکا اور ایک لمحہ ہمدردی سے خیرو کو دیکھ کر بختو سے کہا اس کو اندر لے آؤ۔

"جی"۔۔۔۔۔۔وہ چونکی لیکن ڈاکٹر کہہ کر آگے نکل گیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب کہہ گئے ہیں اس کو اندر لے آؤ"۔۔۔۔۔ پاس ہی کھڑے کسی مریض نے بختو کو بتایا۔ "وہ بیٹھے ہیں سامنے"۔ بختو بچے کو لے کر اندر ڈاکٹر کے پاس جا پہنچی۔ اس وقت وہ یہی سمجھی تھی کہ شاید ڈاکٹر ترس کھا کر کچھ خیرات دینا چاہتا ہے۔

"بیٹھو"۔۔۔۔ ڈاکٹر نے اپنے سامنے رکھے ہوئے اسٹول پر بختو سے بیٹھنے کو کہا اور جب بختو بیٹھی تو ڈاکٹر نے مفصل طبی معائنہ کیا۔ احوال پوچھا اور پرچی لکھ کر بختو کو تھماتے ہوئے کہا۔

"اسے داخل کرا دو سرجری ہوگی اس کی۔۔۔۔۔۔"

"جی کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔"وہ کچھ نہ سمجھی۔

"بہت زیادہ خراب ہو گیا ہے اس کا کیس۔ آپریشن ہوگا۔" ڈاکٹر نے سمجھایا۔

"آپریشن۔۔۔۔۔" وہ چونکی۔ "اس کا باپ۔۔۔۔۔۔"

"اس کا باپ کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"مر گیا ہے۔" وہ بے اختیار بولی۔

"چچ چچ۔۔۔۔۔" ڈاکٹر از راہ ترحم بولا اس کو داخل کرا دو۔ ڈاکٹر نے پرچی دیتے ہوئے کہا۔

"اسلم اسے لے جاؤ وارڈ چھ میں"۔ ڈاکٹر ایک وارڈ بوائے سے مخاطب ہوا

"آ جاؤ میرے ساتھ۔۔۔۔۔" وارڈ بوائے نے بختو کے ہاتھ سے پرچی لے کر کہا۔

"لیکن وہ آپریشن کے پیسے۔۔۔۔۔۔" بختو نے پس و پیش کی۔

"کوئی بات نہیں ہو جائے گا آپریشن اس کا۔۔۔۔۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تم لے جاؤ اسے وارڈ میں۔"

وہ بادل نخواستہ وارڈ بوائے کے ساتھ ساتھ وارڈ کی طرف روانہ ہو گئی۔ یہ جانتے ہوئے کہ جب شیرو کو پتہ چلے گا تو وہ اسے جان سے مار دینے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ "اللہ مالک ہے۔"

بختو نے سوچا اور وارڈ میں داخل ہوگئی۔!

O

اس دن کوٹھی کے اندر ایک بہت عجیب اور غیر متوقع بات ہوگئی جس نے کوٹھی کے مکینوں کو ہلا کے رکھ دیا۔ ویسے بھی کوٹھی کے اندر کچھ دن سے ان دیکھی تبدیلیاں آرہی تھیں جنہیں سب محسوس کر رہے تھے لیکن دیکھ کوئی نہیں رہا تھا اور نہ کوئی بات کر رہا تھا چوہدری مکرم اکثر گھر سے باہر جانے لگے تھے اور پاشا کی آمد و رفت میں اضافہ ہوگیا تھا اور بیگم ساجدہ اس بات کو شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ شمسہ یکلخت نکھر گئی ہے اور بہت زیادہ خوش رہنے لگی ہے اور ظاہر ہے چوہدری نے شمسہ کے اندر پائی جانے والی اس تبدیلی کو محسوس کیا تھا۔

"کیا بات ہے تم آج کل بہت خوش نظر آتی ہو۔۔۔۔۔" ایک دن چوہدری نے اس سے پوچھا

"کیا مجھے خوش نہیں ہونا چاہئے۔۔۔۔۔" شمسہ نے اترا کر جواب دیا۔

"ہونا چاہئے۔۔۔۔۔ لیکن اچانک خوش ہونے کی وجہ۔۔۔۔" چوہدری نے تجسس ظاہر کیا۔

"بتاؤں؟۔۔۔۔۔" شمسہ نے ادا سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔" چوہدری نے اپنے ہلتے ہوئے سر کو اور محبت سے ہلایا۔

"ایک شرط پر بتاؤں گی۔۔۔۔" وہ اٹھلاتے ہوئی بولی۔ "پہلے تم مرغا بنو"۔

"اوں ہوں۔۔۔۔ ناں۔" چوہدری کسی ننھے بچے کی طرح ضد کرنے لگا۔ میں نہیں بنوں گا۔"

"پھر میں دوبارہ اداس ہوجاؤں گی۔۔۔۔۔۔۔" وہ نخرہ دکھاتے ہوئے بولی۔

"ارے، نہیں نہیں نہیں۔۔۔۔۔ یہ نہ کرنا۔ لو میں بن گیا مرغا۔۔۔۔" چوہدری نے اپنی ٹانگوں کے بیچ میں سے ہاتھ نکالے اور زمین پر مرغا بن گیا۔

"شاباش۔۔۔۔" شمسہ نے داد دی اور کھکھلا کر ہنسنے لگی۔ "پیچھے سے اونچے ہوجائیں شاباش۔" اس نے ہدایت دی اور چوہدری تھوڑا سا اونچا ہوگیا اور اس کے جسم پر اس طرح کپکپی طاری تھی جیسے کسی کھٹارا گاڑی کے انجن اسٹارٹ ہونے سے اس کے بانٹ اور باڈی میں کپکپاہٹ ہوتی ہے۔!

"بس۔۔۔۔" چوہدری نے ہانپتے ہوئے اجازت مانگی۔

"اوں ہوں۔۔۔۔ بانگ تو تم نے دی نہیں۔۔۔ بانگ دو پہلے۔" شمسہ نے مضحکہ خیز

انداز میں حکم دیا۔

"ککڑوں کوں کوں۔۔۔۔۔۔" چوہدری نے پھولی ہوئی بڈھی اور بلغم زدہ آواز میں مرغا بنے بنے بانگ دی۔

"شاباش، یہ ہے وہ چوہدری۔۔۔۔ جس کی اس کمرے سے باہر اتنی دہشت ہے۔" وہ تنک کر بولی۔

"اٹھ جاؤں۔۔۔۔۔وہ نقاہت سے تقریباً نیچے بیٹھ گیا۔

"اٹھ جاؤ۔۔۔۔۔" شمسہ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے چوہدری کو اپنے طلسم سے مکمل طور پر مٹھی میں کر لیا ہے۔

"اب بتاؤ۔۔۔۔۔ تم اتنی خوش کیوں ہو؟" وہ اپنے نفس کو قابو کرتے ہوئے واپس اپنے سوال پر آیا۔

"میں اس لئے خوش ہوں کہ۔۔۔۔" وہ اٹک اٹک کر نازو ادا سے بولی۔ "جس عورت کو۔۔۔

۔ تم جیسا شوہر ملے گا۔۔۔۔ تو وہ۔۔۔۔ اگر خوش نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ تو کیا ہوگی۔۔۔۔۔ ہے نا سچ۔"

"ہاں تم تو کبھی جھوٹ بول نہیں سکتی ہو۔" وہ فرط محبت سے مزید کانپ گیا۔ معاً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی شمسہ نے بڑھ کر ٹیلی فون اٹھایا۔

"ہیلو ایک منٹ۔۔۔۔" پھر وہ چوہدری سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تمہارا فون ہے"۔

"ہیلو" ۔۔۔۔ چوہدری نے ریسیور پکڑا کوئی کاروباری بات تھی اس نے مختصر سی ہوں ہاں کی اور پھر بولا "ٹھیک ہے میں رقم بھجواتا ہوں" ۔ اس نے ریسیور رکھا۔ شمسہ سے ایک منٹ کی اجازت لے کر تجوری کے تالے کے نمبر گھمائے اسے غیر مقفل کیا اور جب تجوری کو کھولا تو دھک سے رہ گیا۔ اس کے وجود پر جیسے کوئی بم گرا۔

"شمسہ" وہ گرجا۔

"کیا بات ہے جان من۔" شمسہ انتہائی پیار سے مخاطب ہوئی۔ سیف کس نے کھولا تھا۔" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔۔۔۔۔" وہ معصومیت سے بولی۔ "تم نے تو کبھی لاک کا نمبر بھی مجھے نہیں بتایا۔ لیکن ہوا کیا ہے۔"

چوری۔۔۔۔۔۔ ڈاکہ۔" وہ چلایا۔ "سیف میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے لاکھوں روپے کا صفایا ہو گیا" ۔ اس کی آواز غصے میں اور زیادہ لرز گئی تھی

"لیکن ۔۔۔۔" شمسہ نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن چوہدری کے اعصاب جواب دے چکے تھے ۔ وہ حواس باختہ ہو گیا۔

"میں سب کو جہنم میں داخل کر دوں گا" ۔۔۔۔ وہ گرجا اور ایک منٹ ضائع کئے بغیر برگلرز الارم بجا دیا اور دوسرے ہی منٹ وہ ایک انتہائی ہیبت ناک چوہدری بن چکا تھا۔

الارم کے بجتے ہی پورے گھر میں ایک افراتفری سی مچ گئی ۔ شمسہ گھبرا گئی ۔ بیگم ساجدہ پریشان ہو گئی ۔ خانساماں، ماسی، بھنگن، مالن، بڈھا چوکیدار سب کی روح فنا ہو گئی لیکن بچے پھر بچے ہوتے ہیں لہذا روشو اور شاہینہ دونوں گھر کے اندر ہو جانے والی اس واردات اور واردات کے نتیجے میں پیدا ہو جانے والی افراتفری سے بالکل بے خبر کوٹھی کے باغ میں کھیل رہے تھے ۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے ۔ روشو تھک کر ایک جگہ رک گیا اور سانس ٹھیک کرنے لگا شاہینہ دور ایک درخت کے عقب سے نمودار ہوئی۔ اس کی سانس بھی پھولی ہوئی تھی۔

"مجھے پکڑ کر دکھاؤ تب مانوں گی ۔۔۔۔" شاہینہ نے چیلنج کیا۔

"میں پکڑ لوں گا ۔۔۔۔" روشو دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر چوکس ہوا

"اور اگر نہ پکڑ سکے تو" ۔۔۔۔ شاہینہ نے بھی بھاگنے کی تیاری کر کے پھر چیلنج کیا۔

"جو چور کی سزا وہ میری" ۔ روشو بے ساختہ بولا۔ اور اس سے پیشتر کہ وہ شاہینہ کو پکڑنے کے لئے لپکتا عقب سے ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

"پکڑ لو یہ رہا لڑکا۔"

روشو چونکا ۔ پلٹ کر دیکھا تو چوہدری صاحب کھڑے تھے اور ان کے ساتھ پولیس تھی۔ شاہینہ کی بھی جیسے جان نکل گئی۔

"بابا ۔۔۔۔" وہ آگے بڑھی ۔ "یہ کیا کر رہے ہو بابا۔"

"تم الگ رہو۔" چوہدری نے شاہینہ کو پرے دھکیلا اور روشو دم بخود ہو گیا۔

"دیکھو بھاگنے نہ پائے" ۔۔۔۔ سب انسپکٹر کی تحکمانہ آواز ابھری اور اس سے پیشتر کہ روشو کچھ سوچتا ایک پولیس والے نے جھپٹ کر روشو کو گردن سے دبوچا اور کلائی تھام لی ۔ شاہینہ کی ہچکی بندھ گئی ۔!

۸
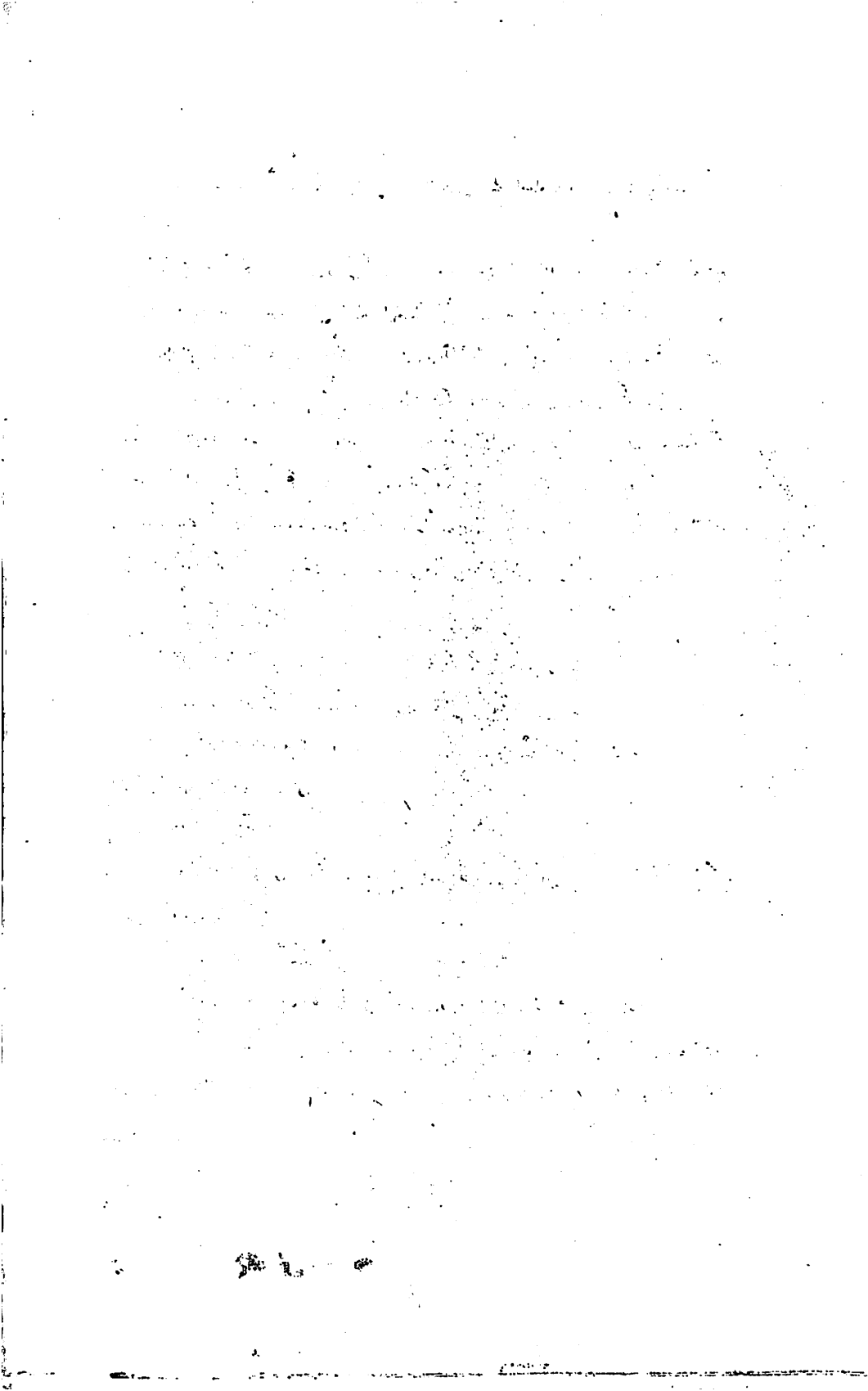
روشو سناٹے میں آ گیا۔

پولیس والے کا ایک فولادی ہاتھ اس کی گردن پر تھا اور کلائی اس کے پنجے میں جکڑی ہوئی تھی وہ حیران، دم بخود، پھٹی پھٹی آنکھوں سے شلپنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ دنیا کی بے ثباتی نے اسے حیران کر دیا تھا کہ ایک منٹ پہلے جس گارڈن میں وہ اس قدر خوش باش اور مسرور تھا اسی باغ میں وہ ایک منٹ کے اندر اندر بغیر کسی وجہ اور گناہ کے پولیس کی گرفت میں آ گیا۔ اور پتہ نہیں آگے کیا ہونا تھا۔ جانے کیا کیا اسے دیکھنا تھا۔ خدا کی زمین اسے انتہائی تنگ اور غیر محفوظ معلوم ہونے لگی۔

"چلو آگے۔" پولیس والے نے اسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"میرا قصور۔۔۔۔۔؟" اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے پولیس والے کو دیکھا۔ ہچکیاں لیتی ہوئی شلپنہ پہ نگاہ ڈالی اور پھر چوہدری صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"آہا۔۔۔۔۔" چوہدری صاحب غصے میں بولے "اسے اس کا قصور بتاؤ۔ کتنا بھولا ہے یہ اسے قصور بھی معلوم نہیں۔ لے جاؤ اسے"۔

"چل آگے"۔ پولیس والے نے پھر ایک جھٹکا روشو کے بازو کو دیا اور آگے گھسیٹا۔

"ٹھہر جاؤ!" بیگم ساجدہ مکرم کو جب پتہ چلا تو دیوانہ وار دوڑتی ہوئی آئیں اور دیوار بن کر پولیس اور روشو کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔ اتنے میں شمسہ بھی دھیرے دھیرے باہر نکل آئی۔ خانساماں، ماسی، مالن، بھنگن، چوکیدار سب جمع ہو گئے۔ اور کچھ فاصلہ قائم کر کے ڈرے سہمے کھڑے ہو گئے۔ کپکپاتا چوہدری، غصے میں اور زیادہ لرزہ براندام ہو گیا تھا۔

"" یہ تمہارا کام نہیں ہے بیگم"۔ وہ برہم لہجے میں بولے۔ "ہٹ جاؤ سامنے سے"۔
"اسے کیوں پکڑ رہی ہے پولیس"۔ وہ اور تن کر کھڑی ہو گئی۔ چوہدری کا خون کھول گیا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ کچھ عرصہ سے ساجدہ بیگم بہت زیادہ دلیر ہوتی جا رہی ہے اور ہر طرح کی صورتحال کیلئے تیار نظر آتی ہے لہذا وہ غصہ پی کر بولا۔ "تمہیں نہیں معلوم؟"
"نہیں، مجھے نہیں معلوم"۔ اس نے قطعی طور پر بے خبری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
"گھر میں اتنی بڑی واردات ہو گئی۔ اور تمہیں کچھ معلوم نہیں"۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولے۔
"اس واردات کا روشو سے کیا واسطہ"۔ بیگم نے کہا۔
"کون ہو سکتا ہے سیف کھولنے والا"۔ انہوں نے استفسار کیا۔ "کیا میں اپنی بیگمات پر شبہ کروں"۔
"کیا اور کوئی نہیں ہے جس پر شبہ کیا جا سکے"۔ ساجدہ بیگم نے سوال کیا۔
"کیا آپ کو کسی اور پر شبہ ہے۔"۔ معاً پولیس انسپکٹر دلچسپی لیتے ہوئے بیچ میں بول پڑا۔
"ہاں"۔ وہ آہستہ سے بولیں۔
"نہیں انسپکٹر!" چوہدری مکرم نے بیگم کی بات کو جیسے کلہاڑی مار کے کاٹا۔ "چوری میرے بیڈ روم سے ہوئی ہے۔ اور میرے بیڈ روم میں میری بیگم ہوتی ہے یا میں ہوتا ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی اور داخل نہیں ہو سکتا"۔
"کیا آپ ہر وقت بیڈ روم میں ہوتے ہیں"۔ بیگم تن کر بولی۔ "اور آپ کے علاوہ کوئی اور بیڈ روم کے اندر نہیں آتا"۔
"کیا میری غیر موجودگی میں میرے بیڈ روم کے اندر کوئی اور داخل ہوتا ہے"۔ چوہدری نے استفسار کیا۔ "یعنی میری بیگم کے علاوہ"۔
"نہیں" اس سے پیشتر کہ ساجدہ بیگم بولتیں شمسہ نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ "کوئی باہر کا آدمی نہیں آتا"۔
"میں نے تم سے پوچھا ہے"۔ چوہدری شمسہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ساجدہ بیگم سے مخاطب ہوا۔ "بولو ساجدہ بیگم"۔ اب کے شمسہ نے عجلت کی لیکن کچھ اس طرح آگے بڑھی کہ چوہدری اور ساجدہ کے درمیان حائل ہو گئی۔
"بتا دو چوہدری صاحب کو یہاں اور کوئی نہیں آتا"۔ شمسہ کی پیٹھ چوہدری صاحب کی طرف تھی

اور چہرہ ساجدہ بیگم کے سامنے ایک مجسمۂ التجا بنا ہوا تھا ایک لمحے میں اس کے رخ پر کئی رنگ آئے اور کئی گئے۔ شمسہ جانتی تھی کہ ساجدہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ پاشا چوہدری کی غیر موجودگی کے لمحات سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور وہ تمام وقت جب چوہدری گھر میں نہیں ہوتا ہے وہ وقت مکمل طور پر پاشا کا ہوتا ہے۔ ساجدہ بیگم نے محسوس کیا کہ دیکھتے دیکھتے شمسہ کا چہرہ ایک سوالی بن گیا جیسے شمسہ کا چہرہ رو رہا ہو۔ شمسہ کا چہرہ کچھ کہے بغیر ساجدہ بیگم کے سامنے ہزار التجائیں کر گیا۔

"بتاؤ بتاتی کیوں نہیں۔۔۔۔ کس پر شبہ ہے تمہیں"۔ چوہدری خشم آلود لہجہ میں بولا۔ "بتادو کون آتا ہے میرے بیڈ روم میں"۔ ساجدہ بیگم نے ایک بھرپور معنی خیز نگاہ شمسہ کے رحم طلب چہرے پر ڈالی تو الفاظ نے ہمت کا ساتھ نہیں دیا۔

"مجھے نہیں معلوم"۔ ساجدہ رقت آمیز لہجے میں بولی اور ایک بے بس نگاہ سے روشو کو دیکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتی کوٹھی میں چلی گئی۔ شمسہ نے اطمینان کا سانس لیا جیسے پھانسی کے پھندے سے بچ گئی۔

"لے جاؤ اسے"۔ چوہدری نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ پولیس والا روشو کو گھسیٹتا ہوا گیٹ سے باہر لے گیا ملازم دم بخود تھے۔ شاہینہ سسکیاں لیتی رہ گئی اور کوٹھی میں سناٹا چھا گیا۔

O

خیرو اور روشو کی ماں بختو کی عجیب کیفیت تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے سب کچھ آٹومیٹک طریقے سے ہو گیا ہے۔ وہ اسپتالوں کے باہر ہزاروں دفعہ بھیک مانگ چکی تھی۔ اسپتالوں کے اندر بھی لوگوں کے آگے جھولیاں پھیلا چکی تھی بلکہ اسے اپنے تجربات کے اعتبار سے مانگنے کیلئے اسپتال سب سے بہتر جگہ معلوم ہوتی تھی لیکن اسپتالوں کے نظم و ضبط کی وجہ سے فقیر زیادہ دیر اسپتالوں میں ٹک نہیں سکتے تھے۔ تاہم آج وہ زندگی کے مختلف تجربے سے گزر رہی تھی اس کا اپنا بچہ بہت سارے بچوں کے درمیان اسپتال کے وارڈ کے اندر بیڈ پر علاج کیلئے لیٹا تھا اور وہ پاس اسٹول پر بیٹھی تیمار داری کر رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دیکھتے دیکھتے معزز شہری بن گئی ہے۔ اس کا بچہ دوسرے بچوں کی طرح بستر پر لیٹا تھا اور دوسری ماؤں کی طرح وہ بھی اپنے بچے کی دیکھ بھال کیلئے پاس بیٹھی تھی۔

کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے خیرو کا معائنہ کیا تھا اس کی چھاتی، پیٹ، آنکھیں اور خاص کر چہرے کو بہت توجہ اور غور سے دیکھا تھا۔ بختو سے کچھ سوالات کئے تھے۔ پھر آپس میں انگریزی میں کچھ بات چیت کی اور پھر بختو کو صفائی ستھرائی کے بارے میں مشورہ دے کر چلے گئے پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک نرس آئی۔ اس نے بختو سے قدرے درشت لہجے میں اور ڈانٹ ڈپٹ سے بات کی لیکن ساتھ ہی خیرو کو مکسچر پلایا۔ دوا کھلائی اور انجکشن لگا کے چلی گئی۔ خیرو اس وقت درد سے کلبلا رہا تھا لیکن انجکشن کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بڑے آرام کی نیند سو گیا۔ اور جب وہ آرام کی نیند سو گیا تو بختو کے اعصاب جاگے۔

"یا اللہ۔ اب کیا ہو گا؟" وہ پریشان ہوئی۔ "کیا وہ خیرو کو یہیں چھوڑ کر چلی جائے۔۔۔۔۔۔ یا اٹھا کر لے بھاگے"۔ وہ سوچنے لگی اسے شیرو کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

"شیرو کو پتہ چل گیا کہ میں نے خیرو کو اسپتال میں داخل کرا دیا ہے تو وہ میرا قیمہ کر کے رکھ دے گا"۔

"اور یہ پرچی اپنے پاس رکھ لو"۔ معاً ایک نرس ٹپ ٹپ کرتی آگئی اور ایک پرچی بختو کے ہاتھ میں تھمادی۔ "اس کا خون ٹیسٹ ہو گا" نرس نے مزید کہا۔

"یہ کون کرے گا"۔ بختو کچھ سمجھے بغیر بول پڑی۔

"ابھی وارڈ بوائے آئے گا سب کچھ کرا دے گا"۔ اس نے جاتے جاتے کہا اور پھر پلٹ کر بولی۔ "صبح بڑا ڈاکٹر دیکھے گا اور پھر بتائے گا کہ کب ہونا ہے آپریشن"۔

"آپریشن" وہ ایک دفعہ پھر چونک گئی۔ "یا اللہ فقیروں نے تو آپریشن کبھی نہیں کرایا"۔

"فکر نہ کر بہن"۔ برابر والے بیڈ پر جو بچہ تھا اس کی ماں اٹھ کے بختو کے پاس آئی اور ہمدردانہ لہجے میں تسلی دی۔

"بہن"۔ لفظ بہن پر بختو اور چونک گئی اور سوچنے لگی۔ "فقیرنیوں کو تو کبھی کوئی بہن کہہ کر نہیں پکارتا۔ اس نے مجھے بہن کہا ہے۔ کیا اس کو معلوم نہیں کہ میں فقیرنی ہوں یا پھر اسپتال میں سب برابر ہوتے ہیں"۔

"میرے بچے کی حالت بہت زیادہ خراب تھی"۔ پڑوس والی عورت مزید بولی۔ "اس کا بھی آپریشن ہوا ہے۔ اب ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہے بالکل۔ یہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کر بہن"

"بہت مہربانی"۔ بختو نے بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کے پاس کھڑی عورت کے چہرے کی

طرف دیکھ کر ممنونیت سے کہا وہ اس طرح ہمک ہمک کے اور حیرت و استعجاب سے اسے سر اٹھائے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ محو حیرت ہو کر کسی ٹاور کی چوٹی کو دیکھتا ہے۔

"دعا کرو آپریشن ٹھیک ہو جائے"۔ بختو آہستہ سے بولی اور ساتھ ہی اس پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ پڑوسی عورت کے ہٹتے ہی ایک جن کا سایہ اسے اپنے اوپر دکھائی دیا اس نے ڈر کر نظر گھمائی تو یہ جن شیرو تھا۔

تم-----" وہ دہل گئی۔

"میں"۔ شیرو سر ہلا کر آہستہ" سے بولا۔ "مجھے اسی وقت پتہ چل گیا تھا کہ تم نے خیرو کو اسپتال داخل کرا دیا ہے"۔

"میں نے نہیں-----ڈاکٹر نے خود داخل کرایا ہے"۔ وہ سہم کر بولی۔ "اور بھی فقیر ساتھ تھے تم ان سے پوچھ لو"۔

"ور فقیروں سے پوچھ کر ہی تو یہاں آیا ہوں"۔ وہ دانت پیستے ہوئے زیر لب بولا۔

"تم پوچھ لو۔ میں نے کچھ نہیں کیا"۔ وہ اپنی بے گناہی کا دامن جھاڑتی ہوئی بولی۔ "ڈاکٹر نے خود بولا ہے کہ آپریشن-----"

"پریشن تو میں تیرا گھر چل کے کروں گا"۔ وہ سرگوشی کے لہجے میں بولا اور آہستہ سے سوئے ہوئے خیرو کے پلنگ کی طرف جھک کر اسے اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھا کے کندھے سے لگایا اور ادھر ادھر نظریں بچا کر دبے قدموں اسپتال سے باہر نکل گیا۔ بختو کیا کرتی۔ حیرت زدہ انداز میں خیرو کے خالی پلنگ کو دیکھتی ہوئی خالی جھولی پھیلائے شیرو کے پیچھے پیچھے وارڈ سے باہر چلی گئی۔

سڑک پر پہنچتے ہی شیرو نے ایک رکشا روکا۔ رکشا کے رکتے ہی اس نے جھپٹ کے بختو کی کلائی پکڑا اور جھٹکا دے کر بختو کو اتنے زور سے رکشا کے اندر دھکیلا کہ اس کی پسلی اور شانہ رکشا کے بریکٹ سے اور سر چھت کے ساتھ بڑے زور سے جا ٹکرایا اور وہ ساری ہل گئی۔

"اوئی مر گئی-----" بے اختیار اس کے منہ سے سسکی نکلی۔

"ابھی کہاں مری ہے تو؟" شیرو دھواں اڑاتے رکشا کے اندر قہر و غضب کا دھواں پھینکتے ہوئے بولا۔ "گھر جا کر میں تجھے بتاؤں گا کہ موت کیسے آتی ہے"۔

"تو خواہ مخواہ گرمی دکھا رہا ہے"۔ وہ کولہا سہلاتے ہوئے بولی۔ "میرا ذری برابر قصور نہیں"

"قصور تو میرا ہے"۔ وہ قہر آلود لہجے میں بولا۔ "جس نے تجھے اتنی ڈھیل دے رکھی ہے آج میں تیری طنابیں کھینچوں گا"۔

راستے میں بختو نے اپنے ناز نخرے سے شیرو کو بہت رام کرنے کی کوشش کی لیکن شیرو آج آپے سے باہر تھا۔ اس کا پارہ چڑھتا ہی گیا اور رکشا جب فقیروں کی بستی میں پہنچا تو رکشا والے سے فارغ ہوتے ہی شیرو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ خیرو کو پلنگ پر پٹکا اور خونخوار بھیڑیے کی طرح پلٹ کر بختو پر حملہ آور ہو گیا۔ پاس ہی ایک ڈنڈا پڑا تھا جو شیرو کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے اسی ڈنڈے سے بختو کو اس طرح پیٹنا شروع کر دیا جیسے کوئی گدھے کو بھی نہیں پیٹتا۔

"بچاؤ بچاؤ ۔۔۔۔ مر گئی مر گئی"۔ بختو دونوں ہاتھوں سے اپنے وجود کا دفاع کرتے ہوئے چلانے لگی ڈنڈے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں پر پڑنے لگے اور شیرو بے دردی سے پیٹتا چلا گیا۔

"بد بخت ۔۔۔۔۔ کی جنی"۔ اس نے ڈنڈا گھماتے ہوئے گالی دی۔ "ایک حرام کا جنا بھاگ گیا دوسرے کو تو اسپتال لے گئی ۔۔۔۔ کی نسل"۔ اس نے مغلظات بکیں۔ "تو اسے اسپتال لے گئی تھی میں تجھے قبرستان پہنچاؤں گا"۔

وہ تابڑ توڑ ڈنڈے برساتا چلا گیا۔ تھوڑے بہت فقیر اس وقت جھگیوں میں تھے۔ باقی سب کام کاج کو گئے ہوئے تھے۔ اکا دکا جو بستی میں موجود تھے وہ جھونپڑیوں سے باہر نکل آئے۔

بختو "بچاؤ بچاؤ" چلاتی رہی اور مدد کیلئے پکارتی رہی لیکن کوئی قابل ذکر فقیر اس وقت موجود نہیں تھا جو آگے بڑھتا۔ بختو نے بے بس ہو کر شیرو کو ایک زور دار دھکا دیا۔ شیرو پیچھے جا لگا اور بختو بچاؤ بچاؤ چلاتی اور فریاد کرتی ہوئی آگے بھاگی۔ شیرو ڈنڈے چلاتا ہوا اس کے تعاقب میں تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ مکمل طور پر پاگل ہو گیا ہو۔ بختو پیچھے سے ڈنڈے کھاتی شیرو کے آگے بھاگی جا رہی تھی بھاگتے بھاگتے وہ دھڑ سے فقیروں کے چوہدری کے گھر میں جا گھسی۔ شیرو بھی پیچھے پیچھے تھا اتفاق سے چوہدری اس وقت کوارٹر میں موجود تھا۔

"مجھے بچالو چوہدری مجھے بچاؤ اس راکشش سے مجھے بچاؤ"۔ وہ گوشت کی لوتھ کی طرح چوہدری کے قدموں میں گری اور اس کے پاؤں پکڑ کے فریاد کرنے لگی۔

"بس ۔۔۔۔۔" چوہدری نے شیرو کا ہوا میں گھومتا ہوا ڈنڈا پکڑ لیا۔ "اب تو اسے نہیں مار سکتا"۔

"چوہدری ۔۔۔۔۔ یہ بیوی ہے میری"۔ شیرو نے اپنا تنفس درست کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس کے پاس نہیں رہنا چاہتی چوہدری"۔ وہ گڑگڑا کر بولی۔ "یہ مجھے مار ڈالے گا۔

مجھے بچالو۔ میں تجھ سے مدد مانگتی ہوں"۔

"اسے دھکے دے کر باہر نکالو چوہدری"۔ شیرو ہانپتے ہوئے بولا۔

"نہیں شیرو۔۔۔۔۔۔اس نے مجھ سے مدد مانگی ہے"۔ چوہدری نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا۔ "اب یہ میری پناہ میں ہے"۔

"لیکن یہ کہاں رہے گی"۔ شیرو نے پوچھا۔

اس کا فیصلہ کل پنچایت کرے گی۔ جرگہ ہو گا"۔ چوہدری نے جواب دیا۔

"جب تک یہ کہاں رہے گی"۔ شیرو نے تجسس سے دریافت کیا۔

"جہاں اس کی مرضی ہوگی۔ تم پنچایت کے فیصلے کا انتظار کرو۔ ورنہ تمہارا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ جاؤ تم یہاں سے"۔ وہ کڑک دار لہجے میں بولا۔ اور شیرو خونخوار ترچھی آنکھوں سے بختو کو دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ ڈنڈے کھا کھا کے بختو کے وجود کی ہڈی ہڈی اور ریشہ ریشہ درد کر رہا تھا۔ وہ ہائے ہائے کرتی اپنا جسم سہلانے لگی۔ چوہدری نے ازراہ ہمدردی دست شفقت اس کی جانب بڑھایا اور بختو کو سہارا دے کر اوپر اپنے قد کے برابر اٹھاتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔ میں کل ہی تمہارے معاملے میں پنچایت بلا رہا ہوں۔ آج تم میری حفاظت میں ہو"۔ اور پھر چوہدری نے اسی شام پنچوں کو پنچایت کی خبر کر دی۔

O

"امی، روشو چور کیسے ہو سکتا ہے"۔ شاہینہ نے رقت بھرے لہجے میں ماں سے پوچھا۔

"نہیں بیٹے۔ روشو چور نہیں ہے"۔ بیگم ساجدہ دکھ کے ساتھ بولیں۔

"تو پھر کیوں امی۔۔۔۔۔ کیوں پولیس والے روشو کو پکڑ کر لے گئے ہیں"۔ شاہینہ زور سے چلائی۔ اور اس کی آواز سارے ڈرائنگ روم میں گونج گئی۔

"آہستہ بولو بیٹی"۔ ماں نے دھیمے لہجے میں ہدایت کی

"لیکن کیوں امی۔۔۔۔۔۔ کیوں پکڑا گیا ہے اسے"۔ شاہینہ نیچی آواز میں لیکن تلخ لہجے میں بولی

"پولیس نے کسی نہ کسی کو پکڑنا تھا بیٹے"۔ ساجدہ بیگم نے وضاحت کی۔ "اور کیونکہ تمہارے بابا نے روشو پر شبہ ظاہر کیا ہے اس لئے پولیس نے اسے پکڑ لیا"۔ شاہینہ کچھ دیر چپ رہی

اور پھر قدرے سوچ کر پوچھنے لگی۔

"امی ---- کیا روشو ہمیشہ قید میں رہے گا"۔

" نہیں بیٹے " ۔ وہ شاہینہ کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "روشو بے گناہ ہے اور اصلی چور ایک نہ ایک دن ضرور پکڑا جائے گا۔"

"اصلی چور کون ہے امی "۔ شاہینہ نے معصومیت لیکن تجسس سے پوچھا۔

" وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا بیٹے " ۔ ساجدہ بیگم نے جواب دیا اور پھر دونوں ماں بیٹیاں چپ ہو گئیں۔ اور کمرے میں ایک گمبھیر سناٹا چھا گیا۔

آج صبح ہی سے پوری کوٹھی ویران اور اداس تھی اور کوٹھی کے تمام مکین ایک تو اس واردات پر اور دوسرے روشو کی گرفتاری کی وجہ سے خاصے پریشان اور مضمحل تھے۔ سب کو سو فیصد یقین تھا کہ روشو اس طرح کی اتنی بڑی چوری اور ڈکیتی میں ملوث نہیں ہو سکتا لیکن سب چپ تھے اور کوئی کسی سے اس مسئلے پر بات نہیں کر رہا تھا۔ اور ساجدہ بیگم بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھیں اور ساجدہ بیگم سے بھی زیادہ اداس شاہینہ تھی۔ اور اس پر عجب طرح کا ایک نفسیاتی دباؤ سا پڑ گیا تھا اور وہ سر میں شدید درد اور گردن میں کھنچاؤ سا محسوس کرنے لگی تھی اور یہ اس طرح کی بیماری تھی جس کے اندر وہ شدید ذہنی دباؤ کی صورت میں مبتلا ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اپنے باپ سے پہلے بھی محبت نہیں کرتی تھی لیکن آج اسے اپنے والد سے شدید نفرت ہو گئی تھی کہ جس نے کبھی اسے کوئی کھلونا تک لا کے نہیں دیا۔ اس کی خاطر کسی خوشی کا انتظام نہیں کیا جبکہ خوشی چھین لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

روشو اس گھر کے اندر رچ بس گیا تھا۔ اپنے اخلاق، پیار محبت اور رویے سے اس نے کوٹھی کے تمام مکینوں کے دل موہ لئے تھے اور شاہینہ تو اسے اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھنے لگی تھی وہ یہ محسوس ہی نہیں کر رہی تھی کہ روشو اس گھر میں اجنبی، نووارد یا ملازم ہے۔ یا چار چھ ماہ سے یہاں آیا ہوا ہے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اسی کوٹھی میں پیدا ہوا۔ یہیں پلا بڑھا اور آگے جو کچھ اس نے کرنا ہے اور جو کچھ بننا ہے اسی کوٹھی کے اندر رہ کر بننا ہے۔ شاہینہ کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ روشو کا قیام اس کے گھر کے اندر وقتی اور عارضی ہے اور یہ کہ روشو کے ساتھ مل کر اپنی خوشیوں کے جتنے گھروندے بنائے تھے وہ سب تنکوں کے محل تھے جو اتنی بیدردی سے بکھر جائیں گے اور وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ روشو کو اس گھر سے اتنے بے رحم طریقے کے ساتھ پولیس کے ذریعے ذلیل کر کے اور گھسیٹ کر لے جایا جائے گا۔ وہ عجیب وہ غریب قسم کے ایک

نفسیاتی کھنچاؤ اور تشنج کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ شاید اسے اس گھر کے اندر زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی عمر کا اور اپنی طرح کا ایک کھلونا ملا تھا جو اس سے زبردستی چھین لیا گیا۔

"لڑکی زیادہ جذباتی ہونے کی کوشش مت کرو"۔ ساجدہ بیگم نے شاہینہ کو قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

لیکن شاہینہ مزید اداس اور پریشان ہو گئی تو ساجدہ بیگم نے شاہینہ کو پیار کے ساتھ تھپتھپایا اور حوصلہ افزا لہجے میں آہستہ سے بولی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ اور پھر شام کو جب چوہدری صاحب گھر سے باہر گئے تو ان کی غیر موجودگی میں پہلا موقع پاتے ہی ساجدہ بیگم تن کر شمسہ کے سر پر کھڑی ہو گئی۔

"شمسہ۔۔۔۔" وہ تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوئی۔ شمسہ نے جو صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی معنی خیز انداز میں سر اوپر اٹھایا اور سوالیہ نظروں سے ساجدہ بیگم کو دیکھنے لگی۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ روشو نے چوری نہیں کی"۔ ساجدہ بیگم کہنے لگی۔ "چوری کرنا تو دور کی بات ہے وہ اس سیف کو کھول بھی نہیں سکتا۔ وہ اتنی بڑی رقم گن بھی نہیں سکتا۔"

"یہ سب کچھ آپ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں۔۔۔۔؟" شمسہ نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ چور کون ہے۔؟" ساجدہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"وہ تو آپ بھی جانتی ہیں۔۔۔۔" شمسہ کھٹ سے بولی۔ "لیکن نام نہیں لے سکیں گی آپ۔"

"کیا مطلب۔۔۔۔!" ساجدہ بیگم نے برہم لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ چوری صرف تجوری کی نہیں ہوتی دھن کے ساتھ تن اور من بھی چرایا جاتا ہے" وہ فلسفیانہ لہجے میں مخاطب ہوئی۔ "کچھ چوریاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کیلئے آدمی چور کو دعوت دیتا ہے۔ جن کی رپٹ تھانے میں درج نہیں کراتا۔ آدمی لٹنے کیلئے خود اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔" وہ زہر خند انداز میں منفی کردار ادا کرنے والی عورت کی طرح مسکرانے لگی۔

"تم کھل کر بات کرو۔۔۔۔۔" ساجدہ بیگم نے کہا۔

"کھل کر بات۔ یہی کہ تم اور میں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں ساجدہ بیگم۔" شمسہ ایک خبیث مسکراہٹ کے ساتھ معنی خیز انداز میں بولی۔

"دیکھا جائے گا۔۔۔۔" ساجدہ بیگم کے نتھنے غصے میں کپکپانے لگے اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

○

فقیروں کا چوہدری ایک مونڈھے پر بیٹھا تھا۔اس کے مد مقابل زمین پر اگلی صف میں تمام پنچ موجود تھے۔پنچوں کے ایک طرف بختو تھی جو مقدمے کی ایک فریق تھی اور دوسری جانب مقدمہ کا دوسرا فریق شیرو تھا۔پنچوں کے پیچھے بستی کے معتبر اور سرکردہ فقیر تھے اور کواٹر کے آس پاس کھلی کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے فقیرنیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے جو مقدمے کی کاروائی دیکھنے کیلئے موجود تھیں اور فقیرنیوں کی گودوں میں چڑھے بچوں نے بھی ایک چیخ پکار مچا رکھی تھیں جنہیں اندر بیٹھے فقیر گاہے گاہے اشاروں سے چپ کرانے کی ہدایت دیتے تھے۔مقدمے کا خاص کردار ننھا خیرو پنچائت کے اندر ہی ایک کونے میں سویا ہوا تھا جسے شیرو نے صبح ہی صبح افیم کی ڈبل چٹکی کھلادی تھی کیونکہ آج وہ کچھ زیادہ ہی کلبلانے لگا تھا۔اور بختو پنچایت کے انتظار میں دو دن سے فقیروں کے چوہدری کے ہاں پناہ گزین تھی اور اس پنچایت کے فیصلے سے قبل شیرو کے پاس جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"مقدمہ شروع کیا جائے-----" سرپنچ نے تالی بجا کر مقدمے کی کاروائی کے آغاز کا حکم دیا۔

"سش ش ش ش------" پنچایت میں بیٹھے کچھ لوگوں نے اطراف میں بیٹھی عورتوں اور ان کے بچوں کو چپ رہنے کیلئے کہا۔کواٹر میں مکمل خاموشی چھا گئی تو شیرو تھوڑا سا آگے سرک کر بولا۔"جیسا کہ پنچوں کو معلوم ہے------"

"تم چپ رہو-----" پنچایت کے چوہدری نے حکم دیا۔"پہلے فریادی کو بولنے دو-----بختو۔"اس نے بختو کو پکارا اور شیرو چپ ہو گیا۔

"چوہدری صاحب اگر بولو تو میں ساری پنچایت کے سامنے چیتھڑے الگ کر کے داغ دکھادوں جو اس راکشش نے لاتوں، مکوں اور ڈنڈوں سے کوٹ کوٹ کر میرے بدن پر لگائے ہیں۔"

"چوہدری صاحب-----اس کو منع کر دو مجھے راکشش نہیں بولے۔" وہ رسیاں تڑانے کے انداز میں آگے بڑھ کر بولا۔

"راکشش نہیں بولو-----" چوہدری نے آہستہ سے حکم دیا۔

"کچھ بھی بولو چوہدری جی-----پر یہ ہے بہت ظالم آدمی۔" بختو درد سے کراہتے ہوئے بولی۔"جس طرح اس نے مجھے پیٹا ہے اس طرح کبھی کوئی جانور کو بھی نہیں پیٹتا ہو گا-----"

"خاوند مار سکتا ہے بیوی کو چوہدری۔" شیرو بختو کی بات بیچ میں کاٹ کر بولا۔

"خاوند مار سکتا ہے بیوی کو چوہدری۔" بختو نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔"لیکن وہ جان سے

نہیں مار سکتا۔ اس نے میرے کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔ میں اسی لئے کہتی ہوں کہ اگر پنچایت بولے تو میں پنچایت کے سامنے اپنا بدن دکھادوں۔"

" اب یہ پنچایت کے سامنے ننگی ہونا چاہتی ہے چوہدری۔" اس نے طنز کرنے کے انداز میں کہا۔

" میں تیرے ظلم کو پنچایت کے سامنے ننگا کرنا چاہتی ہوں۔" بختو اور شیرو کی براہ راست جھڑپ ہو گئی۔

" خاموش خاموش------" چوہدری نے تالی بجاکر دونوں کو چپ کرایا۔ کچھ دیر پنچایت میں مکمل خاموشی رہی اور پھر بختو نے آہستہ آہستہ شیرو کے ظلم کی ساری داستان پنچایت میں دہرادی--

" تم نے بختو کے سارے الزامات سنے شیرو------" چوہدری شیرو سے مخاطب ہوا۔ " تم ان سے انکار کرتے ہو یا اقرار"۔

" میں انکار نہیں کرتا چوہدری----- میں نے مارا پیٹا------ لیکن کیوں، یہ اس سے پوچھا جائے یا پھر میں بتاتا ہوں۔" شیرو نے کہنا شروع کیا۔" اس کے جو لچھن ہیں وہ ہیں۔ مین نے برداشت کیا۔ اس کے سارے کرتوت میں نے برداشت کیئے۔ لیکن کوئی فقیر اپنی عورت کا وہ گناہ برداشت نہیں کرسکتا جس گناہ سے نقصان سارے فقیروں کو ہو۔ پوری برادری کو جس سے خسارہ ملے اور جس گناہ سے فقیروں کا جدی پشتی پیشہ برباد کیا جائے------"

" چوہدری اس سے پوچھو۔ ایسا کیا گناہ کیا ہے میں نے۔" بختو شیرو کی بات کاٹ کر بولی۔

" میں بتاتا ہوں چوہدری-----" شیرو بولا۔" تم سارے جانتے ہو ساری پنچایت کو معلوم ہے کہ بھیک ایک مقدس پیشہ ہے ہم دوسرے کو دعا دے کے خیرات لیتے ہیں۔ دوسرے کا حق نہیں مارتے۔ کسی کی جیب نہیں کاٹتے۔ کسی سے چھینتے نہیں کسی کی کلائی نہیں پکڑتے۔ پستول نہیں رکھتے سینے پر۔ خود بخود کسی کا ہاتھ جیب میں جاکے ہمارے پھیلے ہوئے ہاتھ کے اوپر آتا ہے ہم اپنا حق لیتے ہیں حق مارتے نہیں۔ ہے ناں۔ کیوں پنچو ٹھیک کہہ رہا ہوں"

" ٹھیک ہے بات ٹھیک ہے۔" پنچایت کا ایک ممبر بولا۔

" پہلے بات پوری کرو-----" چوہدری نے ہدایت دی۔" بھیک جو ہے چوہدری وہ ہمارے باپ دادا کا مقدس پیشہ ہے۔" شیرو بولا۔ اور چوہدری نے بات کاٹی۔

" یہ سب کو معلوم ہے۔ تم ایک ہی بات کو بار بار دہراؤ مت۔ بات مختصر کرو۔" چوہدری

کسی منصف کی طرح بولا۔
" مطلب کی بات یہ ہے چوہدری۔۔۔۔ کہ اس عورت نے ہمارے باپ دادا کے مقدس پیشے کو نقصان پہنچایا ضرب لگائی نفرت کی"۔ وہ بختو پر کھلا الزام لگاتے ہوئے بولا۔
" وہ کیسے ۔۔۔۔۔" اس سے پیشتر کہ بختو منہ کھولتی چوہدری نے استفسار کیا۔
" اس کی نفرت کی وجہ سے روشو بھیک سے بد ظن ہوا۔ اور فقیروں سے بغاوت کر کے فرار ہو گیا"۔ شیرو نے کہا۔
" یہ غلط ہے۔ روشو کو خود اس نے بھگایا میں نے نہیں۔" وہ فوراً تردید کرتے ہوئے بولی
" خیر جانے دو اس بات کو۔۔۔۔۔" شیرو در گزر کے لہجے میں بولا۔ " بڑا الزام جو اس عورت پر ہے وہ یہ کہ اس نے خیرو کو ہسپتال داخل کرایا بگڑے چہرے کے علاج کیلئے یہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔"
" چوہدری۔۔۔۔" بختو نے اپنی ڈھیلی ماٹھی اور سریلی سی آواز بلند کی۔ " پہلی بات تو یہ ہے کہ خیرو کو میں نے ہسپتال میں داخل نہیں کرایا ڈاکٹر نے خود ترس کھا کر اس کی پرچی بنائی۔" بختو بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ " دوسری بات یہ کہ بیماری کا علاج کرانا کوئی گناہ نہیں ہے۔ کوئی جرم نہیں ہے علاج۔" وہ زور دے کر بولی۔
" فقیروں میں ہے۔۔۔۔۔۔" شیرو کھٹ سے بولا۔ " فقیروں میں علاج جرم ہے؟"
کیا خیال ہے پنچو۔ علاج جرم ہے کہ نہیں۔" چوہدری آگے بیٹھے پنچایت کے ممبروں سے مخاطب ہو کر بولا۔
" ہے جرم۔۔۔۔" ایک آواز آئی۔
" نہیں ہے۔" دوسری آواز بلند ہوئی۔
پنچوں نے متضاد رائے دی اور پھر دلیلیں دیتے ہوئے آپس میں اس طرح الجھ پڑے کہ عدالت اچھی خاصی مچھلی مارکیٹ بن گئی۔
" خاموش خاموش۔۔۔۔" چوہدری نے تالی بجا کر سب کو چپ کرایا اور پھر اپنا فیصلہ دیتے ہوئے بولا۔ " فقیروں کے قنون میں یہ ایک بات جاننا بڑی ضروری ہے کہ علاج گناہ ہے کہ نہیں اس مسئلے پر آج تمام ممبر اچھی طرح سوچ لیں پرسوں رات کو پھر پنچایت لگے گی۔ اس وقت تک برخاست ہوتی ہے پنچایت۔"

"اس وقت تک بختو کہاں رہے گی؟" شیرو نے پھر آگے بڑھ کر فقیروں کے چوہدری سے سوال کیا۔
"یہ بختو کی مرضی پر ہے۔" چوہدری نے سوالیہ اور متجسس انداز میں بختو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"میں چوہدری کی پناہ میں رہوں گی۔" بختو نے فیصلہ سنایا۔

O

چوہدری صاحب کے گھر کی چوری کی خبر شام تک آس پاس کے تمام بنگلوں میں پھیل گئی اور ساتھ ہی یہ چرچا بھی ہوگیا کہ چوری میں گھر کے ملازم کا ہاتھ تھا جسے پولیس نے حراست میں لے لیا ہے۔ تاہم چوہدری صاحب نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے خبر کو اخبارات میں آنے سے رکوا دیا تھا۔ ہر چند کہ ٹھیک ٹھاک رقم ان کی تجوری سے نکلی تھی لیکن وہ اس چوری کو زیادہ پبلسٹی آئیٹم نہیں بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ بات بڑھنے سے رقم کا حساب کتاب اور کھاتے سامنے لانے پڑ جاتے تھے پھر ٹیکس میں بھی ملوث ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا تھا۔ لہٰذا اپنی رپورٹ میں انہوں نے زور اسی بات پر دیا کہ ان کے سیف میں ان کی بیگم کے بہت قیمتی زیورات تھے اور تقریباً چار لاکھ روپیہ نقد تھا اور یہ مختلف اوقات میں نکلنے والی پرائز بانڈز کی رقم تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے عام رشوت خور افسروں اور بلیک مارکیٹوں کی طرح مختلف انعام یافتہ پرائز بانڈز خرید رکھے تھے تاکہ وقت ضرورت بلیک رقم کو ثبوت کے طور پر وائٹ کیا جا سکے۔

روشو صبح ہی سے حوالات میں بند تھا اور تھانے والوں کا اس پر شدید قسم کا دباؤ تھا اور اے ایس آئی ایک ذہین اور زیرک قسم کا آدمی تھا جو غصے، سختی، درشتگی اور مار پیٹ کی جگہ پیار، نرمی اور شفقت کا لہجہ اختیار کئے ہوئے تھا۔

"دیکھو بیٹے ------ میں ایک بات تمہارے بارے میں جانتا ہوں کہ تم عادی مجرم نہیں ہو۔" اے ایس آئی نے انتہائی ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "یہی وجہ ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہو گئی ہے۔ شاباش بتاؤ مال کہاں ہے؟"

"یقین کریں جناب میں چور نہیں ہوں۔" روشو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑا کر کہا۔

"میں جانتا ہوں تم چور نہیں ہو۔ تمہارے پیچھے کوئی اور چور ہے جس نے تمہیں اس کام پر لگایا۔" اے ایس آئی نے اپنے تجربے کی روشنی میں کہا۔

"نہیں جناب -----" اس نے التجا کی۔

"کوئی ایک شخص ہے کیا ------؟" اے ایس آئی نے پوچھا۔ روشو گم صم اے ایس آئی

کو دیکھنے لگا۔

"ٹیلینگ ہے پوری ------؟" اے ایس آئی نے مزید پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟" وہ انتہائی معصومیت سے بولا۔

"بتاتے ہو کہ نہیں حرامزادے ------" اے ایس آئی نے ایک دم لہجہ بدل کے گرجدار آواز میں پوچھا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" روشو نے جواب دیا۔

یہ ایسے نہیں بتائے گا سر۔ یہ بہت پکا عادی مجرم ہے۔" اے ایس آئی کے برابر خاموش کھڑا حوالدار بولا۔

"بتاؤ او تے ------" حوالدار دھاڑا اور ایک زناٹے کا تھپڑ روشو کے رسید کیا۔ "بتاتا ہے کہ نہیں۔" اس نے دوسرا فولادی پنجہ روشو کے رخسار پر لگایا۔ جس کے زور سے روشو دیوار کے ساتھ ٹکرا گیا۔ جب واپس آیا تو حوالدار نے ایک اور تھپڑ رسید کر دیا اور پھر تابڑ توڑ تھپڑوں کی بارش روشو پر شروع ہو گئی روشو کو ایسے لگا جیسے اس کے کان کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ سر پر گولے بن گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"بتاتا ہے کہ نہیں------" اس نے ہاتھ روکا اور ایک لک لگائی۔

"ہائے مر گیا------" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام لیا۔

"بتاتا ہے کہ نہیں------" اس نے فوراً ہی دوسری لک لگائی اور جب تیسری مارنے لگا تو روشو نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے فریاد لگائی۔

"بتاتا ہوں۔"

"بتاؤ جلدی بتاؤ------" حوالدار نے ایک ڈنڈا اٹھا کے ڈرایا۔

"میں نے کی ہے چوری۔" روشو اعتراف جرم کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے۔" وہ ہانپ رہا تھا کراہ رہا تھا۔

"شاباش------" اے ایس آئی اب کے آگے بڑھا اور تھپکی دی۔ "یہ ہوئی نا بات۔"

"پانی" روشو نے ہانپتے ہوئے پانی طلب کیا۔

"اسے پانی پلاؤ اور آرام سے اس کا بیان قلمبند کر لو۔" اے ایس آئی نے ہدایت دی اور روشو کو حوالدار کے سپرد کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

(۹)

روشو حوالات میں تنہا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے اسے پینے کو پانی دیا گیا تھا اور حولدار نے اسے لالچ دی تھی کہ بیان قلمبند ہو جائے تو پھر اسے کھانے کو بھی ملے گا۔ اب حولدار اسے تھوڑی دیر تنہا چھوڑ کر بیان لکھنے کیلئے کاغذ اور قلم لینے گیا ہوا تھا۔ روشو کی اتنی پٹائی ہو چکی تھی کہ اس کے جسم کی ہڈی ہڈی درد کر رہی تھی اور ریشہ ریشہ دکھ رہا تھا اور مار کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے بے اختیار کہہ دیا تھا اور اس جھوٹ پر اے ایس آئی نے اسے تھپکی دیکر شاباشی دی تھی اور اب حولدار اس کے اس جھوٹ کو کاغذ پہ اتار کے پکا قانونی چور بنا دینا چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جھوٹا اور مجرم بن جائے۔

"یا خدا۔۔۔۔۔۔" روشو کانپ سا گیا۔ "کیا وہ چور بننے کیلئے گھر سے نکلا تھا" وہ سوچنے لگا۔

"اس کی ساری جدوجہد عزت سے زندگی گزارنے کیلئے تھی ورنہ وہ فقیر کیا برا تھا۔ کتنا فرق ہے اس دنیا میں جو فقیروں کی ہے اور اس دنیا میں جو فقیروں کی نہیں ہے۔ جب وہ فقیر تھا تو اس کا پولیس سے کوئی واسطہ نہیں تھا کوئی اسے مارتا نہیں تھا کوئی اسے جھوٹ بولنے پر مجبور نہیں کرتا تھا بس اس کے باپ کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا جو پھیلا رہتا تھا اور اس کا باپ جھوٹ بولتا رہتا تھا اور جھوٹ کے بدلے میں اس کے ہاتھ میں نوٹ گرتے رہتے تھے صدقہ زکوٰۃ، خیرات یہ سب جھوٹ کی قیمت تھی جو اس کا باپ وصول کرتا تھا۔ مفت خوری بے غیرتی اور بے عزتی کی زندگی تھی جس پر اس کا باپ زندگی بھر چلتا رہا اور روشو کو بھی وہ اسی زندگی پر چلانا چاہتا تھا اس نے تو یہ سمجھا تھا کہ فقیروں کی دنیا سے نکل کر جس دنیا میں آیا ہے وہ بہت عزت و آبرو کی دنیا ہے اس میں سب عزت دار لوگ بڑے لوگ اور اچھے لوگ رہتے ہیں لیکن یہاں بھی اسے قدم قدم پر جھوٹ، دغا، مکروفریب اور دھوکا دکھائی دے رہا تھا۔ تاہم ایک بات ضرور تھی کہ کچھ بھی سہی بڑے آدمی بھی

اسی دنیا میں بستے ہیں اور وہ بھی اس دنیا میں بڑا آدمی بننے کیلئے ہی آیا تھا ہر چند کہ اس سفر کے آغاز ہی سے اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن شاید بڑا آدمی بننے کیلئے مشکلات ضروری ہیں۔ شاید جتنے بڑے لوگ اور عزت دار لوگ ہیں انہیں تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا یقیناً ان کو بھی پولیس نے پکڑا ہوگا مار پیٹ کی ہوگی اور جھوٹ بولنے پر مجبور کیا ہوگا اور کسی نے جھوٹ بولا ہوگا اور کسی نے جھوٹ نہیں بولا ہوگا اور اب اگر اس نے مار کھانے سے بچنے کے لئے جھوٹ بول کے الزام اپنے اوپر لے لیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ قانونی جھوٹا اور قانونی مجرم ہو جائیگا اور اگر شریفوں کی دنیا میں اگر بھی اس نے چور اور مجرم ہی بننا تھا تو پھر فقیر کیا برے تھے۔

"نہیں" ۔ اس نے اپنے ذہن پر زور دے کر فیصلہ کیا کہ اسے کتنی ہی سزا ملے کتنی ہی اذیت دی جائے وہ نہ تو چوری کرے گا اور نہ چوری کا جھوٹا الزام اپنے اوپر لے گا چاہے اسے جان سے ہی کیوں نہ مار دیا جائے۔

یہ تھوڑا سا وقفہ جو حولدار کے باہر جانے سے اسے ملا تھا اس میں اس نے مصمم فیصلہ کر لیا کہ وہ چور نہیں بنے گا۔

"نہیں!"

"نہیں!"

"نہیں!"

"نہیں!"

"نہیں!" تھوڑی ہی دیر بعد حوالات میں "نہیں، نہیں کی آواز گونج رہی تھی ایک تکرار تھی جو اس کے منہ سے جاری تھی اور حولدار جو کاغذ قلم لے کر اس کا بیان قلم بند کرنے کیلئے آیا تھا اس پر لاتوں اور مکوں کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔

"بولتے ہو کہ نہیں۔۔۔۔۔!" حولدار نے کاغانی مینڈھے کی طرح پیچھے ہٹ کے پھر آگے بڑھ کر ایک زور کی لک مارتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں نہیں نہیں۔۔۔۔۔" روشو نے منہ سے خون تھوکتے ہوئے کہا۔ "چاہے جان سے مار دو نہ میں نے چوری کی ہے اور نہ میں قبولوں گا"۔

"بہت ضدی بچہ ہے" ۔ ایک صوفی منش آدمی تسبیح گھماتے ہوئے اندر آیا اور روشو پر ترس کھانے کے انداز میں ازراہ ہمدردی بولا۔ صوفی کے سر کے بال شانوں کو چھو رہے تھے چہرہ خاصا جلالی تھا داڑھی کے بال تیل سے چکنے ہو رہے تھے آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی

اور ہونٹوں پر تسبیح کے دانوں کی تھرکن کے ساتھ ایک نامعلوم قسم کی جنبش محسوس ہو رہی تھی اے ایس آئی جو کچھ دیر قبل حوالدار کے ساتھ تھا اب صوفی کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور دونوں رک کر خاموشی سے مار کھاتے اور انکار پر انکار کرتے روشو کو دیکھنے لگے۔

"اصل میں ۔۔۔۔۔۔" اے ایس آئی نے کچھ کہنا چاہا تو صوفی نے اس کی بات کاٹی۔

"اصل میں بنیادی غلطی یہ ہوئی ہے کہ تم لوگوں نے اسے سوچنے کا موقع دے دیا۔" صوفی نے کہا۔ "اور سوچنے کا موقع جب بھی کسی کو ملتا ہے تو وہ غلط فیصلہ کرتا ہے یا صحیح"۔

"صحیح ۔۔۔۔" حوالدار ہاتھ روک کر بولا۔

"غلط" صوفی نے ڈانٹ پلائی۔ "اب چھوڑ دو اسے مت مارو۔" صوفی نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "جب اس نے پانی مانگا تھا تو اس وقت پانی نہ دیتے پہلے بیان قلم بند کر لیتے۔ جب لوہا گرم ہو تو چوٹ لگا لینی چاہیئے"۔

"میں اس لوہے کو پھر تپاتا ہوں۔" حولدار دونوں مکے تان کر روشو کی جانب بڑھا۔

"نانا ۔۔۔" صوفی نے پھر روکا۔ "داغی کردو گے اسے ۔۔۔۔۔۔ کل کورٹ میں پیش ہونا ہے ریمانڈ لے لو پہلے ۔۔۔۔۔"

لیکن ریمانڈ ملا نہیں ۔۔۔۔۔ اگلے دن جب روشو کو عدالت میں ریمانڈ کیلئے پیش کیا گیا تو بادل خان وکیل نے ریمانڈ کی سخت مخالفت کرتے ہوئے عدالت سے استدعا کی کہ روشو کو پولیس کی تحویل میں نہ رکھا جائے۔ اس نے عدالت میں ایک ڈاکٹر بھی پیش کیا جس نے روشو کے جسم پر پولیس کے تشدد سے ابھرنے والی چوٹوں کی نشاندہی کی بادل خان وکیل نے موقف اختیار کیا کہ اگر روشو کو مزید پولیس کی تحویل میں رکھا گیا تو تشدد کے ذریعے اس سے جبری اقبال جرم کرا لیا جائے گا بادل خان وکیل نے اپنی شناخت یہ کروائی تھی کہ وہ روشو کو ایک غریب اور بے سہارا لڑکا سمجھ کر رضا کارانہ طور پر اس کا دفاع کر رہا ہے لیکن در حقیقت وہ ساجدہ بیگم کے دور پرے کا ایک عزیز تھا جسے ساجدہ بیگم نے درپردہ روشو کے دفاع پر مامور کیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ چاہے جتنی رقم بھی خرچ ہو روشو کا دفاع کرنے میں کسی طرح کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے لہذا بادل خان نے روشو کا دفاع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور استغاثہ کی تمام کوششوں کے باوجود ریمانڈ نہیں ہونے دیا تاہم ضمانت نہیں ہو سکی اور روشو کو جیل بھیج دیا گیا!

◯

جیل کا نام "اصلاح" گھر رکھا گیا تھا یہ بچوں کیلئے بنایا گیا ایک سدھار ہی ادارہ تھا اس خصوصی

نام ۔ کے تحت جیل کو چلانے کا مطلب یہ تھا کہ ملزم اور مجرم بچوں کی اصلاح ہو سکے اگر وہ بھٹکے ہوئے اور گمراہ ہیں تو انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی جا سکے اس مقصد کے تحت جیل میں کچھ ٹیکنیکل کام بھی سکھائے جاتے تھے اور کبھی کبھار کوئی سوشل ورکر کوئی استاد یا کوئی ماہر نفسیات آکر بچوں کو لیکچر بھی دے جاتا تھا لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود "اصلاح گھر" کا ماحول مکمل طور پر ایک جیل کا سا تھا اور یہاں آکر روشو کو ایسا لگا کہ جیسے وہ فقیروں کی دنیا سے نکل کر دوسری دنیا اور اب تیسری دنیا میں آگیا ہے۔

جیل شہر سے دور ایک بڑے قطعہ اراضی پر مشتمل تھی جس کے چاروں طرف ایک بڑی اونچی اور چوڑی دیوار تھی مرکزی دروازہ لوہے کا تھا جو کسی پرانے قلعہ بند شہر کے دروازے کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ پولیس راہداری دکھا کر روشو کو اس گیٹ سے اندر لے گئی۔ گیٹ سے اندر ایک بڑا میدان نما کورٹ یارڈ عبور کرنے کے بعد جیل کا اصل دروازہ آیا۔ دروازے کے ساتھ ہی اندر کی جانب استقبالیہ کمرہ تھا جہاں پولیس والوں نے روشو کے کاغذات دکھا کے چیک ان کرنے کے بعد روشو کو جیل کے عملے کے سپرد کر دیا یہاں اسے ایک راہداری سے گزار کر اندر عقبی سمت لے جایا گیا جہاں راہداری کے دائیں اور بائیں جانب دو بڑے ہال نما کمرے تھے دائیں جانب پکے قیدیوں کا دالان تھا اور بائیں جانب کچے قیدیوں کے رکھنے کی جگہ تھی۔ جیسے ایک بڑا ہال! یہ ہال اس وقت خالی تھا قیدی باہر گئے ہوئے تھے۔

"یہاں پڑ جا..... " کانسٹیبل نے اسے اندر دھکیل کر سلاخ دار دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"جو جگہ اچھی لگتی ہے قبضہ کر لے ...... پورا ہال تیرا ہے ......" اس نے ازراہ طنز مسکرا کر کہا اور روشو کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ اس وقت ہال مکمل طور پر خالی تھا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیوار کے ساتھ ساتھ قطار میں بستروں کی طرح لپٹی ہوئی پندرہ بیس دریاں تھیں اور ہر دو دریوں کے درمیان ایک چھوٹی سی الماری یا نعمت خانہ رکھا ہوا تھا۔

ہال کافی ہوا دار اور متعدد کھڑکیوں پر مشتمل تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور کارنسوں پر تیل کی شیشیاں کنگھیاں اور ڈبے وغیرہ رکھے ہوئے تھے آمنے سامنے مقدس مقامات کی دو تصویریں آویزاں تھیں اور چاروں کونوں میں چٹائیاں لپیٹ کر کھڑی کی ہوئی تھیں۔ جو غالباً جائے نماز کا نعم البدل تھیں۔ اس نے جیل کا نام سنا تھا لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ جیل میں وہ تنہا ہوگا اسے دریاں دیکھ کر اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس جیل میں بہت سے قیدیوں کیلئے جگہ ہے لیکن وہ یہی سمجھ رہا

تھا کہ شاید جرم اتنے زیادہ نہیں ہو رہے ہیں اور شاید وہ فی الحال اس جیل میں اکیلا ہی قیدی ہے۔ تاہم اس وقت وہ اس مسئلہ پر زیادہ سوچ بچار کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس میں اپنی جگہ کھڑے رہنے اور سوچنے کی بالکل سکت نہیں تھی۔ تھانے میں رات اس کی جو پٹائی ہوئی تھی اس کی وجہ سے اس کے جسم کا ایک ایک جوڑ دکھ رہا تھا اور تکلیف کی وجہ سے گزشتہ رات بھی نہیں سو سکا تھا اور اب بھی اس کے بدن میں درد اگرچہ شدید تھا لیکن نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اس نے باقی قیدیوں کے بارے میں مزید کچھ سوچے بغیر لپٹی ہوئی دریوں میں سے ایک دری کھولی اور ڈھیر ہو گیا۔

دری پر پڑتے ہی وہ اس طرح بے خبر سو گیا جیسے برسوں کے بعد پہلی مرتبہ سویا ہو۔

O

فقیروں کی پنچایت کا دوسرا اجلاس جاری تھا۔

شیرو نے سرپنچ کے سامنے رکھے کشکول پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائی کہ وہ جو کچھ کہے گا سچ کہے گا اور پھر اس نے سچ ہی کہا کہ بختو سے وہ بے پناہ محبت کرتا ہے لیکن اس کا یہ بھی سچ تھا کہ روشو کے بھاگ جانے سے اس کے دماغ اور اس کے مزاج پر سخت منفی اثر پڑا ہے اور پھر اس نے اپنی طرف سے یہ بھی سچ کہا تھا بختو کشکول کی عزت و ناموس کا زیادہ خیال نہیں رکھتی۔ میل، گندگی، غلاظت اور کھردرا پن جیسی چیزیں جو فقیروں کا سرمایہ ہیں ان سے بختو نفرت کرتی ہے اور یہ بڑا الزام جو بختو پر شیرو نے لگایا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے خیرو کو علاج کیلئے اسپتال میں داخل کرایا۔

"میں بتاتا ہوں چوہدری۔۔۔۔۔" شیرو نے چوہدری کے استفسار پر بیان دینا شروع کیا۔ "کیا ہم صبح صبح جب کام کاج کو نکلتے ہیں تو اپنے چہرے اپنا جسم اور اپنے حلیئے نہیں بگاڑتے ہیں،" اس نے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا "بگاڑتے ہیں۔۔۔۔ ہم اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے کالا کرتے ہیں میل لگاتے ہیں منہ پر مٹی ملتے ہیں اور بعض بعض دفعہ کھرچ دیتے ہیں اور نوچ ڈالتے ہیں کہ نہیں۔۔۔۔"

"بات تو صحیح کہہ رہا ہے۔۔۔۔۔" پنچایت کے ایک ممبر نے حمایت کرتے ہوئے لقمہ دیا۔

"اللہ تجھے نیکی دے۔۔۔۔۔۔" حمایت کرنے والے ممبر کی بات سراہتے ہوئے شیرو نے بات جاری رکھی۔ "خیرو کا چہرہ قدرت نے بگاڑا ہے چوہا اللہ کی رحمت بن کر ہماری جھونپڑی

میں آیا اور اس کے منہ کو نوچا اس کا منہ نوچا جانا ہمارے لئے رحمت بن گیا۔ یہ سامنے بیٹھی ہے بختو اس سے پوچھ لو جب سے خیرو کے منہ کی کھال ادھڑی ہم پر ہن برسنے لگا۔ پیسوں کی برسات ہو گئی پوچھو اس سے یہ انکار نہیں کر سکتی ہم چاروں مل کر اتنا نہیں کماتے تھے جتنا خیرو کی اکیلی ننھی جان کمانے لگی۔۔۔۔۔۔۔۔اب تم خود بتاؤ چوہدری اس کا اسپتال میں داخل کرانا اور اس کی ادھڑی ہوئی کھال کو درست کرانا کفران نعمت ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔۔ میں کچھ نہیں بولوں گا تم خود بولو، منصف ہو، صحیح فیصلہ کرنا۔۔۔۔۔۔"

شیرو بیان کو ختم کر کے خاموش ہو گیا تو کچھ دیر پنچایت پر بھی خاموشی چھائی رہی اور پھر ایک ممبر نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"پنچو میں پھر یہی بولوں گا کہ شیرو کی بات صحیح ہے۔۔۔۔۔۔"

" میرا کوئی مغز تو خراب نہیں نا کہ میں عورت کو بے وجہ مارنا شروع کر دوں۔" اس نے پنچوں سے مخاطب ہو کر کہا لیکن ساتھ ہی الفت بھری نظروں سے بختو کو دیکھا اور بختو نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

"قصوروار بختو ہے۔۔۔۔۔۔" ایک ممبر نے رائے ظاہر کی۔

" بختو کا کوئی قصور نہیں۔۔۔۔۔" کسی اور نے کہا پھر سارے پنچ آپس میں کچھ دیر الجھتے رہے آخر کار چوہدری نے سب کو چپ کرا کے اپنی رائے دینی شروع کی۔

" پنچو میری رائے میں آدھا قصور شیرو کا اور آدھا بختو کا ہے بلکہ بختو کا قصور آدھے سے بھی کم ہے۔ اس لئے انصاف کی تکڑی کا پلڑا بختو کی طرف جاتا ہے موقع کے گواہوں کی شہادت سے ایک بات تو طے ہو گئی ہے کہ بختو اسپتال کے باہر بھیک مانگ رہی تھی اس کا ارادہ خیرو کو اسپتال میں داخل کرانے کا نہیں تھا اور نہ وہ علاج کرانے کیلئے وہاں گئی تھی"۔

" چوہدری یہ وہاں گئی اسی نیت سے تھی۔۔۔۔۔" شیرو بیچ میں بول پڑا۔

" تم نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا اب بیچ میں مت بولو۔" چوہدری نے شیرو کو ڈانٹ پلائی اور پھر کہنے لگا۔ "فرض کرو تھوڑی دیر کیلئے اگر یہ بھولے بھٹکے وہاں چلی گئی اور اس کا دل چاہا کہ خیرو کا بگڑا ہوا منہ صحیح ہو جائے تو یہ ماں بھی تو ہے ناماں کی ممتا (ممتا) بھی تو ہے نا تم سب کو ماؤں نے جنا ہے ماں کی ممتا ہوتی ہے کہ نہیں ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ بولو بتاؤ ماں کی ممتا ہوتی ہے کہ نہیں"۔

" ماں کی ممتا ہوتی ہے چوہدری۔۔۔۔۔۔" تین چار ممبروں کی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں

"تو پھر اگر ماں کی منتا ہوتی ہے تو بختو کی منتا بھی ہے۔" چوہدری نے جذباتی ہو کر بختو کی طرف دیکھا اور پھر بولنے لگا۔ "فیصلہ کرتے وقت بختو کو منتا کی رعایت ضرور ملنی چاہئے"۔

"ضرور ملنی چاہئے۔۔۔۔۔۔" کسی اور ممبر نے تائید کی۔

"تم جو فیصلہ کرو گے چوہدری مجھے منظور ہے۔۔۔۔۔۔۔" شیرو نے چوہدری کا رخ اور مزاج دیکھا تو ہتھیار پھینکنے کے انداز میں بولا۔

"تمہارا فیصلہ مجھے بھی منظور ہے چوہدری۔۔۔۔۔۔" بختو نے کہا۔

"تو پھر میرا فیصلہ سنو!۔۔۔۔۔ چوہدری نے حکم جاری کرنے کے انداز میں کہا اور پنچایت پر مکمل خاموشی طاری ہو گئی اور اطراف میں کھڑی دروازوں سے تاک جھانک کرنے والی عورتیں اپنے بچوں کے منہ پر ہاتھ رکھ کر سراپا گوش ہو گئیں۔ "میں بختو کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ وہ چاہے تو شیرو کے ساتھ رہے اور چاہے الگ ہو جانے اب یہ فیصلہ میں نے بختو کے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ بختو۔" اس نے بختو کو پکارا پنچایت میں ایک دم سے بھنبھناہٹ شروع ہو گئی اور شیرو کی جیسے روح فنا ہو گئی۔

"خاموش، خاموش۔۔۔۔۔" چوہدری پکارا اور پھر بختو سے مخاطب ہوا۔۔۔

"بولو بختو جلدی فیصلہ کرو۔۔۔۔۔۔"

میں ایک شرط پر رہوں گی اس کے ساتھ۔۔۔۔" بختو کی آواز گونجی اور محفل پر پھر خاموشی چھا گئی۔

"شرط بتاؤ۔۔۔۔۔" چوہدری نے حکم دیا۔

"شرط یہ ہے کہ شیرو نے میرے ساتھ جو زیادتی کی ہے اس کیلئے بھری محفل میں سب کے سامنے پاؤں پکڑ کر مجھ سے معافی مانگے"۔ بختو نے سینہ تان کر شرط عائد کی۔

"ہرگز نہیں۔۔۔۔۔" شیرو بھڑکا۔

"تو پھر میری اور اس کی زندگی بھر کی جدائی۔۔۔۔۔" اس نے پیٹھ موڑ کر حتمی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"بختو۔۔۔۔" وہ التجا کرنے کے انداز میں بختو سے مخاطب ہوا۔

"میری شرط پوری کرو۔۔۔۔" بختو نے اصرار کیا۔ شیرو نے شکست خوردہ انداز میں بھری محفل کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہ اندر کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی عورتوں پر پڑی جن میں شاداں

کا چہرہ بھی اسے دکھائی دے رہا تھا۔ شاداں کے چہرے پر اسے ایک عجیب طرح کی للکار دکھائی دے رہی تھی لیکن اس نے شاداں کو زیادہ اس لئے نہیں دیکھا کہ وہ اس کے راستے کی رکاوٹ بن رہی تھی!

"فیصلہ کرو شیرو..... منظور یا نامنظور"۔ چوہدری نے مداخلت کی۔

"منظور....." وہ دبے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں بولا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھ کر زمین پر جھکا اور آہستہ سے بختو کے دونوں پاؤں پکڑ لئے۔ بختو تن گئی اور اس کے چہرے پر فتح مندی کی ایک مسکراہٹ آ گئی جو فقیر نیوں کے چہرے پر کبھی نہیں آتی لیکن پتہ نہیں اچانک کیا ہوا فوراً ہی بختو نے ایک دبی سی چیخ ماری۔

"اوئی....." بختو درد سے چلائی اور سب لوگ چونک گئے۔

"کیا ہوا....." چوہدری نے ازراہ حیرت پوچھا۔

"اس نے میری بوٹی نوچ لی ہے" منہ بختو نے ایک ٹیس محسوس کرتے ہوئے کہا اور اپنا پاؤں مسلنے لگی۔

"غلط کہہ رہی ہے چوہدری۔ یہ دیکھ میرے ہاتھ کتنی دور ہیں"۔ شیرو نے دونوں ہاتھ کھڑے کئے۔ چوہدری ہنس پڑا بختو پاؤں مسلنے لگی اور محفل کشت زعفران بن گئی!

O

قیدی لڑکے جب جیل کے عملے کی نگرانی میں کام کر کے باہر واپس جیل کے اندر آئے تو روشو اس وقت بہت گہری نیند سو رہا تھا اچانک شور کی آوازیں اس کے کان میں سنائی دیں۔ گھبرا کے اس نے آنکھ کھولی تو دیکھا لڑکوں کا ایک جمگھٹا اندر داخل ہوا۔ دروازہ اسی وقت کھلا تھا اور لڑکے دھکم پیل کرتے اندر آرہے تھے۔ روشو کو یوں لگا جیسے بچھڑوں کا ایک ریوڑ طویلے میں داخل ہو رہا ہے۔ کم و بیش ہر عمر کے لڑکے تھے روشو کی عمر کے بھی، بڑے بھی تھے۔ کافی بڑے بھی تھے۔

"اٹھ بے....." ایک صحت مند سر منڈے لڑکے نے گریبان پکڑ کر روشو کو اس طرح کھڑا کر دیا جیسے وہ زمین پر پڑی ہوئی کوئی ہلکی پھلکی اور بے وزن چیز ہو۔ تمام لڑکے روشو کے آس پاس جمع ہو گئے تھے۔

"میرا نام روڈا ہے"۔ گنجے لڑکے نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کے اپنا تعارف کرایا۔ "کیا نام ہے تیرا"۔

"روشو....." روشو آہستہ سے بولا۔

"کیا کر کے آئے ہو ------" روڈو نے پوچھا۔ روشو نے کوئی جواب نہیں دیا" ۔ بتاؤ کیا کیا ہے" ۔ روڈے نے دوبارہ پوچھا۔ روشو پھر بھی چپ رہا۔

"ماں یا بہن کے آشنا کو مارا ہے ۔" روڈے نے بد تمیزی سے پوچھا۔

"قاتل ہو" ۔ روشو چپ رہا۔

"ڈاکہ ڈالا ہے" ۔ روشو کی خاموشی پر روڈے نے پھر پوچھا۔ وہ تڑ تڑ سوال پوچھتا جا رہا تھا۔

"جیب کاٹی ہے ؟"

"چوری کی ہے ؟"

"میرا خیال ہے یہ بے گناہ ہے روڈے -----" روڈے کا ساتھی ڈوڈا آگے بڑھا اور روشو کا معصوم چہرہ دیکھتے ہوئے اپنی رائے دینے لگا۔ "اس کا چہرہ دیکھو کتنا معصوم ہے" ۔

"چہرے بہت دھوکا دے جاتے ہیں ڈوڈے -----" روڈا اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ "ابھی اس کا فیصلہ ہو جاتا ہے" ۔

"روڈے نے اپنی آستین اوپر کی اور تنی ہوئی چھاتی کو اور باہر نکالا اور گھما کے ایک ہاتھ روشو کے منہ پر مارا۔ روشو پرے جا لگا۔۔ روڈے نے دوسرا مکا مارا اور فوراً ہی تیسرا ۔ اس دوران تمام لڑکوں نے اطراف میں گھیرا ڈال لیا اور جب بھی روشو روڈے کا مکا کھا کر گرنے لگتا کوئی نہ کوئی لڑکا اسے ہاتھوں سے روک کر پھر روڈے کے آگے کھڑا کر دیتا۔ روشو گدھے کی طرح مار کھا رہا تھا اور روڈے پر کسی قسم کی جوابی کاروائی نہیں کر رہا تھا۔

"وار کر مجھ پر احمق ----" روڈے نے اسے للکارا اور ایک کک ماری۔ "میں کہتا ہوں مارو مجھے -------" روڈے نے ایک اور مکا مار کر کہا۔ "ارے بے غیرت دیوس وار کر میرے اوپر" ۔ لیکن روشو نے کوئی وار نہیں کیا اور مار کھاتا رہا۔

"تھو لعنت ہے ------" روڈے نے ایک آخری زور دار گھونسہ مارا اور روشو دیوار سے ٹکرا کر دور زمین پر جا گرا ۔ ایکے روڈے نے ہاتھ روک دیا اور ترس کھانے کے انداز میں ڈوڈے اور باقی لڑکوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"نہیں یار ------ اس نے کچھ نہیں کیا۔ یہ معصوم ہے" ۔ پھر روشو کی جانب بڑھا اور ازراہ ہمدردی ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"اٹھ جا ----- شاباش اٹھ جا" ۔ روشو جو کل ہی تھانے میں کافی مار کھا چکا تھا ۔ اب روڈے سے مزید مار کھانے کے بعد اپنا جسم سہلاتے ہوئے ہمک ہمک کر روڈے کی طرف

دیکھنے لگا۔

"دیکھ بچے ......" روڈا کسی بزرگ کی طرح روشو سے مخاطب ہوا۔ "یہاں جو آتا ہے نا وہ مجرم ہوتا ہے۔ یا بے گناہ لیکن اس کے فیصلے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ بعض اوقات بچہ جیل میں جوان ہو جاتا ہے اور اسی جگہ بوڑھا ہو کے مر جاتا ہے۔ میں اتنا انتظار نہیں کرتا۔ میں جس دن ملزم آتا ہے اسی دن اس کے بارے میں فیصلے کر کے اس کو سزا سنا دیتا ہوں یا بری کر دیتا ہوں۔ جا میں نے تجھے بری کر دیا ہے۔ تو بے گناہ ہے"۔ اس نے آگے بڑھ کر روشو کی پیٹھ تھکی اور اور حوصلہ افزا لہجے میں بولا۔ "کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتانا"۔ پھر قدرے توقف سے پوچھا۔ "بھلا بتا میرا نام کیا ہے"۔

"روڈا......" روشو نے اپنے ہوش قائم کرتے ہوئے کہا۔

"شاباش...." روڈے نے داد دی۔ "اور میں یہاں کا لیڈر ہوں...... کیا ہوں"۔ روڈے نے پوچھا۔

"لیڈر......" روشو کا خوف اب دور ہو رہا تھا۔

"شاباش میں اس پوری جیل کا واحد لیڈر ہوں۔ اور میری مرضی کے بغیر یہاں پتا بھی نہیں ہل سکتا۔"

"میں نہیں مانتا....." ایک گندا میلا کچیلا اور لمبے بالوں والا لڑکا آگے بڑھا اور روڈے کو چیلنج کرتے ہوئے بولا۔

"کیا کہا سکھڑے"۔ روڈے نے بازو پھیلا کر حقارت سے پوچھا۔

"میں تمہاری لیڈری کو نہیں مانتا....." سکھڑے نے اپنے دونوں بازو پھیلائے اور ٹانگیں اس طرح کھولیں جیسے ابھی اڑ جانا چاہتا ہو۔

نہیں مانتے ہو سکھڑے؟" روڈے نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں" سکھڑے نے مزید بازو پھیلائے مزید ٹانگیں کھول دیں اس وقت روڈے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زوردار لک سکھڑے کے پیٹ میں لگا دی۔ سکھڑا دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھامے مرغ بسمل کی طرح تڑپنے اور کراہنے لگا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ سکھڑے پر جان کنی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

"اسے ایک طرف لے جا کر مالش کرو"۔ روڈے نے ڈوڈے کو ہدایت دی اور تڑپتے سکھڑے کو سہارا دے کر ڈوڈا ایک کونے میں لے گیا۔

"کوئی اور ہے جو مجھے لیڈر نہیں مانتا ہے"۔ روڈے نے پوچھا لیکن مجمع پر خاموشی طاری تھی۔

"یہ کیا تم لوگوں نے مجمع لگا رکھا ہے۔ چلو اپنی اپنی جگہ پر جاؤ"۔ سلاخوں کے باہر سے کانسٹیبل چلایا اور سب لڑکے اپنی اپنی جگہ پر چلے گئے۔

"میری جگہ کون سی ہے ------" روشو نے ڈرتے ڈرتے روڈے سے پوچھا۔

"جو جگہ تمہیں اچھی لگے وہی تمہاری ہے۔ گھبراؤ نہیں" روڈے نے تسلی اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم بے گناہ ہو۔ باقی باتیں پھر ہوں گی۔" ----- روشو کو روڈے کی مار بھول گئی اور بڑی ڈھارس ہو گئی۔ تاہم وہ اپنے موجودہ اور آنے والے حالات سے بے خبر ہو کر چپ چاپ تمام لڑکوں سے الگ ایک کونے میں جا کے دبک گیا۔

شمسہ پاشا کی آستین چڑھی کلائیوں کو بہت توجہ سے دیکھ رہی تھی جن پر سیاہ کالے اور گھنیرے بالوں کے گچھے کسی ننھے سے کالے جنگل کا سماں پیدا کر رہے تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو جان ------" پاشا نے پہلے شمسہ کو اور پھر اپنی کلائیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بال ------" وہ آہستہ سے بولی۔

"برے لگتے ہیں کیا ----" اس نے کلائیاں گھمائیں۔

"نہیں ----" وہ دھیرے سے بولی۔ "مجھے تو ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"کیسے لوگ۔" پاشا نے پوچھا۔

"ایسے گھنیرے بالوں والے ------ وہ التفات سے بولی۔

"پھر تو تمہیں بھالو بہت اچھے لگتے ہوں گے -----" پاشا نے بے اختیار کہا اور دونوں کھکھلا کر ہنسنے لگے۔ پھر شمسہ نے ہنسی روکی اور سنجیدہ ہو کے بولی۔

"پاشا اب تم جاؤ"۔

"بیزار ہو گئی ہو کیا ---" پاشا نے یگانگت سے پوچھا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔ وہ دعوے سے بولی۔

"تو پھر کیوں بھگا رہی ہو"۔

"کہیں چوہدری نہ آجائے"۔ شمسہ نے قدرے تشویش سے کہا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"۔ وہ یقین سے بولا"۔ تمہیں بار بار بتا رہوں کہ جب تک میں چوہدری کو لینے نہیں جاؤں گا۔ وہ نہیں آئے گا"۔

بات بھی درست تھی چوہدری کچھ دنوں سے باہر کے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ جاپان سے ایک کاروباری ٹیم آئی ہوئی تھی جن کے ساتھ روز کہیں نہ کہیں کا ڈنر ہوتا تھا۔ آج بھی ایک کلب میں کھانا تھا۔ جہاں پاشا چوہدری کو چھوڑ آیا تھا اور چوہدری نے اسے تقریباً گیارہ بجے پک کرنے کی ہدایت کی تھی اور یہ کچھ دنوں سے معمول ہی بن گیا تھا کہ چوہدری جتنا وقت گھر سے باہر گزارتا تھا۔ اتنا وقت پاشا چوہدری کے بیڈ روم میں گزارتا تھا۔ اور شمسہ بہت خوش تھی اور اس کی زندگی کے ٹھہرے ہوئے سمندر میں جیسے ایک دم سے خوشگوار لہریں پیدا ہو گئی تھیں جو اس کے اندر کے بے آب جزیروں سے ٹکرا کر ایک سبزہ زار اگا رہی تھیں۔

"کیا بات ہے۔" شمسہ نے از راہ حیرت پوچھا۔ کیونکہ پاشا ایک دم پلنگ سے چھلانگ لگا کر سیف کی طرف دوڑا تھا۔ شمسہ بھی سیف کے پاس گئی۔

"کل چوہدری نے بہت رقم رکھی ہے اس میں"۔ پاشا نے آہستہ آہستہ تجوری کے تالے کا نمبر گھمانا شروع کیا شمسہ بہت تجسس اور دھڑکتے دل کے ساتھ پاشا کے متحرک ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ اور پھر جیسے پاشا نے آٹو میٹک طریقے سے کلک کی آواز کے ساتھ سیف کھول دیا اور اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

"دیکھا۔۔۔۔" اس نے شمسہ کی طرف دیکھ کر داد چاہی اور ہاتھ نوٹوں کی گڈیوں کی طرف بڑھایا۔ "بہت مال ہے آج"۔

"نہیں پاشا نہیں۔۔۔۔" شمسہ نے آہستہ سے پاشا کا ہاتھ تھام کر روکا۔

"کیوں۔۔۔۔۔" پاشا نے پوچھا۔

"پہلے تو روشو تھا۔۔۔ اس پر الزام لگ گیا"۔ شمسہ نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "اب رقم نکلی تو قیامت آجائے گی تم پکڑے جاؤ گے یا مجھ پر الزام آئے گا"۔

"بات درست ہے۔۔۔۔۔" پاشا نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"پھر ہم بچھڑ جائیں گے ہمیشہ کیلئے۔۔۔۔۔ شمسہ نے مزید تشویش ظاہر کی۔

"اور میں تم سے اب کبھی نہیں بچھڑنا چاہتا"۔ اس نے سیف بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔" شمسہ نے قدرے اطمینان سے کہا۔

"نہیں شمسی۔۔۔۔" وہ بہت یگانگت سے پلٹ کر بولا۔ "اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا"

"کیوں۔۔۔؟" شمسہ بولی۔
"ایسا لگتا ہے کہ ہمیں ابھی بہت انتظار کرنا پڑے گا"۔ پاشا معنی خیز انداز میں بولا۔
"کیا مطلب۔۔۔۔۔؟" شمسہ کچھ سمجھ کر کچھ نہ سمجھ کر بولی۔
"کیا تم محسوس نہیں کر رہی ہو کہ چوہدری کی طبیعت کچھ سنبھلتی جا رہی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ جلدی مرنے والا نہیں"۔
"زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے"۔ شمسہ بولی۔
"نہیں شمسی انسان کے ہاتھ میں بھی ہے"۔ پاشا معنی خیز انداز میں بولا۔
"میں سمجھی نہیں۔۔۔۔۔" شمسہ ذہنی الجھن سے بولی۔
"ابھی سمجھاتا ہوں"۔ پاشا نے تیکھی نظروں سے شمسہ کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ہاتھ کی انگلیوں کو کیکڑے کے پنجوں کی طرح ٹیڑھا کیا اور دھیرے دھیرے شمسہ کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھا کے کسی شکرے کی طرح اس کی گردن کو اپنے پنجے میں جکڑ کر دو انگلیاں شمسہ کی نسوں میں گاڑ دیں۔
"پاشے۔۔۔۔ پا۔۔۔۔" شمسہ پوری آواز بھی نہ نکال سکی اور اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ نرخرے سے دبی دبی سانس چھوٹنے لگی اور چہرہ پھول گیا۔
"فو۔۔۔ہ۔۔؟" شمسہ نے گھٹی ہوئی سانس باہر نکالی اور پاشا نے اسے سہارا دے کر پلنگ پر بٹھا دیا۔
"ریلیکس کرو۔۔۔۔۔" پاشا نے ڈھارس دی۔ شمسہ نے اپنی غیر متوازن اور اکھڑی ہوئی سانس کو صحیح کیا اور قدرے خوف اور حیرت سے پوچھا۔
"یہ کیا کیا تم نے پاشی"۔
"میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ اگر چند سیکنڈ اور تمہاری گردن سے میں ہاتھ نہ اٹھاتا تو تم مر جاتیں"۔ پاشا نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اس کی گردن کے اس حصے کو چھو کے آہستہ سے ملا۔ جہاں نشان پڑ گئے تھے۔
"اس کا مطلب یہ ہے"۔ شمسہ تشویش سے بولی۔
"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں چوہدری کی طبعی موت کا انتظار نہیں کرنا چاہئے"۔ وہ آنکھوں میں ایک قاتل کی چمک پیدا کرتے ہوئے بولا۔
"ہاں شمسی۔۔۔۔ میں ایک منٹ میں اس کا دم گھونٹ دوں گا"۔ وہ جلال میں تھا۔
"نہیں پاشا یہ صحیح بات نہیں ہے"۔ وہ گھبرائی۔

"اس کے مرنے میں ابھی بہت دیر دکھائی دے رہی ہے شمسہ"۔ اس نے تشویش کے لہجے میں کہا۔

"تو ہمیں کیا پریشانی ہے۔ ہم اپنا اچھا وقت نہیں گزار رہے ہیں کیا"۔ شمسہ نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں شمسہ۔۔۔ میں اس وقت کو چوری چھپے نہیں گزارنا چاہتا۔" اس نے اپنے پورے وجود کو متحرک کر کے کہا۔

"لیکن۔۔۔۔۔" شمسہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن کچھ نہیں۔۔۔۔۔ وہ شمسہ کی بات کاٹ کر بولا"۔ میں اب چوہدری کا گلا گھونٹ کر اسے مار دینا چاہتا ہوں اور اس کے بعد تم اور میں، میں اور تم۔۔۔ وہ جذباتی ہو کر شمسہ کے قریب آ گیا۔

۱۰

چوہدری مکرم اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے یوں لگا جیسے ان کے جسم کی چلتی مشین کا کوئی پرزہ اچانک ٹوٹ گیا ہو۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے تو ان کا موڈ انتہائی خوشگوار تھا۔ وہ شمسہ کے سامنے ہمیشہ بہت اچھے موڈ میں ہنستا کھیلتا چہرہ لے کر آتے تھے۔ شمسہ کو دیکھتے ہی ان کے چہرے کی کیفیت بدل جایا کرتی تھی اور ایک آدھ بار تو شمسہ نے ازراہ مذاق پوچھا بھی تھا۔

"یہ مجھے دیکھ کر تمہارے چہرے پر بجلیاں کیوں چمکنے لگی ہیں۔"

"تم ہو جو بجلی۔۔۔۔۔" چوہدری نے بے ساختہ جواب دیا تھا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ شمسہ کو دیکھ کر چوہدری کا چہرہ روشن ہو جاتا تھا کبھی کبھی تو اس قدر ہیجان ہوتا تھا کہ ان کے جسم کا رعشہ اور زیادہ تیز ہو جاتا اور وہ جلدی جلدی کانپنے لگتے تھے اور کبھی کبھی الٹا ہی اثر ہوا کہ ان کا لرزیدہ بدن ایک دم ساکت ہو جاتا۔ اور شمسہ پوچھتی۔

"تم پتھر کے کیوں ہو گئے؟"

"تم نے جو پتھر بنا دیا ہے۔۔۔۔۔" چوہدری بڑے جوش سے جواب دیتا۔

لیکن آج جب انہوں نے بیڈ روم کی کیفیت دیکھی شمسہ کو اور پاشا کو دیکھا تو سچ مچ پتھر کے بن گئے۔ شمسہ اور پاشا اتنے قریب تھے کہ چوہدری کے داخل ہونے تک وہ قربت میں فاصلہ بھی پیدا نہیں کر سکے۔ چوہدری مکرم جانتے تھے کہ عورت کچھ بھی کر سکتی ہے۔ خاص کر ایسی عورت جو ان جیسے آدمی کی تحویل میں ہو اور جسے وہ مسخر نہ کر سکا ہو ایسی عورت طلب کی خالی جھولی رکھنے والی بے منزل اور محروم عورت پر زیادہ بھروسہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے انہوں نے اپنی کوٹھی میں عام طور پر اور اپنے بیڈ روم میں خاص طور پر کسی بھی ذی روح کا داخلہ ماسوائے چند کے بند کر رکھا تھا۔ پاشا کو وہ صرف اس وقت بیڈ روم میں بلاتے تھے اور داخل ہونے کی اجازت دیتے تھے

جب وہ خود بھی بیڈ روم میں موجود ہوتے۔ پھر پاشا کے وجود کو تو انہوں نے بحیثیت ایک مرد یا نقصان پہنچانے والے فرد کی حیثیت سے بالکل صفر کر رکھا تھا۔ چوہدری صاحب کے نزدیک تو پاشا ایک جذبات اور احساسات سے خالی فالتو کل پرزہ تھا۔ ایک نٹ بولٹ کہ جہاں ان کی کام کاج کی مشین میں ضرورت پڑی اسے فٹ کر دیا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہی اضافی کل پرزہ، ان کے دل میں ایٹم والو کی طرح فٹ ہو جائے گا۔

وہ پاشا کو محض ایک روبورٹ سمجھتے تھے ان کی زندگی کا جو انتہائی گھٹیا کام ہوتا تھا اس گھٹیا کام کے لئے انہوں نے پاشا کو مامور کر رکھا تھا اور کبھی غیرت، عزت اور انا، کی ہلکی سی جھلک بھی چوہدری نے پاشا کے اندر نہیں دیکھی تھی اور پاشا نے بھی چوہدری کے سامنے صرف ایک ہی چیز کا اظہار کیا تھا اور وہ تھی چوہدری کے ساتھ وفاداری اور اس وفاداری کو ثابت کرنے کیلئے پاشا نے کبھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا اور کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی اور ایک دن اسے آزمانے کیلئے چوہدری نے محض تفریح کیلئے پوچھ لیا تھا۔ کہنے لگے۔

"پاشا میں تمہاری وفاداری پر کس حد تک یقین کر سکتا ہوں؟"

"جس حد تک آپ کا یقین جا سکتا ہے چوہدری صاحب۔۔۔۔۔۔" پاشا نے فوراً جواب دیا۔

"کوئی ثبوت دے سکتے ہو۔۔۔۔؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔ اسی وقت پاشا اٹھا اور اٹھ کے چوہدری صاحب کے دونوں قدموں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

"آپ کے جوتے اٹھانے کو تیار ہوں۔۔۔۔۔۔" اس نے سر بلند کر کے کہا۔ "اور اس پر بھی فخر کروں گا۔"

"مزا نہیں آیا۔۔۔۔" وہ لطف لینے کیلئے ہنسے اور جسم کی کپکپاہٹ تیز ہو گئی۔

"یہ بات ہے۔۔۔۔۔۔" پاشا نے جواب دیا اور پھر ایک لمحہ توقف کئے بغیر اس نے چوہدری صاحب کے پاؤں سے جوتا نکالا۔ جوتا ہاتھ میں اٹھایا۔ پاس ہی ٹیبل پر پانی کا جگ پڑا تھا۔ جگ اٹھا کے چوہدری کے جوتے میں انڈیلا اور جب جوتا پانی سے بھر گیا تو غٹ غٹ کر کے پی گیا اور چوہدری دم بخود اسے دیکھتے رہ گئے

"اب مزا آیا چوہدری صاحب۔۔۔۔" اس نے پانی حلق سے نیچے اتار کر پرسکون لہجے میں کہا۔

"جوتوں میں پانی پینا ایک محاورہ تو ہے چوہدری صاحب۔۔۔۔" وہ مزید بولا۔ "لیکن لوگ پیتے نہیں، بولتے ہیں۔ نہ آپ نے کبھی کسی کو کسی کے جوتے میں پانی پیتے دیکھا ہو گا۔ میں نے آپ

کے جوتے میں پانی پیا ہے۔ اگر اس پر اب بھی کوئی اور ثبوت چاہتے ہیں چوہدری صاحب تو پھر میں کوئی اور ثبوت نہیں دے سکتا۔۔

"پاشے ......۔ چوہدری محو حیرت ہو کر بولے تھے۔ "آج میں تم سے خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔۔

"سو فیصد صحیح کہا آپ نے چوہدری صاحب......۔ پاشا نے وفادار کتے کی طرح چوہدری صاحب کے گرد منڈلاتے ہوئے کہا تھا۔ "آپ حکم تو کریں......میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔۔

اور پھر پاشا کے بارے میں چوہدری کی رائے صحیح نکلی کہ جو بندہ جوتے میں پانی پی سکتا ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ غیر متوقع طور پر چوہدری کی عدم موجودگی میں اس کے بیڈ روم میں نقب لگا کے اس کے تکلیے پر قابض تھا اور اس کی بیوی مکمل طور پر اس کی گرفت اور تحویل میں تھی اور چوہدری کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ غالباً اس کی پہلی نقب زنی نہیں پہلا ڈاکہ نہیں ہے۔ خدا جانے وہ کب سے اس کے مال پر ڈاکے ڈال رہا ہے۔

"کتے ......۔ چوہدری صاحب کا صدمے سے منجمد ہو جانے والا جسم ایک بار پھر متحرک ہوا اور انہوں نے خشم آلود لہجے میں پاشا کو غلیظ گالی دی۔

"فاحشہ......۔ اب کے وہ ایک گندی گالی دے کر شمسہ کی جانب مڑے۔ شمسہ اور پاشا کے ہوش بھی ٹھکانے آ چکے تھے پاشا اس طرح بیڈ سے اچھل کے دور ہو گیا جیسے بلی کبوتری کے ڈربے سے کودتی ہے اور شمسہ بھی کبوتری ہی طرح اچھل کر پرے جا لگی۔

"میں تم سے تو بعد میں بات کروں گا پہلے اس کتے کے بچے سے نمٹ لوں......۔ وہ شمسہ سے مخاطب ہو کر خونخوار انداز میں پاشا کی جانب مڑے اور بوڑھے شیر کی طرح جھپٹنے کے انداز میں آگے بڑھے۔

"خبردار بڈھے کھوسٹ......۔ پاشا جنگلی بلے کی طرح تیار ہو کر سامنے کھڑا ہو گیا اور نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ پاؤں پھیلا کر انتہائی توہین آمیز لہجے میں بولا۔ "اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ایسی فلائینگ کک ماروں گا کہ ایک ہی کک میں تیری اٹکی ہوئی روح پرواز کر جائے گی۔۔

پاشا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اس پر جانکنی کا سا عالم طاری ہو گیا ایک ناقابل برداشت غصہ اور ناقابل برداشت بے بسی کے عالم سے وہ دو چار تھا۔ چوہدری کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔

"میرے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے کے بچے ------- " چوہدری صاحب کپکپائے۔
"تم ہو۔ پاشا آہستہ سے گالی لوٹاتے ہوئے بولا۔
"سور کی اولاد ------" چوہدری نے دانت پیسے۔
" تم ہو ------ "اس نے پھر آہستہ سے گالی لوٹائی۔ چوہدری ادھر ادھر لپکے اور پھر ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا لرزیدہ ہاتھوں سے جب ڈائل گھمانے لگے تو پاشا نے پوچھا۔
"کس کو کر رہے ہو فون کھوسٹ ------
" ابھی معلوم ہو جائے گا ------ "انہوں نے ڈائل گھماتے ہوئے کہا اور پاشا نے چیتے کی طرح جھپٹ کر ٹیلیفون کا تار توڑ دیا اور بد تمیزی سے بولا۔
سن بڈھے ------ آرام سے پہلے بات سن لے میری۔۔
چوہدری جہاں تھا وہاں کھڑا رہ گیا۔
"ادھر آ، شمسی ------ "اب کے وہ بہت پیار کے ساتھ شمسہ سے مخاطب ہوا لیکن شمسہ بہت ڈری سہمی خوف و ہراس کے عالم میں کھڑی رہی۔
" ڈر نہیں جان ------ " پاشا شمسہ کے پاس چلا گیا اور اپنا ایک بازو اس کے کندھے پر حمائل کر دیا۔
" دیکھ بڈھے ------ "وہ چوہدری سے مخاطب ہوا۔
" اف خدایا ----- یہ کتنا دلیر ہو گیا ہے ------ " چوہدری صاحب اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گئے اور بے بس ہو گئے۔
" تم نے آج تک جتنے کام کئے غلط کئے ------ " پاشا نے شمسہ کو اپنے اور قریب کر لیا اور پھر بولا۔
" غور سے دیکھ ------ شمسہ کو دیکھ کر اور مجھے دیکھ۔ کیا جوڑی سج رہی ہے ہماری۔۔ "وہ انتہائی ڈھٹائی سے بولا۔ " ایسا لگتا ہے جیسے خدا نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کیلئے بنایا ہے۔۔ "وہ مزید بولا " یہ تقدیر میری تھی اس پر قابض تم ہو گئے۔ لیکن تمہارا یہ قبضہ ناجائز تھا کیونکہ تم نے اس پر قبضہ تو کر لیا لیکن مسخر نہیں کر سکے۔ مسخر اسے میں نے کیا ہے اور اس نے مجھے کیا ہے تم اسے سب کچھ دے کر بھی کچھ نہ دے سکے اور میں نے کچھ نہ دے کر بھی اسے سب کچھ دے دیا۔۔
پھر وہ شمسہ کی طرف مڑا اور بڑی محبت سے بولا۔ " ٹھیک کہہ رہا ہوں نا جان -----
شمسہ نے ایک ترچھی سی نظر سے اسے اور پھر چوہدری کو دیکھا لیکن کچھ نہ بولی۔ چوہدری کی

غصے اور بے بسی میں ایسی کیفیت ہو رہی تھی جیسے اس کے پھیپھڑوں میں ہوا بھری جا رہی ہو۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ سرخ ہوتا جا رہا تھا جسم کی کپکپی تیز ہو رہی تھی اور لگتا تھا کسی وقت دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

" تم خود کو دیکھو اور اس معصوم کو دیکھو، بڈھے۔" وہ مزید بولا۔ " کوئی یقین کرے گا کہ تم میاں بیوی ہو۔ تم باپ بیٹی بھی نہیں، دادا پوتی لگتے ہو۔ لہذا ہم دونوں نے اس غیر حقیقی اور غیر فطری ملاپ کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا ہے اور اب ہم دونوں تمہاری موت کے بعد شادی کر رہے ہیں اور تمہاری موت اب زیادہ دور نہیں، آج، اسی وقت اسی کمرے میں، موت کا فرشتہ تمہاری اٹکی ہوئی روح کو قبض کر کے تمہیں دوزخ میں بھیج دے گا۔ پھر وہاں تم قلو پطرہ، ہیلن آف ٹرائے، مارلن منرو اور دوسری حسیناؤں کے ساتھ وقت گزارنا بڈھے

" بند کرو یہ بکواس کتے ......۔ چوہدری کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ بڑے زور سے بلغمی اور رندھی ہوئی آواز میں دھاڑے اور پاگلوں کی طرح دراز میں سے پستول نکال کے کپکپاتے ہاتھوں سے پاشا پر شست باندھی۔

" میں ایک کتے کو مار کر پھانسی نہیں چڑھنا چاہتا تھا......۔ وہ خشم آلود لہجے میں بولے۔ " لیکن کتا پاگل ہو گیا ہے اور پاگل کتے کو شوٹ کرنا بہت ضروری ہے۔۔ پاشا تھوڑا سا گھبرایا لیکن پھر فوراً مستعد ہو گیا۔

" اوں، ہوں......۔ پاشا نے گھما کے شمسہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ کچھ اس طرح کہ شمسہ کی پیٹھ پستول کی نالی کے آگے آگئی۔

" اب مارو گولی......۔ پاشا نے شمسہ کو سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

" پاشا......۔ شمسہ گھبرائی۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ " یہ مجھے مار دے پاشا گا۔۔

" فکر نہ کرو جان......۔ وہ شمسہ سے مخاطب ہوا۔ " یہ گولی صرف تمہیں نہیں تمہاری پیٹھ میں داخل ہو کر میری چھاتی میں پیوست ہو جائے گی۔۔

شمسہ کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔

" ہم دونوں اکھٹے مریں گے چوہدری......۔ وہ چوہدری سے مخاطب ہوا۔ " اور اس طرح ایک نئے لیلی مجنوں کا قصہ مشہور ہو جائے گا اور یہ قصہ تمہاری کوٹھی سے نکلے گا، اخباروں میں چھپے گا اور اس پر فلمیں بنیں گی۔۔

" تم کیا سمجھتے ہو میں اب گولی نہیں چلاؤں گا......۔ چوہدری غرایا۔۔ مجھے دو گولیوں سے

تم دونوں کو مارنا تھا اب اگر ایک سے دونوں مرو گے تو اور بھی اچھا ہے۔ ایک گولی بچے گی۔"

"بہت کفایت شعار ہو گیا ہے تو ------" پاشا پھر بد تمیزی سے بولا۔ "کہاں تو عورت کیلئے لاکھوں روپے برباد کر دیتا تھا کہاں اب اس پر الگ، ایک گولی نہیں خرچ کر رہا ہے۔ ہاہاہا۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا اور شمسہ کو مزید نشانے پر لے آیا۔

"بند کرو بکواس کتے ------" چوہدری صاحب بالکل ہی بے قابو ہو گئے تھے۔ شمسہ پر گولی چلانا ان کیلئے آسان تو نہیں تھا وہ اسے کچھ نہ دے سکنے کے باوجود اسے اپنی جان تک دینے کو تیار تھے لیکن اس وقت پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور شمسہ کی بے حیائی اور بے وفائی نے انہیں سخت صدمہ پہنچایا تھا اور اشتعال نے ان کی قوت برداشت کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔!

"میں تجھ سے آخری بار کہتا ہوں کہ عورت کا سہارا مت لے ------" چوہدری صاحب نے پستول کی لبلبی پر انگلی رکھی اور پاشا سے مخاطب ہوئے۔ وہ اب بھی شمسہ کی زندگی غالباً بچانا چاہتے تھے۔

"عورت کا سہارا تو سیزر انتونی اور ہٹلر جیسے جرنیلوں نے بھی لیا ہے بڈھے ----- میں کیسے نہ لوں۔" وہ بے شرمی سے بولا اور شمسہ کو زیادہ قریب اور زیادہ پستول کے نشانے پر لے آیا۔

"میں کہتا ہوں ہٹا اس کو آگے سے ------" وہ غصے میں لبریز ہونے کے باوجود شمسہ کو گولی نہیں مارنا چاہتے تھے۔

"اب تو یہ آگے ہی رہے گی -------" وہ ہٹ دھرمی سے بولا اور چوہدری صاحب نے بادل نخواستہ آنکھیں بند کر کے پستول کی لبلبی دبا دی۔ لیکن اس میں سے ہلکی سی "کڑک" کی آواز آئی۔ کوئی فائر، کوئی دھماکہ نہیں ہوا۔ چوہدری نے گھبراہٹ میں جلدی جلدی دو تین بار لبلبی دبائی لیکن کوئی گولی نہیں نکلی۔ اس پر پاشا نے شمسہ کو الگ کیا اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"ہاہاہاہا، پاگل سٹھیائے ہوئے بلکہ اسیائے ہوئے بڈھے ------" وہ چھاتی نکال کر سامنے آیا۔ "تو کیا سمجھتا ہے میں تیرے بیڈ روم میں قبضہ کرنے کے بعد تیرے بیڈ میں بھرا ہوا پستول چھوڑ دوں گا۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور گولیاں نکال کر بستر پر پھینک دیں۔ چوہدری نے گولیوں پر جھپٹا مارا لیکن ابھی وہ جھکا ہی تھا کہ پاشا نے ایک زوردار کک چوہدری کے منہ پر ماری۔ چوہدری کے منہ سے ایک ہائے نکلی۔ کک کے زور پر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑا کر دور پرے، باتھ روم کے پاس جا گرا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا

"بچاؤ بچاؤ ------" اس نے دو تین آوازیں نکالیں لیکن ساؤنڈ پروف کمرے سے آواز باہر نہ

نکل سکی۔ ویسے بھی کوٹھی کے باہر کی دنیا کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ بیڈ روم کے اندر کیا ہو رہا ہے اور پاشا نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ روم کا سرخ بلب بھی روشن کر دیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب اندر کوئی نہیں آسکتا۔ چوہدری نے ہمت کر کے اٹھنے کی کوشش کی اور نہایت بے بسی سے رحم طلب انداز میں ہاتھ شمسہ کی طرف بڑھایا اور آہستہ سے پکارا۔

"شمسہ۔۔۔۔۔۔"

"لیٹا رہ۔۔۔۔۔۔" پاشا نے ایک ہلکی سی لک اور لگا کے پھر چوہدری کو لٹا دیا۔ اس وقت چوہدری نے زور سے مدد کیلئے پکارا۔ لیکن پاشا نے نہایت پھرتی کے ساتھ بلے کی طرح چھلانگ لگائی اور چوہدری کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور بائیں ہتھیلی سے دبا کر اس طرح چوہدری کا منہ بند کر دیا جیسے ڈھکن لگا دیا ہو۔ پھر اس نے چوہدری کی گردن پر اسی طرح اپنی انگلیاں گاڑیں جس طرح انگلیاں گاڑنے کا مظاہرہ شمسہ کی گردن پر کیا تھا۔ چوہدری کے نرخرے سے آوازیں آنے لگیں اور آنکھیں پھٹ کر باہر نکل آ ئیں۔

"کیسا۔۔۔۔۔۔؟" وہ لطف لیتے ہوئے مسکرایا اور داد پانے کے انداز میں شمسہ کی طرف دیکھ کر پوچھا لیکن شمسہ قطعی طور پر لطف اندوز نہیں ہو رہی تھی کیونکہ اس پر خوف سے کپکپی طاری تھی۔

"گھبراؤ نہیں جان من۔۔۔۔۔۔" اس نے شمسہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اگر یہ ڈر ہے کہ یہ زندہ بچ جائے گا تو یہ ڈر دل سے نکال دو۔ یہ اب بچے گا نہیں۔ اگر بچ گیا تو ہم دونوں مارے جائیں گے۔ اس لئے اسے فوری طور پر مار دینا ضروری ہے۔" یہ کہہ کر پاشا نے اپنی انگلیاں اور زیادہ اندر کی طرف گاڑ دیں اور چوہدری جیسے مکمل طور پر، شکنجے میں آکے بے بس ہو گیا وہ فریاد کرنے یا کراہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے دونوں ہاتھ کسی طرح اٹھائے اور ان کو ملتجیانہ انداز میں جوڑا۔ پتہ نہیں وہ پاشا کے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا یا شمسہ کے آگے۔ لیکن یہ اس کی آخری اپیل تھی۔

"پاشا۔۔۔۔۔۔" شمسہ نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن کہہ نہ سکی اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"ہمت رکھو۔۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پاشا نے شمسہ کو تسلی دی اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "ادھر آؤ۔۔۔۔۔۔" شمسہ پاس آئی اور سوالیہ نشان بن گئی۔ "اس کے گلے پر میری انگلیوں کے نشان رہ جائیں گے۔" پاشا نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"ہاں" شمسہ بے اختیار بولی۔ "تم نشانوں کی وجہ سے پکڑے جاؤ گے۔" وہ اندیشہ ظاہر کرتے

ہوئے بولی۔

"ایک کام کرو۔۔۔۔۔۔ پاشا نے کہا۔" یہ تانبے کا گل دان اٹھاؤ اور پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارو۔۔۔۔ پاشا نے تجویز پیش کی۔ "یہ ایک ہی چوٹ میں مر جائے گا۔۔ شمسہ پاشا کا چہرہ دیکھنے لگی۔ "ہاں شمسی۔۔۔۔۔۔ وہ قائل کرتے ہوئے بولا۔ "اس طرح کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں اس کا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا تھا چکرا کے تانبے کے گلدان پر گر گیا۔۔

"شمسہ کچھ دیر خاموش رہ کر سوچنے لگی تو پاشا حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔ "زیادہ سوچو مت آدمی جتنا سوچتا ہے اتنا زیادہ الجھ جاتا ہے۔ شاباش اٹھاؤ گل دان۔۔

"شمسہ نے ہمت کی اور کارنس پر رکھا ہوا بھاری بھر کم گلدان اٹھایا۔ اس وقت پاشا نے چوہدری کی گردن پر اپنی انگلیوں کی گرفت ذرا سی ڈھیلی چھوڑی اور چوہدری کو سانس لینے کا ذرا سا موقع دیا۔

"بول بڈھے کوئی آخری خواہش ہے۔۔۔۔۔۔ پاشا نے ظالمانہ طریقے سے پوچھا اور چوہدری جو بمشکل زندہ رہنے کیلئے ایک سانس لے سکا تھا اپنے سر کو نفی یا اثبات میں نہیں ہلا سکا۔

"بڈھے کی کوئی خواہش نہیں کرو وار۔۔ پاشا شمسہ سے مخاطب ہوا۔ شمسہ نے گل دان کو مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور گھما کے سر کے اوپر لے گئی۔

"شاباش پوری قوت سے مارنا تاکہ ایک وار میں کام تمام ہو جائے۔۔

"تم فکر نہ کرو۔۔۔۔۔۔ شمسہ میں پتہ نہیں کہاں سے ہمت اور قوت عود کر آئی تھی اس نے پوری طاقت استعمال کر کے بھاری بھر کم گلدان گھمایا اور دھائیں سے چوہدری کے بجائے پاشا کے سر پر دے مارا اور ایک ہی وار میں پاشا دھڑام سے دائیں جانب فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ چوہدری نے ایک بار پھر زندگی کی لمبی اور کھلی سانس لی جیسے قبر سے باہر نکالا گیا مردہ ہو۔ اس نے اپنے تنفس کو قابو میں کیا آنکھیں کھولیں۔ بے ہوش پڑے ہوئے پاشا کو ایک نظر دیکھا اور پھر بے وفا شمسہ کو دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تم نے۔۔۔۔۔۔ وہ کہتے کہتے چپ ہوا۔

"میں بہر حال جیں تمہاری بیوی ہوں چوہدری۔۔۔۔۔۔ شمسہ نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"چلو بھول جاؤ اب۔۔۔۔۔۔ چوہدری نے زمین سے اٹھ کر اس کا جھکا ہوا سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم مجھ سے انتقام نہیں لو گے ------ شمسہ تذبذب میں بولی۔
"نہیں ------ چوہدری نے جواب دیا۔ تمہاری بے وفائی اپنی جگہ، بے وفائی کی وجوہات اپنی جگہ۔ لیکن تم نے میری جان بچا کر سارے حساب چکا دیئے ہیں۔" وہ اپنی گردن مسلنے اور سہلانے لگے۔
"اوہ ------ شمسہ نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور پھر بے سدھ پڑے پاشا کی طرف دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔
"یہ زندہ ہے یا مر گیا ------
"یہ زندہ اور خطرناک بھی ہے ------ چوہدری نے اسے چھو کر اور تنفس کا جائزہ لے کر کہا۔
"اس کا کیا کریں ------ وہ تشویش سے بولی۔
"میں ذرا سستا لوں۔ تھک گیا ہوں۔ پھر سوچوں گا۔ فی الحال یہ رسی تم اس کے ارد گرد لپیٹ کر اسے مضبوطی سے باندھ دو۔"
چوہدری نے دراز سے نائیلون کی ایک ڈوری نکال کے شمسہ کے سپرد کی پھر دونوں نے مل کر ڈوری پاشا کے اطراف اس طرح لپیٹ دی کہ اس کے بازو اور ٹانگیں شکنجے میں آگئیں۔ انہوں نے دہری تہری گرہیں لگا کر شکنجہ مضبوط کر دیا۔
"اب یہ گزند نہیں پہنچا سکتا ------ چوہدری نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔
"اب کیا کرو گے اس کا ------ شمسہ کو پھر تشویش ہوئی۔
"رک جاؤ ------ جلدی نہ کرو۔ اس کے بارے میں اب مجھے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔" وہ تردد سے بولا اور پھر سوچ میں پڑ گیا۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔
"کرمی ------ شمسہ نے آہستہ سے چوہدری کو پکارا اور چوہدری کسی سوچ سے چونک گیا۔ وہ کبھی کبھی چوہدری مکرم کو پیار سے "کرمی" کہہ کر پکارا کرتی تھی وہ پیار کتنا ہی سطحی، مصنوعی اور جعلی ہو لیکن چوہدری اس کے تخاطب پر یقین کر لیا کرتا تھا۔
"ہونہہ ------ چوہدری آہستہ سے بولا۔
"ایک بات بتاؤں ------ شمسہ نے پوچھا۔
"بولو ------ چوہدری بے توجہی سے بولا وہ غالباً یہی سمجھا کہ شمسہ اپنے نئے عشووں سے پھر اسے بے وقوف بنانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔
"کیا بات ہے ------ چوہدری نے پوچھا۔

"تمہارے سیف سے جو چوری ہوئی تھی نا.... وہ اس نے کی تھی۔ روشو نے نہیں۔"
شمسہ نے انکشاف کیا اور چوہدری ایک دم چونک سا گیا۔
"تو یہ بات...... " چوہدری سوچ میں پڑ گیا۔
"روشو معصوم اور بے گناہ ہے بالکل...... وہ روشو کی وکالت کرتے ہوئے بولی۔
"یہ خیال تمہیں اس وقت کیوں نہ آیا......... چوہدری ازراہ طنز بولا۔ "کیونکہ اس وقت عشق تمہارے دماغ میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں۔" اس نے کھوپڑی پر ہاتھ لگا کر کہا۔
"اب تم جو چاہے کہہ لو....... وہ کسی مجرم کی طرح پھر سر جھکا کے بولی۔ "میں نے تمہیں حقیقت بتا دی ہے۔"
"اس رقم میں تمہارا کتنا حصہ تھا....... اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
شمسہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آبدیدہ ہو گئی۔
"اب مجھے واقعی سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا پڑے گا۔" وہ اپنا لہجہ بدل کر بولا۔ "تم فی الحال مجھے ایک کپ کافی پلا دو۔ لیکن کسی کو اندر نہ بلانا۔ خود بنا لاؤ۔"
شمسہ کافی بنانے کیلئے کچن میں چلی گئی اور چوہدری پلنگ پر ٹیک لگا کے پاشا اور شمسہ کے مستقبل کے بارے میں منصوبہ تیار کرنے لگا۔

O

"اصلاح گھر کا ماحول روشو کے تصور سے باہر تھا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ کہاں ہے اور کیوں ہے..... اتنے بہت سارے لڑکے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں، اور رشتے داروں سے دور اور الگ تھلگ ایک جگہ قیدی کی حیثیت سے بند رہیں اور کمال حیرت کی بات اس کیلئے یہ تھی یہ تمام کے تمام لڑکے مجرم تھے اور ان میں سے کچھ نے بہت بڑے بڑے جرائم کر رکھے تھے!
"بھلا ایسے چھوٹے بچے مجرم کیسے ہو سکتے ہیں.......؟" اس نے لمحے کے لئے سوچا لیکن دوسرے لمحے خود زہر خند طریقے سے ہنس پڑا۔ یہ سوچ کر کہ وہ خود بھی تو مجرم ہے اور چاہے اس نے جرم نہیں کیا لیکن اسے بھی تو ایک بہت بڑے جرم کی پاداش میں جیل بھیجا گیا ہے کیا یہ سب لڑکے جو اس جیل میں ہیں وہ بھی بے گناہ ہیں یا انہوں نے جرم کر رکھے ہیں یا آدھے مجرم ہیں اور آدھے بے گناہ ہیں یا سب کے سب بے گناہ ہیں یا سب کے سب مجرم ہیں عجیب گورکھ دھندا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ جیلوں میں کون لوگ ہوتے ہیں مجرم یا بے گناہ۔ وہ صرف اپنے بارے میں جانتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے اور اس نے کسی قسم کا کوئی جرم نہیں کیا۔ ای۔جی اس کی بے

گناہی کی گواہی دے چکی ہیں شاہینہ کو یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہے اور شاہینہ تو اس کے بے گناہ پکڑے جانے پر پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔

"شاہینہ۔۔۔۔۔" اسے بے اختیار شاہینہ یاد آئی۔

اس وقت جیل کے اندر رات کی تاریکی میں تمام لڑکے گہری نیند سو رہے تھے تاہم گھپ اندھیرا نہیں تھا۔ باہر برآمدے میں بلب روشن تھا جس کی روشنی روشن دان اور کھڑکی سے چھن کر اندر اس کے بستر کے قریب دیوار پر پڑ رہی تھی۔ جس کی ملگجی سی روشنی سارے کمرے میں دکھائی دیتی تھی اور تمام بے خبر سوئے ہوئے لڑکے بھی صاف نظر آرہے تھے۔ لیکن روشو کی آنکھوں میں نیند بالکل نہیں تھی۔ وہ پتہ نہیں کیوں اچانک شاہینہ کے بارے میں سوچنے لگا تھا اس کا معصوم پرکشش سفید اور چاند کی طرح گول لیکن مغموم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا وہ اس کے بے گناہ پکڑے جانے پر کتنی اداس تھی کہ کس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اور کس طرح پولیس اور روشو کے درمیان دیوار بن گئی تھی اور کس طرح اس کے ظالم باپ نے ایک زور دار دھکا دے کر شاہینہ کو دور پھینکا تھا۔

"کتنی اچھی ہے شاہینہ۔۔۔۔۔" وہ سوچنے لگا۔ "کتنا خوبصورت چہرہ ہے اس کا کتنی اچھی باتیں کرتی ہے وہ کتنی نیک دل ہے، کتنی لائق ہے اور کتنا اچھا پڑھاتی ہے۔۔" روشو شاہینہ کے بارے میں سوچتے سوچتے اس طرح گہری اور پرسکون نیند سو گیا جیسے شاہینہ کے خیال نے ہی اسے لوری دیکر نیند کے سبزہ زاروں میں تحلیل کر دیا ہو وہ بے خبر سو گیا سہانے خوابوں کے آسمانوں کی نیلگوں وادیوں کے اندر!

رات کا تیسرا پہر تھا تب اچانک اس کی نیند میں کچھ خلل سا پیدا ہوا۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھ مکمل طور پر کھلی تو نہیں لیکن اس نے ایک اضطرابی سی کیفیت محسوس کی جیسے کوئی پرکٹا پرندہ الجھے ہوئے سرکنڈوں میں اس طرح پھنس گیا ہو کہ اسے باہر نکلنے کا راستہ دکھائی نہ دے۔ وہ نیند ہی میں کسمسایا کچھ ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی پھر اسے ایسے لگا جیسے وہ سرکنڈوں میں پھنس گیا ہے کانٹے دار جھاڑیاں، جدھر بھی مڑتا ہے ایک چبھن محسوس کرتا ہے پھر ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ روشن دان سے چھن کر آتی ہوئی ملگجی روشنی میں اسے سکھڑا دکھائی دیا جس کے سر کے لمبے گندے بال اس کے منہ پر جھاڑو سی لگا رہے تھے۔

"پرے ہٹ۔۔۔۔۔!" روشو نے اسے دھکا دیا۔ "اپنی جگہ پر سو۔۔"

"میری بات سن۔۔۔۔۔۔" سکھڑا سرگوشی میں بولا۔ "یہاں بہت خراب لڑکے ہیں۔۔

"تو.........روشو بر ہم تھا۔
"آتو اور میں دوستی کرلیں۔ سکھڑا سرگوشی میں بولے جارہا تھا۔
" میری تیرے ساتھ دشمنی تو نہیں ہے.......روشو نے آنکھیں ملتے ہوئے پریشانی میں جواب دیا۔
" پر دوستی بھی تو نہیں ہے......سکھڑا بولا۔" ہم تم دوست ہو گئے تو ان سب کو ناک چنے چبوادیں گے۔۔
لیکن وہ ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اچانک ایک ٹانگ ہوا میں گھومی اور دھائیں سے سکھڑے کی ناک پر اتنے زور دار انداز میں لگی کہ وہ دور جاگرا اور ساتھ ہی خون کا فوارہ اس کی ناک سے بہہ نکلا۔
"تو ناک چنے بعد میں چبوانا پہلے میں تیری ناک میں پھنسا ہوا چنا تو باہر نکالوں۔۔
یہ روڈے کی آواز تھی جس نے ایک ہی لک سے سکھڑے کو سیدھا کر دیا تھا ایک دم سے سوتے ہوئے کئی لڑکے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور۔ روڈا بے انتہا غصے اور قہر کے عالم میں سکھڑے کی جانب بڑھا اور اس کی ناک سے بہتے خون کی پروا کئے بغیر گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک زنانے کا تھپڑ مارتے ہوئے بولا۔"کمینے......تو اپنی بد معاشیوں سے باز نہیں آئے گا کتے کی ٹیڑھی دم۔.....
" تجھے کس نے معتبر بنایا ہے۔کتے کے بچے۔۔ سکھڑا ایک جنونی کیفیت میں مبتلا ہو کے روڈے کی ٹانگوں میں گھس گیا ساتھ ہی چیخنے چلانے اور گالیاں دینے لگا۔شور شرابا سن کر تمام لڑکے بیدار ہو گئے روڈا اور سکھڑا ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور روشو سہما ڈرا ایک طرف کھڑا تھا معاً لوہے کے دروازے کو کسی نے ڈنڈے سے بجایا، ساتھ ہی دروازہ کھلا اور سنتری اندر داخل ہوا۔
" خاموش خاموش.......سنتری زور سے پکارا۔ پھر اس نے سکھڑے اور روڈے دونوں کو دو دو ڈنڈے مار کر الگ کیا۔" خبردار.....شرم نہیں آتی ہے۔آدھی رات کو بھی ہنگامے کرتے ہو۔۔
" اس کتے کی نسل کو سمجھاؤ.......روڈے نے سکھڑے کی طرف دیکھ کر غصے سے ہانپتے ہوئے کہا سکھڑا بھی تھوڑا سا اکڑا لیکن سنتری نے ڈنڈا دکھاتے ہوئے کہا۔
"اچھا بس ختم۔۔

ہال میں تھوڑی دیر کیلئے خاموشی ہوگئی تو سنتری نے حکم دیا۔ "چلو سب اپنی اپنی جگہ پر سو جاؤ۔۔۔۔" اور پھر توقف کئے بغیر بولا۔ "یہ روشو کون ہے "۔؟

روشو ذرا چونکا تو سنتری خود ہی روشو کی طرف دیکھ کر بولا

"تم ہو۔۔۔۔۔!"

روشو نے تذبذب کے عالم اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آجاؤ میرے ساتھ"۔ سنتری نے روشو کی کلائی پکڑ کر کہا۔

"کہاں لے جارہے ہو اسے۔۔۔۔۔؟" روڈے نے راستے میں مدافعت کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم چاچے لگتے ہو۔۔۔۔۔؟" سنتری سخت گیر لہجے میں بولا اور روڈے کو ہاتھ سے ایک طرف کیا۔

"پہلے بتاؤ اسے کہاں لے جارہے ہو۔۔۔۔؟" روڈا پھر سامنے کھڑا ہوگیا اس کے تیور بہت ہی اکھڑے ہوئے اور خراب تھے اور سنتری بھی جانتا تھا کہ روڈا ایک انتہائی طاقتور لڑکا ہے جس سے اصلاح گھر کی تمام پولیس ڈرتی ہے اور جو کسی قسم کی سزا سے نہ دبتا ہے اور نہ ڈرتا ہے۔

"دیکھو اڑی بازی میرے ساتھ نہ کرو"۔ سنتری نے دھمکاتے ہوئے کہا۔ "یہ سرکاری کام ہے"۔

"کیسا سرکاری کام ہے؟" روڈے نے پوچھا۔

"کفیل صاحب نے بلایا ہے اسے"۔ سنتری نے کہا۔

"جیل قوانین کے مطابق کسی قیدی بچے کو رات کے تین بجے اٹھا کے نہیں بلایا جاسکتا ہے" روڈا کسی قانون دان کی طرح بولا۔

"تو کیا جانتا ہے جیل قوانین کے بارے میں"۔ سنتری نے قدرے سختی سے پوچھا۔

"اور تو کیا جانتا ہے۔۔۔۔۔" روڈا کھٹ سے بولا۔

"دیکھ میں تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ صاحب نے بلایا ہے اسے"۔۔۔۔۔ سنتری زچ ہو کر بولا وہ زبردستی بھی روشو کو لے جاتا لیکن روڈا ساطرح پر تول رہا تھا کہ سنتری کو ڈر تھا کہ کہیں لپک کر دبوچ نہ لے اور جیل کے تمام سپاہی یہ بات جانتے تھے کہ روڈا جب کسی کو اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیتا ہے تو ایک آدھ ہڈی پسلی توڑ کر ہی چھوڑتا ہے اور وہ ایسا پہلے بھی کر چکا ہے اور سنتری

اپنی ہڈی پسلی نہیں تڑوانا چاہتا تھا۔
"یہ نہیں جانے گا اس وقت۔۔۔۔۔ روڈا صاف انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔
"کیا تیری حکومت ہے۔۔ سنتری نے محض رعب دینے کیلئے ڈنڈا گھمایا۔
"ہاں اس دروازے کے اندر میری حکومت ہے اور اپنی رعایا کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔
وہ حکیمانہ انداز میں بولا۔
"ٹھیک ہے میں جارہا ہوں۔۔۔۔ اب نتیجے کا ذمہ دار تو ہوگا۔۔ سنتری غصے میں پلٹا تو اب
کے ڈوڈا آگے بڑھا۔
"سنتری۔۔۔۔۔۔ ڈوڈے نے پکارا۔۔۔۔ پھر ڈوڈا، روڈے کی طرف مڑا۔ "لے جانے
دے یار روڈے خواہ مخواہ بات بڑھانے کا فائدہ کچھ نہیں۔۔۔۔ روڈے نے خاموش ہو کے پیٹھ
موڑلی اور سنتری ڈوڈے کے اشارے پر روشو کو ساتھ لے گیا۔
"پتہ نہیں یار اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔۔ روشو کے جانے کے بعد روڈے نے
تشویش ظاہر کی۔
"اللہ مالک ہے۔۔ ڈوڈے نے کہا۔

○

"آجاؤ روشو، آجاؤ بیٹھو۔۔۔۔۔ کفیل اس طرح روشو سے مخاطب ہوا جیسے وہ ایک
دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔
"بیٹھو بیٹھو گھبراؤ نہیں۔۔۔۔۔ کفیل بہت محبت سے بولا اور روشو ذرا سہما سا کفیل کی میز
کی دوسری طرف والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
"تم جاؤ۔۔۔۔۔۔ کفیل نے سنتری کو حکم دیا۔

"یس سر۔۔۔۔۔ سنتری سیلوٹ کرکے واپس چلا گیا اور جب کمرہ میں روشو اور کفیل کے
سوا کوئی اور نہیں رہا تو کفیل روشو سے مخاطب ہو کر رازداری سے بولا۔
"کیا کام جانتے ہو۔۔۔؟۔ روشو کفیل کے موٹے، بھدے اور بھاری بھرکم چہرے کو
دیکھنے لگا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔
"سیف کریکر ہو۔۔۔۔۔ کفیل نے دوبارہ پوچھا
"جی۔۔۔۔۔ روشو کچھ نہ سمجھ کر بولا۔

"تالے کھولنا جانتے ہو۔۔۔۔۔۔؟" کفیل نے وضاحت کی۔ "اگر ایسا ہے تو یہ بہت بڑا ہنر ہے اور جس آدمی کو یہ ہنر آتا ہو وہ کبھی بھوکا نہیں مر سکتا۔" روشو گم سم ہو کر کفیل کی بات سننے لگا۔

"تمہارے بیگ گراؤنڈ سے یہی اندازہ ہوا کہ تم دولت کے پجاری ہی نہیں، اس کو حاصل کرنے کا علم اور ہنر بھی جانتے ہو۔" کفیل نے کہنا شروع کیا، اور یہ مت سمجھو کہ دولت صرف جیل کے باہر ہے جیل کے اندر آدمی اتنا پیسہ کما سکتا ہے کہ جیل سے باہر تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔۔۔۔ سمجھ رہے ہو نا۔" کفیل نے خاموش روشو کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع دیا اور پھر بولا۔

"جیل کے اندر انسان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہاں بڑی سے بڑی واردات بھی کر لو گرفتاری کا کوئی ڈر نہیں ہوتا حتیٰ کہ لوگ جیل سے جاتے ہیں قتل کر کے واپس جیل میں آجاتے ہیں اور پکڑے نہیں جاتے۔" روشو تھوڑا سا پریشان ہوا تو کفیل نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں تم سے کوئی غلط کام نہیں کرایا جائیگا۔ بلکہ تم اپنا مشن جیل میں رہ کر پورا کر سکتے ہو جیل کے اندر رہ کر تم بڑے آدمی بن سکتے ہو۔"

"بڑا آدمی۔۔۔۔۔۔؟" روشو چونکا کیونکہ بڑا آدمی بننا ہی اس کی کمزوری تھا۔

"ہاں کیوں نہیں دنیا کے جتنے بھی بڑے آدمی ہیں وہ زیادہ تر جیل کے اندر رہ کر بڑے آدمی بنے ہیں۔" کفیل نے کہا "جیل ایک ایسی جگہ ہے جو آدمی کو مٹی بنا دیتی ہے یا سونا۔۔۔۔۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم مٹی بنو یا سونا۔"

"میں سونا بننا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔" وہ ایک پر خلوص جذبے کے ساتھ بولا۔

"شاباش ہمیں تم سے یہی توقع تھی۔" کفیل نے اٹھ کر روشو کی پیٹھ ٹھونکی۔

"دیکھو روشو.....۔ کفیل بہت اپنائیت سے مخاطب ہوا اور پھر رک کر پوچھا۔ "یہی نام ہے نا تمہارا روشو"۔

"جی....۔" روشو نے سر ہلایا اور پھر اپنے نام کو سنوار کر بتایا۔ "محمد روشن دین"۔

"بہر حال....۔" کفیل بولا۔ "میں تمہیں روشو کہہ کر ہی مخاطب کروں گا۔ یہ زیادہ پیارا نام ہے اور پھر نام میں کیا رکھا ہے اور پھر کسی نے کہا تھا۔ کس نے کہا تھا"۔ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "بہر حال جس نے بھی کہا تھا خوب کہا تھا کہ پھول کو جس نام سے بھی پکارو وہ پھول ہی رہے گا سو روشو میاں، تمہاری سوچ بڑی اچھی ہے کہ تم جیل میں رہ کر سونا بننا چاہتے ہو۔ اور تمہیں پتہ ہے کہ سونا کس چیز سے حاصل کیا جاتا ہے"۔ کفیل بولتے بولتے اچانک رکا اور روشو کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ "بتاؤ سونا کیسے حاصل کیا جاتا ہے"۔ اس نے دوبارہ پوچھا اور پھر روشو کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی بولا۔ "سونا حاصل کرنے کے لئے پیسے کی ضرورت ہے.....اور پیسہ کہاں ہے"؟ اس نے پھر سوال کیا اور پھر روشو کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی بولا۔

"پیسہ سیف میں ہے.....یا پھر یہاں ہے......"

لفظ "یہاں" پر اس نے انگلی سے اپنے دماغ کو بجایا۔ "آج کل کے زمانے میں سیف کا تالا کھل جا سم سم سے نہیں کھلتا ہے۔ آج کل کے زمانے میں سیف دماغ سے اور ان انگلیوں سے کھلتا ہے"۔

اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ٹیڑھا میڑھا کر کے چابی کی شکل دے دی۔ "اور تمہارے بارے میں معلوم ہوا کہ تم ایک بڑا سیف کھول چکے ہو....."

"میں نے کوئی سیف نہیں کھولا"۔ روشو نے جیسے کفیل کی زبان بند کرنے کے لئے ایک دم تردید کی۔ وہ ایک لمحے کیلئے بھی یہ الزام اپنے اوپر لینے کو تیار نہیں تھا۔

"یہ موقف تمہارا درست ہے۔ لیکن یہ موقف تم عدالت میں اختیار کرنا"۔ کفیل نے جواب دیا اور پھر کہنے لگا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تم ایک بچے ضرور ہو لیکن ایک تربیت یافتہ برگلر ہو۔ سیف کریکر، تالے کھولنے اور توڑنے والے"۔

"یہ غلط ہے-----" وہ سختی سے تردید کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بالکل غلط ہے۔"

"یہ صحیح ہے برخوردار کہ----" کفیل نے شفقت سے لیکن اپنے الزام پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ مجھ پر چوری کا غلط الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی۔ کوئی تالا نہیں کھولا۔ وہ سختی سے بولا۔

"خبردار ناراض ہونے کی ضرورت نہیں"۔ کفیل نے نرمی سے جواب دیا۔ "نہ ہمیں بحث میں پڑنا ہے کہ تم مجرم ہو کہ نہیں۔ یہ عدالت کا کام عدالت جانے۔"

"آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں"۔ روشو قدرے ناراضگی سے سے بولا۔

"تم سے ہمیں کافی کام لینا ہے"۔ کفیل نے جواب دیا۔

"کیا کام----؟" روشو نے پوچھا۔

"وہی کام جو تم کرتے رہے ہو۔" اس مرتبہ کفیل کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ "تم تالے کھولو گے"۔ وہ حرف مدعا پر آیا۔

"مجھے تالا کھولنا نہیں آتا"۔ اس نے پھر انکار کرتے ہوئے کہا۔

"آتا ہے برخوردار آتا ہے۔ انکار مت کرو۔ خدمت کرو"۔ اس نے بہت پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ اور اگر تمہاری تربیت میں کچھ تھوڑی بہت کسر ہے بھی تو ہمارہ بندہ پوری کر دے گا۔ بس تم تیار ہو جاؤ"۔

"روشو ذرا چپ ہوا تو کفیل کہنے لگا۔ "تم اس کام میں اکیلے نہیں ہو گے۔ ہمارا بندہ تمہاری مدد کرے گا۔ تمہاری رہنمائی کرے گا۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ کونسی کار کا دروازہ ہے۔ کس سیف کا تالا ہے۔ کس درواز کا جندرہ ہے تم نے اس کے ساتھ مل کے یہ تالے کھولنے ہیں بالکل جس طرح تم نے چوہدری مکرم علی کا سیف کھولا تھا۔"

"نہیں میں نے چوہدری مکرم کا سیف نہیں کھولا تھا۔" وہ ایک دم برہم لہجے میں

قدرے بلند آواز میں بولا۔

"دیکھو لڑکے -----" اس مرتبہ کفیل نے بہت سخت اور قدرے درشت لہجہ اختیار کیا۔ " یہ جیل ہے۔ اس سے قطع نظر کہ بچوں کی جیل ہے لیکن جیل پھر جیل ہے "۔ یہاں تم سے وہ کام لئے جائیں گے کہ تمہیں چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ اور اس بات کو بھول جاؤ کہ تم بری ہو جاؤ گے تم اس جیل میں مقدمہ بھگتتے ہوئے اٹھارہ سال کے ہو جاؤ گے اور جب تمہاری عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہو جائے گی تو تمہیں بڑوں کے جیل میں بھیج دیا جائے گا اور پھر بڑوں کی جیل میں تمہارا ٹھیک ٹھاک شناختی کارڈ بنے گا۔ سمجھے -----" کفیل غصے میں لال پیلا ہونے لگا۔

روشو پر کفیل کے لہجے سے گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ وہ چپ چاپ کفیل کا منہ دیکھنے لگا اور کفیل بولتا چلا گیا۔

" پھر بڑوں کی جیل میں قاتل، ڈکیت، چور اچکے، لچے لفنگے، بدمعاش، سب مل کر تیرا پورٹریٹ بنائیں گے۔ میں تو تیرے ساتھ بہت رعایت کر رہا ہوں

"کیا رعایت کر رہے ہیں آپ" روشو کفیل کی بات کاٹ کر اعتماد سے بولا۔

" میں یہ رعایت کر رہا ہوں کہ میں تجھے تیرے رجحان اور تیرے مزاج کے مطابق کام دے رہا ہوں۔" کفیل نے کہا۔

"تالے کھولنے کا کام------" روشو نے اس طرح پوچھا جیسے وہ رضامندی ظاہر کر رہا ہو۔

"اور کیا----- میں کوئی تجھ سے کدالیں تھوڑی چلوا رہا ہوں"۔

"یہ کہاں کھولنے پڑیں گے جیل سے باہر!" روشو نے ازراہ معلومات پوچھا۔

"ظاہر ہے جیل کے اندر ایسی کونسی تجوری یا تالا ہے جس کے پیچھے دولت ہوگی"۔ کفیل نے جواب دیا اور پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ان تالوں کے پیچھے سے جتنا مال برآمد ہوگا اس کا پچیس فیصد تمہارا ہوگا۔ باقی پچھتر فیصد میں بہت سے لوگ شامل ہوں گے لیکن یہ تمہارا دردسر نہیں تم اپنے پچیس فیصد میں ہی۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ "یوں مالا مال ہو جاؤ گے۔"

"آپ جیل کے اندر لوگوں سے ایسے کام بھی لیتے ہیں-----" روشو نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا

"قیدیوں سے؟"

" جیل کے اندر تو لوگ قاتلوں سے مزید قتل کروا دیتے ہیں۔ میں تم سے قتل تو نہیں کروا رہا ہوں۔ میں تم سے ایسا کام لے رہا ہوں جس میں پیسہ ہی پیسہ ہے۔ اور سنو-----" وہ کہتے

کہتے چونک کر بولا۔ "اور یہ لوگ جن کی تجوریوں کی نشاندہی کی جانے گی یہ کوئی مظلوم یا غریب غربا لوگ نہیں ہوں گے ۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کو لوٹنا کار ثواب ہے بس تم اپنے ہاتھ کی صفائی دکھانے کیلئے تیار ہو جاؤ۔"

"نہیں" وہ کھٹ سے بولا۔

"تم محفوظ رہو گے ۔اور اگر خدانخواستہ پکڑے گئے تو جیل میں ہی آؤ گے کہیں اور نہیں جاؤ گے ۔" کفیل تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

"نہیں ----" وہ سختی سے انکار کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ میں کوئی جرم کروں گا"۔

"دیکھو لڑکے ۔ پچھتاؤ گے ۔ کفیل نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر عزت بنانی ہے ۔ بڑا آدمی بننا ہے تو پیسہ کماؤ اور تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں جیل کے اندر پیسہ کمانے کا موقع مل رہا ہے یہ موقع ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔"

"نہیں ---- میں ہر گز ایسا کام نہیں کروں گا"۔ وہ ایک مضبوط قوت ارادی کے ساتھ بولا

"پھر سوچ لو ------ آخری موقع دیا جا رہا ہے"۔ کفیل نے پوچھا۔

"نہیں، نہیں، نہیں ----" وہ نہیں کی تکرار کرتے ہوئے بولا۔ "سو دفعہ پوچھو گے سو دفعہ نہیں کہوں گا۔"

"ٹھیک ہے کفیل بولا۔ تمہاری مرضی"۔ پھر اس نے گھنٹی بجائی سنتری اندر آیا تو اس نے حکم دیا

"سورما کو بھیجو"۔

"یس سر ------" سنتری نے سلام کیا اور حکم بجالانے کیلئے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ کفیل بھی چپ رہا اور معنی خیز انداز میں روشو کو دیکھنے لگا۔ روشو بھی خاموشی کے ساتھ آنے والے پر تجسس لمحے کا انتظار کرنے لگا۔ اب وہ زیادہ خوفزدہ بھی نہیں تھا۔ اس نے کافی کچھ دیکھ لیا تھا جب فقیروں سے فرار ہوا تھا تو اسے ڈاکو مل گئے تھے دو دن اور دو راتیں ڈاکوؤں کی تحویل میں گزاریں اور موت کے دروازے پر دستک دے کر لوٹا تھا۔ پھر بیگم ساجدہ مکرم کا اچھا گھر رہنے کو ملا۔ شاہینہ کی دوستی اور رفاقت ایسی نصیب ہوئی کہ پچھلے سارے دکھ بھول گیا لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اور چوری کے الزام میں گرفتار ہو کے پولیس کے قبضے میں آگیا۔

پولیس نے اسے جو اذیت دی وہ اس کے تصور سے بھی باہر تھی لیکن اس کی ہمت اور قوت ارادی اس کے عزم کو توڑ نہیں سکی اور پولیس اپنے تمام ٹارچر اور دباؤ کے باجود اسے اقرار جرم پر مجبور نہ کر سکی تھی۔ اب جو کچھ وہ جیل میں دیکھ رہا تھا اور جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا وہ اس کے تصور سے باہر تھا کہ آگے اب کیا ہونے والا ہے تاہم اس نے ایک بار پھر اپنے تمام عزم اور قوت ارادی کو سمیٹ کر یکجا کیا اور طے کر لیا کہ چاہے اس کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے ہی کیوں نہ ہو جائیں وہ غلط راستے پر کبھی نہیں پڑے گا۔ تاہم یہ اس کا ارادہ تھا لیکن ضروری نہیں کہ جو کچھ ارادہ ہو وہ ہو بھی جائے آگے کے حال کے بارے میں وہ حتمی طور پر کچھ نہیں جان سکا تھا۔

"جی سر۔۔۔۔" اچانک ایک انتہائی ہیبت ناک قسم کا ہٹا کٹا آدمی جس کے چہرے پر کچھ چاقو وغیرہ کے پرانے اور مند مل نشان بھی تھے الہ دین کے جن کی طرح کفیل کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔

"سورما میں نے بہت کوشش کی۔ لیکن یہ لڑکا میری زبان نہیں سمجھتا ہے"۔ کفیل نے کہا

"آدمی کے ساتھ اسی زبان میں بات کرنی چاہئے سر جو زبان وہ سمجھ سکتا ہو"۔ سورما نے سر اٹھا کے جواب دیا اور پھر روشو کی کلائی پکڑ کر اسے گھسیٹنے کے انداز میں باہر لے گیا۔

○

شمسہ جب اپنے ہاتھ سے کافی کا کپ بنانے کے لئے کچن میں جا رہی تھی تو راہداری میں ساجدہ بیگم سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ شمسہ بہت شرمائی ہوئی، ہچکچائی ہوئی اور پریشان تھی اس وقت اس میں ساجدہ بیگم کا سامنا کرنے کا یارا بھی نہیں تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ گزشتہ کچھ عرصے سے کوٹھی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا علم ساجدہ بیگم کو ہے اور ساجدہ بیگم اس کے تمام کرتوتوں سے واقف ہونے کے باجود مصلحتاً خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے لیکن پھر بھی وہ اس وقت ساجدہ بیگم کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ سر جھکا کے بظاہر بے نیازی سے گزر جانا چاہتی تھی لیکن ساجدہ نے اچانک روکا۔

"شمسہ۔۔۔۔۔۔" ساجدہ نے پکارا۔ شمسہ کے قدم تھم گئے۔ "یہ اندر کیا ہو رہا ہے آج"۔ ساجدہ بیگم نے معنی خیز اور متجسس انداز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں"۔ وہ بوکھلاہٹ میں بولی۔ "کوئی خاص بات نہیں۔" اس کے

من کا چور چھپ نہیں سکا۔
"سب نارمل ہے کیا۔" ساجدہ پھر گویا ہوئی۔
"ہاں ہاں ---- کیوں نہیں۔" اس نے جلدی سے جواب دیا اور پھر یہ کہہ کر آگے بڑھی۔
"میں کافی بنالاؤں۔"
"کافی کیلئے خانساماں سے کہا ہوتا" ۔ساجدہ نے پھر اس کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکا۔
"نہیں نہیں ۔ وہ چوہدری کہہ رہا ہے اپنے ہاتھ سے بنالاؤ۔" وہ گھبراہٹ میں بولی اسے میرے ہاتھ کی -----"
"کیا بات ہے تمہارے ہاتھ کی -----" ساجدہ ازراہ طنز داد دیتے ہوئے بولی --- "جسے پسند آجائے تمہارا ہاتھ لیکن اس وقت تو دونوں موجود ہیں" ۔ساجدہ کا اشارہ پاشا کی طرف تھا کیونکہ ساجدہ جانتی تھی کہ پاشا کی موجودگی میں غیر متوقع طور پر چوہدری بھی آج آگیا تھا اور پھر ساجدہ بیگم اس وقت سے دور راہداری میں بیٹھی چوہدری کے بیڈ روم کے اندر ہونے والے کسی تماشے اور کسی ہنگامے کی منتظر تھی۔اسے یقین تھا کہ آج کوئی دھماکہ خیز انکشاف ہو جائے گا لیکن ساجدہ بیگم کے زاویہ نگاہ سے ابھی تک بیڈ روم کے اندر کوئی دھماکہ خیز بات نہیں ہوئی تھی تاہم اس نے شمسہ بیگم کو دیکھ کر یہ اندازہ کرلیا تھا کہ شمسہ بہت زیادہ اکھڑی ہوئی اور پریشان ہے ۔اور اندر کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔
"پلیز ساجدہ جی ----!" شمسہ نے گڑگڑانے کے انداز میں ساجدہ کو راستے سے ہٹا کر پھر آگے بڑھنا چاہا۔
"شمسہ" ساجدہ نے پھر پکارا۔لیکن اب ساجدہ کے لہجے میں تحکم تھا۔شمسہ پھر رک گئی۔
"مجھے پاشا کے ساتھ تمہاری پارٹنر شپ پر کوئی اعتراض نہیں۔اعتراض کرنا یا نہ کرنے والا چوہدری ہے۔جس نے اس وقت تم دونوں کو اندر پکڑ لیا ہے۔"
"کیا تم نے اسے ٹیلی فون کیا تھا ----" شمسہ نے شبہ کرتے ہوئے کہا۔
"لاحول ولا ------" ساجدہ جھنجھلاہٹ میں بولی۔" میں اتنی نیچ نہیں ہوں۔لیکن میں صرف تم سے اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ تم نے معصوم روشو کو پھنسوا کر اچھا نہیں کیا۔"
"میں نے روشو کو نہیں پھنسوایا ساجدہ جی --- میں بالکل بے قصور ہوں ---" وہ اپنی بے گناہی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔
"تم یہ بھی جانتی ہو کہ روشو بھی بے قصور ہے۔" ساجدہ نے کہا۔" لیکن تمہارے اوپر تو

عشق کا جو بھوت چڑھا ہوا تھا اس نے تمہاری زبان روک رکھی تھی۔
"مجھے دیر ہو رہی ہے ----!وہ سنی ان سنی کر کے تیزی سے کچن کی طرف کافی بنانے چلی گئی -- لیکن اس نے ساجدہ بیگم کو یہ بتایا نہیں کہ وہ چوہدری کے سامنے روشو کی بے گناہی کا اظہار کر چکی ہے۔ وہ اس وقت سخت پریشانی اور انتشار میں مبتلا تھی!

O

شمسہ جب کافی کا کپ لے کر بیڈ روم میں داخل ہوئی تو اس نے محسوس کیا کہ چوہدری کے تیور بالکل بدلے ہوئے ہیں وہ یہ بات پہلے ہی جان گئی تھی کہ چوہدری کو کافی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ شمسہ کے بغیر تھوڑا سا وقت چاہتا تھا۔ ایسا وقت جس میں وہ شمسہ اور پاشا کی زندگی کے بارے میں فیصلہ کر سکے۔ اس وقت چوہدری بیڈ پر ٹانگیں نیچے کئے بہت سوچ بچار میں بیٹھا تھا جب شمسہ کافی کا کپ لے کر اندر داخل ہوئی وہ ماتھے پر ایک خندہ اور چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ بکھیر کر کپ ہاتھ میں لئے چوہدری کی جانب بڑھی۔
"پ وہیں رکھ دو ٹیبل پر -----" چوہدری نے سینٹرل ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ شمسہ کافی ٹیبل پر رکھ کر بیڈ کی طرف جب مڑی تو چوہدری نے دوسرا حکم دیا۔
"اور وہاں بیٹھ جاؤ کرسی پر۔" شمسہ چپ چاپ الگ کونے میں رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پاشا ابھی تک رسیوں میں لپٹا زمین پر پڑا تھا اس کے جسم میں ہلکی ہلکی جنبش سی ہو رہی تھی اور وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ دھیرے دھیرے ہوش میں آ رہا ہے۔
شمسہ ٹکر ٹکر چوہدری کو دیکھے جا رہی تھی۔ چوہدری نے بڑے اطمینان سے تکیئے کے نیچے سے پستول نکالا اور اس کی چرخی کو ہاتھ میں گھما کے پستول کی نالی کا رخ شمسہ کی طرف موڑ دیا۔
"اب یہ خالی نہیں ہے۔" چوہدری نے ریوالور ایک بار پھر گھمایا۔ گولیاں باہر نکال کے دوبارہ ڈالیں اور شمسہ کو پستول کے بھرے ہوئے ہونے کا یقین دلایا۔
"شمسہ اسلحہ یا تو انسان کو مارنے کیلئے ہوتا ہے یا بچانے کیلئے۔" چوہدری مزید بولا "اگر وقت ضرورت اسلحہ سے کام نہ لیا جائے تو اسلحہ، اسلحہ نہیں ہے کھلونا بن جاتا ہے۔ آج وقت آگیا ہے کہ میں اس پستول سے کام لوں"۔ بولتے بولتے اس نے قدرے توقف کیا اور پھر پستول کی نالی سے شمسہ کی جانب شست باندھے ہوئے پر عزم لہجے میں بولا۔
"میں نے تمہیں شوٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے شمسہ۔ کیونکہ تم ایک شریف عورت نہیں ہو۔"

"تم بھی ایک شریف آدمی نہیں ہو چوہدری۔۔۔۔" وہ کھٹ سے بولی اور چوہدری کے کپکپاتے ہاتھ میں پستول مزید لرزنے لگا۔ شمسہ مزید بولنے لگی۔ "اور اگر ایک غیر شریف عورت کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے تو پھر ایک غیر شریف مرد کو بھی زندہ رہنے کا حق نہیں ہونا چاہئے۔ اور تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کے دیکھو چوہدری تمہارے اندر وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک بد معاش اور غیر شریف آدمی میں ہوتی ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔۔۔۔۔" وہ غصے سے کپکپایا۔

"جب مجھے مار ہی رہے ہو تو مرنے سے پہلے میری بکواس سن لو۔۔۔۔۔۔۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔ "اگر یہ رہنما اصول بن جائے کہ ملک سے تمام بد معاشوں کو مار دیا جائے اور صرف شریف لوگوں کو زندہ رکھا جائے تو اس ملک کی آبادی بمشکل ایک بٹا دس رہ جائے اور یہ ملک سونا بن جائے۔ لیکن حقیقت کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ شریف لوگ اس ملک میں سسک سسک کے جیتے اور سسک سسک کے مر جاتے ہیں جبکہ بد معاش دندناتے پھرتے ہیں"۔

"ختم کرو اپنا یہ فلسفہ۔۔۔۔۔۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں اپنے فلسفے کے ذریعے تم سے زندگی کی بھیک نہیں مانگ رہی ہوں چوہدری"۔ وہ مصمم ارادے کے ساتھ بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ تمہارے پاس مجھے مارنے کا جواز موجود ہے۔ کیونکہ میں ایک بد چلن عورت ہوں اور یہ مرد کی دنیا ہے۔ جہاں بد چلن مرد تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن بد چلن عورت کے لئے آخر کار موت ہے"۔ وہ اٹھ کر چوہدری کے قریب آگئی۔

"میرے قریب نہ آنا۔۔۔۔۔ نہیں تو گولی مار دوں گا"۔ وہ غصے میں اور کپکپایا اور پستول کو مزید نشانے پر لایا۔

"میں بھی گولی کھانے کے لئے قریب آرہی ہوں تاکہ تمہارا نشانہ خطا نہ جائے"۔ وہ چوہدری کے پاس آن کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑے آرام سے ہاتھ بڑھایا اور چوہدری کی کپکپاتی کلائی تھام لی۔

"تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں ان کو مضبوط رکھو"۔ اور پستول کی نالی کو اپنی بائیں پسلی کے قریب لگالیا۔

"یہاں گولی چلاؤ اس جگہ۔۔۔۔۔۔" اس نے تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے چوہدری کا پستول درست کیا۔

"یہاں کیوں۔۔۔۔۔" چوہدری نے ازراہ حیرت پوچھا۔۔۔۔۔ "اس لئے کہ یہاں دل ہے؟

وہ خود ہی بولا "اور صرف ایک گولی میں کام ہو جائے گا"۔

"یہ بات بھی ہے"۔ شمسہ نے اتفاق اور پھر بہت دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "ایک اور بات بھی ہے چوہدری۔۔۔۔ تم نے میرے سارے جسم پر قبضہ کر رکھا ہے لیکن یہ دل ایک واحد جگہ ہے جو تمہاری نہیں ہے جس کے علاقے میں تمہارا داخلہ ممنوع ہے۔ اسی نے تم سے بے وفائی کی ہے۔ یہی تمہارا نہ ہو سکا۔ ختم کر دو اسے ایک ہی گولی میں چلا دو گولی چوہدری۔" وہ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔

چوہدری نے اس کی پسلی کو نال سے دبایا۔ اس کے ہاتھ اس طرح زور زور سے کانپنے لگے کہ پستول کی نالی بھی ہل رہی تھی، پلنگ بھی اور شمسہ کا جسم بھی، اور لحظہ بہ لحظہ چوہدری کے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ پھر اس کا پستول خود بہ خود نیچے کی طرف جھک گیا اور کمزور چوہدری نے اپنا سر شمسہ کے کندھے سے لگایا اور رونے لگا جیسے کوئی دو سال کا بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے لپٹا رو رہا ہو۔ روتے روتے اس نے سر کو نیچے شمسہ کی رانوں کی طرف کھسکایا پھر اس کے گھٹنوں سے اپنی نم آلود آنکھیں صاف کیں اور اپنے سر کو شمسہ کے قدموں پر گرا دیا۔

"میں تمہیں نہیں مار سکتا شمسی۔ نہیں مار سکتا"۔ وہ شمسہ کے قدموں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا "میں خود مر جاؤں گا، اپنے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا لیکن تمہیں خراش نہیں لگا سکتا"۔ وہ بے اختیار روتا چلا جا رہا تھا۔ شمسہ پسیج گئی اس نے جھک کر کسی بچے کی طرح چوہدری کو "پچ پچ" کر کے پچکارا اور سہارا دے کر اوپر اٹھا لیا۔

○

"مجھے معاف کر دو چوہدری صاحب۔ پلیز انکل۔" پاشا گڑگڑایا "میرے پیارے انکل" میری غلطیاں معاف کر دو"۔

وہ رسیوں میں ابھی تک مضبوطی سے بندھا اور جکڑا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بھکاریوں کی طرح زندگی کی بھیک مانگنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جب وہ مکمل ہوش میں آیا تو چوہدری صاحب نے شمسہ کی مدد سے اسے گھسیٹ گھساٹ کے دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا اور اس وقت وہ شکنجے میں کسا ہوا مکمل طور پر چوہدری کے رحم و کرم پر بے یار و مددگار تھا۔

"تمہیں معاف کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"۔ چوہدری نے پستول تانا اور لبلبی پر انگلی رکھی۔ "ایک دھوکے باز، ایک فراڈیئے، ایک بے ایمان اور ایک مجرم کو معاف کیا جا سکتا ہے۔

منافق کے لئے موت کے سوااور کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا"۔

" وقت مت ضائع کرو، کرمی۔ مار دو اسے گولی"۔ شمسہ چوہدری کے بالکل قریب ہو کر اضطرابی کیفیت میں بولی۔

"اے عورت۔۔۔۔۔۔تو کسی کی بھی نہیں ہے"۔ وہ شمسہ کی طرف دیکھ کر کف افسوس ملتے ہوئے بولا۔

"اے مرد تو بھی کسی کا نہیں ہے۔" اس نے ترنت جواب دیا۔

"اس سے بحث مت کرو جان۔۔۔۔۔۔۔" چوہدری نے شمسہ کو مشورہ دیا۔

"تو پھر گولی مارنے میں دیر نہ کرو کرمی۔۔۔۔۔۔ وقت گزر رہا ہے" شمسہ بولی۔ "ورنہ کچھ بھی ہو جائے گا"۔

"اسکینڈل ہو جائے گا چوہدری۔۔۔۔۔۔" پاشا رسیوں کے اندر کسمسایا۔ "کیا کہو گے لوگوں سے کیوں مارا ہے" وہ لہجہ بدل کر بولا۔

" تمہیں جان سے نہیں مارا جائے گا" چوہدری نے وضاحت کی۔ " تم پر چار گولیاں برسائی جائیں گی۔ ایک سیدھی ٹانگ پر، دوسری الٹی ٹانگ پر، تیسری سیدھے بازو پر اور چوتھی الٹے ہاتھ پر ماروں گا تاکہ تم ٹانگوں سے بھی اور بازوؤں سے بھی معذور ہو جاؤ۔ اور تمہیں اس دنیا میں ایک گھونٹ پانی پلانے والا کوئی نہیں ہو۔ اور جس کمزوری اور بے بسی کا طعنہ تم مجھے بڑھاپے میں دے رہے ہو نا وہ مجبوری تمہیں جوانی میں پیش آجائے گی۔

" لیکن چوہدری اسکینڈل تو ہو گا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ میرے، تمہاری بیوی سے ناجائز تعلقات تھے۔" پاشا نے دھمکی دی۔

" بکواس بند کرو"۔ چوہدری نے دھمکایا"۔ لوگ یہ نہیں کہیں گے، پاگل کتے"۔

"تو پھر کیا کہیں گے"۔ پاشا نے پوچھا۔

" بتاؤ اس کو جان۔ لوگ کیا کہیں گے۔" چوہدری شمسہ سے مخاطب ہوا۔

" میں بتاتی ہوں" ایکے شمسہ تن کر بولی۔ "سنو پاشا پولیس کے سامنے اسٹوری کیا جائے گی۔ "اس نے پہلے سے تیار کیا ہوا بیان بتاتے ہوئے کہا۔ " بیان یہ ہو گا کہ چوہدری کی غیر موجودگی میں تم میرے بیڈروم میں داخل ہوئے۔ تم نے مجھے تنہا پا کر مجرمانہ حملہ کیا۔ تم یہ سمجھے کہ چوہدری صاحب کمرے میں نہیں ہیں لیکن چوہدری صاحب باتھ روم تھے۔ میں نے شور مچایا میرا شور سن کر چوہدری صاحب باتھ روم سے نکلے اور تم پر فائر کئے۔ خون بہہ جانے سے جب تم بے ہوش

ہو گئے تو ہم نے تمہیں رسیوں سے باندھا اور پولیس کو اطلاع کر دی"۔
"میرا خیال ہے بہت ہی کمزور بیان ہے"۔ اسکینڈل تو پھر بھی بنے گا۔" پاشا نے بھنکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے رہا کر دو چوہدری صاحب میں وعدہ کرتا ہوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا اور کبھی اپنی شکل آپ کو نہیں دکھاؤں گا۔ خدا کے لئے معاف کر دو، میری زندگی بچ جائے گی۔ آپ بدنامی سے بچ جائیں گے"۔
"اس کی باتوں پر کان نہ دھرو کرمی ------ یہ بڑا مکار ہے۔" شمسہ پاشا سے نجات حاصل رنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔
"یہ آج نہیں بچ سکتا ------- تم فکر نہ کرو۔" چوہدری نے تسلی دی۔
"تو پھر مار دو گولی اسے ------ انتظار نہ کرو ------" وہ اضطراری کیفیت میں بولی۔
"چوہدری نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں میں معلوم نہیں کیسے جان ڈالی اور ایک دم پستول گھما کر فائر کھولنا چاہا کہ پاشا چونکا۔
"ایک منٹ چوہدری -----" پاشا تڑپ کر بولا ------ "کیا آخری خواہش نہیں پوچھو گے میں نے تمہیں اس وقت چانس دیا تھا جب تمہاری زندگی میری انگلیوں کی گرفت میں تھی۔"
"جلدی بولو ------ کیا خواہش ہے۔" چوہدری نے موقع دیتے ہوئے کہا۔
"میری خواہش ہے کہ مجھ پر گولی چلانے سے پہلے تمہارے بک شیلف میں دوسرے خانے کے اندر بائیں جانب تیسرے نمبر پر جوہری جلد والی کتاب ہے اس کو کھول کر ایک دفعہ دیکھ لو ------" پاشا نے جیسے الجبرے کا ایک سوال کیا۔
چوہدری نے انتہائی تجسس سے شمسہ کی طرف اور شمسہ نے چوہدری کو دیکھا اور پھر چوہدری نے آگے بڑھ کر پاشا کے بتائے ہوئے حساب کے مطابق ہری جلد والی ضخیم کتاب نکالی اور سرسری سی ورق گردانی کی۔
"کیا ہے اس میں ------" چوہدری کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔
"غور سے دیکھو ------" پاشا نے کہا۔
چوہدری نے ایک بار پھر صفحے پلٹے تو ایک جگہ اچانک اس کے ہاتھ رک گئے اور وہ دھک سے رہ گیا۔
"اوہ خدا ------" وہ سر سے پاؤں تک اندر ہی اندر کانپ گیا۔ "بدمعاش کتے کمینے ---- ۔" اس نے اوپر نیچے پاشا کو فحش گالیاں دیتے ہوئے اس کے منہ پر دو تین ٹھوکریں ماریں اور پھر

ساتھ ہی ایک زنانے کا تھپڑ شمسہ کے منہ پر رسید کیا۔
کتاب کے اندر شمسہ اور پاشا کی قابل اعتراض تصویریں تھیں۔ چوہدری کے تھپڑ سے شمسہ جب ایک طرف گری تو تصویریں چھوٹ کر پلنگ پر بکھر گئیں۔
"اف۔۔۔۔۔" شمسہ نے ایک تصویر دیکھی اور منہ چھپالیا۔۔۔۔۔اور پھر جلدی جلدی اس نے تاش کے پتوں کی طرح دو تین تصویروں کو پھینٹ کر پرے پھینک دیا۔ اور تھر تھر کانپنے لگی چوہدری تو قدرتی طور پر کپکپاہٹ میں مبتلا تھا ہی۔۔۔۔۔ غصے قہر اور غضب سے بالکل لال پیلا ہو گیا۔
"تو یہ ہیں تیرے لچھن۔۔۔۔" وہ گدھ کی طرح شمسہ پر لپکا۔
"حوصلہ کریں۔۔۔۔۔۔ حوصلہ" اس نے دونوں ہاتھوں سے سہارا دے کر چوہدری کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "پہلے میری بات سن لو۔۔۔۔ یہ بدمعاش اشتعال دلا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ تمہیں معلوم ہے۔۔۔۔۔ تمہیں بتا چکی ہوں۔۔۔۔۔ معافی مانگ چکی ہوں اور تم معاف کر چکے ہو۔۔۔۔۔۔ معاف کر چکے ہو ناجان؟۔۔۔۔۔ میری کوتاہی میری غلطی تم نے درگزر کر لی ہے۔"
"لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم نے اس کا ثبوت بھی رکھا ہوا ہے۔" وہ تقریباً رقت آمیز لہجے میں بولا۔
"مجھے تصویروں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم جان۔۔۔۔۔ سچ کہتی ہوں میں تصویروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی" ۔وہ بے بسی سے بولی۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم کہ تصویریں اس گھٹیا انسان نے کب بنائی ہیں" ۔وہ ایک دم غصے میں بے قابو ہو گئی اس کے نتھنے پھول گئے اور وہ جنگلی بلی کی طرح رسیوں میں جکڑے پاشا پر جھپٹ پڑی اور اوپر نیچے اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے ہسٹریائی لہجے میں پوچھنے لگی۔ "کب۔۔۔۔۔ کب۔۔۔۔۔ بدمعاش، کمینے کب بنائی ہیں تم نے یہ تصویریں۔"
"غصہ نہ کرو جان۔۔۔۔۔" وہ مار کھانے کے باوجود بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگا۔ "یہ تصویریں میں نے کہیں اور جا کے تو نہیں بنائی تھیں۔ یہ اسی جگہ اسی بیڈ روم میں بنی ہیں۔"
ٹھوکریں کھا کر اس کے ہونٹوں سے ہلکا ہلکا خون بہہ رہا تھا جنہیں بندھے ہاتھوں کی وجہ سے وہ صاف بھی نہیں کر سکتا تھا تاہم وہ بہت ڈھیٹ تھا۔ وہ اسی ڈھیٹ پن سے مسکرایا اور مزید کہنے لگا۔ "کیمرہ وہاں چھپا کے رکھا تھا ٹھیک پر اور تصویر کا منظر وہ سامنے آئینہ۔"

اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینہ کی طرف اشارہ کر کے کہا اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگا جیسے وہ بھی کسی ہسٹریائی دورے میں ہو۔

چوہدری صاحب دم بخود اور پریشان تھے پھر پاشا نے اچانک اپنا قہقہہ روکا اور شمسہ کی بجائے چوہدری صاحب سے بہت سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔

"سنو چوہدری صاحب۔۔۔۔۔صاف بات بتادوں یہ تصویریں میں نے تفریح کے لئے نہیں اپنے تحفظ کے لئے بنائی ہیں۔" چوہدری نے بڑی مشکل سے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور پاشا بولنے لگا۔ "یہ تصویریں فی الحال ایک چھوٹا سا نمونہ ہیں۔ تم اگر اصل رول دیکھو گے تو پورا رول دیکھ نہیں سکو گے۔"

"کتے کے بچے۔۔۔۔۔۔" چوہدری نے بے قابو ہو کر دو چار ٹھوکریں ماریں اور ہانپنے لگا۔

"تمہیں اس وقت صبر کی ضرورت ہے۔۔۔۔خواہ مخواہ اپنا بلڈ پریشر ہائی مت کرو۔۔۔۔۔۔" وہ انتہائی بے شرمی سے بولا۔

"اسے مار دو۔۔۔۔۔" شمسہ بھی غصے سے بے قابو ہو رہی تھی۔ اس نے چوہدری کے ہاتھ سے پستول چھین کر خود اسے شوٹ کرنا چاہا۔ "نہیں تو میں اسے مار دوں گی۔"

"اگر مجھے مار دیا تو بتادوں یہ رول ایسے ہاتھوں میں ہے کہ دوسرے دن تصویریں پریس میں پہنچ جائیں گی۔" وہ بلیک میل کرنے کے انداز میں بولا۔

"بے شک پہنچیں۔۔۔۔۔" شمسہ نے تڑاخ سے گولی چلادی۔ لیکن پاشا لیٹے لیٹے پھرتی سے رول ہو گیا اور گولی خطا ہو گئی، پاشا اب گھبرا گیا لیکن چوہدری نے جھپٹ کر شمسہ کے ہاتھوں سے پستول چھین لیا۔

"پاگل مت بنو۔۔۔۔۔" چوہدری برہمی سے بولا۔۔۔۔۔ "تم پہلے ہی بہت پاگل پن کر چکی ہو۔" اس نے شمسہ کو پلنگ پر بٹھا دیا اور اپنے تنفس کو قابو میں کرتے ہوئے بولا۔ "جذباتی فیصلے بہت نقصان دہ ہوتے ہیں۔"

"گڈ۔۔۔۔۔" پاشا نے چوہدری کو داد دی۔

"گھٹیا، کمینے، ذلیل، احسان فراموش۔۔۔۔۔" چوہدری اس کی مداخلت برداشت نہ کر سکا اور پھر دو چار ٹھوکریں مادیں۔ "اب کیا چاہتے ہو مجھ سے۔" وہ سودے بازی کے انداز میں بولے۔

"بولو کمینے کیا چاہتے ہو۔"

"زندگی۔۔۔۔۔۔" پاشا فوراً بولا۔۔۔۔ "مجھے آپ زندگی دے دیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ پورا فلم رول آپ کے حوالے کر دوں گا۔ اور آئندہ اپنی پوری زندگی میں آپ سے شمسہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا۔ یہ ایک بھولی بسری داستان ہوگی۔"

"چوہدری نے ایک لمحہ توقف کیا کچھ سوچا اور پھر شمسہ سے مخاطب ہوئے۔۔۔۔ "اسے کھول دو"۔

"کرمی۔۔۔۔۔"شمسہ تڑپی۔۔۔۔۔۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔"

"میں کہتا ہوں اسے کھول دو۔" چوہدری تحکمانہ انداز میں بولے۔ "میں تصویریں ہر قیمت پر واپس لینا چاہتا ہوں۔"

شمسہ بادل نخواستہ اٹھی کباٹ سے ایک ریزر نکالا اور پاشا کی ڈوریاں کاٹ دیں۔ رسیاں کھلتے ہی پاشا کسی بازی گر کی طرح پھدک کر کھڑا ہوا اور کلائیوں کو ذرا سا مسل کر شمسہ سے بولا۔

"شکریہ۔۔۔۔۔۔ تصویریں میں تمہیں کل صبح پہنچا دوں گا۔

"اس کمرے میں دوبارہ گھسے تو میں گولی مار دوں گی۔"شمسہ بپھر گئی۔ "یہاں بالکل نہیں آنا۔"

"تصویریں تم آفس میں لے آنا۔۔۔۔۔۔ کتنے بجے آؤ گے"۔ چوہدری نے پوچھا۔

"دس پینتالیس پر۔۔۔۔۔۔" پاشا نے گھڑی دیکھ کر صحیح ٹائم بتایا۔

"اگر تم نے پھر دھوکا دیا تو تمہیں معلوم ہے۔۔۔۔۔۔ تم ایک ہی پاشا نہیں ہو۔۔۔۔۔ اور بھی بہت سے پاشا موجود ہیں۔۔۔۔۔۔" چوہدری معنی خیز انداز میں بولا۔

" جب تک تمہارے جیسے چوہدری موجود ہیں اس وقت تک بہت سے پاشا اور بہت سی شمشائیں اور ساجدائیں موجود رہیں گی چوہدری۔"

پاشا نے ترنت جواب دیا اور چوہدری نے بے اختیار ایک زنانے کا تھپڑ پاشا کو مارا جس سے پاشا کو تو کچھ نہیں ہوا لیکن چوہدری خود گھوم کر گرنے لگا اور شمسہ نے اسے سہارا دے کر روک لیا۔

"اب دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔۔" چوہدری ہانپتے ہوئے بولا"۔

"تصویروں کی قیمت تو ابھی تم نے ادا نہیں کی۔۔۔۔۔" پاشا ڈھیٹ بن کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا مطلب۔۔۔۔۔" چوہدری چونکا۔

"پانچ لاکھ روپے ------" پاشا نے کسی بلیک میلر کی طرح رقم طلب کی۔

"میرا پورا سیف کھا گئے ہو حرامزادے -----" چوہدری گرجا۔

"سیف والی بات ختم ہو گئی ہے چوہدری ----- یہ ایک نیا معاملہ اور نیا سودا ہے۔"

"تم پاگل بھی ہو ------" شمسہ تڑپی۔

"یہ پاگل پن نہیں بزنس ہے ------- چوہدری تصویروں کی قیمت ادا کر کے تصویریں واپس لے گا"۔ پاشا نے شمسہ کو جواب دیا۔

"پیسے کے بغیر زندگی کیا ہے ------" وہ ترنت میں بولا۔

"ایک پائی اسے مت دو ------" شمسہ بولی۔

"تم چپ رہو" ۔ چوہدری نے کہا۔ "تین لاکھ دوں گا ----- اگر منظور ہے تو ٹھیک ورنہ چھاپ دو تصویریں"۔

چلو نہ میرے پانچ لاکھ نہ تمہارے تین، چار لاکھ ----- اگر منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کھڑا ہوں سامنے گولی مار دو ------" وہ بھی ڈٹ گیا۔

شمسہ نے چوہدری کا بازو تھام کر اسے روکنا چاہا لیکن چوہدری نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور بیوپاری کی طرح بولا "مجھے منظور ہے۔"

"لاؤ آدھی رقم ------ آدھی کام ہونے پر دینا ------" پاشا بھاؤ تاؤ کرتے ہوئے بولا۔

چوہدری نے بغیر کسی تامل کے تجوری کھولی اور دو لاکھ روپیہ پاشا کے منہ پر دے مارا ------ "دو لاکھ ہیں"۔

"کل دس پینتالیس پر مال مل جائے گا۔" پاشا نے نوٹ جیکٹ کے کھیسوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"پاشا ------" جاتے ہوئے جب دروازے تک پہنچا تو شمسہ نے پکارا ------ وہ رک کر مڑا۔ "روشو کا کیا ہو گا ----- وہ معصوم بچہ تمہارے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے ------ اس چوری کا اعتراف کر لو۔"

"روشو کو اب اس اسٹوری سے نکال دو"۔ وہ بے نیازی سے بولا۔ "اگر اس کا قصہ دوبارہ سے چھیڑا گیا تو پھر بہت ساری باتیں کھلیں گی اور میرا ہی نہیں تمہارا بھی نقصان ہو گا۔ لہذا روشو کو بھول جاؤ"۔ اس نے ایک ہلکی سی آنکھ جھکائی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

۱۲
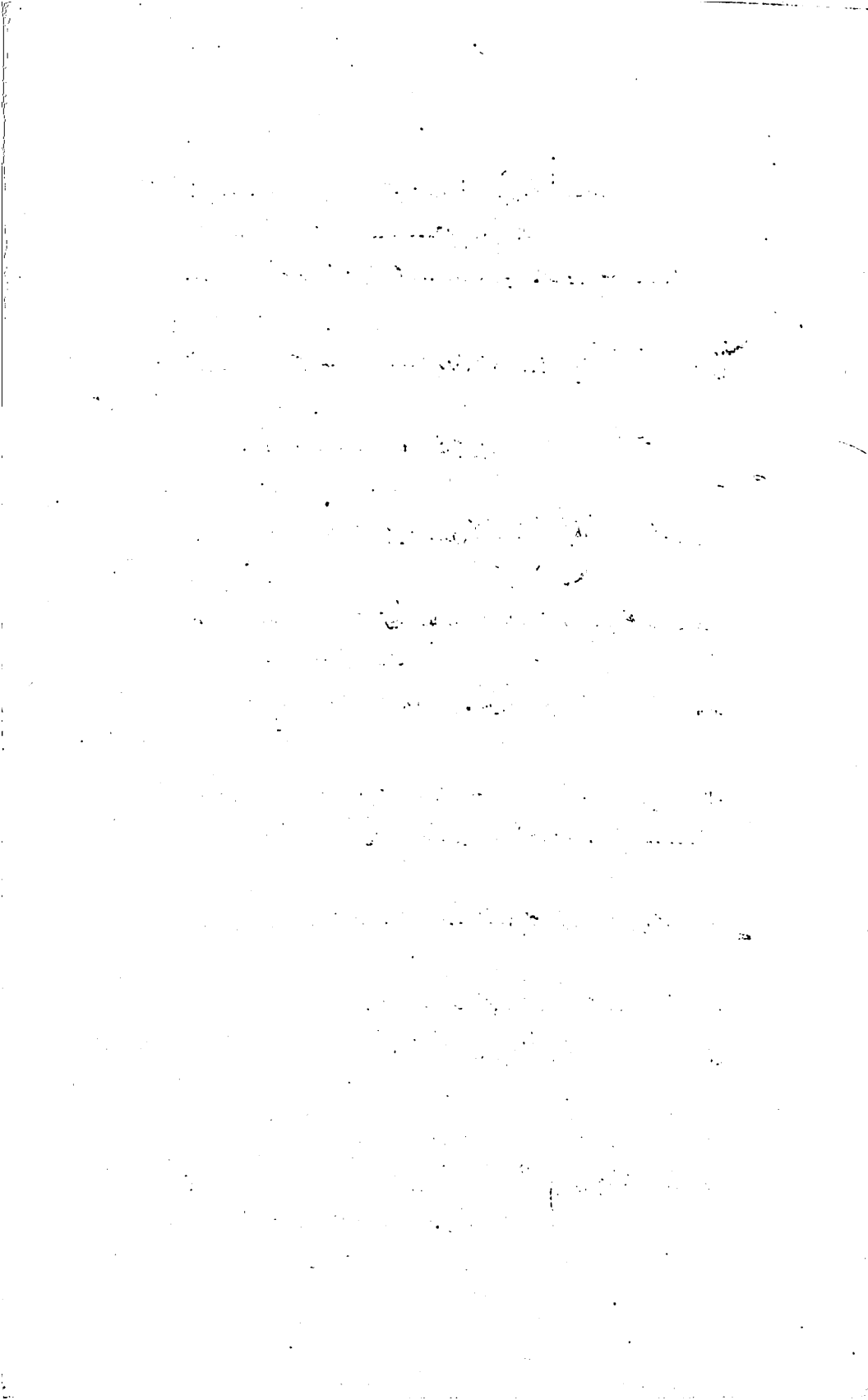
نصف رات بیت چکی تھی۔

لڑکے ابھی تک جاگ رہے تھے کیونکہ روشوا بھی تک واپس نہیں آیا تھااور روشو کی وجہ سے لڑکے تشویش میں مبتلا تھے اور سب سے زیادہ تشویش روڈے کو تھی روڈے نے ایک خواہ مخواہ کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی کہ جیسے جیل کے لڑکوں کا ہر مسئلہ اور مسئلہ کا حل اس کی ذاتی ذمہ داری ہو۔ وہ سخت مضطرب اور بے چین تھااور کونے میں رکھے ہوئے ایک طویل بانس کو دیکھے جارہا تھا۔

"دیکھو ادھر آجاؤ پاس پاس ......" اس نے سرگوشی میں کہااور رات کی ہلکی ہلکی تاریکی میں اونگھتے جاگتے لڑکے رول ہوتے ہوئے روڈے کے قریب آگئے۔

حسبِ معمول برآمدے کا بلب روشن تھااور اس کی روشنی کھڑکی دروازے اور روشن دان سے چھن کر اس طرح اندر آرہی تھی کہ جیل کے ہال میں ایک ہلکی ملگجی روشنی چاندنی کے سائے کی طرح پھیلی ہوئی تھی جس میں تمام قیدیوں کے چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے اور سفیدی کی ہوئی چھت بھی ٹھیک ٹھاک روشن نظر آرہی تھی۔ کونے میں ایک لمبا بانس کھڑا تھا جس کے اوپر والے حصے میں کوچی لگی ہوئی تھی اور آج دن کے وقت جب لڑکے قریب کے ایک سرکاری باغ کے پودوں میں گوڈی کرنے گئے ہوئے تھے تو کسی نے اس کوچی لگے بانس سے چھت اور دیواروں کی صفائی کی تھی کیونکہ کوئی افسر اصلاح گھر کا معائنہ کرنے والا تھااور اس طرح یہ بانس اندر ہی رہ گیا تھا۔

"یہ بانس دیکھا ہے ......" روڈے نے بانس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ لڑکوں کی نظریں

کونے میں رکھے ہوئے چھت کی طرف جاتے بانس کی جانب گئیں۔ وہ حیرت سے دیکھنے لگے۔

"کیا مطلب----؟" ڈوڈے نے متجسس لہجے میں روڈے سے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" روڈے نے جواب دیا پھر اٹھ کے دروازے کی طرف ادھر ادھر چور نظروں سے باہر برآمدے اور جیل کے بیرونی منظر کا جائزہ لیا اور بانس کو بیچ میں سے تھام لیا۔

"بیچ میں راستہ کھلا چھوڑ دو۔" وہ لڑکوں سے مخاطب ہوا لڑکے ایک طرف ہٹے تو روڈے نے بانس کو مضبوطی سے تھام کر اپنے قدم جمائے، زمین کو دیکھا خاصی اونچی اور بلند بالا چھت پر نگاہ ڈالی اور شست باندھ کے بانس کے ساتھ جو دوڑ لگائی تو پلک جھپکنے میں چھپکلی کی طرح چھت کے ساتھ چپک گیا اور بانس دور پرے جا لگا۔ چھت پر پنکھا لگانے کیلئے ایک کنڈا لگا ہوا تھا لیکن پنکھا اس میں نہیں تھا کنڈا خالی تھا۔ روڈے نے کچھ اس طرح شست باندھ کے چھلانگ لگائی تھی کہ بندر کی طرح بانس کی چوٹی پر گیا اور جب بانس چھت سے گزرا تو کنڈے کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں پھنسا لیا اور لٹک گیا۔ لڑکے سارے دم بخود رہ گئے۔ روڈا بندر کی طرح چھت کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔

"گر جاؤ گے روڈے----"! ڈوڈے نے نیچے کھڑے ہو کر اور چھت کی طرف دیکھ کر تشویش سے کہا۔

"بانس پکڑا دو----" روڈا لٹکے لٹکے بولا۔

"کیسے----ڈوڈے نے پوچھا۔

"بس تم ذرا اونچا کرو------" روڈے نے ایک ہاتھ نیچے کیا اور دوسرے ہاتھ کی گرفت اور پاؤں کی پکڑ سے چھت کے ساتھ چپکا رہا۔ ڈوڈے نے بانس کا ایک سرا پکڑا اور دوسرا اوپر روڈے کی طرف بڑھا دیا۔ روڈے نے ایک جھپک ماری، بانس کو پکڑا اور بندر کی طرح پھسل کر ایک سیکنڈ میں نیچے آگیا۔ تمام خوش ہو کے تالیاں بجانے لگے----سوائے سکھڑے کے---- وہ قطعی طور پر الگ تھلگ رہا----جیسے دیکھ ہی نہ رہا ہو۔

"ششش ش ش ش------" روڈے نے ششکار کے سب کو چپ کرایا اور تالیوں کو اس طرح کاٹ دیا جیسے کوئی فلم ایڈیٹر اچانک فلم کو ایڈٹ کر کے کاٹ دیتا ہے۔

"اس سارے قصے کا مطلب کیا ہے۔" ڈوڈے نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے ڈوڈے کہ اگر اس بانس کو میں یہاں سے باہر نکال لوں اور وہاں اس باغ

میں لے جاؤں. جہاں ہم پودوں کی گوڈی کرتے ہیں تو مزا آجائے-----" روڈے نے پر تجسس لہجے میں کہا-

"کیسے------؟" ڈوڈے نے پوچھا اور تمام لڑکے تجسس بھری نظروں سے روڈے کو دیکھنے لگے-

"وہ ایسے------" روڈا بولا- "کہ گارڈن کی جو چار دیواری ہے اس چھت سے اونچی نہیں ہے میں اسی بانس کے ذریعے بڑی آسانی سے باہر گر کر فرار ہو سکتا ہوں-"

"بھاگ جاؤ روڈے----ڈوڈے نے تجسس ظاہر کیا- "تم فرار ہو جاؤ-"

"نہیں ڈوڈے------" روڈا بولا- "اکیلا نہیں بھاگوں گا------" یہ بتاؤ اور کون کون بانس کی مدد سے قلانچ کر سکتا ہے-"

"میں" سکھڑا سینہ تان کر آگے بڑھا- "یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے-"

اس نے حقارت سے روڈے کو دیکھا اور پھر بانس پکڑ کر اس طرح اوپر گیا جیسے اولمپکس کھلاڑی بانی جمپ لگاتے ہیں لیکن فوراً ہی اس کا توازن بگڑا بانس ایک طرف جا لگا اور سکھڑا دھڑام سے نیچے زمین پر آن لگا----- لیکن اس سے پیشتر کے اس کا سر زمین پر لگتا، روڈے نے جنگلی بلے کی طرح پھرتی سے ایک چھلانگ لگائی اور سکھڑے کو روک کر اس کا سر زمین پر لگنے سے بچالیا- سکھڑا سہلاتا ہوا نادم سا ہو کے ایک کونے میں چلا گیا----- پھر ایک ایک کر کے تمام لڑکوں نے بانس پکڑ کر چھلانگ لگانے کی پریکٹس شروع کر دی اور دو چار لڑکے کامیاب بھی ہو گئے-

"سنو----سنو سنو----" روڈے نے روکا- اور بولنے لگا- "میں نہیں چاہتا کہ تم سب فرار ہونے کی کوشش کرو میں جانتا ہوں کہ تم میں سے کس کس نے جرم کیا اور کون کون بے گناہ پکڑا گیا ہے جو بے گناہ ہیں ہو سکتا ہے عدالتوں میں ان کی بے گناہی ثابت ہو جائے لیکن اگر بھاگ جاؤ گے تو پھر یہ لوگ تم پر فرار ہونے کی فرد جرم لگا کے مجرم بنادیں گے لہذا کل جب ہم گارڈن جائیں گے تو اس بانس کو میں کسی طرح نکال کے باہر لے جاؤں گا-" روڈا بولتا چلا گیا- "پہلے چار لڑکے کوشش کریں ان کے پیچھے ڈوڈا جائے گا یہ سب باہر سرسوں کے کھیت میں ہمارا انتظار کریں دوسرے گروپ میں چھ لڑکے جمپ لگائیں گے جن میں آخری لڑکا میں ہوں گا-----کون کون جائے گا اور کون کون نہیں بھاگے گا یہ میں کل موقع پر ہی بتادوں گا----- لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ اسلم، احمد، شمشاد، توکی، فاضا اور روشو وغیرہ کو بھاگنے میں فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ ان کے چھوٹنے کا چانس ہے-

"روڈے ------" اچانک ڈوڈا چونکا۔ "روشو-----"

ایک دم جیل میں سناٹا چھا گیا سب لڑکوں کی نظریں جیل سے باہر راہداری کی طرف چلی گئیں جہاں ایک سپاہی تقریباً نیم بے ہوش اور ادھ مرے ----- روشو کو سہارا دے کر لارہا تھا۔ روشو کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے اور ٹانگیں اس طرح کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ لکڑی کی اور بے جان ہوں۔ وہ ٹھیک طرح سے چل بھی نہیں سکتا تھا اس کی حالت سنگین ہو رہی تھی۔

"روشو-----" روڈا بلند آواز میں پکارا۔ روشو نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ وہ چونکا، نہ سر اٹھایا۔ سپاہی نے سلاخ دار دروازہ کھولا اور روشو کو اندر داخل کر کے چھوڑ دیا اور روشو ایک لحہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا دھڑام سے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ سپاہی اسے ویسے ہی چھوڑ کر دروازے سے باہر نکلنے لگا تو روڈے نے اس کی گردن پکڑ کے نیک لاک لگالیا اور گالی دے کر بولا۔

"------ کے بچے -----کیا کیا ہے اسے۔"

"میں نے کچھ نہیں-----" سپاہی گھٹی ہوئی سانس میں بولا۔ "خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں مجھے کچھ پتہ نہیں-----یہ سورما کا کام ہے۔"

"سورما-----روڈے نے دانت پیسے۔ "کون ہے سورما۔"

"مجھے چھوڑ دو----- میرا کچھ واسطہ نہیں۔" سپاہی کے نرخرے سے آوازیں نکل رہی تھیں--"سورما-------"

"ایک شرط پر چھوڑتا ہوں۔" روڈے نے اپنے شکنجے کی تھوڑی سی گرفت ڈھیلی چھوڑی۔ "اس سورما کے بچے سے کہو کہ اگر ماں کا دودھ پیا ہے تو یہاں آئے تاکہ میں دیکھوں وہ کتنا بڑا سورما ہے۔"

"میں ابھی بھیجتا ہوں اسے-----" سپاہی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "میں اسے ابھی بھیجتا ہوں

"تو پھر جاؤ----" روڈے نے سپاہی کو پرے دھکیلا۔ "یاد رکھنا اگر وہ میرے پاس نہ آیا تو پھر تم بھی نہ آنا۔" اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "مارے جاؤ گے"۔

"وہ آئے گا ضرور-----" سپاہی جان چھڑا کر تیزی سے باہر نکلا اور دروازہ مقفل کر دیا۔ سپاہی کے جاتے ہی روڈا روشو کی طرف لپکا۔

"روشو او، روشو-----" اس نے بہت ہی اپنائیت اور شفقت کے ساتھ اسے پکارا---- پھر کسی لڑکے نے جلدی سے بتی جلا دی۔ تمام لڑکے ہمدردی کے طور پر روشو کے ارد گرد جمع

سو گئے تھے۔ روشو نے بہت نقاہت کے ساتھ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔ بڑی ممنونیت اور مظلومیت سے روڈے کو دیکھا اور پھر نظریں گھما کر سب لڑکوں کی موجودگی کو محسوس کیا اور اس کی آنکھ پر نم ہو گئی!

"میں نے اگر تمہارا بدلہ نہ لیا۔۔۔۔ تو اپنے باپ کا نہیں ہوں روشو۔۔۔۔۔" روڈے نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا اور پھر روشو کو گردن سے ذرا اونچا اٹھا کے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔

"اسے پانی پلاؤ ڈوڈے۔" اس نے ڈوڈے سے کہا۔ ڈوڈا لپک کے پانی کا گلاس لایا جو اس نے روڈے کے ہاتھ میں دے دیا۔ روڈے نے گلاس روشو کے ہونٹوں سے لگایا۔ روشو اس طرح گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پینے لگا جیسے کوئی جاں بلب مریض پیتا ہے۔ معاً لوہے کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔

"ٹھک، ٹھک، ٹھک۔۔۔۔" تمام لڑکے چونکے۔ روڈے نے پلٹ کر دیکھا تو اسی سپاہی کے ساتھ سورما باہر کھڑا تھا۔ اس نے اپنی چوڑی چکلی چھاتی نکال رکھی تھی اور جو بنیان پہنے ہوئے تھا جس پر کسی آدم خور جانور کی ہیبت ناک قسم کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔

"کون ہے اوئے روڈا۔۔۔۔" اس نے باہر سے ہی کڑک لہجے میں پوچھا۔

"میں ہوں روڈا۔۔۔۔" روڈے نے روشو کی گردن کو آہستہ سے نیچے رکھا اور لڑکوں کے جلو سے باہر نکل کر سامنے آگیا۔

سنا ہے تم مجھے یاد کر رہے ہو۔۔۔۔" سورما نے چھاتی تان کر پوچھا۔

"میں نے سورما کو بلایا تھا۔۔۔۔" روڈا پہچان کر لیکن انجان بن کر بولا۔

"تم یہ ہمت کیسے پیدا ہو گئی کہ تم سورما کو بلاؤ۔۔۔۔ ہیں۔" وہ چھاتی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"اندر آجاؤ۔۔۔ یا مجھے باہر نکالو۔۔۔۔ ہمت کا پتہ چل جائے گا۔" روڈا، سورما کی قوی ہیکل جسامت سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"یہ بات ہے وہ کھٹ سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔۔۔۔ سپاہی باہر ہی کھڑا رہا۔ "شکل سے تو بچے نہیں لگتے ہو تم۔" سورما نے اسے گھورتے ہوئے ازراہ مذاق کہا۔

"تم بھی شکل سے بڑے نہیں لگتے ہو۔" روڈا فوراً بولا۔۔۔ اور جواب میں سورما نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جیسے بجلی کا بٹن دبا اور سورما کا فولادی مکا روڈے کے منہ کی طرف آیا اور اگر روڈے کو پڑ جاتا تو شاید ایک ہی مکے میں روڈے کا کام تمام ہو جاتا لیکن روڈا جیسے پہلے ہی سے اس کے وار کیلئے تیار تھا۔ اس نے بجلی کی سی پھرتی سے گردن بچائی اور سورما اپنے ہی زور پر خود لٹو کی گھوم گیا۔

۔۔گھومتے ہی وہ پھر پلٹ کر روڈے پر جھپٹا لیکن روڈا آگے بھاگا جیسے دروازے سے باہر فرار ہونا چاہتا ہو لیکن اس نے لوہے کی سلاخ کا ہلکا سا سہارا لے کر اور اچھل کر گھوڑے کی طرح بیک کک سورما کے منہ پر دے ماری۔ سورما دھڑ سے دیوار کے ساتھ جا لگا اور چکرا گیا جیسے ہر چیز اس کی نظروں میں گھوم گئی تاہم اس نے فوراً اپنے حواس قائم کئے، سر کو جھٹکا دیا اور روڈے کو دبوچنے کیلئے جمپ لگائی لیکن پھر بجلی کی سی پھرتی سے روڈے نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے والے حصے پر ضرب لگائی اور سورما کا سر اس طرح پیچھے جھٹکا کھا گیا جیسے گردن سے جدا ہو گیا ہو۔ وہ ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا روڈے نے اسے عقب سے پکڑ کر نیک لاک لگا دیا جیسے چوہا شکنجے میں آتا ہے اس طرح دیو قامت سورما روڈے کے شکنجے میں پھنس کر بے بس ہو گیا۔

"بول تیری۔۔۔۔" روڈے نے گالی دے کر شکنجہ اور مضبوط کیا۔ سورما کی آنکھیں پھٹ کر باہر آ گئیں اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن وہ روڈے کے شکنجے کی گرفت کمزور نہیں کر سکا۔

"سورما۔۔۔۔۔" سپاہی سورما کی حالت دیکھ کر پریشان ہوا۔

"خبردار۔۔۔۔" روڈے نے دھمکی دی۔ "تم آگے نہیں آنا"۔

سپاہی رک گیا لیکن سورما کی کیفیت دیکھ کر اس پر خوف و ہراس طاری ہو گیا تھا۔ اچکے روڈے نے خود ہی پھنسے ہوئے قفل سے سورما کو آزاد کیا لیکن اس کو سنبھلنے کا موقع دینے سے پہلے نہایت پھرتی کے ساتھ ایک پنچ مارا ایک فلائنگ کک ماری اور پھر اس کے بازو کو اپنے قفل میں لے کر اس طرح دھیرے دھیرے گھمانا شروع کیا کہ اس کے کندھے کا پیچ جیسے مڑنا اور ڈھیلا ہونا شروع ہوا۔ سورما نے پہلے تو ضبط کیا لیکن پھر ضبط نہ ہو سکا اور درد سے کراہنا شروع کیا اور پھر اس کی چیخیں نکل گئیں۔

"بول تیرے سورما کی۔۔۔۔" اس نے ایک اور گالی دی سپاہی نے جب یہ حال دیکھا تو وہ گھبرا کر واپس بھاگا۔ غالباً وہ کسی مدد کے لئے بھاگا تھا لیکن اتنے میں روڈے نے سورما کو ادھ مرا کر دیا تھا اس کے کندھے میں ہڈی چٹخنے سے ایک کڑک کی سی آواز آئی اور سورما جیسے بے ہوش ہو گیا۔ اس وقت روڈے نے اپنے قفل کی گرفت توڑی اور سورما دھڑ سے زمین پر کسی لاش کی طرح گر گیا سورما کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔

اتنے میں دھڑ دھڑ کی آواز آئی اور پولیس کی ایک گارڈ دندناتی اندر آئی۔ انہوں نے ڈنڈے، مکے، لاتیں اور بٹ مار مار کر روڈے کو قابو کیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ روڈا غصے سے بے قابو تھا اور بڑے زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ تمام لڑکے دم بخود سانس کھینچے خاموش کھڑے تھے

"میں نے تمہارا بدلہ لے لیا ہے روشو۔ تم چل کر آنے تھے یہ اسٹریچر پر جائے گا۔"
سپاہی جب روڈے کو دروازے سے گھسیٹ رہے تھے تو اس نے ہانپتے ہوئے پلٹ کر پھر روشو سے کہا "میں نے تمہارا بدلہ لے لیا ہے"۔

روشو نقاہت سے کچھ بول تو نہ پایا لیکن اس کی آنکھوں میں روڈے کے لئے بے انتہا تشکر اور احسان مندی کا جذبہ تھا جس کا اظہار اس نے آنسو ٹپکا کر کیا۔

○

نقص امن توڑ پھوڑ کرنے جیل کے عملے کو مارنے اور قیدی لڑکوں کو گمراہ کرنے کے الزام میں انکوائری کے لئے روڈے کو جیلر کے آفس میں لایا گیا۔ آفس میں دوسرے افسروں کے علاوہ کفیل بھی تھا۔ سب لوگ سربراہ کی میز کے اطراف کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جب کہ روڈا ایک جانب کونے میں کھڑا تھا۔ اسے یہاں لانے سے پہلے کسی دوسرے کمرے میں لے جاکر ٹھیک ٹھاک پھینٹی دی گئی تھی اور مار کے نشانات اس کے چہرے اور جسم کے دوسرے حصے پر نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے جیلر کے استفسار پر اپنے جسم پر لگائے جانے والے نشانات بھی دکھائے تھے۔ روشو پر ہونے والے مظالم کی ہولناک داستان بھی سنائی تھی اور اس بات کا اعتراف بھی کر لیا تھا کہ اس نے انتقام کے طور پر سورما کی گردن اور بازو توڑ دیا ہے۔

"مجھے اس بات کا دکھ نہیں ہے"۔ جیلر نے کہا۔ "جو آدمی سورما ہو نام بھی سورما رکھے باڈی بلڈر بھی کہلائے اور پھر چھوٹے سے معصوم بچے پر ظلم کرے اور پھر معصوم بچے ہی سے اپنی گردن تڑوائے تو مجھے اس کی گردن یا بازو ٹوٹنے کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جیلر نے بہت صاف گوئی سے کہا۔

"سر بات یہ-----؟" کفیل نے کچھ کہنا چاہا

مسٹر کفیل-----" جیلر نے بات کاٹی۔ "یہ مت بھولو کہ اس جیل کو اصلاح گھر کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں بچوں کو اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ وہ اگر مجرم ہیں بھی تو ان کے لئے ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ وہ جرائم کی دنیا سے دور ہو جائیں اور جب یہاں سے جائیں تو اچھے شہری بن کر باہر نکلیں اور معاشرے میں ایک باعزت اور فعال کردار ادا کر سکیں لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں اور میرے پاس مسلسل اس قسم کی شکایات آ رہی ہیں کہ تم اپنے گرگوں کے ذریعے ان معصوم بچوں کو جرائم کے لئے اکساتے ہو اور جب وہ آمادہ نہیں ہوتے تو ان پر مظالم کرتے ہو"۔

"سریہ اس جیل کا ایک بہت ہی خطرناک اور جھوٹا لڑکا ہے ---- اور"۔
"کفیل صاحب ------" جیلر نے پھر کفیل کی بات کاٹی۔ "آپ شادی شدہ ہیں؟" اس نے براہ راست سوال کیا معلوم ہوتا تھا جیلر کفیل کو ذلیل کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔
"ظاہر ہے جناب ------" کفیل نے اقرار۔ میری کافی عمر ہے"۔
"کتنے بچے ہیں آپ کے -----" جیلر کا یہ دوسرا ڈائریکٹ سوال تھا۔
"کوئی نہیں جناب ------" کفیل نے مایوسی سے سر جھکا دیا"۔ بے اولاد ہوں"۔
"تو یہ وجہ ہے دوسروں کی اولاد پر مظالم کرنے کی"۔ یہ بھی جیلر کا ایک طرح سے ڈائریکٹ حملہ تھا۔ جس کے جواب میں کفیل تو کچھ نہ بولا لیکن روڈا ترنت بول پڑا۔
"نہیں جناب ------ میرا خیال ہے ان کے مظالم کی یہ وجہ نہیں ہو سکتی اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں"۔ روڈا اجازت لینے کے لئے چپ ہوا اور پھر جیلر کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر بولا۔ "جناب ان کے مظالم کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بے اولاد ہونے کے باوجود دولت حاصل کرنے کی کوشش میں انہوں نے اپنی تمام انسانی اور اخلاقی قدروں کو پامال کر دیا ہے۔ یہ پورے سسٹم کی خرابی ہے جناب ------ کہ ایک ایسا آدمی جس کا کھانے والا کوئی نہیں وہ دولت کی حرص میں دیوانہ ہے"۔
"تم کیا جانتے ہو اس سسٹم کے بارے میں"۔ جیلر روڈے کی اس بات پر چونکا اس ادارے میں آنے ہوئے جیلر کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے روڈے کا نام تو سنا تھا لیکن آمنا سامنا غالباً پہلی مرتبہ ہوا تھا۔
"بتاؤ کیا جانتے ہو تم سسٹم کے بارے میں"۔ جیلر نے پوچھا۔
"میں اس سسٹم کے بارے میں اتنا جانتا ہوں جناب کہ اس سسٹم نے پہلے فرد کو پھر فرد سے جماعت کو اور جماعت سے پورے سماجی نظام کو بگاڑ دیا ہے۔ اس سسٹم نے پولیس قائم کر رکھی ہے تاکہ جرائم میں اضافہ ہو۔ تعلیمی ادارے کھلے ہوئے ہیں تاکہ جہالت پھیلے۔ اور -----
"خاموش -----؟" کفیل سے برداشت نہ ہو سکا اور بیچ میں چیخ اٹھا۔ "شرم نہیں آرہی ہے صاحب کے سامنے فضول بکواس کر رہے ہو"۔ پھر وہ جیلر سے مخاطب ہو کر بولا۔
"دیکھ لیا صاحب آپ نے اپنی آنکھوں سے اور سن لیا خود اسے کتنا بے ہودہ اور منہ زور لڑکا ہے"۔
"ہونہہ -----" جیلر سوچ میں پڑ گیا۔ لگتا تھا جیسے وہ روڈے سے کافی متاثر ہو گیا تھا۔
"اس لڑکے کا بیک گراؤنڈ کیا ہے"۔ جیلر نے پوچھا۔

"سر بہت لمبا چوڑا بیک گراؤنڈ ہے اس کا ......" کفیل نے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے اسے فی الحال اور لڑکوں سے علیحدہ رکھو۔" جیلر نے قدرے سنجیدگی سے حکم دیا اور جب سپاہی روڈے کو لے جانے لگے تو جیلر نے دوسرا حکم صادر کیا۔
"اور میں کوئی بد تمیزی کی بات نہ سنوں۔"
روڈو نے ایک چھلتی سی نگاہ جیلر پر ڈالی اور ایک نا معلوم سا سلام کر کے چلا گیا۔ اور دونوں میں ایک غیر مرئی ڈور سی قائم ہوگئی۔

O

پاشا کے اپارٹمنٹ پر ہلکی سی دستک ہوئی پھر دروازہ کھلا تو شمسہ اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ موجود تھی۔
"مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔" پاشا نے کہا اور بے اختیار شمسہ کی جانب لپکا۔
پاشا نے شہر کے ایک بہت ہی پوش علاقے میں انتہائی بلندی پر ہر قسم کی آسائشوں اور سامان تعیش سے مزین لگژری اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔ ظاہر ہے رقم اس کے پاس بہت آ گئی تھی۔ ایک تو اس نے چوہدری کا پورا سیف چرا لیا تھا جس کا حساب روشو کے کھاتے میں چلا گیا اور سزا بھی اسی کو بھگتنی پڑی تھی۔ اس نے شمسہ کی تصویریں دکھانے کے بعد بلیک میل کر کے تین لاکھ روپے مزید اینٹھ لئے تھے۔ لیکن چوہدری ان ساری باتوں کو بھول بھال کر ایک بار پھر شمسہ کے سامنے مرغا بن گیا تھا اور اس طرح شمسہ پر دوبارہ لٹو ہو گیا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو اور خوش تھا کہ پاشا جو ایک کانٹا بن کے اس کے اندر کھب گیا تھا نکل گیا ہے۔ لیکن یہ غلط فہمی تھی۔ پاشا بھی موجود تھا اور کانٹے کی چبھن بھی موجود رہی۔ پاشا نے ایک دن پھر ایک تصویر بذریعہ ڈاک روانہ کر دی تھی اور ابھی وہ تصویر دیکھ کر غصے سے کانپ ہی رہا تھا کہ پاشا کا ٹیلی فون آ گیا تھا۔
"چوہدری صاحب پیسے ختم ہو گئے ہیں کچھ اور پیسے چاہئیں"۔ پاشا نے کوئی تمہید باندھے بغیر مطالبہ کر دیا تھا۔
"حرام زادے"۔ وہ گرجا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اب ہمارے راستے میں نہیں آؤ گے۔"
"چوہدری صاحب وہ وعدہ ہی کیا جو پورا ہو جائے"۔ وہ ڈھٹائی سے کھکھلا کر ہنسا تھا اور پھر سنجیدہ ہو کے کہنے لگا۔
"اصل میں ہمارے پاس اور ہے ہی کیا چند تصویر بتاں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اپنے

پاس کچھ نہ رکھوں پھر بعد میں خیال آیا ہے کہ جو لوگ مرغی کو ایک ہی دفعہ مار کے انڈے کھا لیتے ہیں وہ ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں۔ لہذا میں نے سارا اثاثہ تو آپ کو دے دیا کچھ تھوڑا سا اپنے پاس رکھا ہے بونس سمجھ لو یا منافع"۔

" بکواس بند کرو"۔ چوہدری نے اس کی بات کاٹ کر ٹیلی فون رکھ دیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے پھر گھنٹی بجی اور پاشا نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ " پاگل مت بنو چوہدری صرف دس ہزار مانگ رہا ہوں۔۔۔زیادہ نہیں اور آج کے زمانے میں دس ہزار روپے دس روپے کے برابر ہیں"۔

" دس ہزار مانگ رہا ہے"۔ وہ فون رکھ کر شمسہ سے مخاطب ہوا۔

" یہ کتا اب بڑی مانگتا رہے گا"۔ وہ حقارت سے بولی تھی۔ "اپنے سر کا صدقہ بھجوا دو اسے دس ہزار اور۔۔۔۔"

اور پھر چوہدری نے ایک دن اسے اسٹور کے باہر بلوایا اور اور گاڑی روک رک دس ہزار کا لفافہ اس کے منہ پر مارا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آیا۔ ہر ہفتے ایک تصویر بذریعہ پوسٹ آجاتی اور دس ہزار کا مطالبہ بھی اور چوہدری زچ ہو گیا تھا۔

" میرا جی چاہتا ہے کہ ایک گولی تمہیں مار دوں ایک اس کمینے کو اور ایک خود کو مار کر آزاد ہو جاؤں"۔ ایک دن چوہدری نے بیزار ہو کر کہا۔

" حوصلہ رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کتا جب پاگل ہو جائے تو وہ زیادہ دن پاگل نہیں رہتا ہے۔" شمسہ بہت التفات کے ساتھ چوہدری سے مخاطب ہوئی اور چوہدری پھر اس بات سے مطمئن اور پر سکون تھا کہ کم از کم شمسہ اور پاشا کے درمیان اب کوئی رابطہ نہیں رہا ہے لیکن اس دن چوہدری جب شمسہ سے یہ کہہ کر گیا کہ وہ دن بھر کیلئے جا رہا ہے اور شام کو لوٹے گا تو شمسہ نے پہلی فرصت میں پاشا کو ٹیلیفون کیا اور بتایا کہ چوہدری شام تک کے لئے غائب ہے لہذا آج فرصت کا دن ہے

" فوراً آجاؤ شمسی۔ خدا کیلئے پر لگا کر آجاؤ۔۔۔۔" وہ اضطراب سے بولا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں تھا کہ شمسہ دوبارہ رابطہ قائم کرے گی۔

" پر تو نہیں لگا سکتی۔۔۔۔ لیکن جلد پہنچ رہی ہوں"۔ شمسہ بھی بے چینی سے بولی۔ راستے صاف تھے ڈرائیونگ میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ بمشکل پچیس منٹ گزرے ہوں گے کہ پاشا کے اپارٹمنٹ پر دستک ہوئی ساتھ ہی شمسہ اندر داخل ہوئی اور پاشا بے اختیار مقناطیسی انداز میں شمسہ کی طرف لپکا۔

مجھے یقین تھا تم ایک نہ ایک دن ضرور آؤگی۔" وہ فتح مندی کے جذبات سے بولا۔

"پیاسے کو کنویں کے پاس آنا ہی پڑتا ہے" شمسہ نے جواب دیا۔اور پھر توقف سے بولی۔

تم سانپ ہو پاشا۔۔۔۔ڈس لیتے ہو آدمی کو"۔

"سانپ کے ڈسنے سے تو مر جاتا ہے آدمی۔۔۔" پاشا بولا۔

"نہیں تمہارے ڈسنے سے مرتا نہیں ہے آدمی بلکہ زندہ رہنے کیلئے ڈسوا تا رہتا ہے"۔وہ معنی خیز انداز میں بولی"۔ تم ایک دفعہ جسے کاٹ لو پھر وہ نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے"۔

خیر مجھے اتنا مت چڑھاؤ۔۔۔۔۔۔اور یہ وقت جو آج ہمیں اتنے عرصے بعد ملا ہے اسے فلسفے میں ضائع مت کرو۔۔۔۔۔۔اس نے دروازہ بند کیا اور فاصلے سمیٹتے ہوئے کہا۔" یہ بتاؤ آج تمہیں وقت کیسے مل گیا؟"

"پلیز پلیز پاشا"۔ شمسہ نے پاشا کو شریفانہ رویہ اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا۔

"تم نے ہیرالڈ رابن اکی کارپٹ بیگرز پڑھی ہے۔۔۔" پاشا نے پوچھا۔

"شاید کبھی پڑھی تھی کیا ہے اس میں"۔ شمسہ بے نیازی سے بولی۔

"اس میں جب وہ بہت ہی نرم روی اور سوفٹلی عورت سے پیش آتا ہے تو وہ جنگلی بلی کی طرح بپھر کر اسے کہتی ہے۔" پلیز ڈونٹ بی جنٹل ود می آئی ایم اے وومن"۔ وہ جنگلی بلے کی طرح جنگلی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بولا۔

"لیکن شاید تم بھول رہے ہو"۔ شمسہ نے ہٹ کر آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔اسی ناول میں ایک جگہ ایک عورت کے ساتھ جب وہ جنگلی پنے سے پیش آتا ہے تو وہ بہت آرام سے اسے بٹھا کر کر نرم روی سے کہتی ہے

"پلیز بی جینٹل ود می، آئی ایم اے وومن۔۔۔۔یہ دوسرا رخ ہے عورت کا۔" شمسہ بولی۔

"نیو نیو۔۔۔۔۔" پاشا نے سیٹی بجائی۔" تمہیں اچھی طرح یاد ہے وہ ناول"۔

کیوں نہیں۔۔۔۔" شمسہ فخریہ بولی۔" میں جو کچھ پڑھ لیتی ہوں یاد رہ جاتا ہے۔"

" پھر تمہیں ماننا پڑے گا شمسی کہ عورت کی سو قسمیں ہوتی ہیں۔ان میں ایک قسم تم بھی ہو جس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ وقت کیا سوجانے کیا کر بیٹھو۔۔۔۔۔۔ان پریڈکٹیبل۔۔۔۔ وہ فلسفہ بگھارتے ہوئے بولا۔

- نہیں پاشا جی۔۔۔۔۔یہ بات نہیں ہے"۔ شمسہ نے تردید کی۔ قسمیں صرف عورت کی سو نہیں ہیں۔ تم کہہ سکتے ہو انسان کی سو قسمیں ہیں۔اگر عورت کی سو قسمیں ہیں تو مرد کی بھی ہزار قسمیں

ہوں گی۔۔۔۔۔" شمسہ بھی فلسفہ بگھارنے لگی۔ "یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ جیسے کوئی کہے کہ گھوڑی کی تو سو قسمیں ہیں لیکن گھوڑے کی صرف ایک ہی قسم ہوتی ہے"۔

" بھئی ویل سیڈ ہاہاہاہاہا۔۔۔" پاشا نے کھکھلا کر قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے پلنگ پر لیٹ گیا۔ پھر شمسہ کی کلائی تھام کر بولا۔ "بتاؤ تمہیں آج کیسے وقت مل گیا اور بڈھا کہاں چلا گیا ہے"۔

" بڈھا آج زمینوں پر گیا ہے بول گیا تھا شام کو لوٹوں گا۔۔۔۔" شمسہ نے کہا۔ "میں نے سوچا وقت سے فائدہ اٹھالو۔"

"گڈ یہ وقت جو آج بڈھے کے قبضے میں نہیں ہے۔ ہمارا ہے شمسی۔ ہمیں اس وقت کو ضائع کئے بغیر حرف مدعا پہ آجانا چاہئے۔۔۔" اس نے قربت چاہی۔ اور پھر شمسہ کی کلائی تھام لی۔

"صبر، صبر، صبر۔۔۔" شمسہ نے تامل کیا اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا جہاں اسے اپنے بناؤ سنگھار میں تھوڑا سا بگاڑ دکھائی دیا۔ "ڈیلی کیسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ پاشا، تم مرد لوگ بنیادی طور پر ڈسٹرائر ہوتے ہو۔ عورت کو تباہ کر دینا چاہتے ہو"۔ اس نے اپنے پرس سے لپ اسٹک نکالی اور ہونٹ پر اسکن کلر کی ایک نئی تہہ جمائی۔

"اور یہ جو عورت ہے تمہیں پتہ ہے اس نے دنیا کی کتنی بڑی بڑی شخصیتوں کو تباہ کیا ہے۔ ہیں۔ وہ سب تمہاری جیسی تھیں۔۔۔۔ کیسے فاتح تھے سیزر انٹونی تباہ ہو گئے۔" وہ بیقراری سے لوٹتا ہوا پھر شمسہ کی جانب رواں ہوا۔ "صرف عورت کے ہاتھوں"۔

"یہ تم بڑے بڑے لوگوں کا نام لے رہے ہو پاشا جی۔۔۔۔۔" اس نے پرس کھولا لپ اسٹک واپس رکھنے کیلئے پرس میں ہاتھ ڈالا اور ساتھ ہی بولی۔ "عورت نے چھوٹے چھوٹے گھٹیا، ذلیل اور کمینے لوگوں کو بھی تباہ کیا ہے۔ تمہارے جیسے گھٹیا لوگوں کو پاشا۔ آج میں تمہیں تباہ کرنے آئی ہوں۔"

"یہ کیا نان سنس ہے" وہ جھنجھلایا۔

"یہ نان سینس نہیں ہے پاشا۔ شمسہ نے لپ اسٹک رکھتے ہی پھرتی کے ساتھ اپنا ہاتھ پرس سے نکالا اور ساتھ ہی پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر خونخوار طریقے سے دور پرے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا کہ میں گولی چلانے میں جلدی کر دوں"۔ اس نے پستول کو بجلی کی طرح ہاتھوں میں حرکت دی۔

"پلیز شمسہ۔۔۔۔۔۔ کیا کرتی ہو۔ کس کام کے لئے آئی ہو تم۔۔۔۔" اس نے قدرے

خوفزدہ ہو کر لیکن ہنستے ہوئے کہا۔

"وہی کام کر رہی ہوں جس کام کیلئے آئی ہوں"۔ وہ لحظہ بہ لحظہ سنجیدہ ہو رہی تھی۔

"ہو کم آن ------ ختم کرو مذاق ----" پاشا نے دونوں بازو پھیلائے اور شمسہ کی جانب بڑھا۔

"یہ مذاق نہیں ہے پاشا ------" اس نے پستول لہرایا اور دھائیں سے ایک فائر پاشا کے قدموں میں کیا۔ "یہ وارننگ فائر ہے اب ایک قدم بھی آگے نہیں آنا۔ اس میں پانچ گولیاں اور ہیں۔ پھر اس نے دروازے کی طرف دیکھا کہ کہیں آواز باہر تو نہیں گئی لیکن اپارٹمنٹ ساؤنڈ پروف تھا۔

"تم سنجیدہ ہو کیا؟"۔ وہ اندر ہی اندر کانپ گیا۔

"ہاں بہت سنجیدہ ----- میں آج تمہارے اگلے پچھلے تمام حساب چکانے آئی ہوں۔" شمسہ کی آنکھوں میں بلی کی سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"میں اب بھی تم سے محبت -----"

"شٹ اپ"۔ وہ غضبناک ہو کر بولی۔ "بہت سن چکی ہوں تمہاری یہ بکواس"۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں میں تمہارے راستے میں اب کبھی نہیں آؤں گا۔ تم میری زبان پر بھروسہ کرو۔ صرف ایک بار۔" وہ گڑگڑانے کے انداز میں بولا۔

"زبان اس کی ہوتی ہے جس کا ضمیر ہوتا ہے۔ تمہارا نہ ضمیر ہے نہ زبان۔" اس نے پستول کی نالی درست کرتے ہوئے کہا۔

مجھ پر رحم کرو ----- ہم کبھی ایک دوسرے کو چاہتے بھی تھے -----" اس نے ہاتھ جوڑے۔

"غلط -----" شمسہ بولی۔ "تم مجھے چاہتے تھے نہ میں تمہیں چاہتی تھی ---- میں کیا چاہتی تھی تم جانتے ہو اور تم کیا چاہتے تھے مجھے معلوم ہے۔ تم نے مجھے سونے کی کان بنا رکھا ہے پاشا ایسی کان جس میں سے روز تھوڑا تھوڑا سونا نکال کر کھاتے ہو۔ تم نے مجھے ہروایا، جتوایا بکوایا اور پھر ایک اسی سالہ بڈھے سے شادی کرادی۔ میں نے اس کی بھی وفادار بیوی بن کر رہنا چاہا۔ لیکن تم نے میرے جذبات کو ابھارا اور مجھے اس کے ساتھ دغا کرنے پر مجبور کیا۔ پھر میں نے سوچا کہ شوہر سے بے وفا اور تمہاری وفادار بن کر رہوں گی لیکن تم نے مجھے دھوکا دیا اور بلیک میل کرنے

کیلئے میری گندی تصویریں بنائیں"۔

"مجھے معاف کردو اب کبھی-----" وہ ذرا حرکت میں آیا۔

"خبردار" اس نے لیلیٰ پر انگلی رکھی۔ "میری بات سن لو پہلے۔" پھر وہ بولنے لگی۔ "تم نے سیف چوری کیا اور مجرم بے گناہ روشو بن گیا۔ خدا مجھے معاف کرے میں نے بھی اپنی زبان بند کر دی اور اب وہ تمہارے گناہوں کی سزا جیل میں بھگت رہا ہے۔ وہ بھگت رہا ہے۔ میں بھگت رہی ہوں۔ چوہدری بھگت رہا۔ جو بہرحال ایک شریف آدمی ہے ساجدہ بھگت رہی ہے۔ شاہینہ بھگت رہی ہے اور نہیں معلوم اس شہر میں اور کون کون تمہاری سیاہ کاریوں کی سزا بھگت رہا ہوگا۔ ہماری بد نصیبی صرف بڈھے چوہدری نہیں ان چوہدریوں کے دلال بھی ہیں تم جیسے دلال پاشا۔"

"تم اگر کہو گی تو میں یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" وہ پھر گڑگڑایا۔

"نہیں میں نہیں چاہتی کہ تم یہ شہر چھوڑ کر چلے جاؤ------" وہ زہرخند طریقے سے بولی "میں تمہیں اس دنیا سے ہی باہر بھیج دینا چاہتی ہوں۔ تمہاری فلائٹ تیار ہے۔ بلکہ اناؤنس ہو چکی ہے تم چیک ان ہو چکے ہو۔ یہ رہا تمہارا بورڈنگ کارڈ------" اس نے ابھی اتنا کہہ کر لیلیٰ دبائی ہی تھی کہ پاشا شمسہ کو قابو میں کرنے کیلئے پھرتی سے لپکا اس نے ایک تیز جھپٹ لگائی لیکن شمسہ پہلے ہی چوکس تھی۔

"خبردار----" وہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ شمسہ نے دھائیں سے اس کے سینے میں ایک فائر کیا اسے دھچکا لگا۔

"دھائیں----" اس نے دوسرا فائر کیا۔ پاشا جس طرح زور کے ساتھ آگے جھپٹا تھا اسی طرح جھٹکے کے ساتھ پیچھے گیا۔

دھائیں------"

"دھائیں-----"

شمسہ جیسے مکمل طور پر پاگل ہو چکی تھی اس نے پانچوں گولیاں پاشا کے سینے پر چلادیں اور پاشا جیسے خون میں نہا گیا۔

(۱۳)

گولیوں سے پاشا کی چھاتی چھلنی ہو گئی تھی اور خون اس طرح بہہ گیا تھا جیسے بکرا ذبح کیا گیا ہو۔ پاشا ابھی تک زندہ تھا اس کی آخری سانسیں چل رہی تھیں۔ وہ سکرات کے عالم پتھرائی ہوئی آنکھوں سے شمسہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے محو حیرت ہو۔

"سوری پاشا سوری۔۔۔۔" شمسہ بھی جیسے پتھرا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم لالی آگئی تھی اس نے پپوٹے بند کئے تو آنسو بھی جیسے خون بن کر نکلنے لگے۔ اور پاشا کے تقریباً مردہ جسم سے مخاطب ہوئی۔

"نہیں پاشا نہیں۔۔۔۔۔" شمسہ کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ "میں تمہیں مارنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ تمہارے مرنے کے دن نہیں تھے جوانی مرنے کیلئے نہیں ہوتی۔ جوانی تو خوبصورت ہوتی ہے۔ اور تیری جوانی تو بہت ہی خوبصورت تھی۔ لیکن تو نے بہت حشر اٹھا رکھا تھا پاشا۔ ایک ایسا طوفان تھا تو جسے صرف موت ہی سلا سکتی تھی۔" شمسہ ہسٹریائی انداز میں بولے جا رہی تھی۔ "لڑکی تو ہوتی ہی مسئلہ ہے۔ میں بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی جو مسئلہ کے ساتھ ماں کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے میں نے بچپن کیسے گزارا تھا۔ میں نے بچپن سنڈریلا کی طرح گزارا تھا۔ خوابوں اور خیالوں میں رہنے والی اس لڑکی کی طرح جو صبح شام ہری بھری پر پیچ پگڈنڈیوں کی طرف دیکھتی ہے کہ شاید کہیں کوہ قاف کی وادیوں سے اس کا شہزادہ آرہا ہو اور پتہ ہے پاشا میرے اس خواب کی تعبیر کیا نکلی کتنی بھیانک ہولناک۔ مجھے کون سا شہزادہ ملا۔۔۔ تم تو جانتے ہو نا اسے۔۔۔۔ اسی سالہ رعشہ زدہ ضعیف اور لاغر بوڑھا چوہدری مکرم۔۔۔۔ اور یہ تعبیر تم نے مجھے دی ہے۔۔۔۔ وہ آبدیدہ ہو گئی۔

اس نے اپنے خونیں آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن جیسے آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا۔
" مجھے معاف کردو پاشا۔ میں نے تمہارے ساتھ زندگی کے بہت ہی مختصر دن گزارے ہیں۔ لیکن میری دکھوں سے بھری طویل زندگی میں لطیف اور خوبصورت لمحات صرف وہی تھے جو میں نے تمہارے ساتھ گزارے۔" رقت سے شمسہ کی آواز بیٹھ گئی۔ اور وہ خود بھی دھیرے دھیرے نیچے زمین پر پاشا کے پاس بیٹھ گئی غور سے پاشا کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ شاید مر چکا تھا یا شاید پاشا کی زندگی کی آخری سانسیں چل رہی تھیں۔ پاشا کے ہونٹ تھوڑے سے کھل گئے تھے اور آنکھیں پھٹ کر جیسے باہر آگئی تھیں۔ شمسہ بہت آہستگی سے نیچے پاشا کے سر کی طرف جھکی انگلیوں کی ہلکی نرم پوروں سے اس کی آنکھیں بند کیں اس کے بعد وہ ایک لمحہ کو نہیں رکی۔ پستول اس نے واپس پرس میں ڈالا اپارٹمنٹ سے باہر نکلی اور تیز تیز ڈگ بھرتی لفٹ کے پاس گئی بٹن دبا اور لفٹ میں غائب ہوگئی۔

○

اور پھر اس دن بختو کیلئے سچ مچ قیامت کا دن آگیا۔ جیسے سورج سوا نیزے پر آگیا ہو۔
بختو اور شیرو میں پنچایت کے بعد صلح ہوگئی تھی۔ دونوں کے تعلقات نارمل ہوگئے تھے لیکن بختو کے اطوار بدلے نہیں تھے بلکہ اس سارے جھگڑے کا فائدہ بختو کو ہی ہوا تھا۔ اب وہ شیرے پر شیر ہوگئی تھی۔ شیرو ذرا ہیکڑی دکھاتا تو چھوڑ کر چلے جانے کی دھمکی دیتی۔ اور پھر اسے چوہدری کی بھی حوصلہ افزائی تھی اور باڑے بھی اس کی ملاقاتوں میں اضافہ ہوگیا تھا جس کا علم شیرے کو رہتا تھا لیکن اب وہ بختو کے آگے بہت دب کے رہنے لگا کیونکہ اب اسے بختو کے تیور اچھے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے بختو فرار کی دہلیز پر کھڑی ہے اور شیرو سے جان چھڑانے کا اسے محض بہانہ چاہئے اور شیرو اب بختو کو کھونے کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔
روشو کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے وہ تھک گیا تھا اس نے شہر کی ایک ایک کار میں سر ڈال کے دیکھا تھا۔ ہر بیگم کے ساتھ جانے والے بچے کا جائزہ لیا تھا سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے خاندانوں کے بچوں کو دیکھتا تھا۔ پارکوں میں جاتا تھا اور پھر کھیل کے میدانوں کے کھلنے والے بچوں کو ایک ایک کر کے دیکھتا تھا کہ شاید ان میں سے کوئی روشو نکل آئے۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ روشو کھیل تماشا دیکھنے اور خود کھلنے کا بھی بہت شوقین تھا لیکن اسے پھر کہیں روشو دکھائی نہیں دیا۔ کبھی کبھی وہ کسی بچے کو دور سے دیکھ کر ایک دم سے دھوکا کھا جاتا۔ اسے روشو کا پرتو سا دکھائی دیتا وہ دوڑتا بھاگتا قریب آتا اور مایوس ہو کے لوٹ جاتا اور اب تو ہو بالکل ہی مایوس ہوگیا تھا۔ اسے روشو

کے ملنے کی ذرہ برابر بھی آس نہیں رہی تھی اور یہ اس کا بہت بڑا نقصان تھا جیسے کسی کی چلتی ہوئی مل بند ہو گئی ہو۔ کارخانہ تباہ ہو گیا ہو۔ فصل ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اجڑ گئی ہو۔

روشو اس کی آمدنی کا اچھا ذریعہ تھا جو ختم ہو گیا۔ اب بختو بھی کل پرزے نکال رہی تھی اور اسے اندیشہ تھا کہ کل کہیں خیرو بھی بڑا ہو کر اپنے باپ دادے کے ورثے کے خلاف نہ ہو جائے۔ اس لئے وہ بہت زیادہ برداشت کرنے لگا تھا اور ایک دن جب شیرو اور بختو میں پھر کسی بات پر تکرار ہو گئی اور بختو نے دوبارہ چوہدری کے پاس چلے جانے کی دھمکی دی تو چڑ کر بولا۔

"تجھے پتہ ہے نا وہ تیری سیڈ لے گا اس لئے دھمکی دیتی ہے"۔

"ہاں انصاف کرے گا تو میری سیڈ ضرور لے گا ـــــــ" بختو نے جواب دیا۔

"انصاف کا مطلب یہ تو نہیں، عورت ہی کی سیڈ لی جائے" شیرو بولا اور پھر قدرے توقف سے ایک رقیبانہ جذبے کے ساتھ کہنے لگا۔ "فقیروں نے اسے بڑا تو بنا دیا ہے پر یہ بد بخت جھگڑے فساد میں سیڈ ہمیشہ عورت کی لیتا ہے۔"

"ہر مرد عورت کی سیڈ لیتا ہے شیرو ـــــــ سوائے تیرے ـــــــ" وہ منہ بنا کر بولی۔

"اری جا جا ـــــــ کیوں جھوٹ بولتی ہے۔ کیا میں تیری سیڈ نہیں لیتا ہوں۔" وہ قدرے التفات سے بولا۔

"تو ظالم اور جابر ہے"۔ وہ متنفر ہو کر بولی۔

قرب قیامت ہے ـــــــ" شیرو نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا آثار تجھے نظر آ گئے قیامت کے ـــــــ" بختو طنزیہ بولی۔

"ارے جب بے زبان مخلوق اتنی منہ زور ہو جائے تو قیامت نہیں آئے گی تو اور کیا ہو گا۔ عورت کبھی بے زبان مخلوق ہوتی تھی۔ آج جس کو دیکھو اس کے منہ میں گز بھر کی زبان ہے"۔ وہ فلسفہ بگھارتے ہوئے بولا۔

"ارے گائے بھینس پر ظلم کرو گے تو وہ بھی داد فریاد کرے گی شیرو ـــــــ عورت کو تو اللہ نے زبان دے رکھی ہے وہ کیوں نہ بولے کیوں نے کھولے زبان ـــــــ یہ دیکھ یہ ـــــــ یہ کیا حشر کیا ہے تو نے میرا"۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جس پر شیرو نے اس روز ڈنڈا مارا تھا جس سے اس کی ہڈی اندر سے چٹخ گئی تھی اور اب اس کا بازو مخصوص زاویہ اوپر نہیں اٹھتا تھا۔

"یہ یہاں سے اوپر نہیں جاتا ہے"۔ بختو نے ہاتھ کو اٹھایا اور درد محسوس کرتے ہوئے

کہا۔ "اب ایک ہی ہاتھ پھیلائے رکھتی ہوں۔ تھک جاتا ہے ایک ہاتھ تو دوسرا ہاتھ مدد بھی نہیں کر سکتا"۔ وہ مایوسی سے بولی۔

"تچ تچ تچ۔۔۔" اس نے بختو کے ہاتھ کو پیار سے تھاما۔

"ہٹ پرے دفع ہو۔" اس نے شیرو کو جھٹک دیا۔ "تیرے چونچلے مجھے اچھے نہیں لگتے ہیں"۔

لیکن باؤ کے چونچلے بختو کو بہت اچھے لگتے تھے۔ شیرو کی مار سے لگنے والے زخموں اور نیل کے نشانات دیکھ کر باؤ نے بہت دکھ اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اسے چپکے سے ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور درد کیلئے گولیاں خرید کر دی تھیں جو بختو چبا کر کھا جاتی تھی۔ پھر باؤ نے ڈاکٹر سے پرچی لے کر بختو کے بازو کے ایکسرے بھی نکلوائے تھے جسے دیکھ کر ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ بہت ہی باریک اور نامعلوم سا فریکچر ہے جس پر پلاسٹر کی ضرورت نہیں بلکہ ڈاکٹر نے کریب بینڈیج لگا دیا تھا اور بتایا تھا کہ چند روز میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

"آدمی اور آدمی میں میں کتنا فرق ہے۔۔۔۔" بختو سوچنے لگی تھی۔ شیرو بھی ایک آدمی ہے جو جانور کی طرح عورت کو پیٹتا ہے اور پھر اس کی ہڈی توڑ دیتا ہے۔۔۔ اور باؤ بھی آدمی ہے جو اسی ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑوانے کیلئے ایکسرے نکلواتا ہے پٹیاں بند ھواتا ہے، دوائیں دیتا ہے اور جتنی کوشش اس کے بس میں ہے کرتا ہے جتنا پیسہ خرچ ہوتا کرتا ہے۔" اور وہ سوچتی تھی کہ کہ کتنی عزت دیتا ہے باؤ عورت کو جبکہ شیرو اس کے مقابلے میں بالکل ایک جانور یا بیل ہے جو عورت کو گائے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن پھر وہ خود ہی اپنے خیالات کی نفی کرتے ہوئے سوچنے لگی تھی کہ شاید یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ شیرو کی بیوی ہے جب کہ باؤ کی بیوی نہیں ہے اور اس کے تجربے میں یہی بات آئی تھی کہ یہ مرد لوگ جو عورتوں کو پیٹتے ہیں تو زیادہ تر اپنی بیویوں کو ہی پیٹتے ہیں دوسری عورتوں کے ساتھ چاہے ان کے بیویوں جیسے ہی تعلقات قائم ہو جائیں، انہیں مارتے پیٹتے نہیں بلکہ بڑی سے بڑی غلطی پر بھی پیار ہی کرتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شیرو اور شاداں کے تعلقات کیسے ہیں لیکن شاداں کو کبھی شیرو نے چپت بھی نہیں لگائی جبکہ بختو کی وہ پچاسوں دفعہ پٹائی کر چکا تھا اور وہ سوچتی تھی کہ باؤ بھی اگر اس کا خاوند ہوتا تو شاید وہ بھی پیار کے ساتھ ساتھ اس کی پٹائی بھی کرتا رہتا لیکن ایسا وہ کم ہی سوچتی تھی اور اس کی تسلی کیلئے یہ بات کافی تھی کہ باؤ کی شکل میں دنیا میں ایک آدمی ایسا بھی ہے جو فقیر نہیں، فقیروں میں سے نہیں لیکن اس کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے اسے چاہتا ہے، پیار کرتا ہے اور اسی باؤ نے چپکے چپکے خیرو کا بھی علاج کرایا تھا اسے جلدی امراض کے ماہر ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا جس نے خیرو کو کھانے کیلئے جراثیم کش

شربت اور جلد پر لگانے کیلئے مرہم دیا تھا۔ جو صبح شام وہ اس کی متاثرہ جلد پر لگا دیتی اور باؤ کی ہدایت پر اس نے شربت کی بوتل جیب میں ہی رکھ لی تھی کہ بھیک مانگتے ہوئے جب بھی اور جہاں بھی دوا کا وقت ہوتا وہ اسے بوتل کا ڈھکن بھر کے پلا دیتی جس سے خیرو کی بگڑتی جلد میں افاقہ ہوا تھا۔ کھرنڈ سوکھ کر آہستہ آہستہ اتر رہے تھے اور نیچے سے نئی جلد برآمد ہو رہی تھی۔ شیرو کو پتہ تھا کہ وہ باؤ سے مل کر خیرو کا علاج کروا رہی ہے لیکن اس نے اس طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں وہ جانتا تھا کہ اگر کسی دن بختو خیرو کو لے کر فرار ہو گئی تو پھر اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا۔ رہے نام مولا کا، اسے ویسے ہی لوگ کہتے رہتے ہیں کہ ہٹے کٹے ہو کر کیوں مانگتے ہو۔ بختو اور خیرو اگر نہ رہے تو پھر وہ بالکل ہی کنگال ہو جائے گا اور ویسے بھی اسے ایک نئی آس لگی تھی ایک نئی امید پیدا ہو گئی تھی کہ بختو نے اسے ایک نئی خیرو برکت لانے کا مژدہ سنا دیا تھا ایک نو وارد کی امید لیکن یہ مژدہ اس نے شیرو سے پہلے باؤ کو سنا دیا تھا اور باؤ خوشی سے پھولا نہیں سمایا تھا جیسے باؤ کے اپنے آنگن میں بہار آنے والی ہو۔

"پتہ ہے باؤ میرا اب کیا جی چاہتا ہے -----!" اس نے بہت آس بھرے لہجے میں باؤ سے کہا تھا۔

"ہونہہ-----" وہ سراپا گوش ہو کر سننے لگا۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ اب جو میرا بچہ پیدا ہو نا وہ فقیروں میں نہ پیدا ہو۔" اس نے اپنی آرزو کا اظہار اس طرح کیا جیسے کوئی چاند پر جانا چاہتا ہو لیکن نہ جا سکتا ہو۔ "میرا مطلب ہے اس کی پیدائش کہیں اور ہو"۔

"کیوں------؟" باؤ نے پوچھا

"جو بچہ فقیروں میں پیدا ہوتا ہے وہ سدا فقیر ہی رہتا ہے----" وہ آس اور یاس کے ملے جلے جذبے میں بولی۔ "تم لوگ کتنے اچھے ہو جو فقیر نہیں ہو جو اپنی روٹی کھاتے ہو۔ سچی روٹی۔" پھر اس نے توقف کیا اور دکھ اور سکھ کی ملی جلی سانس لے کر بولی۔ "میں بہت خوش ہوں کہ روشو بھاگ گیا ہے۔ جہاں بھی ہے جس حال میں بھی ہے فقیر تو نہیں ہے نا۔ مانگ کے تو نہیں کھاتا"۔

"تم چھوڑ دو مانگنا بختو---- میں سچ کہتا ہوں میں تمہارا سب خرچہ برداشت کروں گا۔" وہ کھلے دل سے بولا۔

"نہیں بابو۔ یہ بات نہیں ہے"۔ بختو بے نیازی سے بولی۔ "مجھے اپنی پروا نہیں، بس اب میں اور فقیر نہیں جننا چاہتی--"

"تو پھر تمہارا نام ہسپتال میں لکھوادوں----" باڈ نے پوچھا۔

"ہاں لکھوادو----چاہے شیرو مار ہی دے مجھے پروا نہیں"۔وہ سنجیدگی سے بولی۔" میں بچہ اسپتال میں پیدا کروں گی"۔

"تو پھر جو اسپتال میں پیدا ہوگا۔وہ فقیر نہیں ہوگا کیا"۔باڈ نے استفسار کیا۔

" نہیں وہ پاکستانی ہوگا۔" بختو نہایت سنجیدگی سے بولی۔

" بھئی خوب-----" باڈ نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔"یہ کیا بات ہوئی؟"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے-----" بختو نے حیرت سے پوچھا۔

" پتہ ہے ----بہت سے لوگ بچوں کی پیدائش کیلئے پاکستان سے امریکا بیویوں کو لے جاتے ہیں"۔باڈ نے کہا

" وہ کیوں----" بختو نے ازارہ معلومات پوچھا۔

" وہ یوں کہ جن بچوں کی پیدائش امریکہ میں ہوتی ہے ،انہیں امریکہ کی قومیت مل جاتی ہے امریکی کارڈ مل جاتا ہے ۔وہ امریکی بن جاتے ہیں۔جیسے تم کہتی ہو کہ فقیروں سے باہر بچے کو جنم دے کر پاکستانی بچہ پیدا کروگی"۔وہ ازراہ مذاق زور سے ہنسا۔

" یہ مذق کی بات نہیں ہے میں بچے کو پاکستانی بنانا چاہتی ہوں فقیر نہیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"آج تمہیں کیا ہوگیا ہے ایسی سنجیدہ تو تم کبھی بھی نہ تھیں۔" باڈ بھی سنجیدہ ہوگیا۔"اگر واقعی یہ بات ہے تو میں تمہارا نام اسپتال میں لکھواؤں گا اور تمہارا بچہ پاکستانی ہوگا۔" باڈ مصمم عہد کرتے ہوئے بولا۔لیکن باڈ باوجود مخلص ہونے کے اپنا وعدہ پورا نہ کرسکا اس نے بختو کا نام اسپتال میں لکھوا تو دیا لیکن وہ اسپتال پہنچ نہ سکی اور وہ رات بختو پر قیامت کی رات تھی جب اس کے یہاں نئی ولادت ہورہی تھی۔اس نے پہلے بھی بچے پیدا کئے تھے لیکن کبھی ایسا درد نہیں اٹھا تھا اور فقیرنیاں تو بلیوں کی طرح بچے جن دیتی ہیں نہ کوئی ڈاکٹر ہوتا ہے نہ نرس،نہ دائی۔بس ذرا درد اٹھا نائیں نائیں رونے کی آواز آئی اور فقیرنی بچہ گود میں لئے بیٹھی ہوئی ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو لیکن اس مرتبہ کوئی انہونی ہی بات ہوگئی تھی اچانک رات بختو پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی اسے وہ درد اٹھے کہ حشر بپا ہوگیا۔فقیروں کی ماہر دائی ماسی جمالو جس نے اپنی ماہرانہ صلاحیت سے فقیروں کے لشکر پیدا کردیئے تھے آج بھی ایک اور فقیر پیدا کرنے کیلئے اپنی بھرپور صلاحیت کا مظاہرہ کرنے میں مصروف تھی۔جمالو کو جتنی دوائیں معلوم تھیں اس نے سب بختو کو کھلادیں لیکن بے سود مرض

بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ وہ کراہ رہی تھی اور بڑبڑا رہی تھی۔
"مجھے پاکستان لے چلو۔۔۔۔۔۔ مجھے پاکستان لے چلو"۔
"یہ کیا کہہ رہی ہے"۔ شیرو نے نہایت پریشانی کے عالم میں جمالو سے پوچھا۔
"اسے بخار ہے بخار میں ہذیان بک رہی ہے"۔ جمالو نے کہا
"شیرو خدا کیلئے مجھے اسپتال لے چلو۔۔۔۔۔ مجھے پاکستان۔۔۔۔۔"اسے ایک ٹیس اٹھی اور اس ٹیس کے ساتھ ہی ٹائیں ٹائیں کرتا، ایک نیا فقیر، فقیروں کی دنیا میں آگیا بختو زیر لب جیسے پاکستان پاکستان کا ورد کر رہی تھی۔

بچے کے رونے کی آواز سنتے ہی شیرو دوڑتا ہوا پاس آیا اور بچے کی تصدیق کر کے خوشی سے اچھل پڑا "او ہو مرد فقیر"۔ پھر شیرو نے بختو کی طرف مڑ کر دیکھا تو دہل سا گیا۔
"بختو۔۔۔۔۔"شیرو نے زور سے پکارا بختو کچھ نہ بولی۔
"بختو۔۔۔۔۔"اس نے پھر آہستہ سے پکارا لیکن بختو خاموش تھی مکمل خاموش۔ اس کی آخری خواہش پوری نہ ہوسکی تھی کہ اس کا بچہ پاکستان میں پیدا ہو وہ فقیروں میں ہی پیدا ہوا تھا فقیروں کی بستی میں ایک نیا فقیر آیا تھا اور اس کی آمد کے ساتھ ہی ایک فقیرنی چلی گئی تھی۔ شیرو کو بختو کی موت کا بہت صدمہ ہوا لیکن اس میں قوت برداشت بھی بہت تھی وہ تیسرے دن نومولود کو کندھے سے لگائے اور خیرو کو دوسرے کندھے سے لگائے ننھے ننھے ہاتھوں کو آگے بڑھا کر گڑ گڑا تا جا رہا تھا۔

"اللہ کے نام پر سخی بابا۔۔۔۔۔ معذور ہوں۔۔۔۔۔ بن ماں کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ۔۔۔۔"وہ مانگتے مانگتے رو رہا تھا۔

"بن ماں کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"اس نے تکرار شروع کر دی اور ساتھ ہی چھم چھم آنسو برس رہے تھے۔ شاید زندگی میں وہ پہلی مرتبہ سچے آنسوؤں کے ساتھ رو رہا تھا۔

○

"اصلاح گھر" میں لڑکوں کے مختلف گروپ بن گئے تھے۔ اور جیل کی انتظامیہ نے لڑکوں کی عمر قد و قامت اور رجحان کے مطابق مختلف کاموں پر لگا رکھا تھا۔ جیل کے احاطے ہی میں جہاں ایک طرف کچھ لڑکے دیواروں اور پھولوں کے گملوں پر سفیدی کر رہے تھے۔ وہاں دوسری طرف کچھ لڑکوں کو پودوں کی گوڈی پر لگایا گیا تھا اس کے علاوہ ایک نیا کام یہ ہوا تھا کہ جیل کے احاطے میں

ایک جانب آٹو موبائیل ورکشاپ کھول دی گئی تھی۔ جہاں بڑی جیل سے ایک قیدی مستری آکر لڑکوں کو روزانہ کار مرمت کا کام سکھاتا تھا۔ روشوا نہی لڑکوں میں تھا جو آٹو ورکشاپ میں تھے۔ روشو اس ورکشاپ میں بالکل نیا آیا تھا لیکن بالا مستری روشو سے بہت مطمئن تھا۔ ابتدا میں تو یہاں صرف ڈمی کاریں آتی تھیں جن پر لڑکوں کو کام سکھایا گیا۔ پھر جب عملے کے لوگوں نے دیکھا کہ کام سکھانے والا مستری ٹھیک ٹھاک کاریگر آدمی ہے تو انہوں نے اپنی کاریں بھی مفت میں بنوانے کا تجربہ کیا اور جب یہ تجربہ بھی کامیاب ثابت ہوا تو پھر باہر سے پرائیویٹ کاریں بننے کیلئے آنے لگی تھیں کچھ جیل کے پرانے لڑکے تھے جنہوں نے کافی حد تک کام سیکھ لیا تھا اور جو اگر جیل سے باہر ہوتے تو کسی بھی گیراج پر کام کی روٹی کما کھا سکتے تھے۔ روشو کا رجحان کار مرمت کی جانب تو نہیں تھا اس لئے کہ وہ اپنے اندر ایک مقصد رکھتا تھا۔ وہ ایک لائحہ عمل بنانا چاہتا تھا جس پر چل کر وہ ایک بڑا آدمی بنے اور قوم کی خدمت کر سکے۔ اور یہ بات اس کی سمجھ سے بالا تر تھی کہ کوئی کار میکینک بڑا آدمی بن سکتا ہے۔ تاہم یہ بات بھی اس کے مزاج کے خلاف تھی کہ وہ کوئی ہنر سیکھے کوئی کام کرے اور اس میں اپنا دل نہ لگائے۔ وہ ساجدہ بیگم کے گھر کے اندر جب صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتا تھا تو اس میں بھی ایسا دل لگا لیتا تھا کہ گھر "لش لش" کرنے لگتا اور ایک تنکا کسی کو ادھر ادھر بکھرا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب جیل میں اسے کار مرمت پر لگایا گیا تو اس میں بھی اس نے پورا دل لگایا اس نے ہر اوزار اور اس کے استعمال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ دو دو گھنٹے کار کے نیچے لیٹا ان کے نٹ بولٹ کھولتا اور کستا رہتا۔ ہرچند کے اسے انجن کے کسی کل پرزے کے استعمال اور فنکشن کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا لیکن وہ استاد بالے سے تمام پرزوں کے نام پوچھتا اور ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے کئی بار غلطیاں بھی کیں اور ہر غلطی پر اس نے استاد سے جھڑکیاں یا گالیاں کھائیں بعض اوقات استاد اسے ہاتھ جڑ دیتا۔ بغیر قصور کے بھی چانٹا رسید کر دیتا لیکن وہ استاد کی ہر بات خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا۔ اس نے یہ سن رکھا تھا اور اس کا اس بات پر یقین ہو گیا تھا کہ استاد کی مار اور جھڑکیاں کھائے بغیر کوئی شاگرد کام نہیں سیکھ سکتا۔

روڈا تقریباً ایک مہینے سے غائب تھا اور روشو کو بھی کام سیکھے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا جیل کے تمام لڑکے جب دن بھر کام کاج کر کے رات کو سونے جاتے تو انہیں روڈا بہت یاد آتا اور وہ اکثر روڈے کو یاد کرتے یہاں تک کہ سکھڑا جو روڈے کا بد ترین دشمن تھا۔ وہ بھی روڈے کی کمی شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ حالانکہ روڈے کے جانے کے بعد اب جیل کے لڑکوں پر سکھڑے کا اچھا خاصا کنٹرول تھا اور ایک طرح سے اب اس کی جیل کے اندر حکومت سی تھی لیکن وہ

محسوس کرتا تھا کہ اس کی حکومت بہت ہی کمزور ہے کیونکہ روڈے کی موجودگی میں وہ روڈے سے کتنا ہی لڑتا تھا اور اس کی حاکمیت کو نہیں مانتا تھا لیکن پھر بھی ایک طرح کا تحفظ محسوس کرتا تھا اور روڈے کے جانے کے بعد کم و بیش تمام لڑکوں کے اندر ایک طرح کا عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو گیا تھا جیسے وہ یتیم ہو گئے ہوں انہیں روڈے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا بس وہ اتنا جانتے تھے کہ روڈے کو جیل ہی کے اندر ایک الگ بیرک میں اور پر قید تنہائی میں رکھا گیا ہے کیونکہ سورما کا بازو اور کندھا توڑنے کے بعد اس نے پھر کسی بد عنوان افسر کی ٹانگ توڑ کر اسے اپاہج بنا دیا تھا اور اب اس کی شکایت جیل سے باہر اعلیٰ حکام تک گئی تھی۔ جن کی ہدایت کے مطابق اسے دوسرے تمام لڑکوں سے الگ کر دیا گیا تھا۔

پھر اس دن اچانک کھلبلی مچ گئی۔ صبح صبح کا وقت تھا۔ لڑکے اپنے اپنے میدان کے اندر کام کاج میں مصروف تھے کہ اچانک سرگوشیاں شروع ہو گئیں کہ روڈا آ گیا ہے۔ پھر لڑکوں نے دیکھا کہ روڈے کو پولیس کے جلو میں جیل سے باہر لے جایا جا رہا ہے۔

"کہاں جا رہا ہے یہ۔" سکھڑا جو جیل کے باہر کیاریوں سے پتھر اٹھانے کے کام پر مامور تھا ایک سپاہی سے پوچھنے لگا۔

"تو اپنا کام کر۔۔۔۔۔" سپاہی نے تڑی دی۔ "تجھے کیا؟"

"میں کہہ رہا ہوں کہاں لے جا رہے ہو اسے۔۔۔۔۔؟" سکھڑے نے اس طرح ایک پتھر پر ہاتھ ڈالا کہ جیسے اگر سپاہی نے صحیح نہیں بتایا تو پتھر اٹھا کے سپاہی کے سر پر دے مارے گا۔

"اسے بڑوں کی جیل میں بھیج رہے ہیں۔۔۔۔" سپاہی نے مصلحت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں۔۔۔۔" سکھڑے نے پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ بڑا ہو گیا ہے۔" سپاہی نے کہا۔ "اس کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ ہو گئی ہے"۔

"تو یہ ان کو اچانک پتہ چلا۔" سکھڑا نے ازراہ طنز پوچھا

"مجھے کیا کہتے ہو۔ وہ جو بھیج رہے ہیں ان کو معلوم ہو گا۔ تم کام کرو اپنا۔" اس نے حکم دیا

"ہم کام نہیں کریں گے۔" سکھڑے نے زور کا نعرہ لگایا۔ "نہیں کریں گے۔ نہیں کریں گے۔"

"ہم کام نہیں کریں گے۔"

"ہڑتال۔۔۔۔۔۔۔"

"ہڑتال۔۔۔۔۔۔" زور زور سے نعرے لگنے لگے۔

سب لڑکے کام کاج چھوڑ کر ایک جگہ جمع ہو گئے اور گیٹ کے پاس روڈے اور سپاہیوں کے آگے راستے کی رکاوٹ بن کر نعرے لگانے لگے

"سنو سنو سنو ---- میری بات غور سے سنو" - روڈے نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے لڑکوں کو چپ کرا دیا اور پھر تقریر کرنے کے سے انداز میں مخاطب ہوا۔ "میرے لئے کوئی ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی مرضی سے جا رہا ہوں"۔

"لیکن یہ تمہیں اوورایج کر کے لے جا رہے ہیں----" اب کے ڈوڈا زور سے بولا۔

"نہیں ڈوڈے ---- تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو کہ میں جب اور جس وقت چاہوں ایکسٹنشن لے سکتا ہوں" - پھر وہ قدرے توقف کر کے کہنے لگا۔ "اس میں شک نہیں کہ مجھے اسی بنیاد پر بڑوں کی جیل میں بھیجا جا رہا ہے کہ میں اٹھارہ برس سے اوپر ہو گیا ہوں لیکن اٹھارہ برس سے اوپر ہونا کوئی انوکھی بات نہیں میں پہلے بھی اٹھارہ برس سے اوپر ہوتا رہا ہوں اور بھی لڑکے ہیں جو اٹھارہ سے اوپر ہیں لیکن اسی جیل میں ہیں۔ میں بھی رہ سکتا تھا لیکن کچھ وجوہات پیدا ہو گئی ہیں کہ چند روز کیلئے جانا چاہتا ہوں" - وہ رکا اور پھر ہنس کر کہنے لگا۔ "ذرا بڑوں کی جیل کا نقشہ بھی دیکھوں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اول تو وہ مجھے قبول نہیں کریں گے لیکن اگر ٹک بھی گیا تو جلدی واپس آجاؤں گا۔ میں جب چاہوں پندرہ برس کی عمر کا برتھ سرٹیفکیٹ بنوا سکتا ہوں یہ ہمارا پیارا ملک ہے اس میں کیا نہیں ہو سکتا ہے دوستو---- خدا حافظ"

سب لڑکے چپ چاپ اس کی بے معنی اور بے تکی سی تقریر سنتے رہے کوئی بات ٹھیک سے وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اسے کیوں لے جا رہے ہیں۔ البتہ جاتے جاتے وہ ایک دم رکا اور نہایت سنجیدگی سے روشو کی طرف اور اس کے گریس اور کالک لگے کپڑوں کی جانب دیکھ کر کہنے لگا۔

"اور ہاں روشو---- موقع ملا ہے تو یہ کام سیکھ لو۔ چاہے جیل سے باہر جا کر نہ کرنا لیکن ہنر کوئی بھی جانتا ہو آدمی کام آتا ہے۔ نقصان نہیں پہنچاتا۔ اور پھر یہ بات بھی ذہن نشین کر لو کہ اگر ملک اور قوم کی خدمت ہی کرنا چاہتے ہو تو آدمی صرف ڈاکٹر اور انجینئر بن کر ہی خدمت نہیں کرتا نہ حکمران بن کر خدمت کرتا ہے۔ حکمران دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں ملک کو۔ اور ڈاکٹر اگر اناڑی ہو تو موت کا فرشتہ بن جاتا ہے انجینئر اگر ناکام ہو تو پورا ڈیم تباہ ہو جائے گا اور لاکھوں آدمی مر جائیں گے لہذا خدمت کیلئے کوئی مخصوص شعبہ نہیں۔ درزی، موچی، لوہار، ترکھان، راج، مزدور، اور کسان سب قوم کی خدمت کرتے ہیں اور انہی کی خدمت کی وجہ سے اب بھی ملک میں ہریالی دکھائی دے رہی ہے۔ تم اگر ایک نیک نیت اور ایماندار میکینک بن جاؤ تو یہ بھی قوم کی خدمت ہے"۔

"چل آجا بھئی آجا۔۔۔۔" سپاہیوں نے روڈے کا بازو کھینچا۔۔۔۔۔روڈے نے ہاتھ کا ہلکا سا اشارہ دیا تو تمام لڑکے آگے سے ہٹ گئے اور انہوں نے روڈے کو گیٹ سے باہر جانے کا راستہ دیا۔

"روڈے۔۔۔۔" روشو ایک دم دوڑ کر روڈے کے پاس آیا اور روڈے سے لپٹ گیا۔

"تم لوٹ کر آؤ گے نا۔۔۔۔" روشو نے بڑی حسرت سے کہا۔

"یہ آس نہ رکھو روشو کہ میں لوٹ کر آؤں گا۔ یہ آس رکھو کہ تم یہاں سے باہر جاؤ گے۔ تمہاری جگہ جیل نہیں۔ جیل سے باہر ہے۔ تم نے بہت کچھ کرنا ہے۔ بڑا آدمی بننا ہے"۔ روڈے نے پیار سے روشو کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی سی کی اور "خدا حافظ" کہہ کر پولیس کے جلو میں باہر نکل گیا۔

تمام لڑکے چپ چاپ کھڑے دیکھتے رہے۔ روشو آبدیدہ ہو گیا تھا۔

○

"اللہ کے نام پر۔۔۔۔اے سخی بابا اللہ کے نام پر۔۔۔۔ میرے چھوٹے چھوٹے بن ماں کے بچے ہیں"۔ شیرو نے نوزائیدہ کو کندھے سے لگا رکھا تھا اور خیرو کو زمین پر چھوڑ کے اس کی انگلی پکڑ کر چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کے کھرنڈ سوکھ کر کافی حد تک اتر چکے تھے لیکن چہرہ خاصا مسخ ہو گیا تھا اور لگتا تھا کہ یہ بھدے نشانات عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلے جائیں گے۔ کندھے کے ساتھ لگا ہوا نوزائیدہ بچہ بالکل ننگا تھا۔ چھوٹا سا بلونگڑا۔ دیکھنے ہی سے پتہ چلتا تھا کہ جیسے ابھی ابھی زچہ خانے سے اٹھا کے لایا گیا ہو۔ لوگ ہاتھ بڑھا بڑھا کر شیرو کو پیسے دے رہے تھے اور شیرو نوٹ پکڑتے وقت ایک لمحے کیلئے خیرو کی انگلی چھوڑتا، کھٹ سے نوٹ واسکٹ کے کھیسے میں ڈالتا اور پھر خیرو کی انگلی پکڑ لیتا

"اللہ کے نام پر۔۔۔۔ سخی بابا۔۔۔۔ تمہارے بچے سلامت رہیں۔۔۔۔ بچوں پر ماں باپ کا سایہ رہے بچوں کی ماں سلامت رہے میں معذور ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بن ماں کے بچے۔۔۔۔۔۔" شیرو بولتے بولتے اچانک ایک راہگیر کو دیکھ کر چپ ہو گیا جو بالکل شیرو کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ باؤ تھا۔

"باؤ اب کیا لینا ہے تو نے مجھ سے۔۔۔۔۔۔" شیرو نے اپنے آپ پر جبر اور ضبط کر کے قہر و غضب کے لہجے میں بولا۔

"کچھ نہیں شیرو۔ کچھ نہیں۔" باڈ کی آواز میں رقت تھی۔ "تیرے پاس اب میرے لئے کچھ بھی نہیں رہا۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔"

"لیکن۔۔۔۔ کیا لیکن۔" شیرو نے رونے کے انداز میں غصہ روک کر پوچھا۔

"یہ لو۔۔۔۔۔ یہ رکھ لو شیرو"۔ باڈ نے جیب میں ہاتھ ڈال کے سو روپے کا نوٹ شیرو کو تھماتے ہوئے کہا۔ سو کا نوٹ دیکھ کر شیرو ایک دم چونک سا گیا۔

"اب کیوں۔ اب کیوں دے رہا تو یہ پیسے۔ اب وہ نہیں رہی جس کو تو پیسے دیتا تھا"۔ شیرو رقت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

" پھر کیا ہوا۔" باڈ آبدیدہ ہو کر بولا۔ "وہ بھی تو تجھے ہی دیتی تھی پیسے۔ میں بھی تجھے دے رہا ہوں لے لے"۔ باڈ نے آنسو روک کر قدرے اصرار سے نوٹ شیرو کے ہاتھ میں تھما دیا۔

" مہربانی۔۔۔۔۔"شیرو نوٹ کھیسے میں ڈال کے آہستہ سے بولا۔ کچھ دیر خاموشی سے باڈ کو دیکھا اور پھر خیرو کی انگلی تھام کر قدم آگے بڑھایا۔ "اللہ کے نام پر سخی بابا اللہ۔۔۔۔۔" اس نے آواز لگائی۔

"شیرو۔۔۔۔۔" باڈ نے پھر آہستہ سے پکارا۔ شیرو پھر رک گیا اور کان باڈ کی طرف لگا دیا۔ "یہ تھیلا رکھ لو"۔ باڈ نے ایک شاپنگ بیگ شیرو کی طرف بڑھایا۔

"کیا ہے اس میں۔۔۔۔۔"شیرو نے پوچھا۔

"اس میں خیرو کیلئے بسکٹ وغیرہ ہیں"۔ باڈ نے جواب دیا اور پھر قدرے توقف کے ساتھ اور کچھ جھجھک سے بولا۔ "اور چھوٹے بچے کے لئے دودھ کے ڈبے اور بوتل وغیرہ ہے"۔ شیرو نے ایک جھٹکے سے باڈ کی طرف دیکھا۔ اس وقت شیرو کے چہرے پر غصہ غضب اور استعجاب کے ساتھ استفسار کی کیفیت بھی تھی۔ وہ کچھ پوچھے بغیر سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

"ظاہر ہے بچے کی ماں نہیں ہے۔ اسے دودھ تو پلانا ہوگا نا۔۔۔۔ تمہیں"۔ باڈ نے وضاحت کی۔

" ہوں۔۔۔۔ ہوں۔" شیرو نے کچھ سوچ کر سر ہلایا۔ " میں نے اس کمینی شاداں سے کہا تھا کہ اسے اپنا دودھ پلاؤ پر وہ انکار کر گئی۔"

"کوئی بات نہیں تم یہ تھیلا رکھ لو مہینہ بھر کیلئے اس میں کافی دودھ ہے"۔ باڈ نے تھیلا شیرو کو تھما دیا۔

"مہربانی-----" شیرو نے سر جھکا کر ایک بار پھر باؤ کا شکریہ ادا کیا اور جب جانے لگا تو باؤ نے ایک بار پھر پکارا۔

"شیرو-----"

شیرو کے قدم پھر رکے تو باؤ نے ایک چھوٹا سا کمبل بغل سے نکالا اور شیرو کے کندھے پر لٹکے بچے پر ڈال دیا۔

"اس بچے کو ڈھانپ دو شیرو"۔ باؤ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

"ہٹاؤ یہ کمبل اوپر سے -----" شیرو نے انتہائی برہم لہجے میں جواب دیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ کمبل اٹھا کے باؤ کے منہ پر دے مارا-----

"یہی جھگڑا، میرا روشو سے تھا اور مرنے والی سے بھی میری یہی لڑائی تھی-- میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں لیکن ایسی کوئی چیز برداشت نہیں کر سکتا جس سے میری روزی پر حرف آئے--- --" شیرو چڑ گیا

"یہ بات نہیں ہے شیرو-----" باؤ بہت آہستگی سے نرم رو لہجے میں بولا۔ "میں تیری روزی کے خلاف نہیں۔ اس بچے کو ٹھنڈ لگی ہوئی ہے اور یہ بچہ اگر سردی سے مر گیا تو-----" باؤ کہتے کہتے رکا اور پھر کھٹ سے بولا۔ "یہ اگر مر گیا تو تیرا ایک اور کمانے والا مر جائے گا۔"

شیرو باؤ کی اس بات سے ایک دم کانپ سا گیا جیسے باؤ نے اس کی دکھتی رگ پکڑ لی ہو"۔ تو ٹھیک کہتا ہے باؤ۔ ٹھیک کہتا ہے تو"۔ وہ سر ہلاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"اس پر ڈال دے کمبل-----" شیرو نے بچے کی پیٹھ باؤ کے قریب کی اور باؤ نے آہستگی کے ساتھ بچے کو کمبل اڑھا دیا۔

"اللہ کے نام پر سخی بابا-----اللہ کے نام پر-----میرے چھوٹے چھوٹے بن ماں کے بچے ہیں"۔ شیرو داد فریاد کرتا بھیڑ میں گم ہو گیا۔

O

شمسہ اس روز پاشا کو جب قتل کر کے ہفت منزلہ عمارت کی لفٹ سے باہر آئی تو اس وقت وہ دیوانی سی ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے اپنی کار کی جانب گئی۔ پھرتی سے دروازہ کھولا اور کار اسٹارٹ کر دی----- لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ اس کی کار ابھی کار پارک گیٹ سے بمشکل نکلی ہی تھی

کہ بلڈنگ کی کار پارکنگ کے ستونوں کے عقب سے ایک اور کار حرکت میں آئی اور کار کی پچھلی سیٹ سے ڈرائیور کو حکم ملا۔

"اس کار کا تعاقب کرو۔"

شمسہ پر پاشا کے قتل کا خوف، صدمہ، اور احساس جرم طاری تھا اور وہ ایک بوجھ تلے دبی بڑی تیزی سے کار بھگا رہی تھی۔ اسے راستے میں کسی ایکسیڈنٹ کے ہو جانے کا اندیشہ بھی نہیں تھا اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی کار کا تعاقب ہو رہا ہے۔

۱۴

تعاقب کرنے والی کار چوہدری کی تھی اور وہ شمسہ کے ہاتھوں پاشا کے انجام سے قطعی طور پر بے خبر تھا اور بظاہر آج چوہدری نے ایک بار پھر اپنی آنکھ سے دیکھ لیا تھا کہ شمسہ نے تقریباً پورا دن پاشا کے فلیٹ میں گزارا ہے اور اسے یہ مکمل یقین ہو گیا تھا کہ شمسہ اب اپنی حرکتوں سے باز آنے والی عورت نہیں ہے۔ اس نے کوٹھی کے گیٹ تک شمسہ کا تعاقب کیا اور جب شمسہ کی کار اندر داخل ہوئی تو چوہدری نے اپنی گاڑی موڑلی اور دفتر کا رخ کیا۔ اس دن دفتر بند ہو جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک تنہا دفتر میں بیٹھا اپنے خیالات اور منصوبوں کی کھچڑی پکاتا رہا۔ وہ سخت تذبذب اور کشمکش کے عالم میں تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے ایک یہ کہ وہ شمسہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر آنکھیں بند کر کے حالات سے سمجھوتہ کرلے یا پھر شمسہ کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ وہ بہت دیر تک ان دو راستوں میں سے کسی ایک راہ پر چلنے کے بارے میں سوچتا رہا اسے یہ دونوں راستے کبھی بہت آسان اور کبھی بہت مشکل دکھائی دیتے تھے۔ وہ جوں جوں سوچتا اس کا تذبذب، خلفشار اور ہیجان بڑھتا چلا جاتا۔ آخر کار اس نے ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنے بیڈ روم کا نمبر گھما دیا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شمسہ کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔

"ہیلو......" شمسہ کی دھیمی آواز ریسیور میں آئی۔ "کون"۔

"میں ہوں تمہارا کرمی۔" چوہدری نے بھی اداکاری کرتے ہوئے بہت اپنائیت سے جواب دیا۔

"اوہ کرمی ڈیئر....." وہ بھی چونک گئی۔ "تم کہاں ہو کرمی؟"

"میں آفس میں ہوں...." چوہدری نے جواب دیا۔

"لیکن تم نے تو زمینوں پر جانے کو کہا تھا۔۔۔گئے نہیں کیا؟" شمسہ نے پوچھا۔
"گیا تھا۔۔۔۔جلدی لوٹ آیا۔" چوہدری نارمل طریقے سے بولا۔ "تمہاری یاد کہیں نہیں ٹکنے دیتی۔" چوہدری اسے بیوقوف بنانے کی کوشش میں تھا۔
"دفتر کیوں چلے گئے ہو؟" شمسہ نے تجسس سے پوچھا۔ "سیدھے گھر آتے نا۔"
"بس کچھ کام یاد آگیا تھا۔۔۔۔۔" چوہدری نے کہا اور پھر بغیر توقف کے پوچھا۔ "یہ بتاؤ تمہارا دن کیسے گزرا۔"
"بہت برا۔" وہ مایوسی سے بولی۔
"کیوں۔۔۔۔؟ چوہدری نے استفسار کیا۔
"کچھ پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔لیکن بہت برا دن گزرا" اس نے پھر دہرایا۔
"کیوں کیا بات تھی۔۔۔۔کہاں گئی ہوئی تھیں۔۔۔۔؟ چوہدری بے اختیار پوچھ پڑا۔
"اوہ کرمی۔۔۔۔مجھے کہاں جانا تھا۔ بس کمرے میں بند بور ہوتی رہی۔۔۔۔" وہ تنہائی کی کیفیت ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "پھر تم نے مجھے عادت جو ڈال دی ہے۔"
"کیسی عادت۔۔۔۔۔" چوہدری نے پوچھا۔
"زیادہ وقت میرے پاس رہنے کی۔" وہ جیسے وفور محبت سے بولی۔ "اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"
"مکار عورت۔" چوہدری دل میں بولا اور پھر کہنے لگا۔ "اور آج جب کہ میں تمہارے پاس نہیں تھا تو تم نے۔۔۔۔میری کمی محسوس کی ہوگی۔۔۔ہیں نا۔" چوہدری نے اس طرح کہا جیسے وہ سنجیدہ ہو۔ "یہ سچ ہے کرمی۔ آج میں واقعی تمہاری شدید کمی محسوس کر رہی ہوں۔" وہ اس طرح بولی جیسے سچ بول رہی ہو۔
"تو بس تھوڑا انتظار اور کرو جان من۔۔۔۔ میں آرہا ہوں۔" وہ اپنے غصے، قہر اور غضب کو کنٹرول کرتے ہوئے بظاہر محبت سے بولا اور دھڑ سے رکھنے کی بجائے آہستہ سے ریسیور رکھ دیا اور پھر غصے سے اپنے جبڑے کو دبا کر خود کلامی کرتے ہوئے بولا۔
"اب تو مجھے دھوکا نہیں دے سکتی مکار عورت۔" وہ فوراً دفتر سے باہر نکلا کار میں بیٹھا اور شمسہ کے بارے میں خطرناک منصوبے بناتا ہوا گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

چوہدری جب کوٹھی میں داخل ہوئے تو وہ ایک بوڑھے بپھرے ہوئے لرزہ براندام شیر کی طرح تھے۔ وہ راہداری میں آئے برآمدے میں نکل کر سیدھا اپنے بیڈ روم کی طرف جا رہے تھے کہ ساجدہ بیگم ان کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہوگئی۔

"آج میں آپ سے کھری کھری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔" وہ راستہ روک کر بولی۔

"پہلے مجھے اندر جانے دو۔۔۔۔" چوہدری اضطرابی کیفیت میں تھے۔

"نہیں۔۔۔۔" ساجدہ بیگم نے مدافعت کی۔ "اندر جانے سے پہلے آپ کو میری بات سننا ہوگی۔۔۔۔" وہ انتہائی برہم لہجے میں بولی۔ "آپ کی چہیتی اندر موجود ہے اس وقت وہ کہیں نہیں بھاگے گی۔ تھوڑا سا صبر اور کرلیں۔" اس نے ازراہ طنز کہا۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔۔؟" چوہدری نے انتشار اور خلفشار کی کیفیت میں بیزاری سے پوچھا۔

"میں بیوی ہوں آپ کی۔ اگر آپ تھوڑی دیر کیلئے میرے کمرے آجائیں تو قیامت نہیں آجائے گی۔۔۔۔" ساجدہ بیگم نے جیسے تہیہ کیا ہوا تھا کہ آج وہ اپنے جذبات اور ہیجان کی جنگ کو کشمکش کے عالم سے نکال کر فیصلہ کن مرحلے میں لے آئے گی۔

گھر کے اندر جو ڈرامے ہو رہے تھے وہ ساجدہ بیگم ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھیں اور بے بس تھیں۔ چوہدری شمسہ اور پاشا کی اس گھر کے اندر ایک ایسی تکون بن گئی تھی جس کے زاویے ایک دوسرے سے الگ الگ لیکن ایک دوسرے سے ملحق اور پیوست تھے اور اس سارے کھیل میں ساجدہ بیگم کی حیثیت گھر کے اندر صفر کے برابر ہو کر رہ گئی تھی۔ شمسہ نے بظاہر چوہدری کو یہ تاثر دے رکھا تھا کہ اب اس کا پاشا سے کوئی واسطہ نہیں رہا لیکن آج ہی جب چوہدری زمینوں پر جانے کا جھوٹ موٹ اعلان کر کے گیا تو شمسہ بھی پیچھے پیچھے غائب ہوگئی۔ اس بات سے بے خبر کہ چوہدری اس کی ٹوہ میں ہے بظاہر ساجدہ بیگم کو بھی شمسہ کے کردار پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اب اس کیلئے یہ بات ناقابل برداشت ہوگئی تھی کہ روشو دوسروں کے گناہوں کی سزا بھگتتے ہوئے پوری زندگی جیل میں سڑتے ہوئے گزار دے۔ سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ وہ روشو سے ایک بار بھی ملنے جیل نہیں گئی تھی۔ جب کہ شائستہ روشو سے ملنے کیلئے ہر روز اصرار کرتی تھی لیکن ساجدہ بیگم اس معاملے میں بہت محتاط تھیں اور چوہدری کو کسی قسم کا منفی قدم اٹھانے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتی تھیں کیونکہ روشو اس کے گھر کی چوری کی واردات کے الزام میں گرفتار تھا اور ایسے میں اگر ساجدہ بیگم روشو سے ملنے جاتیں اور شائستہ کو ملاقات کیلئے لے جاتیں تو گھر کے حالات پر بھی اور

مقدمے پر بھی کئی قسم کے منفی اثرات پڑ سکتے تھے اور چوہدری اسی بات کو بہانہ بنا کر ساجدہ بیگم اور شاہینہ کو گھر سے نکال سکتا تھا لیکن اب جب کہ ساری بات کھل گئی تھی پاشا کے کرتوت بھی چوہدری کے سامنے ظاہر ہو گئے تھے اور وہ رنگے ہاتھوں پکڑا بھی گیا تھا اور بقول شمسہ اس نے اعتراف جرم بھی کر لیا تھا اور شمسہ نے بھی روشو کے بے گناہ ہونے کی تائید کر دی تھی تو اب چوہدری کا روشو کی طرف سے آنکھیں بند کر کے رہنا ساجدہ بیگم کیلئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا اور ہر چند کہ اس کے اور شمسہ بیگم کے درمیان سوکنوں والی رقابت کبھی نہیں تھی اور نہ حسد تھا لیکن آج وہ انتقامی کاروائی کے طور پر ایک مکمل سوت بن گئی تھی اور وہ شمسہ کو سخت ذلیل کرنے کے موڈ میں تھی۔

"بولو کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔؟" چوہدری ایک مدت کے بعد ساجدہ بیگم کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اس کے کمرے میں گیا اور انتہائی عجلت میں پوچھا۔

"چوہدری صاحب میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ شمسہ اور پاشا میرا مسئلہ نہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی اور پھر قدرے توقف سے کہنے لگی۔ "آپ اور پاشا بھی میرا مسئلہ نہیں۔"

"تم اپنا مسئلہ بتاؤ۔۔۔" چوہدری نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"میں نے پہلے آپ کو نہیں بتایا تھا لیکن اب آپ کو خود معلوم ہو چکا ہے کہ پاشا اس گھر میں کیا کر رہا ہے۔" وہ پھر بات کو گول مول کر کے اور گھما کے بولیں۔

"تم کہہ چکی ہو کہ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" چوہدری دو ٹوک لہجے میں بولا۔

"لیکن میرا مسئلہ روشو ہے۔۔۔۔۔۔" وہ کھٹ سے بولی۔ "جو ایک ایسے گناہ کی سزا بھگت رہا ہے جو اس نے نہیں کیا ہے اور یہ صرف میرا مسئلہ نہیں۔ یہ حق اور انصاف کا مسئلہ بھی ہے، یہ انسانیت کا مسئلہ بھی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ آج دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔" اس نے ساجدہ بیگم کے کندھے کو چھو کر راستے سے ہٹایا اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا جہاں شمسہ بیگم چوہدری کی منتظر تھی۔

O

چوہدری صاحب جب بیڈ روم میں داخل ہوئے تو شمسہ آرام دہ صوفے سے ٹیک لگائے اور نظریں جھکائے بیٹھی تھی اس کا ہمیشہ سے یہی انداز تھا۔ جب بھی چوہدری کے آنے کا وقت ہوتا یا چوہدری صاحب ٹیلی فون کر دیتے کہ وہ آ رہے ہیں تو شمسہ کبھی استقبال کیلئے دروازے تک نہ جاتی، نہ احتراماً اٹھتی بلکہ وہ بہت آرام سے صوفے پر بیٹھ کے نئی نویلی، شرمائی، لجائی دلہن کی طرح نظریں

جھکا کر اپنی ادائیں دکھانے لگتی اور چوہدری صاحب اس طرح اس کے پاس جاتے کہ فقط دم ہلانے کی کسر رہ جاتی۔ وہ صوفے پر اس کے پاس جاتے جھکتے اپنے نحیف اور متزلزل بازوؤں کے زور سے اسے اوپر اٹھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دھیرے دھیرے لڑھکتے، ہلتے، گرتے ہوئے اسی کے قدموں میں قالین پر بیٹھ جاتے۔

آج بھی وہ صوفے پر اسی طرح بیٹھی تھی لیکن آج چوہدری کے انداز مختلف تھے۔۔ وہ کچھ تو پہلے ہی انتقام کی آگ میں جلا ہوا آیا تھا اور کچھ ساجدہ بیگم نے مزید ہوا دے دی وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ اس نے گاڑی سے اترتے وقت ہی بریف کیس کھول کر پستول نکال کر جیب میں ڈال لیا تھا اور حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شمسہ کو کسی طور بھی معاف نہیں کرے گا۔

"تو تم نے آج کا دن۔۔۔۔۔۔ میرے بغیر بہت بے کیف اور بور گزارا۔۔۔۔۔ ہونہہ۔"

چوہدری اپنے جذبات کو قابو میں کرتے ہوئے اس طرح نارمل انداز میں بولا جیسے اسے کوئی بات معلوم ہی نہ ہو۔ جیسے ہر چیز معمول کے مطابق ہو۔

"بیوی محبت کرنے والی ہو تو ایسی جو مجھ جیسے شوہر کی جدائی کا ایک دن بھی برداشت نہ کر سکے۔ ہونہہ۔" اب کے چوہدری کے لہجے میں تیکھا طنز تھا پھر معاً غصہ اس کے قابو سے اس طرح باہر ہو گیا کہ اس کے جسم پر کپکپاہٹ بڑھنے کی بجائے ختم ہو گئی۔ اس نے نہایت پھرتی سے ہاتھ جیب میں ڈالا اور گولیوں سے بھرا پستول باہر نکال لیا اور شمسہ پر تان کر نہایت برہم اور بے قابو لہجے میں بولا۔

"بند کرو اپنا یہ ڈرامہ مکار عورت۔ تم کتے کی دم ہو جو سو سال بھی دبی رہے تو سیدھی نہیں ہو سکتی۔ مجھے سب معلوم ہے تم نے آج کا دن کہاں گزارا ہے۔ یہ بات اب طے ہو چکی ہے کہ تم اس بدمعاش کے بغیر نہیں رہ سکتی ہو۔ اس کے ساتھ تو میں بعد میں نمٹ لوں گا لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے تمہیں آج زندہ نہیں۔۔۔۔۔۔" اس نے پستول چلانے کی لبلبی سے اچانک انگلی اٹھا دی اور تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی زبان بولتے بولتے جیسے ایک دم بند ہو گئی وہ شمسہ کی کیفیت دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ شمسہ منجمد تھی۔

"شمسہ شمسہ۔۔۔۔۔" اس نے بے اختیار پکارا۔ لیکن شمسہ صوفے میں دھنسی بے حس و حرکت پڑی تھی اور اس کی کنپٹی پر خون کا لوتھڑا جما ہوا تھا اور ہاتھ صوفے کے دونوں بازوؤں سے بے جان انداز میں نیچے لٹک رہے تھے۔

"شمسہ۔۔۔۔۔" چوہدری دھک سے رہ گیا اور شمسہ کے صوفے پر گر جانے کے انداز میں

جھک گیا۔ اس نے ذرا سا اس کی گردن کو چھوا تو گردن دوسری سمت لٹک گئی۔ زمین پر شمسہ کے ہاتھ کے نیچے پستول پڑا تھا۔ پستول دیکھ کر چوہدری سہم گیا۔

"شمسہ، شمسہ، شمسہ۔۔۔۔۔" چوہدری شمسہ کے کندھوں کو جھنجھوڑ کر جنونی کیفیت میں پکارنے لگا۔ پھر چوہدری دیوانہ وار باہر دوڑا ساجدہ بیگم کو مدد کیلئے پکارا۔ ساجدہ بیگم بھاگتی ہوئی آئیں لیکن شمسہ کو دیکھ کر ان کا بھی کلیجہ منہ کو آگیا۔

"اسے دیکھو اسے کیا ہو گیا ہے۔" چوہدری صاحب کپکپاتے لہجے میں ساجدہ سے بولے۔

"یہ مر چکی ہے چوہدری صاحب۔۔۔۔۔" ساجدہ نے شمسہ کو چھو کر کہا۔ "اس کے سر میں گولی لگی ہوئی ہے"

"کب۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔ کس نے کیا ہے یہ۔۔۔۔ میں نے ابھی فون پر بات کی تھی اس سے۔" وہ قدرے مشتبہ لہجے میں بولے۔

"میرا خیال ہے اس نے خودکشی کی ہے"۔ ساجدہ بیگم نے رائے ظاہر کی۔

"اوہ۔۔۔" چوہدری صاحب کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

"آپ یہاں بیٹھ جائیں۔ میں اسے سنبھالتی ہوں۔۔۔" ساجدہ نے چوہدری کو سہارا دے کر پلنگ پر بٹھا دیا اور شمسہ کو درست کرنے کیلئے صوفے کی جانب مڑنے ہی لگی تھی کہ اچانک بستر پر پڑا کھلا ہوا لیٹر ہیڈ دکھائی دیا۔ جس پر شمسہ کے ہاتھ سے لکھا خط تھا۔

"ایک منٹ۔۔۔۔۔" ساجدہ بیگم چونکی اور لیٹر ہیڈ اٹھالیا۔ "یہ خط ہے اس کا۔" ساجدہ پر بھی گھبراہٹ طاری تھی۔

"خط۔۔۔" چوہدری پھر چونکا اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ شمسہ نے خودکشی کی ہوگی۔ "پڑھو اسے۔۔۔" چوہدری نے کہا پھر خود ہی جھپٹ کے چھین لیا۔ "لاؤ مجھے دو۔۔۔۔" اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے خط کو دیکھا۔ چشمہ کے باوجود الفاظ اسے کاغذ پر اس طرح پھیلے ہوئے لگ رہے تھے جیسے بھیگے ہوئے ہوں۔ اس نے خط پڑھنا شروع کیا۔ خط میں لکھا تھا۔

"چوہدری صاحب۔ اس سے پہلے جو کچھ تھا وہ جھوٹ تھا۔ آج سچ ہے موت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور مرتا ہوا آدمی کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ میں آپ سے شدید نفرت کرتی تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے دل میں آپ کیلئے نفرت کم ہوتی گئی آپ اچھے انسان ہیں میں نہیں کہہ سکتی کہ مجھے آپ پر کبھی پیار آیا کہ نہیں لیکن کبھی

کبھی مجھے آپ پر ترس ضرور آتا تھا۔ عجیب بات ہے نا کہ میں آپ پر ترس کھاؤں۔ میں جو سر سے پاؤں تک ایک مسئلہ تھی۔ جس کا نہ تو کوئی ماضی نہ حال اور نہ مستقبل تھا۔ عورت تو ہوتی ہی مسئلہ ہے اور لڑکی ہماری سوسائٹی میں جب پیدا ہوتی ہے تو اپنے ساتھ ہی مسئلے کو جنم دیتی ہے۔ کہیں تو یہ مسئلے سلجھ جاتے ہیں کہیں الجھتے چلے جاتے ہیں۔ میری زندگی کا ہر رخ میری خواہشات کے برعکس تھا۔ میرے خوابوں کے جزیرے میں میرا دولہا شہزادہ گلفام کی طرح تھا جو حقیقی زندگی میں آپ کی صورت میں مجھے ملا۔ میری یہ شادی میری آرزو کے بالکل برعکس تھی دوسری بات یہ کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میں سوت بن کر کسی گھر میں جاؤں گی لیکن مجھے ساجدہ بیگم جیسی اچھی اور عظیم عورت کی سوت بننا پڑا پھر یہ کہ میں جس پاشا کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی میں نے اس کے ساتھ آشنائی کی اور اس کی دوستی کی وجہ سے میری زندگی اس پورے گھر کیلئے عذاب بن گئی۔ پھر یہ بھی کہ روشو ایک معصوم بچہ تھا اسے بھی میرے گناہوں کی سزا بھگتنی پڑی۔ پاشا نے سیف میرے سامنے کھولا اور رقم نکال کے لے گیا اور پولیس میرے سامنے ناکردہ گناہی میں روشو کو گرفتار کر کے لے گئی اور میں خود غرضی سے خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔ لیکن میں نے آج پاشا کا خاتمہ کر دیا ہے اور آپ کو مزید تردد سے بچانے کیلئے اپنا بھی خاتمہ کر رہی ہوں۔ میری موت سے اس گھر کے مسائل تو ختم نہیں ہو جائیں گے لیکن کم ضرور ہوں گے اور مجھے یقین ہے بے گناہ روشو میری اس تحریر کے بعد رہا ہو جائے گا۔ چوہدری صاحب بلکہ کرمی۔ تم اندر سے ایک اچھے انسان ہو۔ سچ کہتی ہوں میں نے تمہیں پسند کرنا شروع کیا تھا۔ "شمسہ"

خط پڑھتے پڑھتے چوہدری صاحب آبدیدہ ہو گئے اور پھٹی پھٹی نظروں سے ساجدہ بیگم کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا لکھا ہے......" ساجدہ بیگم نے پوچھا اور چوہدری نے جواب میں آہستہ سے خط ساجدہ بیگم کے آگے کر دیا۔ ساجدہ نے خط پڑھا اور پھر کسی قسم کے جذبات کا اظہار کئے بغیر چوہدری کے پیچھے گاؤ تکیہ رکھ کے اسے آرام سے لٹا دیا۔ شمسہ کے مردہ جسم کو احترام کے ساتھ ایک نگاہ سے دیکھا اور پھر پولیس کو ٹیلیفون کر دیا۔

○

"چل بھئی روشو...... تجھے صاحب نے بلایا ہے۔" سنتری نے لوہے کا دروازہ کھٹکھٹا کر آواز لگائی۔

"مجھے......" وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"ہاں ہاں۔ تیرے علاوہ بھی کوئی روشو ہے یہاں پر کیا۔۔۔۔آجا۔۔۔۔" سنتری نے دروازہ نیم وا کر کے حکم دیا۔ روشو ہکا بکا رہ گیا اور سہم بھی گیا۔ اس طرح کے بلاوے اس کیلئے کبھی نیک شگون بن کر نہیں آنے تھے اسے جب بھی جیل کے دفتر میں بلایا گیا کوئی نہ کوئی افتاد اس پر نازل ہوگئی عجیب بات ہے کہ وہ کچھ دنوں سے یہاں جیل میں بھی کافی مطمئن تھا کیونکہ وقت کے بیکار جانے اور ضائع ہونے کا احساس اسے کم ہوگیا تھا وہ صبح نو بجے سے ایک بجے تک روزانہ جیل کی آٹو موبائیل ورکشاپ میں کار مرمت کا کام سیکھتا تھا۔ سیکھتا کیا بلکہ اب تین چار مہینوں میں ایک ٹھیک ٹھاک " چھوٹو" قسم کا شاگرد بن گیا تھا اس نے کئی بار گاڑی کے انتہائی نازک ترین پرزوں کو کھول کر دوبارہ جوڑا تھا۔ استاد سے مار کھا کھا کر وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ گاڑی کا چھوٹا موٹا نقص وہ استاد کی مدد کے بغیر بھی سمجھ اور نکال لیتا تھا اس نے روڈے کی یہ بات پلے سے باندھ لی تھی کہ آدمی کوئی بھی ہنر سیکھ لے وہ انسان کی زندگی میں مددگار ثابت ہوتا ہے اور اب یہاں جیل میں رہ کر وہ ڈاکٹر، انجینئر یا پائلٹ تو نہیں بن سکتا تھا لیکن جو کام اس کے بس میں تھا وہ اس نے دل لگا کر سیکھنے کی کوشش کی تھی اور اب جب کہ وہ ایک چھوٹا موٹا مستری بننے کی راہ پر چل پڑا تھا تو دفتر سے صاحب کا بلاوا آگیا اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کس قسم کا بلاوا آیا ہے تاہم اس کا ماتھا ٹھنکا کہ یہ شگون اچھا نہیں ہے۔ اس کیلئے کبھی دفتر سے اچھا بلاوا نہیں آیا۔

" بہت بری خبر ہے چھوکرے۔۔۔۔" جب وہ سنتری کے ہمراہ دفتر میں داخل ہوا تو افسر نے اسے دیکھتے ہی پر رعب انداز میں کہا اور روشو کے پاؤں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی۔

" جیل میں کبھی انسان کو اچھی خبر کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے۔۔۔۔" افسر نے مزید کہا اور پھر ایک بے تکا سا قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔ " یہاں صرف ایک ہی اچھی خبر ملتی ہے آدمی کو۔۔۔۔اور وہ رہائی کی ہے ہاہاہا۔۔۔۔۔" وہ پھر ہنسا اور ایک کاغذ روشو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ " تم رہا ہوگئے ہو چھوکرے۔" افسر نے کھلی سانس لے کر روشو کو مژدہ سنایا۔ " تمہاری رہائی کے احکامات آگئے ہیں۔"

" میں بری ہوگیا ہوں جی۔۔۔۔" روشو نے بے اختیار جھک کر پوچھا۔

" ہاں بری ہوگئے ہو۔۔۔۔افسر نے اس طرح جواب دیا جیسے اسی نے احسان کر کے اسے بری کیا ہو۔

" میرے اوپر جو چوری کا ٹھپہ لگا تھا ناں جی۔۔۔۔وہ اتر گیا ہے ناں۔۔۔۔" روشو نے تصدیق کرنے کیلئے پوچھا۔ " میرا مطلب ہے اب میں مجرم تو نہیں ہوں نا۔۔۔۔ میں دراصل۔۔۔۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن افسر بول پڑا۔

"او دفع ہو جا یہاں سے سسری کا"۔ افسر چڑ گیا۔ "خدا کا شکر کر رہا ہو گیا ہے بری ہو گیا ہے آزاد ہو گیا ہے۔ اب بھاگ جا یہاں سے جرح کرنے لگ گیا پاگل نہیں تو۔۔۔۔" پھر اس نے سنتری کو راہداری دیتے ہوئے کہا۔ "اس کی چیزیں اسے دلا دو اور پھاٹک سے باہر کر دو۔"

"یس سر۔" سنتری نے سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔ "آجا" وہ روشو سے مخاطب ہوا۔

"سر۔۔۔۔" روشو افسر کی طرف مڑا۔ "شکریہ۔" اس نے سیلوٹ کر کے افسر کا شکریہ ادا کیا۔ افسر نے بھی مسکرا کر سر کو ہلا کے جواب دیا۔

"دوبارہ نہیں آنا یہاں۔۔۔۔" افسر نے اس کے جاتے جاتے تلقین کی۔

"نہیں سر۔۔۔۔" روشو بولا۔ "میں پہلے بھی اپنی مرضی سے نہیں آیا تھا۔"

"اور پھر روشو جیل کے چند دنوں کی بے شمار تلخ اور شیریں یادیں بھی ساتھ لے کر جیل کے آہنی پھاٹک سے تن تنہا باہر نکل گیا۔

O

جیل کے پھاٹک سے جب وہ باہر نکلا تو باہر ایک تھوڑی سی لمبی چوڑی اور ویران سڑک تھی جو مین روڈ پر بڑی شاہراہ سے ملتی تھی۔ مین روڈ تک جیل کا بیرونی احاطہ تھا۔ لیکن اس پر اس وقت نہ تو ٹریفک تھی اور نہ انسانوں کی آمد رفت تھی کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے چھاؤں میں کوئی کار کھڑی تھی اور دوسری جانب درخت کی چھاؤں میں حلیہ بگڑا کوئی فقیر تھا جس نے روشو کو دیکھ کر ایک پیشہ وارانہ آواز نکالی۔

"حق ہو۔۔۔۔ اللہ کے نام پر۔" فقیر کی آواز سن کر روشو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے جیسے وہ زمین سے اوپر اٹھ گیا ہو لیکن جیسے فوراً ہی زمین پر آگیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ فقیر اس کا باپ شیرو نہیں تھا اور پریشان بھی ہوا کہ وہ شیرو نہیں تھا خوشی اور غم دونوں کیفیتیں ایک ساتھ ابھریں اسے اپنی زندگی کے اس انداز اور خاکے پر وقتی دکھ ہوا کہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی وہ ماں باپ کی محبت اور شفقت سے محروم ہے۔ شیرو اسے بات بات پر تھپڑ مارتا تھا اور وہ سوچنے لگا کہ کتنے اچھے ہوتے وہ تھپڑ اگر اسے باپ کسی غلط کام کرنے سے روکنے اور ٹوکنے پر لگاتا۔ لیکن وہ تو اسے اس لئے تھپڑ مارتا تھا کہ روشو اچھی باتیں سوچتا ہے اور بھکاری نہیں بننا چاہتا۔ کاش وہ بھی اچھے گھر میں پیدا ہوتا اس کے بھی اچھے اور باعزت ماں باپ ہوتے اور وہ فقیروں کا بیٹا نہ ہوتا تو آج کم از کم جیل میں نہ ہوتا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ جیل کے اندر جو اتنے لڑکے قید کاٹ رہے ہیں ان میں تو

فقیروں کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ لیکن کم از کم اتنا تو تھا کہ جیل کے اندر ان کے ماں باپ بہن بھائی عزیز و اقارب اور یار دوست ملاقات کیلئے آتے تھے اور ان میں سے جب کوئی رہا ہوتا ہے تو رہا ہو کر اپنے گھر تو جاتا ہے وہ کہاں جائے، نہ گھر، نہ ٹھور، نہ ٹھکانہ۔

"کیا فقیروں میں واپس چلا جائے۔" ایک یونہی از تاسا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ "لاحول ولا قوہ......" لیکن فوراً ہی اس نے خود کو ملامت کرتے ہوئے لاحول پڑھی اور اللہ کا نام لے کر وہ مین روڈ کی طرف چل پڑا یہ جانے بغیر کہ اس نے کہاں کہاں جانا ہے لیکن ابھی وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ درخت کے نیچے کھڑی کار حرکت میں آئی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آکر رک گئی۔

"روشو......" کار کے اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"اوہ بیگم جی......" روشو نے مڑ کر دیکھا تو چونک گیا۔ کار میں ساجدہ بیگم اور شاہینہ تھیں

"امی جی کہتے ہوئے منہ دکھتا ہے......" ساجدہ آبدیدہ ہو کر کار سے نیچے اتر آئی اور شکایت کے لہجے میں بولی۔ اور پھر ایک دم اس نے روشو کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"ہیلو روشو......" شاہینہ بھی نیچے اتر آئی تھی اس نے بڑے تپاک سے ہاتھ روشو کی طرف بڑھایا۔

ہیلو......" روشو بھی فوراً کوٹھی کے مکینوں کی طرح پھر ایک مہذب لڑکا بن گیا اور اس نے بھی تپاک سے شاہینہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"بیٹھو گاڑی میں......" ساجدہ بیگم نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور روشو بغیر کسی تامل کے کار میں بیٹھ گیا۔

ساجدہ بیگم کار چلا رہی تھیں شاہینہ آگے فرنٹ سیٹ پر ماں کے برابر میں تھی اور روشو اپنی پوٹلی وغیرہ کے ساتھ عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کار لمبی کھلی سڑک پر فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔۔ شاہینہ مڑ مڑ کے پیچھے روشو کی طرف دیکھ رہی تھی اور خوش ہوتی جا رہی تھی جیسے ہر بار پلٹ کر روشو کو دیکھنے سے اس کا سیر سیر خون بڑھ رہا ہو۔ روشو کے چہرے پر یکے بعد دیگرے مسکراہٹیں بکھر رہی تھیں۔ دونوں معصوم چہروں پر راستے بھر مسکراہٹوں کا تبادلہ اسی طرح ہوتا رہا جیسے غنچے چٹک رہے ہوں کھل رہے ہوں بند ہو رہے ہوں۔ جیسے بہار کی آمد آمد ہو۔

"روشو...... جیل کی باتیں سناؤ روشو۔" شاہینہ نے پیچھے مڑ کر بھرپور نظریں روشو پر گاڑتے ہوئے کہا

"جیل کی باتیں......" روشو قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ "جیل کی کوئی ایک بات ہو تو سناؤں۔۔

۔کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں سنا بھی نہیں سکتا۔" وہ بہت آزردہ ہو کر بولا۔

"شاہینہ-----" ساجدہ بیگم نے قدرے سختی سے مداخلت کی۔ "ابھی تو جیل سے نکلا ہے بے چارہ۔ گھر پہنچ لینے دو رات کو بیٹھیں گے تو بہت ساری باتیں ہم سنائیں گے روشو کو بہت ساری باتیں روشو سے سنیں گے۔ ٹھیک۔" اس نے کار کے شیشے میں روشو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ٹھیک-----" روشو نے سر ہلا دیا۔

"روشو میں آج بہت خوش ہوں روشو بہت خوش۔" شاہینہ پھر پیچھے مڑی اور بڑے تجسس سے بولی۔ "پتہ ہے۔" اس نے مزید کہا۔ "میں نے تمہیں بہت مس کیا۔" شاہینہ ساجدہ بیگم کی موجودگی کا خیال کئے بغیر ایک طفلانہ معصومیت کے ساتھ جذبات سے پر لہجے میں بولی۔

"میں نے بھی تمہیں بہت مس کیا ہے شاہینہ-----" روشو نے بھی بے اختیار سچے جذبے کے ساتھ جواب دیا لیکن چونکہ اس میں شاہینہ کے مقابلے میں زیادہ پختگی آچکی تھی لہذا اس نے فوراً ساجدہ بیگم کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھا کر کہا۔

"تم سب کو مس کیا ہے تمہیں بیگم جی کو میرا مطلب ہے امی جی کو۔" اس نے بات میں توازن قائم کر دیا۔ پھر قدرے توقف سے بولا۔ "تمہیں یقین آگیا ہے نا میں نے چوری نہیں کی تھی۔"

"کس نے کہا تم نے چوری کی تھی-----" شاہینہ جیسے ایک جھٹکے کے ساتھ چونکی۔

"میں چوری کے الزام ہی میں تو پکڑا گیا تھا-----" روشو نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔

"وہ الزام غلط تھا روشو-----" اب کے بیگم ساجدہ نے وضاحت کی۔ "عدالت نے تمہیں بری کر دیا ہے۔"

"شکر ہے خدا کا-----" وہ آہستہ سے بولا۔ "اگر میں بری نہ ہوتا تو پھر میں آپ کو منہ نہیں دکھا سکتا تھا اور نہ ہی میں اچھی زندگی کا خواب کبھی دیکھ سکتا تھا۔" کچھ دیر کار میں خاموشی رہی شاید روشو آنے والی اچھی یا بری زندگی کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک شاہینہ نے سناٹا توڑا۔

"تمہیں پتہ ہے روشو شمسہ امی نے پاشا کو گولی مار دی۔"

"ہیں-----" وہ چونکا۔

"اور شمسہ امی نے خود کو بھی گولی مار لی-----" شاہینہ نے دوسری خبر سنائی۔

"شمسہ امی نے-----خود کو گولی-----" وہ ہڑبڑا گیا۔ "ان تھوڑے سے دنوں میں---

بس بیٹے ان تھوڑے سے دنوں میں بہت کچھ ہو گیا۔" ساجدہ بیگم نے آزردہ ہو کر جواب دیا۔

"جن لوگوں کی وجہ سے تم جیل گئے تھے ناں-----وہ سب-----" شاہینہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"شاہینہ..... پلیز" ساجدہ بیگم نے شاہینہ کو ٹوکا۔

کیا یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے...... " وہ آزردہ ہو کر بولا۔

" نہیں بیٹے تمہاری وجہ سے کچھ نہیں ہوا..... " ساجدہ بیگم نے کہا۔ " سب اپنے اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہے رہے ہیں بس ایک تم ہو جو بے گناہ مارے گئے تھے...... " ساجدہ بیگم نے اسے ڈھارس دی۔ " بہر حال ہم خوش ہیں کہ تم آگئے ہو۔ بھول جاؤ سب کچھ دیکھو موسم کتنا اچھا ہے۔" ساجدہ بیگم نے باہر سڑک کے کنارے جھولتے ہوئے درختوں کی قطار کی طرف دیکھ کر موضوع بدل دیا اور پھر روشو کار کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اسے واقعی باہر کا موسم بہت اچھا لگ رہا تھا۔ درخت، زمین اور آسمان کے ملتے کنارے ہر چیز اس کے دل کو لبھا رہی تھی اور وقفے وقفے سے پلٹ پلٹ کر شاہینہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا اور شاہینہ بھی جواب میں ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بکھیر دیتی۔ جب کار کوٹھی میں پہنچی تو ساجدہ بیگم روشو کو سیدھا کوٹھی میں اندر لے گئیں اور عقب کی جانب والے خالی بیڈ روم میں اس کا سامان رکھوا کر کہنے لگیں۔

"اب تم یہاں کوٹھی میں رہو گے انیکسی میں نہیں۔"

"ہاں روشو اب ہم تمہیں انیکسی میں نہیں رہنے دیں گے"۔ شاہینہ نے تائید کی۔ روشو کچھ نہ بولا اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا جو نہ نفی کی علامت تھا نہ اثبات کی۔

" چوہدری صاحب کی فکر نہ کرنا وہ اب بہت بدل چکے ہیں"۔ ساجدہ بیگم نے کہا اور پھر کہنے لگیں..... "چلو اب جا کے نہا لو اور کپڑے بدل لو...... معلوم ہوتا ہے ابھی تک قید میں ہو"۔

اس پر تینوں ہنسنے لگے اور روشو اپنے قید خانے کے کپڑوں کو دیکھتا ہوا نئے کمرے میں چلا گیا۔

شام کو دونوں ماں بیٹیاں چائے پر اس کا انتظار کر رہی تھیں کیونکہ دوپہر کا کھانا بھی وہ جیل ہی سے کھا کر آیا تھا اور شاہینہ نے چائے پر آج بہت ساری چیزوں کا خود انتظام کیا تھا چائے کے ساتھ بسکٹ، کیک، شامی کباب، چائے اور نہ جانے کیا کچھ تھا ایسے لگتا تھا جیسے کسی بڑی سالگرہ یا دعوت کا اہتمام تھا اور در حقیقت شاہینہ نے ایک طرح سے روشو کی رہائی کا جشن ہی منایا تھا۔

" بائی دی وے...... تمہارا برتھ ڈے کب ہے"۔ جیل سے پہلے ایک دفعہ شاہینہ نے پوچھ لیا تھا۔

" مجھے کیا معلوم....." روشو نے مایوسی سے جواب دیا تھا۔ ویسے میرا بابا کہتا تھا جب میں پیدا ہوا تھا تو سردیوں کے دن تھے اور بڑی سخت بارش ہو رہی تھی"۔ اس پر دونوں ہنسنے لگے تھے۔

"خیر کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔۔۔" شاہینہ نے کہا تھا۔" ہم کسی دن یونہی کسی موقع پر تمہارا برتھ ڈے منالیں گے"۔اور پھر آج اس نے روشو کے برتھ ڈے کا ہی سامان پیدا کر دیا تھا یہاں تک کہ اس کے کیک کاٹنے کیلئے چھری اور موم بتی جلانے کیلئے ماچس بھی میز پر رکھی ہوئی تھی اور یہ سب کچھ شاہینہ نے روشو کیلئے اور ساجدہ بیگم نے یہ سارا اہتمام اپنی بیٹی کی خوشی کیلئے کیا تھا لیکن جب روشو اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ ڈائننگ میں آیا تو دونوں ماں بیٹیاں اسے دیکھ کر دم بخود اور حیران رہ گئیں۔وہ اپنا سامان ساتھ لئے ہوئے تھا جیسے سفر پر جا رہا ہو۔

"اچھا مجھے اجازت دیں"۔روشو نے اپنا تمام سامان ایک تھیلے میں ڈال کے کندھے پر اٹھا رکھا تھا اور بدن پر جیکٹ اور پینٹ پہن لی تھی۔

روشو؟؟؟" دونوں ماں بیٹیاں ایک ساتھ حیرت سے بولیں۔"کیا ہو گیا ہے تمہیں کہاں جاؤ گے؟"

"بس میں جاؤں گا اب۔۔۔۔۔" وہ رقت آمیز لہجے میں بولا لیکن اس نے اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھا تھا شاہینہ جیسے سکتے میں آ گئی اور ساجدہ بیگم کو بھی جیسے ایک دھچکا لگا۔

"لیکن کہاں جاؤ گے۔۔۔۔۔۔۔؟ ساجدہ بیگم نے ازراہ حیرت پوچھا۔

"کہیں بھی جاؤں مجھے جانا ہے"۔وہ مصمم ارادے سے بولا۔

"لیکن کیوں جا رہے ہو۔۔۔۔۔۔ساجدہ بیگم نے پھر اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔

"میں اب یہاں نہیں رہ سکتا بیگم جی"۔اس نے پھر اپنا فیصلہ دہرایا۔

"لیکن کیوں۔۔۔۔۔۔" ساجدہ بیگم زور سے چلائی۔شاہینہ دم بخود تھی۔

"مجھے اس گھر میں بہت پیار ملا ہے بیگم جی میں اس پیار کو کبھی نہیں بھول سکتا"۔روشو جذبات بھرے لہجے میں بولا "لیکن اسی گھر کے اندر میں چور بھی بن گیا ہوں اس گھر سے میں بڑا آدمی بننے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن اس گھر کا راستہ مجھے جیل میں لے گیا"۔

"روشو اس میں میرا یا شاہینہ کا تو قصور نہیں ہے نا۔۔۔۔۔" ساجدہ بیگم لجاجت سے بولی۔

"ہم نے تمہیں چور نہیں سمجھا تھا"۔

"وہ بات ٹھیک ہے لیکن میں چور بن گیا تھا یہاں"۔

"وہ دھبہ تمہارے اوپر سے عدالت نے دھو دیا ہے۔ساجدہ بیگم نے اس کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

"میں وہ دھبہ دوبارہ اپنے اوپر نہیں لگانا چاہتا بیگم جی"۔اس نے اپنا بیگ زمین پر رکھا کھولا اور پھر کپڑوں کو ٹٹول کے واپس بند کر دیا۔شاید وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ بیگ میں اس کے

کپڑوں کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

"خدا حافظ ۔۔۔۔۔۔" اس نے بیگ بند کیا اور کچھ دیر بیگم ساجدہ کی طرف اور پھر ایک نگاہ شاہینہ کی طرف دیکھا اور تیز تیز ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ کھانے کی میز پر تمام سامان دھرا کا دھرا رہ گیا جسے روشو نے چھوا تک نہیں پلٹ کے دیکھا بھی نہیں اور اس وقت ساجدہ بیگم اور شاہینہ نے بھی محسوس کیا کہ روشو نے گھر میں آنے کے بعد پانی کا گلاس تک بھی نہیں پیا ہے۔

"رک جاؤ روشو ۔۔۔۔۔۔" شاہینہ لان میں اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی آئی۔ "مت جاؤ روشو۔" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں شاہینہ مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا ۔۔۔۔" روشو نے بھی التجا کی۔ "میں نے جیل میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ اور آپ لوگ اگر مجھے لینے نہ آتے تو میں شاید سیدھا ہی چلا جاتا"۔

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔" اتنے میں ساجدہ بیگم بھی آ گئی تھیں۔

"جی یہ میرا آخری فیصلہ ہے ۔۔۔۔۔۔" روشو نے حتمی جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جاؤ ۔۔۔۔۔۔ خدا تمہیں خوش رکھے اور اپنے مقصد میں کامیاب بنائے"۔ ساجدہ بیگم نے رقت آمیز لہجے میں دعا دی اور پھر شاہینہ کا بازو تھام لیا۔

"آ جاؤ بیٹے"۔ وہ شاہینہ کو اندر لے جاتے ہوئے بولی۔

"روشو ایک منٹ رک جاؤ میں ابھی واپس آتی ہوں"۔ شاہینہ نے جاتے جاتے کہا۔

"میں گیٹ سے باہر انتظار کروں گا"۔ وہ سر جھکا کے دھیرے دھیرے گیٹ سے باہر چلا گیا۔ خانساماں، مالی، بڈھا چوکیدار سب چپ چاپ گھر سے باہر جاتے روشو کو دیکھتے رہے روشو گیٹ سے باہر نکل کر دیوار کی اوٹ میں چپ چاپ سڑک کے کنارے کھڑا تھا کہ شاہینہ اداس اور نڈھال سی ہو کر آئی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پلاسٹک کا تھیلا تھا۔

"یہ لیتے جاؤ روشو ۔۔۔۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولی۔ "اس میں تمہاری کتابیں ہیں میں نے اس جگہ تک نشان لگا رکھے ہیں جہاں تک تم نے سبق پڑھے تھے آگے کسی سے یا خود اپنی محنت سے پڑھ لینا پڑھنا ضرور ۔۔۔۔۔۔" اس نے تھیلا روشو کے سپرد کر دیا اور باوجود کوشش کے آنسوؤں کے سیلاب کو نہ روک سکی۔

"شاہینہ ۔۔۔۔۔" روشو نے جاتے جاتے پلٹ کر آہستہ سے پکارا۔ پھر اس کی آنسوؤں سے پر آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا"۔

وہ پلٹ کر دھیرے دھیرے سڑک پر چل پڑا اور شاہینہ نم آنکھوں سے اس وقت تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

کوٹھی کے احاطے سے نکل کر جب وہ مصروف چوک میں پہنچا تو اس وقت پہلی بار اس نے پلٹ کر کوٹھی کی طرف جاتے راستے کی جانب دیکھا لیکن راہ بھی اور شاہینہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی کوٹھی کا بھی ایسے ہی ایک دھندلکا سا دکھائی دے رہا تھا اور روشو کی آنکھیں آنسوؤں سے تر بتر تھیں وہ بڑے ظالمانہ طریقے سے ضبط کر کے برداشت کر کے اور پتھر کا بن کے کوٹھی سے نکلا تھا شاہینہ کے آنسو بھی اس کے پاؤں میں بیڑیاں نہ ڈال سکے تھے اور ساجدہ بیگم کی محبت اور ممتا بھی اسے نہ روک سکی تھی لیکن پھر خود ہی اس نے اپنے خیال کی نفی کرتے ہوئے سوچا کہ شاہینہ کے آنسو کتنے ہی معصوم اور سچے سہی لیکن ساجدہ بیگم کی محبت اور ممتا مانگے کی تھی اگر ممتا سچی ہوتی تو اسے کوٹھی سے کبھی نہ نکلنے دیتی۔ اگر ممتا سچی ہوتی تو جس دن وہ چوری کر کے جھوٹے الزام میں پکڑا گیا تھا اسی دن تڑپ کر دہلیز پر جان دے دیتی لیکن روشو کو گرفتار نہ ہونے دیتی لیکن اس خیال پر بھی اس نے فوراً اپنے آپ کو کوسا کہ کچھ بھی سہی جو محبت اس نے اس کوٹھی میں شاہینہ اور ساجدہ بیگم کی صورت میں پائی ہے اس کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور اس کا اعتراف نہ کرنا انتہائی ناشکرا پن ہے تاہم وہ چوک پر گم سم اور ویران کھڑا تھا ایک ایسے کھوئے ہوئے مسافر کی طرح جس کے آگے کوئی راستہ اور کوئی منزل نہیں تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ واپس اسی مقام پر کھڑا ہے جہاں اس روز تھا جب وہ فقیروں کی بستی سے فرار ہوا تھا لیکن اس نے پھر اس خیال کی بھی نفی کر دی۔

"نہیں ایسا نہیں ہے"۔ وہ سوچنے لگا کہ جب فقیروں کی بستی سے فرار ہوا تھا تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، نہ محبت، نہ نفرت، نہ علم، نہ تجربہ، نہ ہنر، نہ دکھ، نہ آرام، نہ غم، نہ خوشی۔ وہ کسی جذبے سے بھی مانوس نہیں تھا بس صرف فقیر تھا جس کا کام مانگنا مانگنا اور مانگنا ہے اس وقت تک مانگنا ہے جب تک دینے والا یا نہ دینے والا اس کو دھتکار نہ دے یا زچ ہو کر اس کے کاسے میں کچھ ڈال نہ دے لیکن اب جب کہ وہ اس چوک میں کسی منزل کا فیصلہ کئے بغیر کھڑا ہے تو اس کے پاس کچھ نہ ہونے کے باوجود اس کی مختصر سی زندگی کا بہت تلخ اور بہت خوشگوار تجربہ ہے۔ بہت اچھے لوگوں اور بہت برے لوگوں سے واسطہ پڑنے کا تجربہ بھی اس کے پاس ہے اسے انسانوں کی کچھ نہ کچھ پہچان ہو گئی ہے وہ کاروں کے اوزاروں کی شناخت کر سکتا ہے زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت کار مرمت کا ہنر اسے آتا ہے اور پھر زندگی کے راستے میں عمل کا بہت بڑا میدان اس کے سامنے ہے

کیمیا گری کے بارے میں کسی نے اسے جیل میں بتایا تھا کہ کتنا مشکل اور پیچیدہ عمل ہے وہ بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ وہ کیمیا گری کے عمل سے گزر رہا ہے اور اسے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

"بابو اللہ کے نام پر ------" اچانک ایک فقیر بچے کا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا جو کم و بیش اسی کی عمر کا تھا اور اس ہاتھ اور آواز نے چوک پہ کھڑے روشو کے خیالات کو منتشر کر دیا وہ چونک گیا۔

"اللہ کے نام پر بابو ----" فقیر بچے نے دو دفعہ پکارا۔ روشو نے اس مانوس آواز کی طرف چونک کر دیکھا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"بھجو ----"

"بھجو فقیروں کی بستی کا ہی ایک لڑکا تھا جو روشو کی جھونپڑی سے دو تین جھونپڑیاں چھوڑ کر رہتا تھا اور شیرو کی طرح بھجو کا باپ بھی بھجو کو مانگنے کیلئے اکثر اپنے ساتھ گھمایا کرتا تھا اور روشو نے بھی بھجو کے ساتھ مل کر کئی دفعہ بھیک مانگی تھی اور دونوں میں ٹھیک ٹھاک دوستی بھی تھی لیکن ہم خیالی نہیں تھی کہ بھجو نے کبھی فقیروں سے یا فقیری سے بیزاری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور اب جب اس نے روشو کے منہ سے اپنا نام سنا تو ایک دم سہم سا گیا اور چونک کر حیرت سے روشو کو دیکھنے لگا پھر دھیرے دھیرے جیسے اس کے ذہن میں بھی روشو کی پھیلی ہوئی تصویر ایک دم نمایاں ہو گئی اور اس نے چونک کر پکارا۔ روشو ----"

وہ روشو کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا اور اسے پہچاننے میں تاخیر اسی لئے ہوئی کہ روشو اس روشو سے بالکل مختلف تھا جو بھجو نے دیکھا تھا اس وقت اس کے بدن پر چیتھڑے تھے لیکن آج روشو چمڑے کی جیکٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھا اور ہاتھ میں اس نے چمڑے کا ایک اچھا بیگ اٹھا رکھا تھا جیسے سیر بین لوگوں کے پاس ہوتا ہے بھجو بھی ایک نظر اسے دیکھ کر سیر و تفریح کرنے والا سیاح ہی سمجھا تھا۔

"روشو تم کہاں ہو ------ تم تو بالکل بابو بن گئے ہو"۔ بھجو نے اس کے سراپے کو دیکھ کر پوچھا۔ "بس میں ادھر ہی ہوں ٹھیک ٹھاک ہوں یہ بتا"۔ روشو نے ادھر ادھر دیکھ کر عجلت میں پوچھا۔ "تو اکیلا ہے یا تیرے ساتھ ہے کوئی ----"

"میں اکیلا ہوں۔ مجھے ماں یہاں چھوڑ کر گئی ہے"۔ بھجو نے جواب دیا اور محو حیرت ہو کر روشو کو دیکھتا رہا اور پھر پوچھنے لگا "روشو یہ بتا کہ تو نے ------"

"ہش ش ش -----

"روشو نے گھبراہٹ اور بے چینی میں مجھو کو روکا اور بولا۔ "میں تجھے بعد میں بتا دوں گا یہ بتا میرے بابا اور اماں کا کیا حال ہے"۔

"تیرا بابا تو ٹھیک ہے۔۔۔۔ مجھو نے کہا۔

"اور اماں۔۔۔۔۔ روشو نے بے چینی سے پوچھا۔

"اماں تیری مر گئی ہے۔۔۔۔۔۔" مجھو نے جواب دیا۔ اور ماں سے محبت اور رغبت نہ ہونے کے باوجود یہ خبر توپ کے گولے کی طرح اسے لگی۔

"اوہ۔۔۔۔۔۔" اس کے قدم ڈگمگانے جیسے اس کا توازن بگڑ گیا ہو۔

"اس نے ایک بچے کو جنا اور مر گئی۔۔۔۔" مجھو نے بتایا۔

"تو بابا کو ایک منگتا اور مل گیا۔۔۔۔" وہ روہانسا ہو کر تلخ لہجے میں بولا اور مجھو سے مزید کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔

"روشو روشو۔۔۔۔۔۔" مجھو اسے پکارتا رہ گیا لیکن وہ پیچھے مڑے بغیر بھیڑ میں غائب ہو گیا اور جب بھیڑ سے نکلا تو سامنے ایک بس کی طرف دوڑا اور بس میں سوار ہونے سے پہلے اس نے ادھر ادھر دیکھ لیا کہ کہیں کوئی فقیر نہ دیکھ رہا ہو اور پھر جست لگا کے بس میں چڑھ گیا۔

"ہاں بھئی، ٹکٹ، ٹکٹ، ٹکٹ۔۔۔۔" کنڈیکٹر ٹکٹ ٹکٹ پکارتا روشو کی طرف بڑھ رہا تھا اور روشو شدید قسم کی کشمکش میں مبتلا تھا کہ اس کی کونسی منزل ہے وہ کہاں کا ٹکٹ خریدے تاہم وہ شہر سے دور نکل جانا چاہتا تھا اتنی دور جہاں کوٹھی کی خوبصورت یادیں اسے واپس نہ کھینچ سکیں اور جہاں فقیروں کی بستی کے ہیبت ناک سائے اسے دکھائی نہ دیں۔

"ہاں بھئی ٹکٹ۔۔۔۔" کنڈیکٹر اس کے سر پر کھڑا تھا۔ روشو نے جیب سے ایک پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور کنڈیکٹر کو تھماتے ہوئے بولا

"آخری اسٹاپ"۔

۱۵

روشو کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ بس کہاں کی ہے۔ کیا منزل ہے بس کی اور کہاں جانا ہے۔ بس وہ تک میں ہی آخری اسٹاپ کا کہہ کر ٹکٹ لے بیٹھا تھا۔ تاہم یہ اس کی مختصر سی زندگی میں بس کے اندر کا طویل ترین سفر تھا۔ بس کے راستے میں بیسیوں اسٹاپ آئے، گزر گئے کتنے لوگ اترے، کتنے نئے سوار ہوئے۔ کئی بار بس تقریباً خالی ہو گئی۔ پھر کھچا کھچ بھر گئی لیکن وہ آخر تک بیٹھا رہا اور آخر کار کوئی گھنٹہ بھر چلنے کے بعد آخری اسٹاپ بھی آ گیا۔

"چلو بھئی آخری اسٹاپ ....." کنڈیکٹر نے آواز لگائی اور بس ایک گول سا چوک کا چکر لگا کے درختوں کے جھنڈ میں اس جگہ آ کر رک گئی جہاں اس کے ساتھ کی مزید بسیں پہلے سے کھڑی تھیں۔ دو چار آدمی ہی بس میں رہ گئے تھے جن کے پیچھے پیچھے اترنے والا اور آخری مسافر روشو تھا۔ روشو نے پائیدان پر کھڑے ہو کر جگہ کا جائزہ لیا۔ یہ شہر کے مقابلے میں مختلف اور غیر آبادسی جگہ تھی۔ جیسے کوئی نیا بازار، نئی بستی، تعمیر شدہ دکانیں کم اور زیر تعمیر زیادہ تھیں جیسے پختہ دکانوں اور مکانوں کا چھوٹا سا گاؤں آباد ہوا ہو وہ یہاں کیوں آیا تھا یہ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

"چلو بابو آجاؤ نیچے ...." کنڈیکٹر نے بس خالی کراتے ہوئے آخری آواز لگائی۔ روشو اپنا بیگ مضبوطی سے تھام کر چلانگ لگانے کے انداز میں جب نیچے اترا تو اچانک ایک فقیر ہاتھ پھیلائے اس کے سامنے آ گیا۔

"اللہ کے نام پر بابو..... غریب مسکین کو کچھ دیتا جا....." روشو دھک سے رہ گیا۔ جیسے فقیر نے اس کا کلیجہ نکال لیا ہو حالانکہ اس کے دہلنے اور سہم جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی وہ اس کا باپ نہیں تھا، نہ اس کی روشو کے باپ سے مشابہت تھی لیکن روشو کی یہ کمزوری سی بن گئی تھی کہ فقیر کو دیکھتے ہی اس کی عجیب کیفیت ہو جاتی۔

"اللہ کے نام پر بابو....." فقیر نے مزید ہاتھ آگے بڑھایا اور دوبارہ ہانک لگائی۔ "تیرے ماں باپ سلامت رہیں۔"

"یا اللہ....." روشو سوچنے لگا۔ "یہ کہاں کا فقیر ہو سکتا ہے۔ اس کی بستی کے فقیروں میں سے تو یہ نہیں ہے۔ تو پھر یہ کس بستی سے آیا ہو گا۔ کتنی بستیاں ہیں اس ملک میں فقیروں کی کہ انسان جس گلی، جس بازار اور شہر کے جس نکڑ پر جائے وہاں کوئی نہ کوئی فقیر کھڑا ہوتا ہے۔" اور پھر اسے اپنے باپ شیرو کی بات یاد آگئی کہ جب فقیروں کی بستی میں اس بات پر تشویش کا اظہار ہو رہا تھا کہ فقیروں کو ملک سے ختم کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں تو روشو کے باپ نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"تم لوگ دیوانے ہو گئے ہو۔ کبھی فقیر بھی ختم ہو سکتے ہیں بھلا۔ ارے یہ تو فصلوں کی طرح ہیں جن کا بیج سارے ملک میں بویا گیا ہے۔ کاٹتے رہو اگتے رہیں گے۔"

اور آج شہر کے اس آخری نکڑ پر فقیر دیکھ کر روشو کو یقین ہو چلا تھا کہ فقیر فصلوں کی طرح بوئے گئے ہیں جو ہر جگہ اگ رہے ہیں۔ تاہم اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا حلیہ کم از کم ایسا ہے کہ وہ فقیر نہیں لگتا اور اس نے سنا تھا کہ ایک پیشے کے لوگ اپنے پیشے کے دوسرے لوگوں کو مشک سے ہی پہچان لیتے ہیں لیکن یہ جان کر اسے بڑی تقویت ہو رہی تھی کہ فقیروں کی نسل سے ہونے کے باوجود اس کے اندر فقیروں کی خوبو نہیں ہے۔ اس نے فقیر کو جھٹکا تو نہیں لیکن اس کا ہاتھ آہستگی کے ساتھ سامنے سے ہٹا کر تیز تیز ڈگ بھرتا سڑک عبور کر کے سامنے چلا گیا۔

لمبی چوڑی سڑک سے ہٹ کر کوئی سو فٹ پیچھے ایک کھلا میدان جس میں ایک ناپختہ سا گیراج کوٹھی کی دیوار کے ساتھ ملحق تھا۔ گیراج کے باہر پانچ چھ نئی پرانی کاریں کھڑی تھیں اور تقریباً نصف درجن کے قریب میکینک لڑکے ان کاروں کی مرمت اور ڈینٹنگ پینٹنگ کی ٹھکا ٹھک میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے قدم بے اختیار کار ورکشاپ کی طرف اٹھ گئے اور دھیرے دھیرے وہ ایک کار کے پاس جا کے رکا۔ اس نے اپنا بیگ زمین پر رکھا اور خود بھی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا اور کاروں کی مرمت ہوتے دیکھنے لگا۔ اس کی عمر کا یا اس سے کچھ بڑا لڑکا ایک گاڑی کے پہیے نکال رہا تھا۔ ایک گاڑی کی ڈینٹنگ ہو رہی تھی۔ ایک گاڑی کو ایک لڑکا سیلف لگا کے اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ "کرر کرر" کی آواز کے ساتھ مسلسل سیلف لگا رہا تھا۔ ایک گاڑی روشو کے بالکل قریب جیک پر اٹھی ہوئی تھی جس کے نیچے ایک میکینک لیٹا تھا جو نہ بوڑھا تھا نہ جوان بس پکی عمر کا تھا۔ اس کا آدھا جسم یعنی چہرے والا حصہ کار کے نیچے تھا اور ٹانگیں کار

سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور کبھی کبھی اس کا چہرہ بھی باہر آجاتا تھا کار کے نیچے وہ بڑے انہماک سے کام کرنے میں مصروف تھا لیکن اس کے دونوں پاؤں جو گاڑی سے باہر تھے ہولے ہولے کہیں دور بجنے والے میوزک پر تھرک رہے تھے۔ دو تین میکینک لڑکے گاڑی کے آس پاس اس طرح چوکس کھڑے تھے جیسے آپریشن کرنے والے ڈاکٹر کے آس پاس جونیئر ڈاکٹر اور نرسیں چوکس ہوتی ہیں کہ نہ معلوم سرجن کس وقت کون سا ہتھیار مانگ بیٹھے۔

"او چھوٹو......" کار کے نیچے سے میکینک کی کڑک دار آواز آئی۔

"جی استاد....." ایک لڑکا بجلی کی سی پھرتی سے جھک گیا۔ اسی وقت روشو کو پتہ چلا کہ یہ کوئی سینئر میکینک یا استاد ہے۔

"پلاس پکڑا......" استاد نے آہستہ سے حکم دیا اور ہاتھ باہر نکال دیا۔ چھوٹو نے ایک سیکنڈ میں اوزار استاد کو تھمایا اور پھر چوکس کھڑا ہو گیا۔ استاد نے بڑے زور سے کلی کی جس کے چھینٹے روشو تک بھی آئے لیکن اس نے کراہیت محسوس نہیں کی وہ جانتا تھا کہ استاد نے پیٹرول منہ سے پھینکا ہے۔ استاد کے پاس کھڑے لڑکوں نے باری باری دزدیدہ سی نگاہوں سے روشو کو دیکھا۔ روشو کی بھی ان سے نظریں ملیں لیکن وہ گاڑی کی طرف دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ بہت دلچسپی سے استاد کو کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ اسے استاد کا یہ انداز بہت اچھا لگ رہا تھا کہ ہاتھ دماغ اور آنکھیں استاد نے کام میں لگا رکھی ہیں لیکن کان موسیقی میں مصروف ہیں جس کے ساتھ وہ اپنے پیروں کو بھی تھرکا کر لطف اندوز ہو رہا تھا

معاً ایک چھوٹی گاڑی دائیں جانب سے آئی اور استاد کی کار کے قریب آکر رک گئی اور کار کا مالک کار سے نیچے اتر آیا۔

"کہو بھئی چھوٹو کیا حال ہے۔" کار کے مالک نے لڑکے سے پوچھا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ گیراج کا مستقل گاہک ہے۔

"ٹھیک ہوں صاحب....." چھوٹو نے جواب دیا اور پھر استاد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"استاد جمیل مصروف ہے آج....." کار کے مالک نے کہا۔

"کام کر رہے ہیں گاڑی پر......." چھوٹو نے جواب دیا لیکن استاد نے کار کے نیچے سے سر باہر نہیں نکالا۔ وہ مصروف رہا۔

"یار گاڑی میری گڑبڑ کر رہی ہے......." کار کا مالک قدرے بیزاری سے لڑکے سے مخاطب ہوا۔

"کیا سو گیا سر......" میکینک لڑکے نے پوچھا۔
"مسنگ کرتی ہے، پک اپ بیٹھ گیا ہے، سلو میں بند بھی ہو جاتی ہے، ریورس بڑی مشکل سے لیتی ہے۔" کار والے نے ایک ساتھ اتنے نقص بتا دیئے جیسے مریض ڈاکٹر کے سامنے اپنی بیماری ٹکڑوں ٹکڑوں میں بیان کرتا ہے۔
"ابھی استاد فارغ ہو جاتے ہیں۔" لڑکے نے کہا۔ روشو جس نے بس چھوٹی گاڑی کو آتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور گاڑی کی آواز بھی سنی تھی اور گاڑی کے مالک کی گفتگو بھی۔ کھٹ سے بول پڑا۔
"سر اس کا ایک پلگ شاٹ ہے......" یہ بات روشو کے منہ سے بس بے اختیار ہی نکل گئی تھی۔
"کون بولا ہے یہ......" گاڑی کے نیچے سے استاد کی کڑک دار آواز آئی جیسے بجلی کوندی ہو اور ساتھ ہی استاد کا چہرہ بھی باہر نکلا اس نے غصے سے لڑکوں کی طرف دیکھا۔
"اس نے کہا ہے استاد......" چھوٹو نے دیوار کے ساتھ بیٹھے روشو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اور روشو استاد کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ استاد نے اس طرح برا منایا تھا جیسے کسی نے گالی دیدی ہو۔
"ادھر آؤ کھوتی کے پتر......" استاد نے روشو کو پاس بلایا اور خود بھی منہ سے گریس صاف کرتا بڑی مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"ادھر آ....." اس نے انگلی کے اشارے سے روشو کو بلایا۔ ڈرا سہما روشو استاد کے قریب گیا اور حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگا۔ استاد پکی عمر کا لیکن بڑا وجیہہ آدمی تھا۔
"تو کیا جانتا ہے گاڑی کے بارے میں۔" استاد نے برہم ہو کر پوچھا۔
"کچھ نہیں استاد......" روشو انکساری سے بولا۔
"پھر کیسے کہہ دیا کہ پلگ شاٹ ہے۔" استاد نے سوال کیا۔
"بس یونہی نکل گیا منہ سے وہ گاڑی کی آواز....." وہ کہتے کہتے رکا۔
"میکینکی کرتا ہے....." استاد نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔
"سیکھ رہا ہوں جی..... تھوڑا سا کام کیا ہے۔" روشو دبی ہوئی آواز میں بولا۔
"کہاں کیا ہے کام......؟" استاد تابڑ توڑ سوال کر رہا تھا اور لگتا تھا کسی وقت بھی تھپڑ مار دے گا۔

"جیل میں۔۔۔۔۔" روشو کھٹ سے بولا۔

"جیل بھی کاٹی ہے۔۔۔۔۔۔" استاد چونکا۔

"جی۔۔۔۔۔۔!" وہ آہستہ سے بولا۔

"کس الزام میں۔۔۔۔۔۔۔۔" استاد کا سوال تھا۔

"چوری کے الزام میں۔۔۔۔۔" اس نے بھی نور اصاف گوئی سے جواب دیا۔

"کیا چیز چوری کی تھی۔۔۔۔۔۔" استاد نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔ جھوٹا الزام تھا۔ بری ہو گیا ہوں۔" اس نے وضاحت کی۔

"ہونہہ۔۔۔۔۔۔" استاد نے کچھ سوچا اور پھر کہنے لگا۔ "بری ہو جانا کوئی بے گناہی نہیں ہے اور نہ پکڑا جانے والا مجرم ہے۔"

"پھر اچانک اس نے کار کی طرف دیکھا اور اپنی کوتاہی کا جیسے احساس کیا"۔

"اسلام علیکم سر۔۔۔۔۔۔" اس نے بہت عجز کے ساتھ کار کے مالک کو سلام کیا۔ "سوری میں ذرا۔۔۔۔۔"

"کیا بات ہے استاد جمیل۔ آج بہت غصے میں ہو۔" کار کے مالک نے ازراہ مذاق دریافت کیا۔ "لفٹ ہی نہیں کرا رہے ہو۔"

"ارے سر خواہ مخواہ بات ایسے کر دیتے ہیں کہ خون کھول جاتا ہے۔ یہاں کام جانتا کوئی نہیں حکیم سارے بنے ہوئے ہیں اب اس لڑکے کو دیکھو اس کی عمر دیکھو ابھی انڈے سے نہیں نکلا ہے اور گاڑی کا بانیٹ کھولے بغیر کہہ رہا ہے اس کا پلگ شاٹ ہے۔"

"بس بچے ہیں۔۔۔۔۔۔۔" کار کے مالک نے کہا۔

"بچے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ استاد ہیں سب۔۔۔۔۔!" استاد مایوس لیکن طنزیہ لہجے میں بولا۔

"ذرا دیکھو میری گاڑی کو استاد اس میں۔۔۔۔۔" وہ گاڑی کے نقص بتانے لگا۔

"میں نے سن لی تھی بات آپ کی۔۔۔۔۔" استاد نے بات کاٹی۔ "چل او نے فیکے چیک کر شیخ صاحب کی گاڑی کو۔"

اس نے ایک شاگرد سے کہا اور پھر ایک اسٹول گاہک کے آگے کیا۔ "بیٹھو شیخ صاحب"۔

دونوں بیٹھ گئے تو استاد نے چھوٹو کو پکارا۔

"چل او نے چھوٹو چائے پکڑ لا۔"

چھوٹو چائے لینے چلا گیا تو استاد اور شیخ صاحب کار کے پاس بیٹھے سگریٹ پیتے ہوئے

چائے کا انتظار کرنے لگے۔ روشو کو استاد نے ذہن و نگاہ سے او جھل کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر منہ لٹکائے کھڑا رہا کہ شاید استاد مزید کچھ کہے۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ استاد اس کی موجودگی سے بے نیاز ہو گیا ہے تو وہ واپس اپنے بیگ کے پاس دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا اور یہ سوچنے لگا کہ اب وہ یہاں سے اٹھ کر کہاں کی بس پکڑے اور کس جانب جائے۔

"استاد اس کا ایک پلگ شاٹ ہے ۔۔۔۔۔۔۔" جب وہ چائے وغیرہ پی چکے تو میکینک لڑکا گاڑی کا ایک پلگ لے کر آیا اور استاد کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "دو پلگوں پر چل رہی ہے صرف۔"

"جبھی تو چل نہیں رہی ہے ۔۔۔۔۔" کار کے مالک نے کہا۔ اس وقت استاد نے ایک بار پھر تیکھی نظروں سے قریب بیٹھے ہوئے روشو کو دیکھا اور تیز لہجے میں پکارا۔

"ادھر آاو کھوتی کے پتر ۔۔۔۔۔۔" لیکن اب کے گالی دینے کا انداز قدرے مختلف تھا اور لہجے میں تحسین بھی تھی روشو پھر ذرا سہما استاد کے قریب آیا اور منہ بنا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو۔ استاد بن گیا ہے۔" بظاہر استاد بہت گرم تھا۔

"نہیں استاد ۔۔۔۔ مجھے تو کام بھی نہیں آتا ہے۔" وہ انکساری سے بولا۔ "میں تو سیکھ رہا ہوں"۔

"تو پھر گاڑی کو دیکھے بغیر کیسے کہہ دیا کہ اس کا پلگ شاٹ ہو گیا ہے۔" استاد کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"وہ استاد دراصل ۔۔۔۔۔" وہ اٹک اٹک کے بولنے لگا۔ "دراصل یہ ٹو اسٹروک گاڑی ہے۔ میں نے جیل کے اندر اس کے اوپر کچھ کام کیا ہے۔ یہ جب آ رہی تھی تو مجھے اس کی آواز سے لگا جیسے ایک پلگ کام نہ کر رہا ہو۔" وہ جھجھک جھجھک کے بولا۔

"ہونہہ ۔۔۔۔۔" استاد نے کچھ سوچا اور بولا۔ "کھوتی کے پتر۔" پھر روشو پر ایک تیکھی نگاہ ڈالی اور پوچھا۔ "کام کرو گے؟"

"جی استاد ۔۔۔۔" روشو جھک کر بولا۔

"روٹی کپڑا اور جیب خرچ ملے گا ۔۔۔۔۔" استاد نے پیشکش کی۔

"مجھے منظور ہے استاد ۔۔۔۔۔" وہ باہر سے پر امن رہا لیکن اندر سے بہت خوش ہو کر بولا۔

"تو پھر کل سے آجانا۔" استاد نے کہا۔

کہاں سے آؤں استاد ۔۔۔۔۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"کہیں نہیں جاؤ گے کیا ۔۔۔۔۔" استاد نے پوچھا۔

"کہاں جاؤں گا-----" روشو نے بے اختیار کہا۔
"ہونہہ------" استاد سوچ میں پڑ گیا اور پھر دوسرے لڑکے کو آواز دے کر کہا۔
"او نے فیکے دے او نے اس کو گاڑی۔" پھر روشو کی طرف مڑ کر تحکمانہ لہجے میں بولا۔
"جا شیخ صاحب کی گاڑی پکڑ لے۔ اس کے پلنگ صاف کر۔ جو شاٹ ہے اسے بدل دے۔"
"جی استاد جی------" روشو خوش ہو کر نکھر گیا اور پھر اللہ کا نام لے کر اس نے جمیل کی گیراج پر کام شروع کر دیا۔

O

روشو رات کو کھانا کھا کے وہیں گیراج کے باہر پڑ جاتا۔ صبح جب استاد جمیل چابی لے کر گیراج میں آتے روشو پہلے سے باہر موجود ہوتا۔ استاد روشو کو چابی دے کر چلا جاتا اور پھر گھنٹے بھر بعد کچھ باہر کے کام نمٹا کے واپس آتا۔ اس دوران روشو دکان کھولتا، جھاڑو لگاتا، اوزار درست کرتا، کچرا اٹھا کے باہر پھینکتا اور دکان کے سامان کی پوری سیٹنگ کر کے رکھتا۔ ابتدائی دنوں میں ایک بات کا عجیب اتفاق ہوا کہ صبح صبح جھاڑو لگاتے وقت روشو کو کچرے میں سے دس روپے کا نوٹ ملا۔ پھر دوسرے اور تیسرے دن دس دس تین نوٹ ربر بینڈ میں لپٹے ہوئے اس نے کچرے میں سے اٹھائے۔ دو چار دن کے بعد اب اسے کچھ پیسے گرے ہوئے ملے۔ جو اس نے استاد کو واپس لوٹا دیئے۔

"جس کسی کے بھی ہیں کچرے میں سے نوٹ ملنا ایک اچھا شگون ہے۔ برکت ہوتی ہے اس سے۔" استاد نے قہقہہ لگایا۔ لیکن جب دو دن کے بعد پھر روشو کو ایک سو روپے کا نوٹ ملا تو وہ بہت برہم ہوا۔
"یہ نہیں چلے گا استاد-----" اس نے سو کا نوٹ استاد کے آگے پھینکتے ہوئے کہا۔ "میں جا رہا ہوں"۔ وہ غصے میں بولا۔
"کیا بات ہو گئی------" استاد نے انجان بن کر پوچھا۔
"آپ اتنے انجان نہ بنو استاد------" روشو نے ناراضگی کا منہ بنا کر کہا۔ "آپ مجھے کتنے دن ٹیسٹ کریں گے۔"
"بات کیا ہے کھل کر کر یار-----" استاد نے بے تکلفی سے کہا۔
"بات یہ ہے استاد جی میں چور نہیں ہوں۔ نہیں ہوں میں چور۔ آپ مجھے روز روز ٹیسٹ کرتے ہیں۔" وہ قدرے اونچی آواز میں بولا۔

"میں ٹیسٹ کرتا ہوں۔۔۔۔۔" استاد نے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

مطلب آپ کو پتا ہے استاد۔۔۔۔۔ یقین کریں میں چور نہیں ہوں۔" وہ رقت آمیز لہجے میں بولا۔ "مجھے چور بننا ہوتا تو چوہدری صاحب کے گھر بن جاتا۔ جیل میں بن جاتا۔ مجھے بہت پیسے مل رہے تھے وہاں مجھے مار مار کر چور بنانے کی کوشش کی گئی میں نہیں بنا چور۔ مجھے چور نہ بننے پر انہوں نے۔۔۔۔۔" روشو نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"باس باس۔۔۔۔۔" استاد نے روشو کو تھپکی دے کر پاس بٹھایا اور پچکار کر کہنے لگا۔

"دیکھ بیٹے یہ صحیح ہے میں تمہیں ٹیسٹ کر رہا تھا بات یہ کہ میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں چوری برداشت نہیں۔ غلطی سے بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے مجھے پروا نہیں۔ غلطی انسان کرتا ہے۔ کوئی میرے سامنے ہزار کھا جائے پروا نہیں لیکن چوری میں پائی برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم چور نہیں ہو۔ جاؤ شاباش کام کرو۔"

اس کے بعد روشو کو گیراج کے اندر کپڑے میں سے نوٹ نہیں ملے اور دھیرے دھیرے استاد کا اعتماد روشو پر قائم ہوتا گیا اور روشو بھی دھیرے دھیرے استاد کے مسائل اور مزاج کو سمجھنے لگا۔

ایک بات اور روشو کو شروع شروع میں بڑی عجیب اور انوکھی لگی وہ یہ کہ جب روشو دکان میں جھاڑو وغیرہ لگا چکا۔ استاد اور دوسرے شاگرد لڑکے بھی آ گئے اور دن کا کام کاج شروع ہو گیا تو اچانک برابر والے بنگلے سے ایک زرد دھان پان ضعیف پارسی عورت جو دیکھنے میں محض ہڈیوں کا مختصر سا پنجرہ دکھائی دیتی تھی خمیدہ کمر اور جھکی ہوئی گردن کے ساتھ آئی اور استاد جمیل کے پاس کھڑے ہو کر بہت ہی مہین آواز میں استاد کو گالیاں دینے لگی۔

"کوتا کا باچا امارا جگہ خالی کرو۔۔۔۔۔"

"سور کا باچا امارا جگہ کھالی کرو۔۔۔۔۔"

"خالی کرو کوتا کا باچا۔۔۔۔۔"

"خالی کرو سور کا باچا۔۔۔۔۔"

وہ مسلسل اپنی گھٹی گھٹی ہوئی ضعیف اور نحیف آواز میں چیخ رہی تھی اور یہ آواز اتنی کمزور تھی کہ بمشکل استاد جمیل کے کانوں تک پہنچ پاتی تھی۔ روشو پارسی عورت کو دیکھ کر پریشان ہو گیا لیکن روشو کو یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ استاد جمیل نے بڑھیا کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ کبھی روشو سے یہ پانا اور کبھی وہ پانا مانگتا رہا۔ اور بڑھیا گالیاں دیتی رہی جیسے

وہ استاد کو نہیں کسی اور کو دے رہی ہو اور جب وہ تھک کے نڈھال ہو گئی تو ایک ادھیڑ عمر مرد آیا جو عمر میں بڑھیا سے بہت چھوٹا تھا اس نے بڑے آرام سے بڑھیا کا بازو تھاما اور بولا۔ "بہن آوی جاؤ۔ اوے گھر جاوا ناں چھیے۔"

اور بڑھیا چپ چاپ آدمی کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے جھکی ہوئی کپکپاتی ہوئی ایسے واپس چلی گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اور استاد جمیل بھی بڑھیا کے جانے کے بعد معمول کے مطابق اس طرح کام کاج میں مصروف رہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ پھر دوسرے دن وہی عین صبح ساڑھے دس گیارہ بجے کے قریب بڑھیا آئی اور جیسے گوالن اونچے ٹیلے پر کھڑی ہو کر بکریوں کو پکارتی ہے۔ اسی طرح بڑھیا نے اونچے زینے پر کھڑے ہو کر اپنی باریک آواز میں چلانا شروع کیا۔

"کوتا کا باچا امارا جگہ خالی کرو۔۔۔۔"

"سور کا باچا۔۔۔۔"

لا یہ پانا پکڑا دے۔ اور اس راڈ کو ذرا مضبوط پکڑ کر رکھنا۔ شاباش۔۔۔۔" استاد نے گاڑی پر کام کرتے ہوئے کہا اور وہ اپنا کام کرتا رہا اور بڑھیا اپنی جانب سے صحرا میں صدا لگا کے اگلے روز والے مرد کے ساتھ دھیرے دھیرے واپس چلی گئی جیسے اپنا کوئی قرض ادا کر کے گئی ہو۔

" استاد کیا بات ہے۔ آپ اس بڑھیا کو جواب کوئی نہیں دیتے ہیں۔" تین چار دن یہ تماشا دیکھنے کے بعد آخر کار ایک دن روشو نے استاد سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا جواب دوں۔۔۔۔۔ پچھلے تیس برس سے اس کا یہ روز کا کام ہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا آیا ہو کہ بڑھیا نے گالیاں نہ دی ہوں پچ پچ۔" وہ اظہار افسوس کرتے ہوئے بولا۔ " بہت دکھی عورت ہے بے چاری"۔ استاد جیسے واقعی اس کیلئے بہت دکھ محسوس کر رہا تھا۔

استاد جمیل کے مطابق اس دکھی عورت کا نام فریدے تھا۔ یہ پارسی خاتون اس وقت تقریباً پینسٹھ برس کی تھی اور اس کا بھائی مہر جی پچاس کے لگ بھگ تھا۔ مہر جی کے باپ یعنی بڑے مہر جی کا جب انتقال ہوا تو اس وقت مہر جی ایک بینک میں ملازم تھا اور اس کی عمر تقریباً تیس برس تھی۔ باپ ورثے میں ایک کوٹھی (جس میں دونوں بہن بھائی رہتے ہیں) ایک خالی پلاٹ (جس میں استاد جمیل کے گیراج کے علاوہ اور دو تین دکانیں ہیں) اور چار کنواری بہنیں چھوڑ گیا تھا اور گھر کے واحد مرد اور سرپرست ہونے کے ناتے بہنوں کو بیاہنے کا فرض مہر جی پر عائد ہو گیا ایک تو کمیونٹی کے رسم و رواج بڑے سخت قسم کے تھے اور پھر اوپر سے سکڑتی ہوئی برادری میں لڑکوں کا قحط۔ بڑی مشکل سے مہر جی کو ایک بہن کے لئے لڑکا پسند آیا۔ بہن نے بھی پسند کیا

لیکن لڑکے نے رسم کے مطابق اور مہر جی کی مضبوط مالی حیثیت دیکھ کر تین لاکھ روپے لڑکی کے ساتھ نقد طلب کیئے۔ مہر جی کی مالی حیثیت کوئی ایسی اچھی بھی نہیں تھی لیکن لڑکے والوں کی نظر میں مہر جی کی کوٹھی اور بڑا پلاٹ تھا کوٹھی تو مہر جی نے نہیں فروخت کی لیکن باپ کی چھوڑی ہوئی تھوڑی بہت رقم تھی کچھ سیونگ سرٹیفکیٹس تھے۔ انشورنس کی ایک پالیسی تھی۔ جس بینک میں کام کرتا تھا اس بینک سے قرض لیا اور کسی نہ کسی طور پر تین لاکھ روپے جمع کر کے تقریباً پانچ یا چھ برس کے عرصے میں ایک بہن کی شادی کرنے کے قابل ہوسکا۔ اسی دوران فریدے کو بھی ایک لڑکا پسند آگیا اور لڑکے نے بھی فریدہ کو منتخب کرلیا۔ مہر جی نے بھاگ دوڑ کر کے کچھ عزیزوں اور رشتے داروں سے قرض کا بندوبست کیا۔ گھر کی کچھ چیزوں کو فروخت کرنے کا پروگرام بھی بنالیا لیکن رقم پھر بھی پوری نہ ہوسکی۔ فریدے نے بھائی سے کہا کچھ بھی ہو پلاٹ یا کوٹھی میں سے ایک چیز فروخت کر دو۔ کوٹھی تو مہر جی نہیں فروخت کر سکتا تھا کہ تین بہنیں اس میں رہتی تھیں۔ اور وہ خود بھی تھا اور بہنوں کو بیاہ دینے کے بعد اس نے خود بھی شادی کرنی تھی لہذا اس کے پاس سر چھپانے کا ایک ہی ٹھکانہ تھا۔ اور اس چھت کو وہ سر سے نہیں ہٹانا چاہتا تھا لے دے کر پلاٹ کی فروخت فریدے کی شادی کا آخری حل مہر جی کے پاس رہ گیا لیکن پلاٹ کا اول تو گاہک ہی نہیں مل رہا تھا۔ گاہک ملا تو وہ خالی پلاٹ چاہتا تھا جبکہ پلاٹ پر استاد جمیل سمیت تین چار آدمیوں کا اور قبضہ تھا۔ اور یہ قبضہ بھی ناجائز نہیں تھا کہ سب لوگ سیٹھ مہر جی کو کرایہ دیتے تھے۔ لہذا مہر جی نے جب کرایہ داروں سے پلاٹ خالی کرنے کو کہا تو سب نے انکار کر دیا۔

فریدے بہت بے چین تھی۔ لڑکا جلدی میں تھا کیونکہ ایک اور خاندان لڑکے میں دلچسپی لے رہا تھا جو نقد رقم دینے کو تیار تھا۔ فریدے کی حالت غیر ہورہی تھی۔ اس نے مہر جی سے مل کر کچھ وکیلوں سے بات کی۔ تھانے میں درخواست دی۔ انتظامیہ کو لکھا۔ کچھ نوٹس بازی بھی ہوئی لیکن اس چپقلش اور کشمکش میں دکانداروں کا پلہ بھاری رہا اور پلاٹ خالی نہ ہوسکا۔ ادھر فریدے کے منگیتر نے جب شادی کیلئے آخری الٹی میٹ دے دیا تو فریدہ ہذیانی ہوگئی اور اچانک ایک روز استاد جمیل کی دکان کے سامنے کھڑی ہو کر اور دکانداروں کی طرف منہ کر کے چلانے لگ گئی۔

"کوتا کا بچہ۔ امارا جگہ کھالی کرو۔۔۔۔۔۔۔"

"سور کا باچا امارا جگہ کھالی کرو۔۔۔۔۔۔۔۔" اور اس کی یہ گردان پھر بہت دیر تک جاری رہی۔

اور پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ وہ روز صبح دکانیں کھلنے پر آتی اور دکانداروں کو برا بھلا کہہ کر

چلی جاتی لیکن جب اس کے منگیتر نے مایوس ہو کر اسے چھوڑ دیا اور دوسری جگہ شادی کر کے امریکہ چلا گیا تو فریدے کا دماغی توازن بالکل ہی بگڑ گیا۔ اب وہ شادی نہ ہو سکنے کی ذمہ دار ان لوگوں کو گردانتی جو پلاٹ پر قابض ہیں اور گزشتہ تیس پینتیس برس سے روزانہ وہ یہاں ایک چبوترے پر کھڑی ہوتی ہے اور استاد جمیل کے گیراج کی طرف منہ کر کے گالی دے کر کہتی ہے کہ ہماری جگہ خالی کرو حالانکہ مہر جی اب جگہ خالی کرانے کے حق میں نہیں ہے اس نے انہی دکان داروں سے کرایہ وصول کر کے بلکہ انہی سے کچھ ایڈوانس بھی لئے۔ اپنی تنخواہ جمع کی۔ پیٹ کاٹا۔ ٹیوشنیں پڑھائیں بینک سے فارغ ہونے کے بعد کچھ فرموں میں شام کے وقت جز وقتی اکاؤنٹینٹ کی حیثیت سے کام کیا اور رقم پس انداز کر کے دوسری اور پھر تیسری بہن کی شادی کر ڈالی لیکن اس تمام جدوجہد میں مہر جی کی اپنی شادی کی عمر نکل گئی اور اس کی بہن فریدے بوڑھی ہونے کے ساتھ دماغی توازن بھی تقریباً کھو بیٹھی اور اب وہ جب تک چبوترے پر کھڑی ہو کر اور گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نہ نکالے اس وقت تک اس کے دماغ کو سکون نہیں ملتا۔ بلکہ بعض اوقات جب گھر کے اندر بہت ہی زیادہ غیر متوازن ہو جاتی ہے تو مہر جی خود اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کوٹھی سے باہر لاتا ہے۔ چبوترے پر کھڑا کرتا ہے۔ جہاں وہ جی بھر کے گالیاں دیتی ہے اور پھر جب اس کے دماغ کو سکون مل جاتا ہے تو مہر جی دوبارہ ہاتھ پکڑ کر سہارے دیتے ہوئے اسے واپس اندر کوٹھی میں لے جاتا ہے۔

دیکھتے دیکھتے روشو گیراج کے تمام ماحول اور مسائل کا حصہ ہو گیا۔ وہ بالکل اسی طرح محنت کرتا جیسے اس کا اپنا کام اور اپنا گیراج ہو۔ پارسن اب استاد کی غیر موجودگی میں روشو کو بھی گالیاں سنا کے چلی جاتی اور روشو بھی استاد ہی کی طرح صبر و تحمل سے سن لیتا جیسے وہ بھی چالیس برس سے یہ راگنی سن رہا ہو۔ روشو رات کو گیراج بند ہونے کے بعد وہیں فٹ پاتھ پر سو جاتا۔ نہانے دھونے کیلئے حمام چلا جاتا۔ صبح کا ناشتہ برابر والے ہوٹل پر کرتا اور دو وقت کی روٹی تمام لڑکے اور استاد مل کر کھاتے۔ اس دوران استاد کے پاس کئی لڑکے آئے۔ کئی گئے جس کو بھی کسی دوسرے ورکشاپ کے اندر سو پچاس روپیہ زیادہ کی پیشکش ہوئی وہ چلا گیا لیکن روشو نے استاد کا ٹھکانہ مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ رات کو جب تمام گلی سو جاتی تو وہ چپکے سے اپنا بیگ کھولتا اور شاہینہ کی دی ہوئی کتابیں نکالتا انگلش اسٹوری بک اردو ورک بک اور دوسری کتابیں جن پر شاہینہ نے نشانات لگا رکھے تھے اور تاکید کی تھی کہ آگے ضرور پڑھنا یہ کتابیں روشو بڑے انہماک سے پڑھنے

لگ جاتا اور رات گئے تک پڑھتا۔ شاہینہ اگر اسے پڑھنے کیلئے نہ بھی کہتی تو بھی اسے پڑھنا ضرور تھا اس کا مشن ہی تھا پڑھنا لیکن اب وہ کس طرح اس مشن کو جاری رکھے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ اسٹریٹ لائٹ میں لیٹا شاہینہ کی دی ہوئی کتابوں کو کئی بار پڑھ چکا تھا اور کبھی کبھی شاہینہ اسے اتنی شدت سے یاد آنے لگتی کہ وہ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے آبدیدہ ہو جاتا۔ اور وہ سوچنے لگتا کہ اسے زندگی کے اندر صحیح معنوں میں شاہینہ ایک ٹیچر ملی تھی جو اس کی ہم عمر تھی اس جیسی تھی اسے سمجھتی تھی پیار کرتی تھی ٹوٹ کے چاہتی تھی۔ جو یہ سوچتی بھی نہیں تھی کہ وہ فقیروں میں سے ہے وہ دل لگا کے اسے پڑھاتی تھی اور دل سے چاہتی تھی کہ روشو ایک بڑا آدمی بن جائے۔ اور پتہ نہیں اس کے علاوہ اور کیا کیا منصوبے تھے جو آگے چل کر شاہینہ کے ساتھ بننے تھے لیکن روشو نے سب کچھ کھو دیا ہے۔

شاہینہ کو کھونے کے بعد روشو کے علم کا مفہوم بھی بدل گیا تھا وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ علم سیکھنے کیلئے صرف کتابیں ہی کافی نہیں ہیں اور نہ کتابوں ہی میں سب کچھ ملتا ہے۔ اس نے انسانوں سے بہت کچھ سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ چوہدری صاحب کا گھر اس کیلئے ایک مکمل مکتب تھا تھانے والوں نے اسے کیا کیا باتیں سکھا دیں جیل کے اندر اسے کیا کچھ دیکھنے پڑھنے اور سیکھنے کو ملا۔ اور اب استاد جمیل کے گیراج پر اسے بڑا لطف آرہا تھا۔ یہاں ہر طبقے اور ہر مزاج کے لوگ استاد جمیل کے پاس آتے استاد جمیل باتوں کے بڑے رسیا تھے۔ کام کے ساتھ ساتھ ہر روز گیراج پر استاد جمیل کے دوستوں کی محفل جمتی اور روشو اس محفل کو چائے بنا بنا کر پیش کرتا اور اس کا دھیان اگرچہ چائے کی طرف رہتا لیکن کان محفل نشینوں کی گفتگو کی طرف لگے ہوتے اور بعض اوقات اسے ان محفلوں سے بڑی اچھی اور کام کی باتیں مل جاتیں جنہیں وہ پلے باندھ لیتا۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ استاد جمیل اگرچہ زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے لیکن وہ ایک ماہر موٹر میکینک ہے۔ خوبصورت گفتگو کرتا ہے مجلس نشین ہے۔ دیانتدار ہے اور دیانتداری کے نمونے عملی طور پر پیش کرتا ہے اور روشو کو استاد جمیل کے دیئے ہوئے ان اسباق سے بہت مدد ملتی تھی۔ مثلاً ایک دن ایک گاہک اپنی کار لے کر آیا اس کی کار میں چلتے وقت تھوڑی سی کھڑکھڑاہٹ ہو رہی تھی اور اسی نقص کیلئے وہ گیراج میں آیا تھا۔

"استاد ذرا دیکھنا گاڑی کو۔۔۔۔" گاہک نے گاڑی روک کر کہا۔

"کیا ہو گیا سر جی۔۔۔۔" استاد نے کہا۔

"یار استاد یہ اس کا چیز ز کریک ہو گیا۔۔۔۔" گاہک قدرے پریشانی سے بولا۔

"چیسز کریک ہوگیا۔۔۔۔۔۔؟" استاد جمیل چونکا۔ "کیسے۔"

"ہوا یوں کہ گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔" کسٹمر نے بتانا شروع کیا۔ "شاید کوئی چیز ایسی ٹکرا گئی چیسز کے ساتھ کہ چیسز میں کریک آگیا اور یہ کھڑکھڑاہٹ شروع ہو گئی۔" پھر کسٹمر نے جھک کر نیچے وہ کریک استاد کو دکھایا جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیا ہوا تھا۔ استاد گاڑی کے نیچے گیا۔ اس کا معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر بولا۔

"ٹھیک ہے سر جی گاڑی چھوڑ جائیں ہو جائے گی۔ دیکھ لوں گا چیسز کو۔"

"کب ملے گی۔۔۔۔۔" گاہک نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

انحصار کام پر ہے۔۔۔۔۔ کتنا کام ہے چیسز میں دو تین دن کے بعد پتہ کریں۔" وہ غیر یقینی انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے"۔ گاہک نے کار کی چابی استاد کے حوالے کر دی۔ اور جب گاہک چلا گیا تو استاد گاڑی کے نیچے گیا اور روشو کو بھی گاڑی کے نیچے بلایا۔ روشو بھی لیٹ کر گاڑی کے نیچے گیا تو استاد نے چیسز کا وہ حصہ روشو کو دکھایا جہاں دراڑ دکھائی دے رہی تھی۔

"اس نشان کو غور سے دیکھ روشو"۔ اس نے نشان کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔

"جی استاد۔۔۔۔۔" روشو نے غور سے دراڑ کی طرف دیکھا۔ جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا سمجھے۔۔۔۔۔" استاد نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"سر میں وہی سمجھا ہوں جو آپ سمجھے ہیں۔۔۔۔۔ یہ کریک نہیں صرف لکیر ہے۔" روشو نے جواب دیا۔

"یہی میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔" استاد نے کہا۔ اور روشو کو ہدایت دی کہ اس لکیر کو اوپر سے کوئی مسالہ وغیرہ لگا کے اس کو مزید نمایاں کر دے تاکہ معلوم ہو کہ اس جگہ ٹانکا لگایا گیا ہے روشو استاد کی بات سمجھا نہیں کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے لیکن استاد کا چونکہ حکم تھا اس نے ویسا ہی کر دیا۔

"اب اس کے نٹ بولٹ کس دو۔" استاد نے کہا اور روشو نے اس کے نٹ بولٹ کس دیئے اور گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ بند ہو گئی۔

"بن گئی گاڑی استاد۔۔۔۔۔" تیسرے دن گاہک نے آتے ہی پوچھا۔

"جی سر بن گئی۔۔۔۔۔" استاد نے کہا۔

"چیزز ہو گیا ہے سر--------"

"جی ہاں خدا کا شکر ہے ------ بڑی مشکل سے ہوا ہے"۔ استاد نے کہا۔ "اب ذرا ٹرائی لیں اس کی چلائیں گاڑی کو"۔ گاہک گاڑی میں بیٹھا اور ایک طویل چکر لگا کر جب لوٹا تو بہت مطمئن تھا

"کیسی ہے -----"استاد نے پوچھا۔

"اے ون----" گاہک نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کتنے پیسے استاد۔" اس نے پرس نکالتے ہوئے مزید پوچھا۔

"پانچ سو روپے دے دیں------"استاد نے مزید کہا۔ "اسپیشل لیزر مشین پر چیزز کو ویلڈ کرایا ہے"۔

"کوئی بات نہیں استاد----" گاہک نے پانچ سو روپے نکال کے استاد کو ادا کر دیئے۔ روشو استاد کا منہ دیکھتا رہا اور جب گاہک جانے لگا تو اس وقت استاد نے ایک مخصوص قہقہہ لگایا اور گاہک کو روکا۔

"سر جی ایک منٹ----" گاہک رک گیا استاد نے پانچ سو روپے لوٹاتے ہوئے کہا۔ "یہ اپنے پیسے لیتے جائیں"۔

"کیا مطلب-----" گاہک حیرانگی سے بولا۔

"نہ تو اس کا چیزز کریک تھا اور نہ میں نے اسے ویلڈ کرایا ہے------"استاد نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھی تو وہاں کوئی لوہے کی راڈ وغیرہ تھی جس سے لگ کر چیزز پر ایک لکیر آ گئی تھی میں نے کوئی کام نہیں کیا ہے گاڑی پر سر جی"۔

"لیکن یہ جو کھڑکھڑاہٹ تھی-----"اس نے پوچھنا چاہا۔ "اب بند ہو گئی ہے"۔

"نٹ بولٹ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ جو لڑکے نے کس دیئے ہیں۔ آواز بند ہو گئی"۔ استاد نے کہا

"یار تم عجیب آدمی ہو استاد-----اگر سارے میکینک تمہارے جیسے-----"اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن استاد نے بات کاٹ دی"۔

"سارے میکینک ایک جیسے نہیں ہو سکتے اور نہ سارے میکینک آپ کو نصیحت کریں گے۔ میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں----اسے غور سے سنیں۔ تم بھی سنو روشو، یہ زندگی میں کام آنے والی باتیں ہیں۔" وہ روشو سے مخاطب ہو گیا اور پھر نہایت سنجیدگی سے کسی مدرس کی طرح درس دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"اگر آپ کبھی خدا نخواستہ بیمار ہوجائیں اور آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے تو اپنی تکلیف ڈاکٹر کو بتائیں گے کہ آپ کو یہ تکلیف ہے خود تشخیص کر کے اس کے پاس نہ جائیں۔" وہ قدرے چپ ہوا اور پھر بولا۔ "اگر آپ کو بخار کے ساتھ سردی بھی لگتی ہے تو ضروری نہیں یہ ملیریا ہو۔ کبھی ڈاکٹر سے یہ نہ کہیں کہ مجھے ملیریا ہوگیا ہے ڈاکٹر کو تشخیص کرنے دیں۔ یہی حال موٹر کا ہے سر جی ---- خود تشخیص کر کے اسے گیراج میں کبھی نہ لائیں ورنہ آپ کو ایک لکیر کے پانچ سو ٹھک سکتے ہیں۔ خدا حافظ"۔

"گریٹ ----" گاہک نے استاد کا ہاتھ گرم جوشی سے تھاما اور بہت متاثر ہو کر بولا۔ اور جب گاہک چلا گیا تو روشو بھی بڑے اعتقاد کے ساتھ استاد کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"گریٹ ----" روشو کے خراج تحسین پر استاد چونکا اور اس کا کان پکڑ کے ایک چپت لگائی اور گالی دی۔

"کھوتی کا پتر کہیں کا۔" یہ استاد کی محبت کا اظہار تھا۔ اور پھر استاد کا روشو پر یقین پیار اور اعتبار بڑھتا چلا گیا۔ اور پھر اچانک ایک رات پتہ نہیں کیا ہوا وہ ابھی دری بچھا کر فٹ پاتھ پر لیٹا ہی تھا کہ اسے آہستہ سے ایک ٹھوکر لگی۔

"اٹھ ----" یہ استاد کی ٹھوکر تھی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "اس طرح سویا ہے جیسے تیرے باپ کا فٹ پاتھ ہے"۔ استاد نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"کیا ہوا استاد ----" روشو پریشان ہوگیا۔

"آج سے تو فٹ پاتھ پر نہیں سوئے گا۔ چل آ میرے ساتھ"۔ استاد کہہ کر چل پڑا۔

"کہاں -----" "بس تو بیٹھ گاڑی میں۔" استاد نے مرمت کیلئے آئی ہوئی ایک کھٹارا سی گاڑی میں اسے بٹھایا اور اپنے ساتھ لے گیا۔ گاڑی رکی تو ایک پرانی سی بلڈنگ کا احاطہ طے کر کے استاد اسے ایک مکان میں لے گیا۔

"تجھے آج ایک ایسی چیز سے ملاؤں گا کہ تیرا جی خوش ہوجائے گا۔" استاد نے ہاتھ گول کر کے مزا لیتے ہوئے کہا۔

"کیا چیز ہے استاد -----" روشو نے معصومیت سے پوچھا۔

"بس تو دیکھتا جا۔" استاد بولا اور جب گھر کے اندر گئے تو ایک خوبصورت مستانی عورت نے استقبال کیا۔

"یہ ہے وہ چیز -----" گھر کے اندر جا کے استاد نے روشو کو اس مستانی اور خوبصورت

عورت کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"کیوں ہے نا چیز ------" اس نے دوبارہ پوچھا۔ "سارے ہندوستان اور پاکستان سے چھانٹ کر یہ دانہ نکالا ہے"۔ اس نے عورت کے کولھے پر دھپ لگائی۔ "ارے بول پسند ہے کہ نہیں" وہ روشو سے مخاطب ہوا۔

"ابے شرماتا کیوں ہے کھوتی کا پتر کہیں کا ----" استاد نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"اس کا نام عذرا ہے میں اسے بانکی کہتا ہوں ہے نا بانکی۔"

"وہ استاد ------" وہ شرمانے لجانے لگا۔

"ابے مجھے استاد کہتا ہے تو اسے استانی کہتے منہ دکھتا ہے تیرا۔" اس نے ایک دھپ روشو کے بھی لگائی۔

"استانی ------" اس نے بہت تجسس سے لیکن ایک بچے کی نگاہ سے عورت کو دیکھا اور روشو نے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت خوبصورت اور دلکش اور بانکی عورت تھی۔

"اب تو فٹ پاتھ پر نہیں ----اس کی زلفوں کی چھاؤں میں سوئے گا۔" استاد نے ازراہ چھیڑ چھاڑ کہا اور روشو شرمانے لگا۔

"ابے شرماتا کیوں ہے ------" استاد نے کان کھینچ کر کہا یہ تیری ماں کی طرح ہے لگ جا گلے۔ پروا نہیں ------" پھر وہ عورت سے مخاطب ہوا۔

"بانکی ------ تم اس کی جھجھک نکال دو۔" اور پھر بانکی نے خود آگے بڑھ کر روشو کے سر کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر دیں

"جمیل نے تمہاری بہت تعریف کی ہے ------" عذرا نے کہا۔ "اتنی تعریف کہ میں نے جمیل سے کہا کہ تمہیں گھر لے آئیں۔ تمہاری ساری باتیں اور ساری کہانی جمیل نے مجھے بتائی ہے ہماری کوئی اولاد نہیں ہے"۔

"بکواس -----" استاد جمیل اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "اب اس کو لے پالک نہیں بنالینا بچہ وہ اپنا ہے جو اپنی کوکھ سے ہو۔ بعض اوقات وہ بھی نہیں ہوتا۔ اکثر نہیں ہوتا۔ لگائیوں کے ہوجاتے ہیں جیسے میں تمہارا ہوگیا ہوں"۔ استاد بولتا چلا گیا۔ "بس یہ ایک چھالڑ کا ہے۔ اس سے کچھ زیادہ توقع نہ رکھتے ہوئے اسے ماں جیسی محبت دو اور اپنی محبت کے سائے میں اسے جوان کر دو۔" استاد حکیمانہ انداز میں بولا۔

اور روشو جوان ہوگیا۔

(۱۶)

جوانی کی بہار بہت نکھر کر روشو پر آئی۔ نکلتا ہوا قد، صاف گوری رنگت، گہری بلوریں آنکھیں، جن میں سمندر کا سا عمق دکھائی دیتا سر کے بال گہرے ہلکے سنہری لیکن ریشم کی طرح ملائم۔ چھریرا بدن مردانہ وجاہت، وہ ٹی شرٹ جین اور جوگرز پہنے گزر جاتا تو لڑکیاں بے اختیار پلٹ پلٹ کر اسے دیکھتیں وہ ایک نظر دیکھنے میں ایرانی، کشمیری یا بلغارین خوبصورت نوجوان دکھائی دیتا۔ کبھی کبھی اس پر لوگوں کو کابلی، ہسپانوی ہونے کا گمان بھی ہوتا لیکن اکثر اوقات جب وہ گریس اور موبل آئل سے اٹی ڈانگری پہنے ہوتا تو پھر وہ مکمل پاکستانی میکینک دکھائی دیتا لیکن کام کے لباس میں بھی اس کی وجاہت متاثر نہ ہوتی۔

روشو جس تیزی کے ساتھ جوان ہوا تھا استاد جمیل پر اسی تیز رفتاری سے بڑھاپا وارد ہوا تھا اور استاد کی بیوی بانکی بھی ڈھل گئی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ استاد اور بانکی کے درمیان محبت میں اور اضافہ ہو گیا تھا اور روشو نے اپنی زندگی میں میاں بیوی کے درمیان یہ ایک مثالی محبت دیکھی تھی۔ استاد اب بھی روشو کے سامنے بانکی کے ساتھ ویسی ہی چھیڑ چھاڑ اور کبھی کبھار بہت ذاتی یا لچر قسم کا مذاق بھی کرتا اور روشو ہر بار شرما جاتا اور استاد روشو کو ٹہوکا دے کر چھیڑتا۔

"ارے کیوں شرمارہے ہو بھئی ہم تمہارے لئے بھی ایک بانکی ڈھونڈ رہے ہیں"۔

لیکن روشو کے من میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا اس نے شادی کے بارے میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا تھا وہ استاد کی باتوں پر بے نیازی سے مسکرا دیتا وہ استاد اور بانکی کا بہت ممنون تھا وہ اس گھر میں بے انتہا خوش تھا۔ اس نے لڑکپن اور جوانی کے درمیان کا فاصلہ اس گھر کے اندر استاد کی شفقت اور بانکی کی محبت کے سایے میں طے کیا تھا اور یہاں اسے ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ جیسے وہ استاد کا گمشدہ بیٹا ہو جسے استاد اور بانکی نے کھو جانے کے بعد پایا ہو

روشو کی بدولت استاد اب ورکشاپ کی طرف سے بھی مطمئن ہوگیا تھا کہ روشو اب ایک مکمل میکینک تھا ہر ماڈل کی گاڑی پر وہ کام کر چکا تھا۔ گاڑی کے ہر پرزے سے واقف ہوگیا تھا اور پورا انجن کھول کے دوبارہ فٹ کر سکتا تھا۔ استاد اب ورکشاپ پر کم وقت دیتا تھا اور جو وقت وہ صرف کرتا اس میں بھی بہت کم اپنے ہاتھ سے کام کرتا گیراج پر آنے کا استاد نے دوپہر کا وقت مقرر کر رکھا تھا اس وقت اس کے دوست احباب بھی جمع ہوجاتے اور چائے کے دور کے ساتھ ساتھ استاد کی محفل لگتی۔ لیکن اب چائے لانے اور پیش کرنے کے لئے دوسرے شاگرد لڑکے موجود تھے جن کے سپرد یہ کام تھا روشو اب ایک ذمہ دار میکینک تھا جس نے گیراج کا تمام کام سنبھال رکھا تھا وہ اتنا مصروف رہتا کہ اسے استاد کے دوستوں کی محفل سے محظوظ اور مستفید ہونے کا بھی بہت کم موقع ملتا اس نے ہر وقت کوئی نہ کوئی گاڑی کھول رکھی ہوتی یا جیک پر اٹھائی ہوتی اور وہ کام میں مصروف ہوتا اور دو چار شاگرد لڑکے اس کے حکم کی بجاآوری کے لے اسی طرح چوکس کھڑے ہوتے جس طرح کبھی استاد جمیل کے اطراف جمع ہوتے تھے۔ کبھی کبھار استاد جمیل کو بھی محفل چھوڑ کے روشو کے کام میں مداخلت کرنے کا اتفاق ہوجاتا۔ وہ بھی یوں کہ اگر کسی گاڑی کا نقص روشو کی بے انتہا کوشش اور توجہ کے باوجود دور نہ ہوتا تو پھر وہ استاد کی رائے لیتا۔ استاد گاڑی کا جائزہ لیتا ان طریقوں کا جائزہ لیتا جو روشو نے گاڑی کی مرمت کے لئے اختیار کئے ہوتے اور پھر ان طریقوں سے ہٹ کر کوئی نئی راہ استاد نکالتا اور نیا مشورہ روشو کو دیتا۔ لیکن ایسا بہت ہی کم ہوتا۔ روشو میں خود اتنی قابلیت اور صلاحیت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ استاد کی مدد کے بغیر گاڑی صحیح کر لیتا تھا گاڑی کو گاہک سے وصول کرنا بنانا اسے ٹرائی کر کے واپس دینا۔ گاہک کا لین دین، معاوضہ بتانا یا چھوٹا موٹا کام بغیر معاوضے کے کر کے دینا اور سامان کی خریداری وغیرہ یہ سب کچھ روشو اپنی ذمہ داری پر کرتا تھا۔ گاڑی کی مرمت کے علاوہ اب وہ گاڑی کا اتنا ماہر ڈرائیور تھا کہ پہیوں کے برابر دو تختوں پر پوری رفتار کے ساتھ گاڑی چلانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ڈرائیونگ میں اس کا پیڈل ورک کسی مشین کی طرح آٹو میٹک تھا اور اسے اسٹیرنگ پر اس قدر کنٹرول حاصل تھا کہ پہیوں کے ساتھ وہ خط کھینچ سکتا تھا اور آگے بھی اور ریورس بھی ایک ہی طریقے اور رفتار سے گاڑی چلا سکتا تھا جب سے اس نے ڈرائیونگ شروع کی کبھی اس کے ہاتھ سے گاڑی لگی نہیں تھی۔ اگر کبھی کسی دوسرے ڈرائیور کی غلطی سے ایکسیڈنٹ ہونے کا امکان بھی ہوا تو اس نے اپنی مہارت سے گاڑی بچالی تاہم اس کے اندر غرور اور تکبر کبھی پیدا نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ اس بات کا اعتراف کرتا تھا کہ اسے کچھ نہیں آتا ہے اور اس کا کہنا تھا کہ اگر گاڑی سڑک پر ہوگی تو ٹکرائے گی بھی ضرور۔ اس کے

نزدیک گاڑی کا نہ ٹکرانا ایسے ہی ہے کہ کشتی میں بیٹھنا اور پانی کی بوند سے بچے رہنا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فریدے بھی بہت بوڑھی ہوچکی تھی اور اس کا بھائی جمشید بھی دیکھتے دیکھتے ڈھل گیا تھا تاہم بڑھیا کا اب بھی وہی معمول تھا وہ پابندی سے لڑکھڑاتی ہوئی اپنے مقررہ وقت کے لگ بھگ آتی اور چبوترے پر کھڑی ہوکر گالیاں دیتے ہوئے جگہ خالی کرنے کی گردان کرتی اور جب تھک جاتی تو اس کا جوان بھائی جمشید آتا اور کسی روبوٹ کی طرح اس کا بازو تھام کر بولتا۔ "بہن آوی جاو۔ اوے گھر جاواناں چھے" اور وہ بغیر کسی تامل کے بھائی کا سہارا لے کر رعشہ زدہ بدن کو سنبھالتی ہوئی واپس چلی جاتی اور اب چونکہ استاد دکان پر کم بیٹھتا تھا لہذا یہ ساری گالیاں اب روشو ہی کو سننا پڑتی تھیں۔ اور بڑھیا کے لئے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ گالیاں سننے والا روشو ہے یا استاد اور روشو کے لئے بھی بڑھیا کی گالیوں والے ہونٹ اگر شیریں نہیں تو تلخ بھی نہیں تھے کہ استاد کی طرح اس کے لئے بھی یہ ایک معمول کی بات ہوگئی تھی۔

روشو نے شاہینہ کے دیئے ہوئے اور نشان زدہ اسباق کو بہت پیچھے چھوڑ کر آگے کی کتابیں پڑھتے پڑھتے پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تھا لیکن شاہینہ کی یاد کی مورتی آثار قدیمہ سے نکلی ہوئی کسی نادر شے کی طرح اس کے دل و دماغ پر اب بھی کندہ تھی۔ وہ وقتی طور پر اسے بھولا ہوا بھی تھا لیکن ایسے ہی جیسے کوئی فریم شدہ تصویر حالات زمانہ کی گرد سے اچانک چھپ جائے اور پھر یادوں کا ایک جھونکا چلنے سے دوبارہ گرد ہٹ جائے اور تصویر صاف ہوکر سامنے آجائے روشو کو بھی جب شاہینہ کی یاد آتی تو اس کا دل سنبھلنے میں مشکل سے آتا اور ماضی کی لہروں پر جھکولے کھاتا۔ پہروں یادوں کے حسین سمندر میں کھویا رہتا اور اس کی آنکھیں نم ہوجاتیں۔ اور کبھی کبھی جب وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنی صورت دیکھتا تو اس کے خیالوں ہی خیالوں میں ایک دم سے شاہینہ کی تصویر بھی آئینے میں ابھر کر آتی اور اسے وہ لمحہ یاد آتا جب شاہینہ اس کے ساتھ اس کے چہرے سے چہرہ ملا کر موازنہ کرنے لگی تھی کہ کون زیادہ خوبصورت ہے اور روشو کا کہنا تھا کہ شاہینہ زیادہ خوبصورت ہے اور اسی تکرر کے دوران اس نے ایک متنازع بات کہہ دی تھی جس کی وجہ سے شاہینہ بہت چڑ گئی تھی اور غصے میں پاؤں پٹکنے لگی تھی اور روشو سوچ رہا تھا کہ غصہ کرتے ہوئے وہ اور بھی خوبصورت ہوگئی تھی۔

"تیار ہوجا کل تجھے ایک جگہ لے جانا ہے"۔ ایک ویک اینڈ کی شام کو استاد نے روشو کو تھپکی دے کر معنی خیز انداز میں کہا اور روشو اپنے خیالات کے سمندر سے ڈبکی لگا کر جیسے باہر آگیا۔

"کہاں۔۔۔" روشو نے تجسس سے پوچھا۔

"بس یہ سسپنس ہے"۔ استاد نے بانکی کو آنکھ ماری۔" جہاں بانکی لے جائے گی"۔
"لیکن پھر بھی۔۔۔۔" روشو کا تجسس بڑھ رہا تھا۔
"ارے صبر کر۔۔۔۔۔ بانکی تجھے غلط جگہ نہیں لے جائے گی بس ایک رات کی بات ہے"۔
استاد نے روشو کو تسلی دی اور بانکی کو ایک مرتبہ اور آنکھ مار دی۔
وہ رات روشو نے بہت کشمکش میں گزاری استاد کی پہیلی اس کی سمجھ میں آ بھی رہی تھی اور نہیں بھی آ رہی تھی بہرحال اگلے دن سہ پہر کو استاد ٹھیک ٹھاک طریقے سے تیار ہو گیا بانکی بھی بن ٹھن کے نکلی اور روشو سے بھی استاد نے ٹھیک ٹھاک کپڑے پہننے کو کہا لیکن پھر خود ہی کہنے لگا۔ "خیر ہے یہ کھوتی کا پتر کچھ بھی پہن لے ہر لباس میں جچتا ہے"۔
اور یہ تھی بھی حقیقت کہ روشو ہر لباس میں جچتا تھا اور اس دن وہ استاد اور بانکی کے ساتھ جس گھر میں گیا تھا تو وہ دونوں کے درمیان بیٹھا کسی پرستان کا شہزادہ لگ رہا تھا۔ تین یہ تھے دو میاں بیوی میزبان تھے جو استاد اور بانکی کے ساتھ موسم اور سیاست پر بات کر رہے تھے اور وقفہ وقفہ سے روشو کی جانب بھی مخاطب ہو جاتے تھے۔ پھر ایک خوبصورت دراز قد حسین لڑکی جب مشروبات کی ٹرے لے کر داخل ہوئی تو بات روشو کی سمجھ میں آ گئی اور اس کا شبہ یقین میں بدل گیا۔
"یہ ہماری بیٹی ہے۔۔۔۔۔" صاحب خانہ نے استاد سے تعارف کرایا۔ "عابدہ"۔
"ماشاءاللہ" استاد نے کہا۔
"آپ تو جانتی ہیں اسے"۔ خاتون خانہ بانکی سے مخاطب ہوئی
"کمال کرتی ہیں اب کیا مجھ سے بھی تعارف کرانے کی ضرورت ہے"۔ بانکی نے لڑکی کو دعا دی۔ لڑکی نے شربت کا گلاس استاد کو دیا، بانکی کو پیش کیا اور پھر روشو کے سامنے ٹرے کر دی۔ گلاس اٹھاتے ہوئے ایک لمحے کے لئے روشو اور عابدہ کی نظریں ملیں پتہ نہیں روشو نے اندر سے کیا محسوس کیا۔ بے پناہ حسین لڑکی تھی لیکن عابدہ ایک جھٹکا کھا گئی۔ جیسے مقناطیس نے لوہے کو ہلا دیا ہو۔ لڑکی شربت دے کر واپس اندر کمرے میں چلی گئی لیکن جاتے جاتے دروازے کے پاس پہنچ کر اس کے وجود میں پھر تناؤ پیدا ہوا اس نے ایک نگاہ دوبارہ روشو کو دیکھا اور جلدی سے اندر چلی گئی۔
"سنا کیسی تھی لڑکی۔۔۔۔۔" واپسی پر جب کار میں بیٹھے ہوئے تھے تو استاد نے روشو سے پوچھا روشو کار کی عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کچھ نہ بولا اور استاد مزید کہنے لگا۔
"اس نے تو بانکی کا بھی ریکارڈ توڑ دیا ہے قسم خدا کی میں نے جب پہلی مرتبہ بانکی کو دیکھا

تھا تو دل نکال کر لے گئی تھی"۔اس نے بانکی کی طرف مڑ کے دیکھا اور از راہ شرارت بولا۔" دل تو یہ آج بھی نکال کے لے جاتی ہے"۔

"اچھا بس بس۔اپنا ہی قصہ لے کے بیٹھ جاتے ہو مطلب کی بات کرو روشو سے"۔ بانکی نے استاد کو ٹوک کر کہا۔

"مطلب کی بات تم ہی کرو۔ تم ہی نے چھانٹ کے نکالی ہے لڑکی۔۔۔۔۔۔" استاد بولا۔

"روشو ہم نے یہ لڑکی تمہارے لئے منتخب کی ہے۔اس کے ساتھ تمہاری جوڑی خوب جچے گی۔ میں نے کوئی پندرہ لڑکیاں دیکھی ہوں گی جب جا کے اس کا انتخاب کیا ہے"۔ بانکی نے تمہید باندھی"۔ بس تم ہاں کرو تو میں بات آگے بڑھاتی ہوں"۔

"ناں کیوں کرے گا میرا بیٹا۔۔۔۔۔۔" استاد نے شفقت سے کہا۔

"نہیں استاد۔۔۔۔" روشو کچھ دیر خاموش رہا اور پھر قدرے توقف سے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بولا۔" میں شادی نہیں کروں گا"۔

روشو کے اس صاف انکار سے استاد اور بانکی دونوں سناٹے میں آگئے جیسے روشو کے جواب سے انہیں بھی ایک جھٹکا لگا ہو وہ راستے بھر چپ رہے۔رات کو جب کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہوئے تو استاد نے پھر خاموشی توڑی۔

"کیوں انکار کر رہے ہو۔۔۔۔؟استاد نے پوچھا۔لیکن روشو چپ رہا۔

"کیا لڑکی پسند نہیں آئی"۔ بانکی نے دریافت کیا۔

"یہ بات نہیں ہے استانی جی۔ میں نے پسند یا ناپسند کی نظر سے اسے دیکھا ہی نہیں ہے"۔روشو نے بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں؟"استاد نے پوچھا روشو پھر خاموش رہا"۔کیا کوئی اور لڑکی دیکھ رکھی ہے تم نے"۔ استاد نے اس کی خاموشی پر دوسرا سوال کیا۔روشو پھر بھی کچھ نہیں بولا جیسے استاد نے بے معنی سوال کیا ہو۔

"کہیں عشق کر رہے ہو۔۔۔۔؟استاد نے پوچھا۔

"نہیں استاد ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔بات یہ ہے کہ۔۔۔۔وہ کہتے کہتے کچھ نہ کہہ سکا اور کھو سا گیا۔ جیسے ماضی میں گم ہو گیا۔ مردم شناس استاد نے اس کے چہرے پر ماضی کی کھلی کتاب پڑھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا شاہینہ۔۔۔۔" استاد نے اشارتاً آدھی ہی بات کہی تو روشو چونک گیا جیسے اسے بجلی کا

کرنٹ چھو گیا ہو شاہینہ کے نام پر اس کا چہرہ جذبات سے پر ہو گیا اور آنکھیں بھر آئیں۔
"دیکھو روشو۔۔۔۔۔" استاد نے بہت ٹھنڈے دھیمے لہجے میں سمجھانا شروع کیا۔ "تم ذاتی طور پر ایک عملی آدمی ہو جس طرح زندگی تم نے گزاری ہے جن راستوں پر تم چلے ہو جن جن مشکلات سے گزرے ہو یہ سب پریکٹیکل لائف ہے لیکن جہاں تک شاہینہ کا معاملہ ہے مجھے حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ تم خوابوں کی دنیا میں بس رہے ہو۔"
"جس سرزمین پر اس وقت ہم اور آپ بات کر رہے ہیں استاد جی وہ بھی کبھی کسی کا خواب اور خیال رہی ہے"۔ روشو معنی خیز انداز میں بولا اور استاد نے بروقت جواب دیتے ہوئے کہا "لیکن یہ اپنے آپ حقیقت نہیں بنی اسے حقیقت بنانے کے لئے بڑی قربانیاں دی گئی ہیں بڑی جدوجہد کی گئی ہے اس خواب کی تعبیر کو ڈھونڈا گیا ہے تلاش کیا گیا ہے" استاد بولتے بولتے جذباتی ہو گیا اور غصے بھری نظروں سے روشو کی طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہنے لگا" ۔ تم نے کبھی ڈھونڈا ہے اپنے اس خواب کو؟ شاہینہ کی مورتی بنا کر اسے من مندر میں بٹھا دیا اور جب فرصت ملی اس کی پوجا شروع کر دی۔ یہ بات تم جیسے عملی آدمی کو زیب نہیں دیتی کیا تم ایک مرتبہ بھی شہر گئے۔ گزرے بھی اس کوٹھی کے سامنے سے۔ کیا کبھی ایک مرتبہ بھی اسے ٹیلی فون۔۔۔۔"
"ٹیلی فون۔۔۔۔" وہ سوچ میں پڑ گیا جب وہ شاہینہ کی کوٹھی میں تھا تو اس نے کئی بار ٹیلی فون وصول کئے تھے ایک سے زیادہ ٹیلیفون تھے چوہدری صاحب کی کوٹھی میں لیکن اس نے کبھی ان کے نمبر جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور استاد کا کہنا بھی درست ہے کہ اس نے دوبارہ شاہینہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ بلکہ ایک مرتبہ جب وہ شہر گیا تھا تو چوک پہ کھڑے ہو کر کافی دیر تک دور کوٹھی کی طرف جانے والے راستے کو دیکھتا رہا تھا جہاں سے اسے کوٹھی کا ایک دھندلا سا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس کا جی چاہا تھا کہ وہ محض اپنے دل کی تسکین کے لئے ایک مرتبہ کوٹھی کے سامنے سے گزر جائے شاید کہ کوئی نظر آجائے۔ لیکن پھر خود ہی اسے خوف اور خفت کا احساس ہوا کہ اگر کوئی نظر آ گیا تو کیا ہوگا وہ کیا کہے گا اور کیا کرے گا۔ یہی سوچ کر وہ چوک سے ہی واپس آگیا تھا لیکن یہ بہت پہلے لڑکپن کی بات ہے آج استاد کی باتوں سے وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا اور خوف و خفت کا احساس اس کے اندر سے جاتا رہا تھا اگر وہ کسی کو چاہتا ہے عشق کرتا ہے اور بقول استاد کے اس کے من مندر میں کسی کی مورتی نصب ہے تو اسے ہر قسم کی مصلحت اور خوف سے بے نیاز ہو کر جراءت کا مظاہرہ کرنا ہوگا وہ رات بھر اس قسم کے خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا اور صبح اس نے گیراج کھولنے کے بعد لڑکوں کو کام سمجھایا اور بڑھیا فریدے جب

چبوترے پر کھڑی گالی بک رہی تھی تو اس نے بڑھیا کو گالی بکتے چھوڑ کر گیراج سے ایک گاڑی نکالی اور لڑکوں سے کہا کہ۔

"میں ایک لمبی ڈرائی پر جا رہا ہوں۔۔۔۔۔۔" اور پھر آخری اسٹاپ سے شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔

ایک طویل ڈرائیو کے بعد جب وہ شہر کی ان حدود میں داخل ہوا جہاں کوٹھی تھی تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا آٹھ دس برس کا عرصہ دیکھا جائے تو بہت کم ہے اور دیکھا جائے تو بہت زیادہ بھی ہے جیسے لمحے بیت گئے جیسے صدیاں بیت گئیں۔ اگر لمحے بیت گئے تو ہر چیز ویسی کی ویسی ہونی چاہئے اور اگر صدیاں بیت گئیں تو پھر سب کچھ بدل گیا ہو گا۔ پتہ نہیں شاہینہ پہچانے گی بھی یا نہیں۔ ساجدہ بیگم کے رویے میں نہ جانے کتنی تبدیلی آچکی ہوگی۔ چوہدری صاحب تو۔۔۔۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔۔۔" اس نے خود ہی سوچا کہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے وہاں جا کے ہی معلوم ہو گا کہ کون کیسا ہے۔ لیکن وہ بڈھا چوکیدار جو گیٹ پر ہوتا تھا معلوم نہیں ہو گا یا نہیں اور پہچانے گا یا نہیں اور اگر کوئی دوسرا چوکیدار ہو گا تو وہ اندر بھی نہیں جانے دے گا۔

"اللہ مالک ہے"۔ اس نے پھر سوچا کوئی بھی گیٹ پر ہو کوٹھی کے اندر جانا کوئی مسئلہ نہیں کہ اس کوٹھی کے چپے چپے پر روشو کے قدموں کے نشان موجود ہیں اور اس کی یادوں کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وہ اسی طرح کی گتھیاں الجھاتا سلجھاتا ہوا اس چوک پر پہنچا جہاں سے ایک سڑک سیدھی کوٹھی کی جانب جاتی تھی اس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ جگہ آگئی کہ جہاں کوٹھی تھی۔ لیکن وہاں کوٹھی نہیں تھی۔ اور یہ دیکھ کر روشو کا دل دھک سے رہ گیا اسے یوں لگا جیسے اس کے دل و دماغ میں ایک دھماکہ ہو گیا ہو۔ اور اس دھماکے میں اس کے حسین خواب و خیال اور اس کے خوابوں کی تعبیر کے محل کے پرخچے اڑ گئے ہوں۔ کوٹھی کو مسمار کر دیا گیا تھا اور اب وہاں وسیع و عریض پلاٹ کے اوپر بے شمار مشینیں لگی ہوئی تھیں سینکڑوں آدمی کام کر رہے تھے کوئی بڑا پلازہ بن رہا تھا اور ایک ہنگامہ ہر طرف بپا تھا۔

"یا اللہ کوٹھی کہاں چلی گئی۔ وہ لوگ کیا ہوئے کہاں گئے"۔ روشو گاڑی سے نیچے اتر کر حیرت زدہ انداز میں زیر تعمیر عمارت اور اس عمارت پہ لگی ہوئی مشینری اور کام کرنے والے آدمیوں کو دیکھنے لگا۔

"یہ کوٹھی۔۔۔۔" اس نے عمارت پر کام کرنے والے کسی سپروائزر وغیرہ سے آدھی بات کی۔

"کوٹھی۔۔۔" آدمی نے حیرت زدہ انداز میں پوچھا۔

"جی کچھ نہیں۔۔۔" فوراً روشو کو اپنی حماقت کا احساس ہوا اور وہ آگے بڑھ گیا پھر وہ اسی

پلاٹ پر کنسٹرکشن کمپنی کے بکنگ آفس میں گیا بہت ٹھیک ٹھاک قسم کا بکنگ آفس تھا کرسیاں میز صوفے پڑے تھے۔ تین چار ٹیلی فون میزوں پر رکھے تھے اسٹاف کے تین آدمی تھے ایک دو آدمی نقشوں کی مدد سے بلڈنگ کے محل وقوع کو سمجھ رہے تھے جو شاید بکنگ کرانے کے لئے آئے تھے

"کیا بن رہا ہے صاحب یہاں پر ۔۔۔۔۔" ایک بندہ جب فارغ ہوا تو روشو اس کے سامنے جا بیٹھا اور از راہ معلومات پوچھنے لگا۔

"یہ دکانیں ہیں صاحب نیچے۔ اوپر دفاتر ہیں"۔ بکنگ ایجنٹ نے بتایا اور پھر مختلف معلومات فراہم کرنے کے بعد ایک پمفلٹ اس نے نکال کر روشو کو دیا۔ "یہ رکھ لیجئے اس میں تمام تفصیلات درج ہیں"۔ روشو نے پمفلٹ اپنے سوٹ کیس میں رکھا اور ادھر ادھر دیکھ کر حرف مدعا پر آیا۔

"یہ بتایئے پہلے یہاں ایک کوٹھی ہوتی تھی"۔

"ہوتی تو تھی شاید ۔۔۔۔" ایجنٹ نے جواب دیا جیسے اس کے لئے یہ کوئی خاص بات نہ ہو۔

"اس کوٹھی کے جو مالکان تھے ان کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں کیا؟" روشو نے بہت تکلف سے پوچھا۔

"نہیں صاحب میں تو ملازم ہوں۔ ابھی ابھی آیا ہوں یہاں"۔ ایجنٹ بولا۔

"کون بتا سکے گا ۔۔۔۔" روشو نے تجسس سے پوچھا۔

"ہمارے قاضی صاحب پرانے آدمی ہیں یہ بکنگ آفس ایجنسی انہی کی ہے انہیں معلوم ہوگا"۔ ایجنٹ نے دور کونے میں آرام کرسی پر بیٹھے ٹیلی فون میں مصروف ایک صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جب اس نے قاضی صاحب سے بات کی تو وہ بولے

"نور دین صاحب پرانے بروکر ہیں یہاں کے۔ یہ شاید کچھ بتا سکیں"۔ قاضی صاحب نے ایک ادھیڑ عمر کے بروکر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جو ادھر ادھر گاہکوں میں منڈلا رہا تھا۔

"چوہدری صاحب کا تو انتقال ہو گیا تھا ۔۔۔۔" بروکر نے بتایا۔ "کوٹھی ان کی بیگم نے سیٹھ عثمان کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔ عثمان سیٹھ سے سیٹھ ستار نے یہ پلاٹ خریدا۔ سیٹھ ستار نے ہارون بھائی کے پاس فروخت کیا اب ہارون بھائی اس پر کنسٹرکشن کرا رہے ہیں"۔ دلال نے پوری پوتھی بتا دی جس سے روشو کو کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ تو صرف کوٹھی کے مکینوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اسے ساجدہ بیگم کے کوائف سے دلچسپی تھی تاکہ شاہینہ کا پتہ معلوم ہو سکے۔

"چوہدری صاحب کی ایک بیگم بھی تو تھی ۔۔۔۔" روشو نے حرف مدعا پر آتے ہوئے پوچھا۔

"چوہدری صاحب کی دو بیگمیں تھیں ایک نے خود کشی کر لی تھی"۔ بروکر نے مکمل معلومات فراہم کرتے ہوئے کہا۔

اور دوسری ساجدہ بیگم ----"

"آپ کو تو برابر معلومات ہے -----"

"معلومات تو ہے لیکن میں کافی عرصہ باہر رہا ہوں۔ اس لئے ان کا کچھ اتا پتہ نہیں معلوم۔"

روشو نے خاندان سے وابستگی ظاہر کرنے کے انداز میں کہا۔

"اتا پتہ تو میرے کو بھی معلوم نہیں۔ لیکن سنا ہے دوسری بیگم نے شادی کر لی ہے کوئی جوان چھوکرا پکڑ لیا اور نئے خاوند کے ساتھ کینڈا چلی گئی۔ ادھر پلاٹ کا پانی سا بھی بہت مل گیا تھا بینک میں ڈیپازٹ کر دیا ہو گا"۔ بروکر نے مقدور بھر اطلاع فراہم کرتے ہوئے کہا۔

"ا ن ی ایک بیٹی بھی تھی شاہینہ -----" روشو اصل مسئلے پر آیا۔

"ابھی اتنی کھبر میرے کو نہیں ہے۔ ماں گئی ہے بیٹی بھی چلی گئی ہو گی"۔ بروکر نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا اور پھر پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے مال وال لینا ہے پارٹی سے -----"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں بہرحال آپ کا شکریہ"۔ روشو نے بروکر کا شکریہ ادا کیا اور بہت ہی مایوس اور نامراد واپس آگیا۔ اور جب رات کو استاد کو تمام صورت حال معلوم ہوئی تو استاد نے ڈھارس دی استانی نے بھی سمجھایا اور پھر استاد نے اس رات پھر اسے نہایت شفقت کے ساتھ سمجھاتے ہوئے گاڑی اور ڈرائیونگ کی مثال دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو روشو ماضی بیت چکا ہوتا ہے۔ زندگی حال یا مستقبل کا نام ہے۔ ماضی کا نہیں تم جب گاڑی چلاتے ہو تو منزل تک پہنچنے کے لئے تمہیں آگے دیکھنا پڑتا ہے پیچھے نہیں۔"

"پیچھے بھی دیکھنا پڑتا ہے استاد -----" وہ ترنت بولا۔ "آپ نے گاڑی میں اسٹیرنگ کے عین اوپر ایک ریئر ویو مرر لگایا ہوتا ہے یہ آئینہ پیچھے دیکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ گزری ہوئی سڑک پیچھے آنے والی سڑک ماضی"۔ روشو نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ یہ شیشہ پیچھے دیکھنے کے لئے ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار ٹرن لیتے وقت اوور ٹیک میں یا ریورس وغیرہ میں ہمیشہ اسی شیشے میں نہیں الجھے رہتے اگر ہمیشہ اسی شیشے میں دیکھو گے تو آگے نہیں جا سکو گے۔ حادثہ ہو جائے گا۔"

"یہ گھما پھرا کے بات کرتا ہے روشو۔ میں صاف بات کرنے کی عادی ہوں"۔ ابکے بانکی

بولی۔ "کر لو شادی"۔

"نہیں استانی جی۔۔۔۔" وہ آبدیدہ سا ہو گیا اس کی آواز بھرا گئی۔ "میں نے تو ابھی اپنا مشن شروع بھی نہیں کیا ہے۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ بہت کچھ سیکھنا ہے۔ بہت کچھ پڑھنا ہے۔ اور کچھ کر کے دکھانا ہے شادی کرنے کے لئے ابھی عمر پڑی ہے۔ آپ پلیز کتاب کے اس باب کو فی الحال بند رکھیں۔" وہ التجا کرتے ہوئے بولا۔۔۔۔

"میں شادی نہیں کروں گا۔۔۔۔" اس نے حتمی انداز میں کہا اور پھر اس کے بعد استاد یا بانکی نے روشو کے سامنے دوبارہ شادی کا مسئلہ کبھی نہیں چھیڑا۔

" پھر کیا ہوا کہ ایک دم سے جیسے اداسیوں کے بادل چھا گئے اور روشو کی زندگی کی رواں دواں گاڑی سورج کی خوشگوار دھوپ اور تمازت سے نکل کر مایوسیوں کی چھاؤں میں آکر رک گئی۔ وہ اب تک امید پر جی رہا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ ہر آنے والا دن اس کے لئے اچھا ثابت ہو رہا ہے اور اس کی پشت پر لگا ہوا فقیری کا لیبل اس کی انتھک محنت اور لگن سے گھس گھس کر معدوم ہو گیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آنے والی کل اس کی ہو گی اور اس کے لئے کوئی اچھا پیغام لائے گی اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ فقیروں کی بستی سے فرار ہو کر اس نے اچھا کام کیا ہے کہ کم از کم اس دنیا سے ایک بھکاری تو کم ہو گیا ہے لیکن فقط ایک بھکاری کے کم ہونے سے بھیک کے لئے پھیلے ہوئے ان گنت ہاتھ تو ختم نہیں ہوئے وہ پھیلے ہوئے ان ہاتھوں کو بھی ختم کرنا چاہتا تھا کہ فقیر بھی اگر چاہے تو باعزت طور پر زندہ رہ سکتا ہے اور اس مشن کی تکمیل کے لئے شاہینہ اس کی بہترین ساتھی اور مددگار ہو سکتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ شاہینہ اسے ایک نہ ایک دن ضرور مل جائے گی اور اگر اسنے شاہینہ کو تلاش نہ کیا تو شاہینہ اسے ڈھونڈتی ہوئی آنکلے گی لیکن اب تو وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ کوٹھی پر چلنے والے بلڈوزر کو دیکھ کر آنے کے بعد وہ بہت اداس اور بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ آخر اس کی زندگی کا انجام کیا ہو گا۔ وہ تو بڑا آدمی بن کر ملک اور قوم کی خدمت کرنے کے جذبے کے ساتھ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر فقیروں کے نرغے سے فرار ہوا تھا۔ ورنہ ماں باپ جیسے بھی ہوں انہیں کوئی بھی خوشی سے تو نہیں چھوڑتا۔ وہ تو ایک ڈاکٹر ایک انجینئر بننا چاہتا تھا ایک وکیل ایک سیاست دان بن کر ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے پر فریب خواب بھی اس نے دیکھے تھے لیکن ابھی تک وہ صرف میٹرک کر سکا ہے اور ایک چھوٹا موٹا کار میکینک بن سکا ہے کیا یہ سب کچھ کافی ہے۔

"ہاں فی الحال یہ سب کچھ کافی ہے"۔اس کے دل کے اندر سے خود ہی اس کی تشویش کے بارے میں جواب نکلا "یہ کافی ہے کہ تم نے بھیک کے خلاف بغاوت کی اور عزت کے ساتھ اپنی محنت سے روٹی کمانے کا ایک ذریعہ پیدا کیا اور موٹر میکینکوں کی دنیا میں صرف ایک میکینک کا نہیں ایک دیانتدار میکینک کا اضافہ کیا ہے اور تمہاری دیانتداری کے چرچے اس وقت سارے شہر میں ہیں"۔ یہ اس کے اندر کی آواز تھی۔

اور یہ حقیقت تھی کہ موٹر میکینکوں کی دنیا میں روشو کا بڑا چرچا تھا اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا جو بھی گاہک ایک دفعہ اس سے گاڑی بنواتا وہ نہ صرف خود دوبارہ اس کے پاس گاڑی بنوانے کے لئے آتا بلکہ اپنے ساتھ اور دوستوں کو بھی روشو کے گیراج پر لے آتا۔ وہ شہر کا بہت قابل اعتبار اور اچھی ساکھ رکھنے والا میکینک مشہور ہو گیا تھا اور یہ صلاحیت کچھ تو اس کے اپنے اندر تھی لیکن کچھ استاد جمیل کی تربیت کا بھی اثر تھا۔ استاد جمیل کی روشو کے لئے تین حیثیتیں تھیں وہ اس کا استاد تھا باپ تھا اور نہایت بے تکلف اور بعض اوقات فحش مذاق کرنے والا دوست بھی اور روشو کی زندگی میں ان دنوں جو اچانک مایوسی اور اداسی آگئی تھی اس کا سبب صرف شاہینہ کی طرف سے ناامیدی ہی نہیں تھی استاد کے رویے میں تبدیلی بھی روشو کے لئے تکلیف کا باعث بن رہی تھی۔ استاد جمیل ایک دم سے خاموش ہو گیا تھا اور وہ بھی روشو کی طرح چپ چپ اور بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ استاد کے قہقہے، چٹکلے، لطیفے، گالیاں، بذلہ سنجی، چھیڑ چھاڑ اور دوستوں کی محفلوں میں چہکنا سب بند ہو گیا تھا اور یہ تبدیلی استاد کے رویے میں اچانک آئی اور روشو محسوس کرنے لگا تھا کہ شاید اس کے شادی سے انکار کی وجہ سے استاد نے اپنا رویہ بدلا ہے اور اس کے لئے کبھی کبھی وہ احساس جرم میں بھی مبتلا ہو جاتا تھا اور بعض اوقات اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ استاد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے شادی پر رضامندی ظاہر کر دے۔ لیکن اسے حیرت بھی تھی کہ استاد اس کے شادی کے انکار پر ناراض تو ہو سکتا ہے لیکن اس پر اس قدر شدید رد عمل کیسے ہو گیا کہ کئی کئی روز شیو نہیں کرتا اور بعض اوقات بات کا جواب بھی نہیں دیتا اور دوستوں کے ساتھ اکھڑا اکھڑا سا رہتا ہے۔

"استاد مجھ سے اگر کچھ کوتاہی ہو گئی ہے تو میں معافی مانگتا ہوں۔" ایک دن رات کو جب گیراج بند کرنے کا وقت تھا اور دکان میں استاد اور روشو کے سوا کوئی نہیں تھا تو روشو نے ہاتھ جوڑ کر استاد سے معافی مانگی۔

"نہیں روشو۔ تم سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی"۔ استاد نے رقت بھری آواز میں کہا اور روشو

کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھوں کو آہستہ سے چوم کر انہیں کھول دیا۔

"کیا میری شادی۔۔۔۔"

"نہیں روشو تمہاری شادی کی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔۔"استاد نے اس کی بات کاٹ کر کہا "مجھے خوشی ہے کہ تمہارے دل میں محبت کی ایسی شمع روشن ہے کہ اسے تمہاری چڑھتی جوانی کا جنون، وقت کی آندھی کوئی چیز بجھا نہیں سکی۔۔۔۔ بانکی کے دل میں بھی محبت کی ایسی ہی شمع روشن تھی"۔استاد چپ ہوگیا اور آنسو پونچھ کر کہنے لگا۔"شمع کیا اس کے سینے میں تو محبت کی آگ کی بھٹی تھی۔۔۔۔۔"اس کی آواز رندھ سی گئی اور وہ ایک دم سنجیدہ ہوکر روشو کی جانب مڑا اور بولا۔"پتہ ہے وہ اپنے ماں باپ کی اکیلی بیٹی تھی۔بڑے بڑے رشتے اس کے لئے آئے لیکن انکار کر دیا پھر شہر کے ایک بہت بڑے کروڑ پتی بزنس مین کے بیٹے سے اس کا رشتہ طے ہوگیا لیکن بانکی نے وہاں بھی انکار کر دیا اور میرا بازو پکڑ کر تن کر بولی۔"شادی کروں گی تو جمیل سے، نہیں تو نہیں کروں گی۔"اس کا فیصلہ خاندان والوں پر توپ کے گولے کی طرح برسا باپ نے طوفان بن کر کہا اگر اس فیصلے کے ساتھ میری دہلیز پار کرو گی تو پھر اس گھر میں داخل نہیں ہونا۔اور پتہ ہے روشو۔"استاد رو پڑا۔ ،،رآنسو ضبط کرتے ہوئے بولا۔"اس نے دہلیز پار کرنے میں ایک منٹ نہیں لگایا اور پھر دوبارہ اپنے باپ کے گھر کا منہ نہیں دیکھا۔پوری زندگی اتنی بڑی قربانی۔۔۔۔ باپ کو اس نے میرے لئے چھوڑ دیا۔ میں کیا ہوں۔۔۔۔ایک میکینک۔۔۔ایک معمولی موٹر میکینک۔۔۔۔ میری اوقات ہی کیا ہے"۔اس کی آواز پھر بیٹھ گئی۔

"استاد۔۔۔۔۔استاد یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"روشو پریشان ہوگیا۔"استانی نے کچھ کہا ہے کیا۔۔۔"

"نہیں بیٹے استانی بے چاری کیا کہے گی"۔ضبط کے باوجود استاد کے آنسو بہہ نکلے۔استانی تمہاری اب چند روز کی مہمان ہے"۔اس کے جیسے اعصاب جواب دے گئے۔

"استاد۔۔۔۔"روشو چونکا۔"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔"

"ہاں روشو وہ کینسر۔۔۔۔۔"آواز استاد کے حلق میں پھنس گئی۔اور روشو سناٹے میں آگیا

"کیا استانی جی کو معلوم ہے۔۔۔۔"روشو کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔

"نہیں بیٹے اسے کچھ معلوم نہیں وہ کچھ نہیں جانتی وہ بہت معصوم ہے"۔اور پھر استاد روشو کو گلے لگا کے جیسے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس رات روشو جب گھر پہنچا تو استاد بانکی کو غیر مہذب لطیفے سنا سنا کر ہنسا رہا تھا اور ساتھ

ساتھ خود بھی قہقہے لگا رہا تھا۔

"آجاؤ روشو۔۔۔۔ ٹھیک وقت پر آئے ہو۔" وہ روشو کو دیکھ کر بولا۔ "سنو تم بھی سنو" اور اس نے سردار اور سردارنی کا ایک لطیفہ روشو کے سامنے سنا دیا۔ جسے سن کر روشو جھینپ گیا۔ استانی نے بھی ہنسی ضبط کی لیکن استاد خود کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ اور پھر روشو سے داد لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔ کیسا۔۔۔۔؟"

"شرم کرو۔۔۔۔ بچے کے سامنے تو کم از کم سنجیدہ رہا کرو"۔ بانکی نے ڈانٹ پلانے کے انداز میں کہا۔

"یہ بچہ ہے۔۔۔۔۔۔" استاد بولا"۔ جب تم نے میرا دل نکال لیا تھا بانکی تو میں اس کی عمر کا تھا۔ کیا میں بچہ تھا ہیں۔۔۔۔۔"

"اب تو بوڑھے ہو گئے ہو۔۔۔۔" بانکی نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔ "اب کچھ بدلو اپنے آپ کو"۔

"کیا کہا بوڑھا ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔۔" استاد نے بڑھ کر بانکی کی کلائی موڑی۔ "بولو اب بولو"۔

"اوئی اللہ یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔" وہ کسمسائی۔

"تردید۔۔۔۔۔ کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔" استاد نے بڑے رومانوی انداز میں کہا۔

"اللہ مجھے چھوڑ دو جمیل میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔ وہ بے چین سی ہو کر بولی اور روشو نے غور سے استانی کو دیکھا تو اسے پہلی مرتبہ استانی کے گلے پر سوجن سی دکھائی دی اور استاد جو چند روز سے اسپتال میں بجلی کے جھٹکے لگوانے لے جا رہا تھا اس کی وجہ سے اس کی گردن اور ٹھوڑی کے پاس جلد کے کچھ حصے پر کھال جلی ہوئی لگتی تھی جس کا پہلے کبھی روشو نے نوٹس نہیں لیا تھا۔

"کیا بات ہے جانی۔۔۔" استاد نے بانکی کی کلائی چھوڑ دی اور سنجیدگی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے تکلیف ہے مجھے یہاں پر کافی درد ہو رہا ہے"۔ اس نے گلے پر ہاتھ لگا کر کہا۔ "بتانا تھا ناں ڈاکٹر کو مجھ بخار رہتا ہے ہر وقت۔۔۔۔ یہ دیکھ میرا بدن کتنا گرم ہے"۔

"ارے چھوڑ بانکی۔۔۔۔" وہ لاابالی بن کر بولا بدن تو تیرا جنم جنم کا گرم ہے اور یہی گرمی تو زندگی ہے بخار وخار کوئی نہیں تجھے۔۔۔۔۔۔ مجھے تو ہمیشہ تمہارا بدن تپا ہوا لگتا تھا۔"

"جمیل یہ مذاق نہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ ہلکے ہلکے انداز میں کھانسی اور

کھانسی کو روکتے ہوئے بولی۔ "ڈاکٹر کیا کہتے ہیں ہے کیا مجھے"۔

"بس ڈاکٹر کہتے ہیں ایک ہفتے بجلی کے جھٹکے اور لگوالو بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی" اس نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا اور پھر ایک دم سے جیسے چھیل چھبیلا بن کر شرارت سے بولا۔ "ویسے اگر ایک ہفتے کے لئے میرے ساتھ کہیں شہر سے باہر ہنی مون پر چلو تو تمہاری ساری بیماری نکال دوں گا"۔ پھر ہلکی سی آنکھ مار کو بولا "کیا خیال ہے"؟

"شرم کرو شرم۔ اس غریب نے نظریں جھکالی ہیں"۔ وہ روشو کی طرف اشارہ کر کے بولی اور روشو نے واقعی سر جھکا دیا تھا۔ لیکن شرما کر نہیں بلکہ استاد جس طریقے سے اپنے اوپر جبر کر کے زبردستی ہنس رہا تھا اور استانی کے ساتھ ایک ڈرامہ رچا رہا تھا۔ وہ روشو میں دیکھنے کی سکت نہیں تھی۔۔ اس رات کھانے کے دوران بھی استاد بانکی کے ساتھ اسی طرح چھیڑ چھاڑ کر کے اسے ہنساتا رہا اور روشو کے دل پر جیسے چھریاں چلتی رہیں۔

"یہ بجلیاں کیسی ہیں استاد۔۔۔" ایک ہفتہ جب مزید بانکی کو بجلی کے جھٹکے لگے تو ایک دن روشو نے تشویش سے پوچھا کیونکہ ان جھٹکوں کی وجہ سے دھیرے دھیرے بانکی کا چہرہ مسخ ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ بجلیاں آسمانی بجلیاں ہیں روشو۔ جو میرے اوپر گر رہی ہیں"۔ استاد تڑپ کر بولا۔ "ایک دن اتنے زور سے یہ بجلی گرے گی کہ میں ختم ہو جاؤں گا"۔ وہ آبدیدہ ہو کر بولا۔

اور پھر بجلی گر ہی گئی۔ اس رات روشو دن بھر کا تھکا ہارا بڑی گہری نیند سو رہا تھا کہ دھیرے دھیرے استاد اس کے کمرے میں آیا اور آہستہ سے اس کے بدن کو چھوا۔

"استاد۔۔۔۔" روشو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"اٹھ جاؤ روشو۔۔۔ آج آخری بجلی گر گئی ہے"۔ استاد نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

"تیری استانی مر گئی۔۔۔۔۔"

اور روشو نے یوں محسوس کیا کہ جیسے ایک بار اور بجلی گر گئی ہے آخری بجلی کے بعد بجلی۔

(۱۷)

بانکی کی بیماری نے استاد کو خاموش اور اداس کر ہی دیا تھا۔ لیکن بانکی کی موت نے استاد کو جیسے بالکل پتھر کا بت بنا دیا۔ اور یہ صورت حال روشو کے لئے بہت پریشان کن اور تکلیف دہ تھی۔ بانکی کی موت کے بعد سے استاد نے داڑھی بڑھالی تھی۔ اور گیراج کے کام میں قطعاً دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ وہ اب گیراج پر آتا بھی نہیں تھا۔ اور کبھی آ بھی جاتا تو کونے میں چپ چاپ اسٹول پر بیٹھ جاتا اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھیں جھپکانے بغیر خاموش بے حس و حرکت کسی ایک ہی زاویئے سے ایک ہی نقطے پر پہروں دیکھتا رہتا۔ بعض اوقات وہ بالکل ایک مورتی کی طرح لگتا جس کے وجود میں بڑے بڑے دھماکے پر بھی جنبش نہ ہوتی ایسے میں اگر روشو کسی گاڑی میں الجھا ہوتا اور کوئی فنی یا ٹکنیکی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی اور وہ استاد سے پوچھنا چاہتا تو باوجود کوشش کے استاد سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی ایک آدھ دفعہ ہمت کر کے روشو نے استاد سے کچھ پوچھا بھی تو استاد نے کوئی جواب نہ دیا روشو کی بات سن کر اپنی گردن کو دھیرے دھیرے روشو کی جانب موڑا، اداس اور بے روح آنکھوں سے ایک نگاہ روشو کو دیکھا اور کچھ بولے بغیر واپس اسی زاویئے پر پہنچ گیا جہاں اس کی نگاہ منجمد تھی اور پھر پتھر کا بت بن گیا اس کے بعد روشو استاد سے کچھ کہنے سننے کی ہمت ہی نہ کر سکا۔

استاد کے یار دوست بھی دکان پر آتے اور استاد کی صورت دیکھ کر کھڑے کھڑے واپس چلے جاتے۔ اس طرح روشو پر بہت زیادہ جسمانی اور ذہنی بوجھ بھی بڑھ گیا تھا۔ گیراج تو ویسے ہی اس نے سنبھال رکھا تھا۔ اور اب مکمل طور پر ذمہ داری اس کے اوپر آن پڑی تھی اور گیراج کے ساتھ ساتھ گھر کی اور استاد کی تمام ذمہ داری بھی اس کے اوپر آگئی تھی۔ بانکی کے ساتھ گھر کی رونق

چلی گئی تھی۔ چولھا بجھ گیا تھا۔ گھر قبرستان کی طرح ویران ہو گیا تھا۔ اور استاد ایک جیتی جاگتی کھلی آنکھوں والی لاش بن گیا تھا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا۔ اور استاد کی وجہ سے روشو کی بھوک بھی اڑ گئی تھی۔ دن میں تو استاد کچھ بھی نہیں کھاتا تھا۔ بہت زیادہ اشتہا یا طلب ہوئی تو ایک سگریٹ سلگا لیا۔ لیکن پیٹ تو ساتھ ہے ہی کہاں تک جبر ہوتا۔ لہذا رات کے وقت روشو ہوٹل سے پکا پکایا سالن اور روٹی لے کر آتا اور بڑی خوشامد سے استاد کو دو چار نوالے کھانے پر مجبور کرتا اور پھر استاد اظہار تشکر کے طور پر ایک مخصوص نظر روشو کو دیکھتا جس میں شکریہ کے ساتھ ساتھ اشارتاً یہ درخواست بھی روشو کے لئے ہوتی کہ وہ اسے مزید کھانے پر مجبور نہ کرے اور روشو زیادہ مجبور نہ کرتا۔

اس روز بہت دنوں کے بعد استاد کے وجود میں کچھ جنبش ہوئی اور لب کھلے۔ ہوا یوں کہ بوڑھی فریدے حسب معمول جب گیراج پر آکے "ہمارا جگہ خالی کرو......" کی گردان کے ساتھ گالیاں دیتے دیتے نڈھال ہوگئی۔ اس کے چیخنے چلانے کا مقررہ وقت ختم ہوگیا لیکن اسے لینے اس کا بوڑھا بھائی نہیں آیا اور فریدے کے وجود پر اس قدر نقاہت طاری ہوگئی کہ وہ کانپتے کانپتے زمین پر گر جانے کے انداز میں بیٹھ گئی سوکھے ہونے پنجے زمین میں گاڑ لئے آواز رندھ گئی لیکن وہ رندھی ہوئی آواز میں چلاتی رہی اور پلٹ پلٹ کے غالباً مدد کے لئے کوٹھی کی طرف بھی دیکھنے لگی اس وقت استاد نے آہستہ آہستہ اپنے سر کو بڑھیا کی طرف موڑا، ازراہ ترحم اسے دیکھا اور پھر روشو سے اپنے بیٹھی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"اسے لے جاؤ روشو......یہ مڑ مڑ کر بھائی کی طرف دیکھتی ہے وہ شاید آج ہے نہیں...... جاؤ کام چھوڑ دو پہلے اسے لے جاؤ...."استاد جذباتی ہو گیا تھا۔

"بہن آؤ جاؤ۔ اوے گھر جاوانہ چھے......"روشو نے اٹھ کر بڑھیا کا ہاتھ پکڑا اور اسے سہارا دے کر گھر لے گیا۔ بڑھیا سارے راستے بڑبڑاتی رہی اور روشو کو زیر لب گالیاں دیتی رہی۔

"پتہ.....یہ سب تمہارا وجہ سے ہوا۔" روشو نے جب بڑھیا کو باہر کے کمرے میں کرسی پر بٹھایا تو وہ ہتھیلیاں ملتے ہوئے بولی۔ "شالا لوگ یہ سب تمہارا وجہ سے ہوا۔"

"کیا ہماری وجہ سے ہوا بائی جی......."روشو پلٹ کر پوچھ بیٹھا۔

"ہمارا اسیر وس تمہارا وجہ سے ہمارا ساتھ شادی نہیں کیا"۔ وہ کف افسوس ملتے ہوئے بولی۔

"ہماری وجہ سے......"روشو حیران ہوا۔

۱

"ہاں شالا لوگ ------" وہ چلائی۔ "تم ہمارا جگہ کھالی نہیں کیا ہمارا پلاٹ نہیں بکا۔ ہمارا پلاٹ نہیں بکا ہمارا پاس پیسہ نہیں آیا۔ ہمارا پاس پیسہ نہیں آیا۔ سیروس ہم کو چھوڑ دیا۔" بڑھیا چپ ہوئی اور کچھ سوچ کر روہانسی ہو کر بولی۔ "پتہ ہمارا سیروس شہزادہ کے مافق تھا ------ اور وہ کتی ----" کتی کے تصور سے بڑھیا نے غصہ میں اپنے ہونٹ کو دانتوں سے دبایا۔ "وہ کتی ہمارا جوتی کے مافق نہیں تھی جس کے ساتھ سیروس نے شادی کیا" ۔ بڑھیا رو پڑی اور روتے روتے بولی۔ "پن ہم کیا کر سکتا تھا ہمارا پاس پیسہ نہیں تھا۔ اور اس کتی کے پاس پیسہ تھا۔ وہ ہمارا سیروس کو لے گئی۔ ابھی ہم اکیلا ہو گیا نہیں سیروس، نہیں ہمارا بھائی ----"

"بھائی کہاں گیا ------؟" روشو نے جاتے جاتے پوچھا۔

"بھائی ------! وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی" وہ دیکھو اندر ہمارا بھائی مر گیا۔"

"اف میرے خدایا ------" روشو دہل گیا اندر کمرے میں بڑھیا کے بھائی کی لاش پڑی تھی۔ وہ دبے قدموں بڑھیا کے گھر سے باہر نکل آیا۔ اس پر ایک انجانا خوف اور کپکپی طاری تھی وہ فوری طور پر استاد کو جا کر یہ خبر سنانا چاہتا تھا۔ لیکن استاد پہلے ہی شدید صدمے سے دوچار تھا اور مزید کسی دکھ دینے والی خبر کی تاب اس میں نہیں تھی اس لئے روشو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ فریدے کے بھائی کی موت کا ذکر استاد سے کرے یا نہیں لیکن جب روشو گیراج پر واپس آیا تو استاد اس وقت تک گیراج سے جا چکا تھا۔ لہٰذا رات کو استاد روشو کے اصرار پر جب دو چار نوالے روٹی کے کھا کر فارغ ہوا اور کونے میں بیٹھ کر خاموشی اختیار کر لی تو روشو نے دھیرے دھیرے دھیرے حرف مدعا پر آتے ہوئے بڑھیا کے بھائی کی موت کی خبر سنائی پھر استاد کا رد عمل دیکھنے لگا کہ شاید کوئی ہلچل مچے گی کوئی نیا صدمہ، کوئی دکھ، کوئی جھٹکا، کسی غم کا اظہار، کوئی ہمدردی کے دو بول استاد بولے گا۔ لیکن استاد ٹس سے مس نہ ہوا۔ بس خبر سنتے وقت ایک ذرا سی جنبش اس کے کان میں ہوئی جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اس نے پیغام موصول کر لیا ہے۔ اور بس اس کے بعد کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا اور ایک ہی زاویہ نگاہ سے گم صم خاموش بیٹھا رہا۔ پھر روشو نے پاؤں دبانے کے لئے ہاتھ استاد کے قدموں کی طرف بڑھائے تو استاد نے روشو کا ہاتھ روک کر اپنے پاؤں سمیٹ لئے۔ اس وقت اس نے گردن گھما کر کسی بے زبان اور بے ضرر جانور کی طرح روشو کی طرف غور سے دیکھا۔ اور اس طرح دیکھنے لگا جیسے کوئی کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پھر ایک مدت کے بعد اس کے لب دھیرے دھیرے کھلے اور طویل خاموشی توڑتے ہوئے وہ بہت ہی دھیمی آواز میں روشو سے مخاطب ہوا۔

"روشو یہ گیراج جو ہے نا اس میں میرا کوئی حصے دار یا پارٹنر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے میری موت کے بعد کوئی یہ کہے تم سے کہ وہ میرا رشتہ دار یا وارث ہے۔ میرا کوئی رشتہ دار کوئی وارث نہیں۔ اس لئے تم اس گیراج کو اجڑنے نہیں دینا آباد رکھنا۔ ایک دن یہ گیراج تمہیں پھل دے جائے گا"۔

"استاد۔۔۔۔۔" روشو چونکا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔آپ نے ابھی جینا ہے"۔

"سن لو پہلے میری بات۔۔۔۔۔۔" استاد روشو کے چونکنے اور ٹوکنے پر برہم ہوا۔ "آدمی جس لمحے دنیا میں آتا ہے نا اسی لمحے وہ اپنی موت کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ دراصل جسے وہ زندگی کا سفر کہتا ہے نا وہ اس کی موت کی جانب روانگی کا سفر ہوتا ہے۔ کوئی جلدی اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ کسی کو زیادہ وقت لگتا ہے۔ میں بھی اپنی منزل پر پہنچ چکا ہوں۔"

"استاد۔۔۔۔" روشو بے اختیار تڑپ گیا۔ اور آگ کی طرح سرخ گرم آنسو اس کی آنکھ سے چھلک پڑے۔

"ہاں روشو۔۔۔۔۔" استاد نے بہت نرمی ملائمت اور پدرانہ شفقت کے ساتھ روشو کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور کہنے لگا۔

"میں اب زیادہ نہیں جی سکوں گا۔ میں نے جو سفر کیا تھا وہ بانکی کے لئے کیا تھا۔ اب بانکی گور میں اتر گئی ہے تو میں بانکی کے بغیر زیادہ دور نہیں جا سکتا۔"

"ایسا نہ کہو استاد۔۔۔۔۔" روشو استاد کے گھٹنے سے لگ کر آبدیدہ ہو گیا۔

"جب وقت پورا ہو جائے تو کسی کے کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے روشو۔۔۔۔۔" اس نے نہایت محبت سے روشو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہاں روشو میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ اور سچ پوچھو تو میں اب بانکی کے بغیر جینا بھی نہیں چاہتا تم ایک کام کرنا اور یہ بہت ضروری کام ہے۔

"استاد نے ذرا وقفہ دیا تو روشو ایثار اور فرمانبرداری کا مجسمہ بن گیا۔

"جی استاد۔۔۔۔ بتائیں کیا کام ہے" وہ سراپا خدمت گار بن گیا۔

"یہ پرچی اپنے پاس رکھ لو۔۔۔۔۔!" استاد نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر روشو کے سپرد کیا۔

"یہ کیا ہے استاد۔۔۔۔؟" روشو نے پرچی کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ قبر کا اجازت نامہ ہے"۔ استاد بہت سنجیدہ لہجے میں بولا اور روشو دھک سے رہ گیا۔

"اجازت نامہ۔۔۔۔۔۔استاد۔۔۔۔" روشو پاگل سا ہو رہا تھا۔ "یہ کیا کہہ۔۔۔۔۔"

"سنو، سنو۔ بات سن لو پہلے"۔ استاد روشو کو تھپتھپاتے ہوئے انتہائی ٹھنڈے لہجے میں

بولا۔ "جس دن بانکی مری تھی اسی دن اس کے برابر والی جگہ میں نے اپنے لئے مخصوص کرالی تھی۔ یہ پرچی اسی کا اجازت نامہ ہے۔ میں نے رقم قبرستان کی سوسائٹی کو ادا کردی ہے۔ تم سے کہنا یہ تھا کہ مجھے مرنے کے بعد اسی جگہ دفنانا۔ میں نے وہ جگہ اپنے لئے گھیر رکھی ہے۔"

"استاد۔۔۔۔۔" روشو نے کچھ کہنا چاہا تو استاد نے اس کے ہونٹوں کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھو کر چپ کرایا اور بازو تھام کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "بس اب اٹھ کے سو جاؤ۔ باقی صبح۔"

"آپ بھی سو جائیں استاد۔۔۔۔۔" روشو نے ذہنی طور پر پریشان اور بکھرے ہوئے استاد سے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"میں بھی سو جاؤں گا"۔ استاد نے روشو کو چمکارتے ہوئے کہا۔ "تم سو جاؤ"۔

اور پھر روشو اٹھ کر سو گیا استاد بھی سو گیا لیکن استاد سو کے اٹھا نہیں۔ وہ اس کی گہری لمبی آخری اور بے انت نیند تھی۔

صبح جب روشو بیدار ہوا تو استاد مر چکا تھا۔ استاد کی موت نے روشو پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ اور استاد کی محبت نے اسے حیران کر ڈالا تھا۔

○

استاد کی وفات کے بعد کئی روز تک روشو کو یہ زندگی بالکل بے معنی سی معلوم ہوئی ہر چیز قبرستان کی طرح اجاڑ اجاڑ ویران لگتی۔ پھر استاد کے دوستوں، ملنے والوں اور گاہکوں کا جو مجمع لگتا تو استاد کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے اس کی بے شمار خوبیوں اور دوست نوازیوں کے ساتھ اسے یاد کرتے۔ بیوی کے ساتھ اس کی وفاداری اور محبت کا تذکرہ اس طرح کرتے جیسے لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا کا قصہ دہراتے ہوں۔ اور پھر آخر کار دنیا کے بے ثباتی اور فانی ہونے کے تذکرے پر جب تان توڑتے تو روشو بہت اداس ہو جاتا اور اسے بھی محسوس ہونے لگتا کہ استاد کے بغیر جینا کوئی جینا نہیں اور اس کا جی چاہتا کہ وہ گیراج چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے کہیں اور دور اپنا الگ گیراج کھول لے یا کہیں جا کے کسی کے پاس ملازمت کرلے کہ اسے شہر کے بڑے سے بڑے شوروم سے ملازمت کی پیشکش ہو چکی تھی۔ لیکن پھر اسے استاد کی وصیت یاد آتی کہ آخری بار استاد نے جو گفتگو کی تھی اس میں اپنی اسی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ گیراج کو آباد رکھنا سو روشو نے پھر اپنے آپ کو سمیٹا اور ایک نئے عزم اور نئے ارادے کے ساتھ کام کاج میں لگ گیا جیسے یہ اس کا اپنا مشن بھی ہو اور استاد کا مشن بھی کہ اس گیراج کو ہر حال میں آباد رکھنا ہے کہ یہ گیراج ایک دن پھل دے جائے گا۔

اس دن روشو بہت مصروف تھا۔ اس نے ایک ساتھ تین چار گاڑیاں کھول رکھی تھیں جو اسے شام تک تیار کر کے دینی تھیں۔ ساتھ ہی ڈینٹنگ پینٹنگ کا کام الگ ہو رہا تھا۔ جس کی وجہ سے ٹھکا ٹھک کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ روشو کے کاریگر لڑکے الگ الگ گاڑیوں پر کام کر رہے تھے۔ اور روشو نے خود ایک بڑے سرکاری افسر کی نئی ہونڈا کھول رکھی تھی۔ جس کا پورا انجن صاف کرنا تھا۔ وہ ڈانگری پہنے گاڑی کے نیچے مصروف تھا۔ دو لڑکے معاون کے طور پر اس کی مدد کے لئے چوکس کھڑے تھے کہ اچانک دو آدمی آئے جن میں ایک ذرا ٹیڑھا میڑھا سا آدمی تھا۔ آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا۔ بیچ سے تیل لگے بالوں میں مانگ نکالی ہوئی تھی۔ شلوار اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا اور کندھے پر حاجیوں والا رومال تھا۔ اس نے آتے ہی کڑک آواز میں پوچھا۔

"او نے روشو کون ہے یہاں۔۔۔۔۔۔۔"

"کیا بات ہے۔۔۔۔۔۔" روشو اس کے لہجے پر چونکا۔ اور گاڑی کے نیچے سے پیٹھ کے بل گھسٹتا ہوا باہر نکلا اور آنکھیں گھما کے نووارد کی طرف دیکھا۔

"تم ہو روشو۔۔۔۔۔۔" نووارد نے قدرے درشت لہجے میں پوچھا۔

"ہاں میں ہوں۔۔۔۔۔۔" روشو اپنے ہاتھ ڈانگری ہی سے صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کون ہیں؟" اس نے دریافت کیا۔

"میں جمیل کا بھائی ہوں۔۔۔۔۔" نووارد نے جواب دیا۔

"استاد کا۔۔۔۔۔" روشو نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں استاد کا۔۔۔" نووارد نے کہا "تمہارا استاد ہوگا ہمارا بھائی تھا۔"

"بیٹھیں۔۔۔۔۔۔ تشریف رکھیں"۔ اس نے گیراج کے باہر رکھے مونڈھوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم بیٹھیں گے نہیں جلدی میں ہیں"۔ نووارد نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی"۔ روشو نے پوچھا۔

"خدمت کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ ہماری جگہ خالی کر دو اور چابی دے دو ہمیں"۔ نووارد نے مالک مکان کے لہجے میں کہا۔

"آپ کی جگہ کیسے ہو گئی۔۔۔۔" روشو نے تعجب سے پوچھا کام کرنے والے کاریگر لڑکے بھی حیرت زدہ ہو گئے۔

"لو بھائی اسے بتاؤ ہماری جگہ کیسے ہو گئی۔۔۔۔۔۔" نووارد اپنے ساتھی سے تمسخرانہ انداز

میں مخاطب ہوا۔۔۔۔ "کیوں بھائی کی جگہ ہماری جگہ نہیں ہے کیا۔"

"بھائی۔۔۔۔۔! روشو نے پھر حیرت کا مظاہرہ کیا اور کہنے لگا۔ "لیکن استاد جمیل کا تو کوئی بھائی نہیں تھا"۔ اس بات پر نووارد اور اس کا ساتھی دونوں کھلکھلا کر ہنسے۔۔ اور نووارد ہنسی روک کر کہنے لگا "استاد جمیل کا کوئی بھائی نہیں تھا سن لو لالہ۔۔۔ کہہ رہا ہے استاد جمیل کا کوئی بھائی نہیں تھا۔۔۔۔ یعنی اس نے ہمیں زندہ ہی مار دیا۔"

"استاد نے تو یہی کہا تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ روشو نووارد کے وجود کی نفی کرتے ہوئے بولا۔

"یہ بات استاد نے تم سے کہی تھی؟" نووارد خشم آلود لہجے میں بولا اور اس کا ساتھی صرف روشو کو گھورتا رہا اس دوران روشو کے تمام شاگرد اور ڈینٹنگ پینٹنگ کرنے والے لڑکے جمع ہو گئے۔ جن میں ایک سینڈو لڑکا آگے بڑھا اور قدرے سینہ تان کر روشو سے مہذب انداز میں پوچھنے لگا۔

"استاد ہمارے لائق کوئی خدمت"۔

"نہیں سینڈو۔۔۔۔۔ تم کام کرو"۔ روشو نے کہا اور پھر باقی لڑکوں سے مخاطب ہو کر بولا "جاؤ سب لوگ اپنا کام کرو۔"

اور جب سب لوگ اپنے اپنے کام سے لگ گئے تو روشو نے نہایت شائستگی کے ساتھ اور دھیمے لہجے میں نووارد سے کہا۔

"بھائی جان۔۔۔۔ استاد نے خاص طور پر مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ اس کا کوئی رشتہ دار، کوئی بھائی نہیں ہے"۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے سامنے ہمیں استاد کے ساتھ رشتہ ثابت کرنا پڑے گا۔ ہیں" نووارد تیکھے لہجے میں بولا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ روشو کوئی جواب دیتا کہ معاً ایک تیسری آواز ابھری۔

"ہاں بھئی روشن دین یہ رسید لے لو۔" یہ پارسی لوگوں کے منشی کی آواز تھی جو کرایہ کی رسید لے کر آیا تھا اس سے پیشتر جب بڑھیا کا بھائی زندہ تھا تو وہ خود ہی رسید لے کر آتا اور کرایہ لے جاتا تھا لیکن جب سے بڑھیا کا بھائی فوت ہوا تو کرایہ داروں کی وصولی ٹرسٹ نے اپنے ذمہ لے لی تھی اور اب کرایہ کا لین دین ٹرسٹ والے منشی کے توسط سے کرتے تھے۔

"میں ذرا ہاتھ دھولوں منشی جی تو آپ کو پیسے دیتا ہوں"۔ روشو نے پٹرول سے ہاتھ صاف

کرتے ہوئے کہا۔
"پیسے دینے کی ضرورت نہیں ہے روشو۔۔۔۔۔" منشی جی نے رسید پیش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا چھ مہینہ کا کرایہ ایڈوانس آچکا ہے اور گیراج کی رسید بھی تمہارے نام ہو چکی ہے"۔ منشی نے قدرے اونچی آواز میں کہا تاکہ نووارد بھی سن لیں۔
"یہ سب کچھ کس نے کیا۔۔۔۔؟ روشو چونکا اور حیرت سے دیکھنے لگا۔
"یہ تمہارا استاد اپنی زندگی میں سب کچھ کر گیا تھا"۔ منشی نے ایک دستاویز آگے بڑھاتے ہوئے کہا"۔ اور اس نے قانونی طور پر تمہیں منہ بولا بیٹا بنایا ہے۔ یہ اس دستاویز کی نقل ہے اور اصل تمہیں وکیل کے ذریعے مل جائے گی۔"
منشی نے اپنی دستاویز روشو کے ہاتھ میں دی اور فاتحانہ انداز میں بولا۔ "اب تم اس جگہ کے بلا شرکت غیرے مالک ہو"۔
روشو ہکا بکا رہ گیا۔ اور نووارد اور اس کا ساتھی انتہائی بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے وہاں سے کھسک گئے۔
"منشی جی۔۔۔۔" حیرت زدہ روشو نے کچھ کہنا چاہا۔
"تم سے کچھ اور بھی کام ہے میں آرام سے تمہارے پاس آؤں گا"۔ منشی جی نے روشو کی بات کاٹ کر کہا۔ "اس وقت میں ان لوگوں کی چنتا دور کرنے کے لئے آگیا تھا۔ یہ لوگ کئی دن سے چکر کاٹ رہے تھے رب راکھا عیش کرو"۔ منشی روشو کی پیٹھ تھپک کر چلا گیا اور روشو کے دل میں استاد کی یاد سے ایک ٹیس اٹھی اور وہ آبدیدہ ہو گیا۔
پھر یوں ہوا کہ روشو کی زندگی میں غیر متوقع طور پر اور ڈرامائی انداز میں یکے بعد دیگرے واقعات رونما ہونے لگے۔ وہ ایک دن اپنے کاریگروں کے ساتھ کام میں مصروف تھا کہ پھٹیچر سا سوٹ پہنے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اس کے سر پر آن کھڑا ہوا اور بڑی اپنائیت سے بولا۔
"میاں روشن دین ذرا اندر آنا"۔
روشو نے کام سے توجہ ہٹا کر دیکھا تو سلمانی صاحب تھے جو استاد کے دوستوں میں سے تو نہیں تھے لیکن اکثر و بیشتر استاد کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور کبھی کبھار چائے وائے پی کے گپ شپ کر جایا کرتے تھے۔
"کیا بات ہے سلمانی صاحب۔ خیریت"۔ روشو نے ازراہ حیرت پوچھا۔
"بالکل خیریت۔ بس تم اندر آجاؤ"۔ سلمانی نے کہا اور جب دونوں اندر گیراج میں جا کے

بیٹھے تو سلمانی نے اپنا پرانا سا بیگ کھولا۔ اس میں سے ایک لفافہ نکالا اور کہنے لگے۔
"یہ تو تمہیں معلوم ہوگا نا میں انشورنس ایجنٹ ہوں۔۔۔۔۔"
"ارے سلمانی صاحب ہم نے کیا انشورنس کرانا ہے ابھی بہت کام کرنے ہیں ہم نے"۔ روشو بے اعتنائی سے بولا۔
"ارے تم سے کون انشورنس کے لئے کہہ رہا ہے بچے۔۔۔۔۔۔۔"۔ سلمانی نے لفافے میں سے ایک چیک اور فارم نکالتے ہوئے کہا۔ "انشورنس تو تمہارا استاد کرا گیا تھا یہ اس کی لائف انشورنس پالیسی کا چیک ہے ایک لاکھ روپے کا"۔ اس نے چیک روشو کے سپرد کیا۔
"یہ چیک۔۔۔۔۔" روشو نے چیک وصول کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کی۔
"ہاں ہاں یہ تمہارا چیک ہے دھڑلے سے لو۔" سلمانی جھک کر بولا۔ "استاد نے پالیسی میں تمہیں نامزد کیا تھا۔"
"مجھے۔۔۔۔۔" وہ ایک بار پھر چونکا۔ جیسے لاٹری کے بعد پھر لاٹری نکلی ہو۔
"ہاں تمہاری نامزدگی ہے اس میں"۔ سلمانی نے کہا پہلے اس نے بیوی کو نامزد کیا تھا لیکن وہ بے چاری استاد سے پہلے ہی مر گئی تو استاد نے تمہیں نامزد کر دیا تبس یہاں دستخط کر دو"۔ سلمانی نے فارم روشو کے سامنے رکھ کر قلم دستخط کے لئے دیا۔ روشو دستخط کرنے کے لئے نیچے کی طرف جھکا تو جھکتا چلا گیا جیسے استاد نے اپنے احسانوں کے بوجھ کا ایک پہاڑ اس کے سر پر رکھ دیا ہو۔ دستخط کرتے ہوئے اس کی بوجھل آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو برس رہے تھے جیسے اس کے سر پر رکھے احسان کا پہاڑ رو رہا ہو۔ پھر تو جیسے لاٹریوں کا سلسلہ چل نکلا۔ بھائی کی موت کے بعد بڑھیا فریدے کچھ عرصے تک تو اس بنگلے میں رہی اور معمول کے مطابق روزانہ آن کے چبوترے پر کھڑی ہوتی اور مقدور بھر گالیاں دے کر جب تھک جاتی تو روشو خود اس کا ہاتھ تھام کر گھر چھوڑ آتا یا کسی کاریگر کے ہمراہ بھجوا دیتا لیکن چونکہ بڑھیا وقت کے ساتھ ساتھ قطعی طور پر نحیف نڈھال اور تنہا ہو گئی تھی اس لئے کچھ پارسی سرکردہ خاندانوں نے باہم مشورے سے اسے یہاں سے کسی محفوظ پناہ گاہ میں منتقل کر دیا اور بنگلے کی جگہ اور پلاٹ کو مکمل طور پر ٹرسٹ کے حوالے کر دیا اور ٹرسٹ نے جب یہاں ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ بنانے کا منصوبہ بنایا تو روشو کی جیسے ایک مرتبہ پھر لاٹری نکل آئی روشو نے جگہ خالی کرنے کے دس لاکھ روپے مانگے۔
"دس لاکھ روپے بہت زیادہ ہیں۔۔۔۔۔" منشی کے ساتھ جو سیٹھ آیا تھا اس نے سودے بازی کرتے ہوئے روشو سے کہا۔ اور پھر بزنس مین کے لہجے میں بولا۔ "نہ ہمارے پانچ نہ

تمہارے دس بیچ میں آجاؤ چھ دیں گے"۔

"نہیں سیٹھ کہاں دس اور کہاں چھ۔ یہ بیچ والی بات تو نہ ہوئی"۔ روشو بھی دھیرے دھیرے بزنس سیکھ گیا تھا۔

"ابھی پھر میرے کو بولنے کی اجازت دو۔۔۔۔" ابکے دلال بیچ میں بولا۔ "دیو سیٹھ بیعانہ دو اور سات میں ختم کرو"۔ اور پھر روشو نے زیادہ ضد نہ کی اور سات لاکھ روپے لے کر دو تین دن کے اندر گیراج خالی کر دیا اور جب اسی رقم کے ساتھ اس نے اپنے گیراج سے ہٹ کر آگے کی طرف سامنے کی جانب ایک بڑا ایر کنڈیشڈ اور فرنیچر سے آراستہ موٹروں کا شوروم خریدا تو اسے ایک بار پھر استاد بے طرح یاد آیا اور اس کی نصیحت یاد آئی۔ کہ "گیراج کو اجڑنے نہیں دینا آباد رکھنا ایک دن تمہیں یہ پھل ضرور دے جائے گا"۔ اور آج جب اس کے شوروم میں دو دو ٹیلی فون کھڑک رہے تھے تو اسے احساس ہو رہا تھا کہ واقعی استاد کا گیراج پھل بھی دے رہا ہے اور فصل بھی دے رہا ہے۔

"لیکن یہ سب کچھ کیا ہے ؟"۔

اس کے اندر پھر ایک توڑ پھوڑ شروع ہو گئی۔ باہر کی توڑ پھوڑ کی طرح۔ شاہینہ کی کوٹھی اس کے خوابوں اور سپنوں کا ایک محل تھی۔ پھر وہ محل سے نکلا تو اس کوٹھی کی توڑ پھوڑ شروع ہو گئی اور اس کے سپنوں کا محل ریزہ ریزہ ہو گیا۔ نہ وہ کوٹھی رہی نہ اس کے مکین پھر اس نے استاد کے گیراج میں اپنی امیدوں اور حسرتوں کا محل تعمیر کیا جب تک وہ اس گیراج میں رہا وہ خالی ہاتھ سہی لیکن امیدوں کا ایک بے بہا خزانہ اس کے پاس تھا۔ پھر یہاں بھی توڑ پھوڑ شروع ہو گئی۔ کوٹھی کی طرح گیراج پر بھی بلڈوزر چل گیا جس کے عوض اس کے پاس ایک بڑی رقم تو آگئی لیکن امید ختم ہو گئی اب وہ ہزاروں روپے کما رہا ہے۔ اچھا میکینک ہے، اچھے شوروم کا مالک ہے نوکر چاکر بینک بیلنس گھومنے پھرنے کے لئے گاڑیاں اور اس کے علاوہ جو چیز حاصل کرنا چاہے پیسے سے حاصل کر سکتا ہے لیکن کیا یہی سب کچھ اس کا مشن تھا۔ کیا اسی دن کے لئے وہ فقیروں کی بستی سے فرار ہوا تھا کہ کار شوروم کھول کر پیسہ کمانے لگ جائے اور گاڑیوں کی خرید و فروخت کا کمیشن کھائے اور کاریں مرمت کرے۔ کیا یہی وہ بڑا آدمی تھا جس کے خواب وہ رات دن دیکھتا تھا۔ اسے سخت کوفت ہونے لگی۔ وہ یکلخت اٹھا اور شوروم سے باہر نکلا اور ایک گاڑی کے بانیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کے دور حد نگاہ تک جاتی ہوئی لمبی سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سوچوں میں کھو گیا۔

معاً ایک کریم رنگ کی مرسڈیز کار آن کے اس کے شوروم کے باہر رکی۔ تقریباً پینتیس اور

چالیس سال کے درمیان کی ایک نہایت پرکشش، فیشن ایبل اور نسوانی اپیل رکھنے والی پر وقار خاتون کار سے باہر نکلی۔ اس کے سر کے بال مخصوص گول شکل میں ترشے ہوئے تھے جن میں اس کا چہرہ چاند کی گولائی کی طرح نمایاں تھا۔ آنکھیں بھی بڑی بڑی اور گول تھیں جن میں گہرے براؤن رنگ کے لینز لگے ہوئے تھے۔ جو چہرے کی گندمی اور چمکدار جلد سے ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ اس کے لباس کی تراش بھی اسی طرح کی تھی کہ اس کا عورت پن بھرپور انداز میں چھلک رہا تھا۔ وہ ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ بکھیرے اور جبڑوں کو چیونگم چبانے کی ہلکی ہلکی جنبش دیتے ہوئے دھیرے دھیرے روشو کی جانب بڑھی۔ روشو اس وقت تک اپنے خیالوں میں مگن تھا۔

"ہیلو۔۔۔" خاتون نے قریب آکر دھیرے سے وش کیا۔

"ہیلو۔۔۔" روشو ایک دم چونکا۔ وہ اس وقت جیکٹ اور جین پہنے ہوئے تھا اور ایک نگاہ دیکھنے میں کوئی بہت خوبصورت اطالوی لڑکا لگ رہا تھا۔

"آر یو دی اونر۔۔۔۔" خاتون نے چیونگم چباتے ہوئے روشو کی طرف دیکھا۔ خاتون کی آنکھوں سے چنگاری کی طرح شعاعیں نکل رہی تھیں۔

"وٹ کین آئی ڈو فار یو"۔۔۔ روشو نے بھی انگریزی میں کہا اتنی انگریزی تو اس نے شاہینہ کی سنگت میں سیکھ ہی لی تھی۔

"یو کین ڈوا ے لاٹ فار می۔۔۔۔" خاتون نے بے اختیار لیکن معنی خیز انداز میں کہا اور روشو جھینپ سا گیا۔

"آئی سی۔۔۔۔" خاتون نے خود ہی روشو کی جھینپ مٹاتے ہوئے بات آگے بڑھائی "۔ کیا میں شوروم دیکھ سکتی ہوں۔

"ضرور۔۔۔۔" روشو نے آگے بڑھ کر شوروم کا شیشے والا دروازہ کھولا اور خاتون کو پہلے اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔

"تھینک یو۔۔۔۔" اندر داخل ہوتے ہی خاتون نے مہذب طریقے سے سر جھکا کر روشو کا شکریہ ادا کیا اور پھر کھڑے کھڑے آنکھوں ہی آنکھوں سے شوروم کا سرسری جائزہ لے کر سراہتے ہوئے بولی۔

"نائس لٹل پیلس"۔

"تھینک یو۔۔۔" اب کے روشو نے مہذب طریقے سے گردن جھکائی اور خاتون نے ایک

جھٹکے کے ساتھ مڑ کر روشو کی طرف بھرپور انداز میں نظروں سے نظریں ملا کر دیکھا۔ ایک چمک نکلی جس کی روشو تاب نہ لاسکا اور فوراً دوسری طرف مڑ گیا۔

"میرا ایک پرابلم ہے ------" خاتون بولی۔

"فرمائیے -----" روشو نے کہا اور خاتون نے ازراہ تکلف کرسیوں کی طرف دیکھا۔ جیسے بیٹھنا چاہتی ہو۔

"سوری ---- تشریف رکھئے"۔ روشو نے بیٹھنے کی دعوت دی۔

"تھینک یو -----" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ روشو اپنی میز کی دوسری جانب اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اصل میں میرے پاس سب بڑی گاڑیاں ہیں"۔ خاتون حرف مدعا پر آتے ہوئے بولی۔

"ایک مرسڈیز ہے جو باہر کھڑی ہے۔ ایک شیور لیٹ ہے۔ ٹیوٹا کی اسٹیشن ویگن ہے۔ یہ سب بڑی گاڑیاں ہیں۔ ڈرائیور کی حد تک تو ٹھیک ہیں لیکن مجھے خود چلاتے ہوئے ذرا کوفت ہوتی ہے۔ خاص کر شہر کے اندر پارکنگ کا بہت مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے"۔

"آئی سی ---" روشو نے بھی اسی کے لہجے میں تائید کی۔

"میں ایک چھوٹی گاڑی لینا چاہتی ہوں-----" اس نے پھر ایک چھلتی سی نگاہ شوروم پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ لے لیں 1000 سی سی -----سوزوکی"۔ اس نے قریب ہی کھڑی ایک چھوٹی گاڑی کی طرف نگاہ دوڑا کر پوائنٹ آؤٹ کیا۔

"آئی سی -----" اس نے چیونگم چباتے ہوئے اپنے نچلے ہونٹ کو آہستہ سے اوپر والے دانت کے ساتھ دبایا اور روشو پر نگاہ رکھی۔

"آپ دیکھ لیں گاڑی"۔ روشو نے پھر نگاہیں ہٹالیں روشو کو لگتا تھا جیسے خاتون کی آنکھوں سے کبھی چنگاری اور کبھی شعلہ نکلتا ہے جسے برداشت کرنے کی اس میں تاب نہ تھی۔

"دراصل میں پہلے اپنی ایک بڑی گاڑی بیچنا چاہتی ہوں۔ وہ بکوادیں"۔ خاتون نے تجویز پیش کی۔ "بعد میں چھوٹی لے لوں گی"۔

"شیور آپ بھجوادیں گاڑی شوروم میں"۔ روشو نے کاروباری لہجہ اختیار کیا۔ "کوئی نہ کوئی گاہک لگ جائے گا"۔

"نہیں میں گاڑی بھجوا نہیں سکتی۔" خاتون بولی۔ "دراصل میرا ڈرائیور چھٹی پر ہے اس نے

سب گاڑیوں کی بیٹریز کا کنکشن نکال دیا ہے"۔

"تو پھر کیا کیا جائے ------" روشو نے پوچھا۔

" میرا خیال ہے کہ تم آ کے گاڑی دیکھ لو پہلے ------" وہ کہہ کر ایک دم چوکس ہوئی اور قدرے معذرت کے انداز میں بولی۔

" معاف کرنا ---- میں آپ سے تم پر آگئی ہوں ----- دراصل مجھے، تمہیں، تم کہنا زیادہ اچھا لگتا ہے"۔ اس نے بالوں کو ایک جھٹکا دے کر پھر آنکھوں کی شعاع روشو پر ڈالی۔ روشو نے اس طرح تھوڑا سا سر ہٹایا جیسے روشن دان وغیرہ سے سورج کی کرن آ کے اس کے منہ پر پڑ رہی ہو۔ وہ بولی۔" پھر تمہاری اور میری عمروں میں تھوڑا بہت فرق بھی تو ہے"۔

" تھوڑا بہت نہیں کافی ------"۔ روشو نے بے ساختہ تردید کرتے ہوئے کہا۔

" آئی سی -----" وہ مسکرائی"۔ یہ اور بھی اچھا ہے۔ میں زیادہ بے تکلفی سے مخاطب ہو سکتی ہوں۔"

" جیسے آپ کی مرضی" وہ انکساری سے بولا۔

" تو کب دیکھو گے گاڑی ----" خاتون نے پوچھا۔

" جب آپ بولیں"۔ روشو نے کہا۔

" مجھے اپنا کارڈ دیدو۔ میں ٹیلی فون کروں گی"۔ خاتون نے خواہش ظاہر کی۔

" شیور -----" روشو نے دراز سے کارڈ نکال کر حوالے کیا۔" میں نو بجے تک رہتا ہوں یہاں"۔

" آئی سی ----" خاتون نے کارڈ کو دیکھا پڑھا اور بڑبڑائی۔" روشن آٹوز" پھر سوچنے لگی۔" یہ روشن ----- کون ہے"۔

" میرا نام ہے روشن ------" روشو نے کہا۔

" آئی سی ----- اس نے پھر ایک بھرپور نگاہ روشو کے چہرے پر ڈالی۔" گڈ نیم۔ میرا خیال ہے تم پیدائش کے وقت بھی ایسے ہی روشن تھے جیسے اب ہو کہ تمہارے والدین نے چن کر تمہارا نام روشن رکھا"۔ وہ ایک دم چونکا۔ اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں۔ اس کے دماغ میں تڑاخ تڑاخ بجلی چمکی کوندی اور جیسے ایک زوردار کرنٹ کے ساتھ وہ متعفن بستی میں پہنچ گیا۔

" والدین ------ والدین" اس کے کانوں میں عورت کی آواز گنبد کی آواز کی طرح گونجنے لگی۔

" کیا والدین ایسے ہوتے ہیں جیسے میرے تھے"۔" وہ سوچ کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ شیرو اور

بختو جیسے والدین۔ اپنے بچوں کے ساتھ کتے جیسا سلوک کرنے والے۔ گند۔ غلاظت۔ میل۔ بے عزتی۔ بھیک۔ بے غیرتی۔ یہ اثاثہ ہے اس کے والدین کا۔ اور یہی ورثہ ہے فقیروں کے بچوں کا۔ فقیروں کے والدین بھی کوئی والدین ہیں کہ ہونے سے جن کا نہ ہونا بہتر ہے کہ جن کے ہوتے ہوئے غیرت مند اولاد انہیں اپنا نہیں کہہ سکتی۔ وہ خود کسی کو بتا بھی نہیں سکتا ہے کہ وہ کون تھا اور اس کا باپ کیا کرتا تھا یا اب کیا کرتا ہے وہ باپ کے ہوتے ہوئے بن باپ کا بچہ ہے۔ بن ماں کا بچہ۔۔۔۔ سوچتے سوچتے روشو کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

"سوری۔۔۔۔ نسائیت سے بھرپور ایک دھیمی میٹھی اور ہمدرد آواز اس کے کان میں پڑی اور اس نے میز پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھ کے اوپر خاتون کے نرم و گداز لمس کو محسوس کیا۔ وہ چونکا اور خیالات کے سمندر سے باہر آگیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک خاتون کے ہاتھ کے نیچے تھا۔

"سوری۔۔۔۔۔" خاتون نے جیسے زخم پر مرہم رکھنے کے انداز میں ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

"مجھے یہ نجی ایشو نہیں چھیڑنا چاہئے تھا۔ لائف از لائیک دیٹ۔۔۔۔۔" وہ اظہار تاسف کے طور پر خاموش ہو گئی۔ روشو بھی خاموشی سے اسے دیکھنے لگا تو خاتون نے ازراہ حوصلہ افزائی پھر کہا۔۔۔۔ "ٹیک اٹ ایزی"۔ روشو نے ممنونیت کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے میز پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھ کی جانب دیکھا جو ابھی تک خاتون کے پر شفقت ہاتھ کے بوجھ تلے دبا تھا۔

"سوری۔۔۔۔" خاتون کو جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنا ہاتھ الگ کیا اور یکلخت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ٹیلیفون کروں گی۔۔۔۔۔" اس نے جاتے جاتے کہا اور شوروم سے نکل کر اپنی مرسڈیز کی طرف چلی گئی۔

خیالوں میں مگن روشو اٹھا بھی نہیں کرسی پر بیٹھا رہا لیکن بے خیالی میں اس کی نگاہ خاتون کے عقب میں رہی۔ جیسے خود بخود ساتھ جا رہی ہو۔ خاتون کار میں بیٹھی تو بیٹھتے بیٹھتے ایک مسکراہٹ اس نے شیشوں کے پیچھے بیٹھے روشو کی طرف بکھیری اور پھر اس کا ہاتھ ہلتے ہی کار حرکت میں آئی اور آنکھ سے اوجھل ہو گئی۔ روشو شیشوں کے پیچھے گم صم بیٹھا دیکھتا رہ گیا۔

O

اگلے دن اس کے شوروم میں مکمل سناٹا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ شوروم میں تو اکثر سناٹا ہی رہتا تھا۔ پرچون کی دکان تو تھی نہیں کہ بھیڑ بھاڑ ہوتی۔ کبھی کبھار کوئی گاہک گاڑیاں دیکھتا

ہوا اندر آجاتا۔ کبھی بروکروں کی آمد و رفت ہوتی یا پھر روشو کے یار دوست ملنے ملانے کیلئے آجاتے لیکن روشو عام طور سے خود کو شوروم کے باہر کھڑی مرمت کیلئے آئی ہوئی گاڑیوں میں مصروف رکھتا۔ خود کسی گاڑی پر کام کر رہا ہوتا یا پھر کاریگر لڑکوں کے کام کی نگرانی کرتا اور انہیں کام سمجھاتا لیکن اس دن وہ شام کے وقت شوروم کے اندر کسی حساب کتاب میں مصروف تھا جب ٹیلیفون کی گھنٹی گونجی۔

"ہیلووو۔۔۔۔۔۔" روشو نے ریسیور اٹھایا۔

"کیسے ہو روشن۔۔۔۔۔۔؟" ایک نسوانی آواز آئی تھی۔ روشو ایک دم ساکت سا ہو گیا۔ "اوہ میں نے پرسوں تمہیں اپنا نام تو بتایا نہیں اور نہ تم نے پوچھا میں راحیلہ بول رہی ہوں۔۔۔۔۔۔"

"میں پہچان گیا ہوں۔۔۔۔۔" روشو نے جواب دیا۔

"اس وقت میں ذرا فرصت میں ہوں۔ اگر آجاؤ تو گاڑیاں دکھا دوں" ۔ وہ فوراً مطلب پر آگئی۔

"دراصل شوروم کا وقت۔۔۔۔۔۔۔۔" اس نے کچھ پس و پیش کرنا چاہی۔

"ایسا کرو نا شام کو بند کر کے آجاؤ۔ تھوڑی دیر میں چلے جانا" ۔ راحیلہ نے بات کاٹ کر کہا "وہ تمہارے لئے بھی فرصت کا وقت ہوگا میں بھی فارغ ہوں گی"۔

"اچھا پھر۔۔۔۔۔ اگر۔" اس نے آنا کانی کرنا چاہی۔

"اگر مگر کو چھوڑو۔۔۔۔۔ بس آجاؤ" ۔ وہ بے تکلفی سے بولی۔۔۔۔۔ "میں انتظار کروں گی"۔

"کہاں؟" روشو بھی بے اختیار بولا۔

"لکھو ایڈریس۔۔۔۔۔۔" خاتون بولی۔۔۔۔۔ "مشکل سے پانچ منٹ کی ڈرائیو ہے۔" اس نے ایڈریس لکھواتے ہوئے کہا۔

روشو نے جب ایڈریس لکھ لیا تو تھوڑی ہی دیر میں وہ خاتون کے گھر کی طرف جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ کیوں اور کہاں جا رہا ہے۔ کیا یہ واقعی بزنس ہے یا خاتون کی پرکشش شخصیت ہے جو اسے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ کیا اسے وہاں جانا چاہئے یا نہیں۔ وہ اسی کشمکش میں الجھا خاتون کے بتائے ہوئے ایڈریس کے مطابق کوئی پانچ چھ منٹ کی ڈرائیو کے بعد ایک بڑے بنگلے پر تھا۔ جب اس کی گاڑی منزل مقصود پر پہنچی تو غالباً اسی وقت خاتون کی گاڑی بھی گیٹ سے اندر گئی اور گیٹ بند ہو رہا تھا۔ روشو نے گاڑی باہر گیٹ پر ہی ذرا ہٹا کے دیوار کے ساتھ روکی اور نیچے اتر کے ڈور بیل پر ابھی ہاتھ ہی رکھا تھا کہ گیٹ دوبارہ کھلا۔

"ہیلو خاتون کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔

"ہیلو۔۔۔۔۔" روشو نے جواباً کہا اور خاتون نے بڑے تپاک سے نہ صرف مصافحہ کیا بلکہ اس کا ہاتھ گرمجوشی سے ہاتھوں میں لے کر گیٹ کے اندر لے گئی۔ روشو نے ایک سنسنی سی محسوس کی۔ اس نے غالباً پہلی بار کسی عورت سے مصافحہ کیا تھا لیکن روشو نے محسوس کیا تھا کہ خاتون کیلئے مردوں سے ہاتھ ملانا جیسے ایک معمول کی بات ہو۔

"بس میں بھی ابھی پہنچی ہوں۔۔۔۔۔" خاتون نے روشو کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔۔۔ ۔۔" مجھے معلوم تھا کہ تم آرہے ہو میں ایک جگہ سے بھاگی"۔

"میں نے دیکھا تھا۔۔۔۔" روشو نے تائید کی۔۔۔ "میں شاید جلدی آگیا ہوں"۔

"کوئی بات نہیں"۔ خاتون بولی اور پھر کہنے لگی۔۔۔۔ "پہلے گاڑیاں دکھادوں تمہیں"۔

خاتون کچھ فالتو بات کئے بغیر مطلب پر آگئی۔ اس نے پورچ میں کھڑی دو گاڑیاں روشو کو دکھائیں۔ ایک بنگلے کے سامنے گیٹ کے پاس تھی۔ ایک عقب والی گلی میں اور ایک بڑی گاڑی کمپاؤنڈ وال کے ساتھ کونے میں منہ موڑے اس طرح کھڑی تھی جیسے روٹھی ہوئی ہو۔ لگتا تھا بیٹری ڈاؤن کئے وہ برسوں سے یہاں براجمان ہے۔ اس کی چھت پر پرندوں کی بیٹیں، گرد غبار، مٹی اور سوکھے پتوں کی ایک جھالر سی پڑی تھی

"یہ بے بے ہے۔۔۔۔" خاتون اس گاڑی کی طرف دیکھ کر ہنسی۔ "اس کو ہم بے بے کہتے ہیں"۔ روشو بھی اس گاڑی کو دیکھ کر اور اس کا نام سن کر کھکھلا کے ہنسا اور پھر پوچھنے لگا۔

"بیچنی کونسی گاڑی ہے آپ نے۔۔۔۔۔"

"دیکھا جائے گا۔۔۔۔۔ جو تم کہو گے وہی بیچ دیں گے اور جو کہو گے وہی خرید لیں گے۔ بیٹھو تو سہی"۔ گاڑیوں کی خرید و فروخت سے بے نیاز ہو کر اس نے آہستہ سے روشو کے بازو کو چھوا اور عقبی لان میں بچھی ہوئی بید کی کرسیوں کی جانب لے گئی۔

"بیٹھو خاتون نے روشو کو کرسی پیش کی۔

"آپا۔۔۔۔۔" خاتون نے بیٹھتے ہی آپا کو پکارا۔ اس کی آواز پر منحنی سی زرد رو آپا نمودار ہوئی۔

"جی بیگم جی۔۔۔۔" وہ مؤدب ہو کر جھکی اور ساتھ ہی ترچھی سی نگاہ اس نے روشو پر بھی ڈالی۔

"اماں کیسی ہے"۔ خاتون نے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں جی۔۔۔۔ بس ذرا سانس کی تکلیف ہے۔" آپا نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے تم اماں کے پاس رہو۔۔۔۔اور عبدل کو بھیج دو۔" خاتون نے حکم دیا
اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک دبلا پتلا کالا سا لیکن عمر رسیدہ بنگالی خمیدہ کمر کے ساتھ سامنے لان میں آیا

"جی بیگم صاحب۔۔۔اس نے گردن جھکاتے ہوئے ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ روشو پر ڈالی

"عبدل چائے لے آؤ۔۔۔۔" بیگم نے حکم دیا اور پھر پوچھا۔۔۔۔"کوئی فون وغیرہ آیا تھا کیا؟"

"ڈی سی صاحب کا فون آیا تھا۔ ملک صاحب کا آیا تھا۔۔۔۔۔۔" پھر اس نے اپنی ہتھیلی پر لکھے ہوئے نام دیکھ کر کہا۔۔۔۔"ڈی ایس پی سبحان صاحب کا فون تھا۔ انکم ٹیکس والے آغا صاحب کا فون تھا اور اخبار والے نقوی صاحب تھے۔"

"ٹھیک ہے تم چائے لے آؤ۔۔۔۔" خاتون نے کہا۔ عبدل چائے لینے گیا تو آیا آئی اور بولی۔۔۔۔

"بیگم جی ڈی آئی جی صاحب کا فون ہے"۔
"میں آرہی ہوں" خاتون نے کچھ سوچ کر کہا اور اندر چلی گئی۔
روشو تنہا بیٹھا تھا۔ اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی وہ ذرا سہما ہوا بھی تھا اور تجسس کا ایک طوفان اس کے اندر موجزن تھا۔

۱۸

زیادہ دیر نہیں لگی وہ ٹیلیفون سن کر لان میں واپس آئی۔ وہ خاصی اپ سیٹ لگتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے کچھ سخت کلامی کر دی ہے یا اس نے کسی سے سخت لہجے میں بات کی ہے۔ خاتون کی کیفیت سے لگتا تھا کہ خاصی تکرار ہوئی ہے تاہم وہ روشو کے سامنے اپنا غم و غصہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"سوری۔۔۔۔" وہ بیٹھتے ہوئی مسکرائی اور غصے کو پی جانے کی کوشش کی۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔۔" روشو بھی مسکرا دیا۔

"عبدل۔۔۔۔۔چائے لاؤ بھئی۔۔۔۔۔" وہ اندر کی طرف پکاری۔ "اتنی دیر لگا دیتے ہو۔"

"وہ گیٹ پر کوئی آگیا تھا جی۔۔۔۔" عبدل چائے کی ٹرالی لاتے ہوئے بولا۔

"کون تھا گیٹ پر۔۔۔۔" بیگم نے ٹرالی سامنے کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"ذلیل صاحب۔۔۔۔۔" عبدل نے کہا۔ روشو بے اختیار ہنس پڑا۔ راحیلہ بھی ہنس دی۔

"کون جلیل صاحب۔۔۔" راحیلہ نے نام کی اصلاح کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بڈھے سے بڑی مونچھ والے۔۔۔۔" عبدل نے بتایا۔ "وہ جو پتی کا کاروبار کرتے ہیں۔ چائے کا ڈبہ بھی لاکے دیا تھا۔"

"اچھا سنو۔۔۔۔۔۔ جو کوئی بھی ہے اس وقت چلتا کرو۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "کم از کم چائے تو سکون سے پی لیں۔

"ٹھیک ہے جی۔۔۔۔۔۔۔" عبدل جلیل صاحب کو چلتا کرنے کیلئے گیٹ کی طرف گیا۔ راحیلہ چائے بنانے لگی اور مسکراتی رہی۔

اس نے چائے کا کپ بہت نفاست سے بنا کر روشو کے سامنے رکھا اور اور پھر بسکٹ کی پلیٹ تکلفاً آگے کر دی۔
"بس------" روشو نے بھی تکلفاً ہاتھ کھینچا۔
"لے لو کچھ۔ پلیز-----" بیگم نے اصرار کیا اور روشو نے ایک بسکٹ اٹھالیا۔ ابھی بمشکل دونوں نے ایک ایک ہی گھونٹ چائے کا لیا تھا کہ آیا نمودار ہوئی۔
"ٹیلیفون آیا ہے جی-----" آیا نے کہا۔
"کس کا ہے-----؟" مالکن نے پوچھا۔
"سکندر صاحب کا-----" آیا نے جواب دیا۔ "وہ جو ہیں نا کونسی کمپنی کے چیئرمین ہیں۔"
"ان سے نمبر لے لو------ میں انہیں بعد میں فون کر لوں گی۔ کہو اس وقت مہمان بیٹھے ہیں۔" راحیلہ نے تڑخانے کے انداز میں کہا۔
روشو جزبز ہوا۔ "جی دیکھیں آپ میری وجہ سے مطلب ہے آپ سن لیں فون-----"
"دیکھو روشن----- میں بہتر جانتی ہوں کہ مجھے کون سا فون سننا ہے اور کون سا نہیں-----" خاتون اعتماد کے ساتھ بولیں۔
"میں تنگ آگئی ہوں ان لوگوں سے اور ان لوگوں کے ٹیلیفونوں سے-----یہ سب فالتو لوگ ہیں۔" اس نے بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
"دیکھو موسم کتنا خوشگوار ہو رہا ہے۔" پھر وہ ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔
"آپ نے کار کا فیصلہ نہیں کیا۔ کونسی کار آپ بیچ رہی ہیں۔ اور کونسی خریدنی ہے۔" روشو نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔
"جب ہمارے تمہارے درمیان ایک کاروباری تعلق پیدا ہو جائے گا تو کاروں کی خرید و فروخت بھی ہو جائے گی۔" راحیلہ نے کہا۔ "ایسی بھی کیا جلدی ہے-----ہاں"۔ وہ روشو کے اطمینان کیلئے بولی۔ "البتہ اگر تمہیں کار فروخت کرنے میں جلدی ہے تو کوئی بھی بیچ دو----- میں خرید لوں گی۔"
"نہیں، نہیں ایسی تو کوئی جلدی نہیں مجھے-----" روشو ذرا سا کھسیانا ہوا۔ "میں تو آپ کیلئے-----"
"مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ اس وقت اطمینان سے چائے پیو۔"
راحیلہ اس وقت چائے سے مے کا لطف لینے کے موڈ میں تھی۔ اس نے بڑے آرام سے

چائے پی اور بڑے مزے سے باتیں کرتی رہی۔ سیاست، ادب، ثقافت، حسن اور کاروبار سب موضوعات ملا کے اس نے ایک مرکب بنادیا تھااور روشو بڑے سکون سے اس کی گفتگو سننے میں محو تھا۔ تھوڑے سے وقت میں ہی اس کے اندر کا خوف بہت حد تک کم ہوگیا تھا لیکن راحیلہ اس کیلئے ایک معمہ بنتی جارہی تھی جسے وہ حل کرنے کی کوشش کررہا تھااور ایک معمہ کھلتا بھی جارہا تھا جس میں وہ الجھتا چلا جارہا تھا۔

"بیگم جی ٹیلیفون آیا ہے۔۔۔۔۔۔۔"آیا نے پھر آن کر بتایا۔

"اسی سکندر صاحب کا ہے۔"

"اسے کہہ دو۔۔۔۔۔"

"میں نے کہہ دیا جی۔۔۔۔۔۔"آیا بات کاٹ کر بولی۔"اس نے چوتھی دفعہ فون کیا ہے۔ بار بار کرتا ہے فون۔۔۔۔۔"

"ادھر ہی دے دو فون مجھے۔۔۔۔۔۔۔۔"راحیلہ آرام کرسی پر آرام سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی اور آیا نے فون وہیں لان میں دے دیا۔

"ہیلو۔۔۔۔۔۔"راحیلہ نے بات کی اور ساتھ ہی روشو کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ جس سے ظاہر ہورہا تھا کہ اس کے کان ٹیلیفون کی طرف لیکن دھیان روشو کی جانب ہے۔ روشو بھی بڑی دلچسپی سے راحیلہ کو دیکھنے لگا۔ راحیلہ فون پر بول رہی تھی۔!

"ہاں ہاں ناراض کیوں ہورہے ہیں آپ۔۔۔۔ مہمان کوئی بھی ہو ضروری تو نہیں کہ آپ ہمارے ہر مہمان کو جانتے ہوں یا جاننا ضروری ہو۔ اگر آپ کی پرائیویسی ہے تو ہماری بھی تو پرائیویسی ہے۔۔۔۔۔۔ ہم کوئی پبلک پراپرٹی تو نہیں ہیں۔۔۔۔۔"کچھ دیر وقفہ رہا راحیلہ نے کچھ وقت کیلئے دوسری طرف کی بات پر کان لگانے رکھا وہ خاموشی سے سنتی رہی اور پھر جیسے بھڑک اٹھی۔

"دیکھئے دیکھئے سکندر صاحب اگر آپ کا وقت ہے تو ہمارا بھی وقت ہے اور ہمیں یہ حق ہے کہ ہم اپنے وقت میں کسی سے بات کریں۔۔۔۔ یا نہ کریں۔۔۔۔۔"کچھ دیر وہ چپ رہی اور پھر پھٹ پڑی۔

"دیکھئے سکندر صاحب آپ اگر بڑے آدمی ہیں تو اپنے گھر کے ہوں گے۔۔۔۔۔۔ میں آپ کی تنہائیوں کی ذمہ دار نہیں ہوں۔ کیوں ہیں تنہا آپ، آپ کی بیوی ہے، بچے ہیں، آپ کے بچوں کے بھی بچے ہیں۔ آپ چیئرمین ہیں ایک کمپنی کے بہت سارے لوگ آپ کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ آپ اپنے مقام پر رہیں۔۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ کیا کیا کیا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ ہمارے موڈ کی بات ہے۔ کون۔

---کوئی بھی ہو سکتا ہے----- ہم نے کبھی آپ سے پوچھا آپ کے ساتھ کون ہے کیا----کس کو
-----دیکھیں سکندر صاحب۔" وہ ایک دم برہم ہو گئی۔" میں آپ کی بیوی نہیں ہوں اور نہ کیپ
ہوں آپ کی-----او یو شٹ اپ۔" اس نے ٹیلیفون پٹک دیا اور غصے سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔
لیکن فوراً اپنے غصے پر قابو پالیا۔

"سوری روشن-----" وہ خود کو نارمل کرتے ہوئے روشو کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

" میں چلوں گا-----" روشو اٹھ کھڑا ہوا۔ روشو محسوس کر رہا تھا کہ راحیلہ اس کی وجہ سے کچھ لوگوں کو ناراض کر رہی ہے۔" ایز یو وش-----" خاتون نے بھی روشو کو رکنے کیلئے زیادہ اصرار نہیں کیا شاید وہ بھی اندر سے کافی اپ سیٹ ہو چکی تھی۔

O

اس رات اپنے فلیٹ پر جا کے روشو انتہائی بور ہوا۔ صرف بور ہی نہیں ہوا ایک عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی اس کی۔ راحیلہ اس کیلئے ایک معمہ بن گئی تھی اور اس کی پرکشش شخصیت کا طلسم اس پر مکمل طور پر حاوی ہو گیا تھا اسے اپنے اوپر تعجب بھی ہو رہا تھا اور غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ راحیلہ کا قرب اور اس کے گھر کا خوشگوار ماحول چھوڑ کر اپنے فلیٹ کی ہولناک تنہائی کی طرف کیوں بھاگ آیا ہے۔ راحیلہ اس کیلئے کھانا تیار کروا رہی تھی اس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اس کی خاطر اس نے شہر کے کئی بڑے بڑے لوگوں کو ٹرخا دیا تھا اور کئی ٹیلیفون بھی سننے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن روشو کیلئے اس تمام صورت حال کو سمجھنا ایک تاریک غار کی طرح تھا جس کا منہ ایک بڑے بھاری پتھر سے بند ہو اور اس بھاری پتھر کو ہٹا کے اندر جانا اور جھانکنا روشو کیلئے بہت دشوار تھا اس لئے اس نے راہ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت جانی۔ لہٰذا راحیلہ کے گھر سے واپسی پر اس نے ایک قریبی ریسٹورنٹ میں نہاری کھائی اور چپ چاپ اپنے فلیٹ کی تنہائیوں میں آکر گم ہو گیا۔ استاد اور بانکی کے مرنے کے بعد تو یہ فلیٹ ایسے ہی اسے بہت تنہا لگتا تھا لیکن آج تو جیسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ وہ رات بھر نیند سے الجھتا رہا اور جہاں اسے استاد اور استانی کی یاد آئی۔ جہاں شاہینہ نے اس کے خیالوں میں دھیمی دھیمی پرواز کی۔ جیل کے ساتھیوں کا تلخ اور شیریں سلوک یاد آیا۔ بابا کے تھپڑوں کی کسک اس نے محسوس کی۔ جہاں فقیروں کی بستی کی بدبو اور سڑاند اس کے خیالوں میں گرم متعفن بھبکے چھوڑتی رہی۔ وہاں راحیلہ بیگم کے گھر اس کے لباس اور جسم کی خوشبو نے بھی اس کے دماغ کو معطر کئے رکھا اور اس رات کو اس کی

تمام سوچ پر راحیلہ بیگم کی سوچ حاوی رہی۔ وہ کون ہے۔ کیا ہے۔ کیوں ہے کون لوگ ہیں جو اس کی طرف راغب ہیں اتنے بڑے بڑے لوگ، اتنے بڑے بڑے نام، ان کے مقابلے میں وہ ایک دم پہلی ملاقات میں اچانک روشو پر مہربان کیوں ہو گئی ہے۔ کیا یہ سب ڈرامہ ہے اگر ہے تو کیوں ہے۔ وہ سوچتا رہا۔

"یہ سب اچانک نہیں ہوا اور نہ تمہیں اچانک بازار سے پکڑ کر لائی ہوں روشو۔" راحیلہ نے آنکھیں روشو کی آنکھوں میں گاڑتے ہوئے کہا اور پھر قدرے تامل سے بولی۔ "میں تمہیں روشو کہوں تو کوئی حرج تو نہیں ہے نا۔۔۔ تمہیں سب ہی روشو کہتے ہیں تمہارا استاد بھی تمہیں روشو کہہ کر پکارتا تھا۔" وہ اس روز شام کو اپنی کار روشو کے شوروم میں چھوڑنے آئی تھی اور روشو سے لفٹ کے بہانے اسے ساتھ لے آئی تھی۔

"آپ استاد کو جانتی ہیں کیا۔۔۔۔؟" روشو چونکا

"ہاں بہت اچھی طرح۔" راحیلہ بیگم نے جواب دیا۔ "میں اکثر اپنی گاڑی استاد سے ہی بنواتی تھی۔ میرا گیراج پر آنا جانا رہتا تھا میں تمہیں وہاں کام کرتے دیکھتی تھی۔۔۔۔۔ میں نے اچانک تمہیں منتخب نہیں کیا ہے۔"

"مجھے خیال نہیں۔۔۔۔۔" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "شاید میں نے غور سے نہیں دیکھا آپ کو۔"

"تم کبھی غور سے دیکھتے بھی نہیں تھے۔۔۔۔۔۔" خاتون نے روشو کی بات سے اتفاق کیا "تمہاری یہی بات مجھے پسند آئی ہے۔ البتہ تمہارا استاد۔۔۔۔۔ رنگین مزاج اور حسن پرست تھا۔ وہ غور سے دیکھتا تھا مجھے اور اس نے غور سے دیکھا ہے مجھے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"استاد۔۔۔۔۔ روشو کو ایک خیال سا آیا اور اس نے راحیلہ کو غور سے ایک نظر دیکھا۔ وہ واقعی بلا کی خوبصورت اور پرکشش عورت تھی اور استاد جس طرح کا جمالیاتی ذوق رکھتا تھا وہ اس کے معیار پر پوری اترنے والی تھی اور روشو سوچنے لگا کہ بانکی کو اس طرح ٹوٹ کر چاہنے والے اور بانکی کیلئے سچ مچ جان دینے والے استاد کے اس عورت کے ساتھ کس طرح کے مراسم ہو سکتے تھے۔ ایسی عورت جس کے ساتھ شہر کی بڑی بڑی ہستیوں کے تعلقات قائم ہیں۔

"میں تمہارے استاد کو فون کرتی تھی وہ خود آکر میری گاڑی گھر سے لے جاتا اور گاڑی بنا کے خود چھوڑ جایا کرتا تھا۔" راحیلہ بولی

"استاد----" روشو نے پوچھا۔ جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو۔

"ہاں استاد------" خاتون نے جواب دیا۔ "وہ بڑا ہنس مکھ، خوش مزاج، محفل نشین اور باتوں کا رسیا تھا مجھے اس کی کمپنی اچھی لگتی تھی۔ وہ فراڈ نہیں تھا ایک سچا، نیک اور کھرا آدمی تھا۔ اس کی محبت کے ہر چشمے کا رخ ایک ہی طرف تھا۔ بانکی وہی اس کا دریا اور وہی سمندر تھی۔ اسی پر جیتا اور مرتا تھا"۔ وہ ذرا سی چپ ہوئی اور پھر بڑے ڈوب جانے کے انداز میں یہ شعر پڑھا۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

پھر اس نے ایک بھرپور نظر روشو کو دیکھتے ہوئے جیسے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ "کاش ہر عورت کو ایک ایسا ہی چاہنے والا مرد ملے جیسا بانکی کو تیرا استاد ملا۔!"

"آپ استاد کو اچھی طرح جانتی ہیں۔" روشو جو چپ چاپ راحیلہ کی گفتگو سن رہا تھا ایک دفعہ پھر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"کہانا بہت اچھی طرح------" راحیلہ بیگم نے دوبارہ تائید کی۔ "استاد ہی سے میں نے تمہاری تعریف سنی تھی------ بانکی کے بعد استاد سب سے زیادہ تمہیں چاہتا تھا۔"

"وہ تو ظاہر ہے کیا شک ہے اس میں"۔ روشو جذباتی سا ہو گیا----- "استاد نے اس کا ثبوت بھی دیا ہے۔ اس وقت میں جو کچھ ہوں استاد کی بدولت ہوں۔"

"میں اکثر تمہیں وہاں کام کرتے دیکھتی تھی-----اور دیکھتی رہتی تھی۔" راحیلہ بیگم سراہنے کے انداز میں بولی۔ "اور پتہ ہے میرا کیا جی چاہتا تھا------" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا اور روشو تھوڑی دیر کیلئے سوالیہ نشان بن گیا۔

"کیا----؟" اس نے پوچھا۔

"میرا جی چاہتا تھا میں تمہیں اغوا کرلوں-----اور میں نے تمہیں اغوا کرلیا ہے۔" راحیلہ نے ایک نقرئی قہقہہ فضا میں بکھیر دیا۔

O

اس رات روشو پھر خیالات کے سمندر میں غرق رہا اور سوچنے لگا کہ کیا وہ واقعی اغوا ہو گیا ہے------"وہ راحیلہ کے گھر کئی مرتبہ جا چکا تھا۔ دو تین دفعہ تو راحیلہ کسی حیلے بہانے کے ساتھ شوروم سے آکر لے گئی۔ پھر تین مرتبہ اس نے ٹیلی فون کیا اور روشو کے ٹیلیفون کے ذریعے ایک بلاوے پر چلا گیا اور اب وہ خود بھی ادھر سے گزرتے ہوئے کسی بہانے سے چلا جاتا ہے اور

دستک دے دیتا ہے اور اس دوران اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ رات کا کھانا راحیلہ کے ساتھ کھایا تھا اور ایک سے زیادہ مرتبہ شہر کے "معززین" کو راحیلہ نے اس کی موجودگی میں ٹرخا دیا تھا۔

شہر کے "معززین" میں جب کوئی راحیلہ کے پاس آتا تو وہ تخلیہ چاہتا لیکن راحیلہ نے کبھی کسی کو روشو کی موجودگی میں تخلیہ کی نعمت سے نہیں نوازا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کسی "معزز مہمان" کی بیقراری کو مدنظر رکھتے ہوئے "کوئی بات" کرنے کیلئے اسے چند لمحوں کیلئے دوسرے کمرے میں لے جاتی اور ادھر ہی سے الوداع کہہ کر لوٹ آتی۔ اس نے روشو کو کبھی کسی کے سامنے نیچا نہیں ہونے دیا تھا۔

"یہ کیا چیز ہے جو مجھے راحیلہ کے گھر کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔" روشو اپنے تنہا فلیٹ میں بیٹھا اپنے اندر کی تنہائی سے سوال کرتا اور خود ہی جواب ڈھونڈتا۔ "کیا یہ استاد اور استانی کی کمی ہے۔ ساجدہ بیگم کا سایہ ہے۔۔۔۔ شائستہ کا خلا ہے جسے وہ پر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محرومی کا نتیجہ ہے یا پھر اس کی جوانی ایک پرکشش عورت کے دام میں آگئی ہے۔ کچھ بھی سہی راحیلہ کے التفات کے سائے میں اسے اپنی تنہائی کا احساس بہت کم ہو رہا تھا اور راحیلہ بھی دھیرے دھیرے اپنے اسرار اور رموز کی تمام گتھیاں کھول رہی تھی۔

"اصل میں میری بھی کوئی رائے ہے۔ میں عورت ہوں۔ انسان ہوں۔ میری کچھ خواہشات ہیں۔" اس شام راحیلہ بہت ڈوب کے سچائی اور سنجیدگی کے ساتھ روشو سے باتیں کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس کا ٹیلیفون پر کسی "ڈائریکٹر" سے جھگڑا ہو گیا تھا جو اس سے تنہائی میں ملنے کیلئے اصرار کر رہا تھا اور بار بار ٹیلیفون کر رہا تھا اور وہ بار بار اس سے یہی کہہ رہی تھی کہ آج میرا موڈ نہیں ہے طبیعت خراب ہے اور ڈائریکٹر اس پر شبہ کر رہا تھا کہ آج تمہاری کہیں اور مصروفیت ہوگی۔ اور اس نے کہہ دیا تھا۔ "ہاں جو کچھ کرنا ہے کر لو۔"

"یہ سب لوگ مجھے اپنی پراپرٹی سمجھتے ہیں۔ کموڈٹی۔ جیسے بازار سے خریدی ہوئی کرسی اور میز کہ جب ان کا جی چاہا بیٹھ گئے۔۔۔۔ اور جب میں انکار کرتی ہوں تو یہ دھونس دیتے ہیں ان کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ کیوں۔۔۔۔ میں کوئی ان کی زر خرید غلام ہوں۔" وہ غصے میں بولتی چلی گئی۔ "یہ لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں۔ بڑی بڑی اہم میٹنگوں میں مصروف رہتے ہیں دنیا بھر کے دوروں پر جاتے ہیں۔ ان کی بیویاں ہیں، بچے ہیں، بچوں کے بچے ہیں۔ یہ بوڑھے اور نحیف و نزار معزز لوگ یہ جو اپنے گھروں میں نانا اور دادا ہیں۔ یہ جن کے پوتے، پوتیاں اور نواسے اور نواسیاں ہیں۔۔۔۔ یہ کیوں نہیں اپنے گھروں میں خوش رہتے تنہائیاں میرے پاس

کیوں کاٹنا چاہتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب ان کے پاس وقت ہو۔ جب ان کا موڈ ہو۔ جب مکمل طور پر فارغ ہو کر ریلیکس کرنا چاہتے ہوں۔ ہونہہ۔"

راحیلہ کا پارہ چڑھتا جارہا تھا۔ وہ بولتی جارہی تھی۔ پھر خود ہی اس نے اپنی زبان کو لگام دی۔ غصے کو کم کیا۔ اعصاب کو کنٹرول میں لائی اور بڑے التفات کے ساتھ روشو کی جانب دیکھ کر دھیمے ٹھنڈے اور کسی حد تک سریلے لہجے میں کہنے لگی۔

"آخر میرا بھی تو جی چاہتا ہے کسی کو میں بھی چاہوں۔ کوئی مجھے اچھا لگے۔ میں اپنے وقت میں، اپنی مرضی کے ساتھ کسی سے بات کرسکوں۔ میں بھی عورت ہوں۔ میری بھی خواہشات ہیں۔" پھر وہ بولتے بولتے ایک دم سنجیدہ اور خاموش ہوگئی۔

ٹیلی ویژن پر کوئی مشاعرہ آرہا تھا۔ مشاعرے کے دوران ایک بڑے نامور عمر رسیدہ لیکن پر وقار شاعر کا نام پکارا گیا۔ کمپیئر نے بڑے القاب سے "شمع محفل" اس کے سامنے رکھی اور عزت کے ساتھ نام لیا۔ جناب شمس لہر۔ اور راحیلہ شمس لہر کے نام پر کھو گئی۔ ایک لمحے میں وہ اپنے وجود اپنی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔ اسے روشو کی موجودگی کا احساس بھی نہیں رہا۔۔ شاعر نے ترنم سے مطلع پڑھا جیسے کسی مغنّی خوشنوا نے تان لگائی ہو۔ سر لفظ اور صاحب لفظ نے مل کر ماحول پر ایک سماں باندھ دیا۔ حاضرین نے داد کے ڈونگرے برسائے۔ صاحب شعر نے مشاعرہ لوٹ لیا اور روشو نے دیکھا کہ راحیلہ بیگم کی حالت غیر ہوتی جارہی ہے۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے اعصاب بے قابو ہوتے جارہے ہیں وہ غصے سے پھولتی سمٹتی اور تنتی جارہی تھی۔۔ اس کے جسم پر ہلکا سا تشنج پیدا ہوا اور پھر سینٹرل ٹیبل پر پڑا ہوا سویٹ کا پیالہ اس نے اٹھا کے بے اختیار فرش پر دے مارا اور کانچ کا پیالہ چھناکے کے ساتھ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ روشو سر سے پاؤں تک کانپ گیا اس نے جلدی سے اٹھ کر ٹیلی وژن بند کر دیا اور راحیلہ کے پاس آکے ہمدردانہ لہجے میں پکارا۔

"پلیز راحیلہ صاحبہ۔۔۔۔۔۔ پلیز"

"مت کہو مجھے صاحبہ۔ راحیلہ کہتے ہوئے منہ دکھتا ہے کیا۔" وہ غصے سے بولی۔ "کوئی تو ہو دنیا میں جو مجھے خلوص سے پکارے۔ فاصلے سمیٹ کر۔ میرے نام سے۔ جو نہ مجھ سے بڑا ہو نہ چھوٹا "وہ روہانسی ہوگئی تھی اور روشو کو پریشان دیکھ کر فوراً اس نے اپنے جذبات کو گرفت میں لیا۔

"سوری روشو۔۔۔۔ سوری"

"آپ بہت پریشان ہوگئی ہیں۔۔۔۔" روشو نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "میں سمجھا کہ ٹیلی وژن۔۔۔۔۔۔"

"ہاں بات ٹیلی وژن ہی کی تھی۔ دراصل یہ شاعر جو اپنا کلام سنا رہا تھا۔ یہ شاعر میری زندگی کا ایک حصہ ہے روشو۔ شاید حصہ تھا۔" اس نے اپنی بات کی فوراً تردید کر دی اور پھر نہایت جذباتی لہجے میں کہنے لگی۔

"تمہیں پتہ ہے میرے گرد زندگی بھر گدھ منڈلاتے رہے ہیں جن میں سے کچھ گدھوں کو تم نے اپنی آنکھ سے چند روز میں دیکھا ہے۔ ظاہر ہے گدھ سے کوئی پیار نہیں کر سکتا اور نہ گدھ کو کسی سے پیار ہو سکتا ہے وہ تو بس گوشت نوچتا ہے۔ یہ شاعر جسے شمس لہر کہتے ہیں میری زندگی کا واحد آدمی تھا جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا۔ اس نے بھی میرے ساتھ ویسی ہی محبت کی۔ اس نے مجھ پر نظمیں لکھی ہیں۔ مجھ پر غزلیں کہی ہیں۔ شعر لکھے میرے اوپر۔ میں فخر کرتی تھی کہ دنیا جس کی دیوانی ہے وہ میرا دیوانہ ہے۔ یہ خوبصورت لفظوں کا جادوگر ہے۔ میں اس کے الفاظ کے حسن اور طلسم میں گرفتار ہو گئی۔ ایسی گرفتار ہوئی کہ میں نے اپنے جسم کو بھی اور اپنی روح کو بھی مکمل طور اس کی تحویل میں دے دیا اور میں نے چاہا کہ اس کی روح بھی میرے اندر سمو جائے۔ اور پتہ ہے کیا ہوا۔۔۔۔" راحیلہ بیگم کی آواز میں یکلخت رقت پیدا ہو گئی اور انتہائی دکھ کے ساتھ بولی۔ "جب میں نے اسے یہ نوید سنائی کہ میں اس کی روح کی ضامن ہوں۔ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو اس نے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا"۔ راحیلہ ایک سرد سی آہ بھر کے بولی۔

"یہ شاعر، ادیب، دانشور، فنکار یہ بڑے بڑے الفاظ بولنے والے پروفیسر، یہ سب ایک جیسے ہیں کسی کا قول و فعل ایک نہیں۔۔۔۔۔ یہ بولتے کچھ ہیں بیچتے کچھ ہیں۔ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔۔۔۔" اس کی آواز بیٹھ گئی اور بولتے بولتے نڈھال ہو کر اس نے پیچھے صوفے سے ٹیک لگائی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ سب جھوٹے ہیں۔ ان کے الفاظ جھوٹے ہیں لیکن کتنے سیدھے سادھے لوگ ہیں ہم، جو ان کے جھوٹے اور پرفریب الفاظ کے طلسم میں پھنس جاتے ہیں۔ اف میرے خدایا۔۔۔۔"

اس کی سانس جیسے پھول گئی۔ وہ اس طرح تھک گئی جیسے دس کوس کی پیدل مسافت طے کر کے آئی ہو۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالا۔ کچھ سوچا اور جیسے اچانک کوئی بات یاد آئی ہو۔ تیزی سے اٹھی اور لپک کر ٹی وی کھول دیا جیسے وہ لہر کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔

لیکن مشاعرہ ختم ہو چکا تھا لہر جا چکا تھا وہ ایک دم مایوس ہو کر واپس بیٹھ گئی۔ بہت مایوس۔

"میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی"

"سوری۔۔۔۔۔" روشو نے اظہار افسوس کیا کیونکہ روشو ہی نے ہی ٹی وی بند کیا تھا۔
"میں نے ٹی وی بند کر دیا تھا"۔
"کوئی بات نہیں"۔ وہ روشو کا دل رکھنے کیلئے مسکرا دی۔ "پھر کبھی نظر آجانے گا"۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

اور پھر ایک دن آخر وہی ہوا جس کا روشو کو ڈر تھا اور اگر ڈر نہیں تھا تو کم از کم توقع ضرور تھی۔ اس دن وہ راحیلہ کے یہاں خصوصی طور پر مدعو تھا۔ راحیلہ نے دو دن قبل ہی کہہ دیا تھا کہ ویک اینڈ کی شام کو کھانا اکھٹے ہی کھائیں گے۔

"کون کون ہو گا"۔ روشو نے پوچھا تھا۔

"بس تم اور میں۔۔۔۔۔ یا میں اور تم"۔ اس نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا تھا۔ اور روشو کیلئے یہ بڑی اہم بات تھی ہر چند کہ راحیلہ روشو کو سب سے زیادہ اہمیت دینے لگی تھی۔ ایک سچائی اور خلوص کے ساتھ، بغیر کسی تصنع کے روشو سے ملتی تھی لیکن روشو کے مقابلے میں شہر کے تمام "معززین" کو مسترد کر دینے کے باوجود ویک اینڈ کی شام کو روشو کو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ شام اس نے کسی ایم ڈی کسی چیئر مین، کسی ڈی جی، کسی سی ایس پی افسر یا پھر کسی ایسی پارٹی کیلئے مخصوص کی ہوتی جہاں اس قسم کے تمام "بگ شاٹس" یا معززین مدعو ہوتے اور ایسی پارٹی میں شرکت اس کیلئے مصلحت بھی تھی اور اس کی اپنی سماجی معاشرتی اور مالی حیثیت قائم رکھنے کیلئے ضرورت بھی تھی۔ ویک اینڈ کی شام کو وہ روشو کو دکھائی دیتی نہ گھر پر ملتی اور نہ ہی روشو اس دن راحیلہ سے ملاقات کی توقع رکھتا۔ دوسروں کی موجودگی میں روشو سے ملتے ہوئے راحیلہ ویسے بھی گریز کرتی کہ وہ جانتی تھی کہ روشو بہت کم آمیز اور شرمیلا نوجوان ہے۔ اور دوسروں کے ساتھ بے تکلف ہونا یا گھل مل جانا اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ لہٰذا روشو کے مزاج کے مطابق اس دن شام کو کھانے پر راحیلہ نے کسی اور کو مدعو نہیں کیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ شام اس نے روشو ہی کے نام کر دی تھی۔

سر شام جب روشو نے گیٹ کی گھنٹی بجائی تو فوراً ہی گیٹ کھلا جیسے راحیلہ گیٹ کے پیچھے ہی منتظر تھی۔۔۔۔۔

"ویلکم۔۔۔۔۔" اس نے آگے بڑھ کر روشو کا ہاتھ تھاما۔ روشو نے بھی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اب راحیلہ سے مصافحہ کرنا اس کے معمولات میں شامل ہو گیا تھا اور اسے ایسا کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ روشو کو بہت اہتمام کے ساتھ لان میں لے گئی اور اس وقت تک نہیں بیٹھی جب تک

روشو نہیں بیٹھ گیا۔ روشو نے غور سے دیکھا کہ آج راحیلہ پر معمول سے زیادہ نکھار ہے۔ وہ خوب سنوری ہوئی تھی چہرے سے بھی بہت ہشاش بشاش اور ترو تازہ تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی بلا کی چمک اور روشنی تھی جو روشو نے پہلے کم ہی دیکھی تھی۔

"عبدل ایسا کرو۔۔۔۔ دو فریش لائم لے آؤ"۔ راحیلہ نے ملازم سے کہا۔ آج خلاف معمول اس نے چائے نہیں منگوائی۔ اور جب عبدل چلا گیا تو کہنے لگی۔ "معلوم نہیں تم شوق سے کھاتے ہو یا نہیں لیکن میں نے تمہارے لئے آج چائنیز بھی بنوایا ہے"۔

"کچھ بھی کھالیں گے"۔ روشو نے کہا

"کچھ بھی کھالو اچھے لگتے ہو۔ کچھ بھی پہنو۔ کچھ بھی بولو۔ بہر حال میں اچھے لگتے ہو"۔ وہ روشو کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے سراہنے کے انداز میں بولی۔ اور روشو نے شرما کے سر جھکا لیا۔

"آج کل تو ایسے دلہن بھی نہیں شرماتی جیسے تم شرما رہے ہو"۔ راحیلہ نے ازراہ مذاق کہا تو روشو نے ایک جھٹکے کے ساتھ سر اٹھا کے راحیلہ کو دیکھا۔

"ٹیک اٹ ایزی"۔ وہ بولی اور اتنے میں عبدل فریش لائم لے کر آگیا۔

"کھانا تیار ہے ناں۔۔۔۔" اس نے عبدل سے اپنی تسلی کے لئے پوچھا۔

"زی بیگم صاحبہ۔۔۔۔۔" عبدل مستعد ہو کر بولا۔ "بس چکن لیورا بھی نہیں بنایا ہے وہ اسی وقت بناؤں گا زب کھانے لگو گے"۔

"ٹھیک ہے اسی وقت بنانا۔ لیکن کھانا آج ہم کچھ لیٹ کھائیں گے"۔ اس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈال کر کہا۔

"زو حکم۔۔۔۔۔" عبدل نے گردن جھکائی۔

"اور سنو۔۔۔۔۔" راحیلہ نے فریش لائم کا گھونٹ پیا اور روشو کو بھی پینے کا اشارہ کرتے ہوئے عبدل سے مخاطب ہوئی۔

"ہم اندر رہیں بیڈ روم میں ڈسٹرب نہیں کرنا۔ کوئی ٹیلیفون مجھے اندر نہیں دینا۔ اور کوئی طرم خان آجائے اندر نہیں لانا اسے گیٹ سے واپس کر دو۔۔۔۔ ٹھیک"

"ٹھیک۔۔۔۔" عبدل سر جھکا کے لیکن آنکھیں ترچھی کر کے بولا۔

"بیگم صاحب ٹیلیفون ہے"۔ آیا نے آکر پیغام دیا۔

"نہیں کوئی ٹیلیفون نہیں ہے"۔ راحیلہ نے منفی انداز میں سرہلا کے کہا۔ "عبدل کو میں نے بتادیا ہے میں گھر پر نہیں۔۔۔۔ سوں آج۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے جی۔۔۔۔۔۔" آیا بولی۔ "آپ گھر پر نہیں ہیں اور کچھ پتہ نہیں کہاں گئی ہوئی ہیں۔ اور کچھ پتہ نہیں کب آئیں گی۔"

"گڈ اس نے آیا کو سراہا۔ آیا اور عبدل دونوں اندر چلے گئے۔ تو بیگم نے آہستہ سے روشو کا ہاتھ تھاما۔

"آجاؤ اندر چلیں۔ اے سی میں"۔ وہ اپنائیت سے بولی اور روشو قدرے ہچکچاہٹ سے راحیلہ کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔ جہاں اے سی لگا ہوا تھا اور ٹمپریچر بہت خوشگوار تھا۔

"بی کمفرٹیبل۔۔۔۔۔" بیڈ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ اور روشو جیسے خوابوں کے جزیرے میں آگیا۔ وہ جتنی بار بھی راحیلہ کے یہاں آیا وہ یا تو لان میں بیٹھا تھا یا ڈرائنگ روم میں راحیلہ نے اس کو بٹھایا۔ یا ڈائننگ روم میں یا پھر دونوں نے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھ لیا۔ بیڈ روم میں راحیلہ نے آج پہلی مرتبہ اسے داخل کیا تھا۔ اور روشو بیڈ روم کا نقشہ ہی دیکھ کر چکا چوند ہو گیا تھا۔ روشنی نہ بہت تیز تھی نہ بہت مدہم لیکن بجلی کے جو بلب لگے ہوئے تھے وہ عجیب طرح کی آسمانی اور فیروزی رنگ کی روشنی کا ملا جلا عکس دے رہے تھے۔ بیڈ روم بہت ہی نفاست اور سلیقے سے سجایا گیا تھا جس میں ڈیکوریشن کی چیزوں کے ساتھ ساتھ پرانے نوادرات بھی مزین تھے۔ دیوار پر ایک مستطیل شکل میں لمبوتری تصویر ابھرے ہوئے پلر کے ساتھ لگی ہوئی تھی یہ ایک پہاڑ کے دامن سے بہتی آبشار کی تصویر تھی اور آبشار کی موجوں کے اندر ایک جوڑا پانی کی لہروں کے اندر نیم نمایاں انداز میں محو غسل تھا۔ اور اس تصویر کے اوپر بجلی کا بلب ایسے لگایا گیا کہ روشنی صرف آبشار پر پڑتی تھی جس کی بدولت تصویر تصویر نہیں رہی تھی لگتا تھا سچ مچ آبشار بہہ رہا ہے۔ کمرے کے اندر بھینی بھینی خوشگوار خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بیڈ پر شنیل کے بہت دلکش کشن اور غلاف تھے۔ بیڈ کے پیچھے نہایت خوبصورت فریم کے اندر کسی اچھے آرٹسٹ کے ہاتھ کا بنا ہوا پورٹریٹ تھا پورٹریٹ دیکھ کر روشو چونک گیا جیسے ایک دم اس پر بجلی گری ہو۔ وہ پورٹریٹ معروف شاعر شمس لہر کا تھا۔ لیکن روشو نے محسوس نہیں ہونے دیا کہ تصویر کو دیکھ کر وہ ہل گیا ہے یا اس کے اندر کوئی زلزلہ سا آگیا ہے۔ راحیلہ نے بھی پورٹریٹ کا نوٹس نہیں لیا۔ شاید وہ اس کمرے کے اندر تصویر کا نوٹس لیتی بھی نہیں ہوگی کہ یہ اس کیلئے معمول کی بات ہے۔ البتہ روشو نے یہ بات محسوس کی کہ راحیلہ اس تصویر سے دو دھاری تلوار کا کام لے رہی

ہے۔ایک تو شاید اس کی محبت کا جذبہ بھی ہوگا لیکن اس کے بیڈ روم کے اندر آنے والوں کیلئے یہ تصویر یقینی طور پر ایک رقابت کا جذبہ پیدا کرتی ہوگی اور راحیلہ رقیبوں کے اسی جذبے سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں آجاتی ہوگی۔کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی روشو ایک عجیب سے کے اندر خیالات کے سمندر میں جیسے غوطہ سا لگا گیا۔ایک لمحہ میں کئی کہانیاں اس کے ذہن میں آئیں کی چلی گئیں۔

"تم بیٹھو میں چینج کر کے آتی ہوں"۔راحیلہ بیگم نے روشو کو صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی۔اور خود برابر کے دروازے سے غائب ہو کر شاید ڈریسنگ روم میں آگئی لیکن جس لباس میں آئی اسے دیکھ کر روشو کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور ایک بجلی کا کرنٹ جیسے اس کے پورے وجود میں دوڑ گیا اندر ہی اندر وہ کچھ خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔راحیلہ کے جسم پر بغیر آستین کا ایک نائٹ گاؤن تھا جس میں وہ بہت کم چھپی تھی اور بہت زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔

"اب بات کرو-----" وہ بہت خوشگوار موڈ میں اس کے قریب آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔ پھر کباٹ سے مشروب کی بوتل نکالی ساتھ دو گلاس نکالے،ایک روشو کے سامنے رکھا ایک اپنے آگے بیڈ روم کے فریج سے پانی کی ٹھنڈی بوتل نکال کے بھی سامنے رکھی اور "شربت" انڈیلنے لگی۔

"نہیں-----" روشو نے اپنے گلاس پر ہاتھ رکھا۔"میں نہیں پیئوں گا"۔

"اوں ہوں------ تھوڑی سی"۔اس نے اپنی ناک سمیٹ کے پچکارنے کے انداز میں روشو سے اصرار کیا جیسے روشو ایک معصوم بچہ ہو---- "رنگدار پانی ہی تو ہے"۔وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔

"نہیں راحیلہ-----" روشو نے پہلی مرتبہ اسے بے تکلفی سے برابری کا درجہ کے ساتھ عمروں کے تفاوت کو نظرانداز کر کے اس کے نام سے پکارا۔

"شکر ہے تم نے مجھے میرے نام سے تو پکارا----" وہ خوش ہو کر بولی۔"کچھ آگے تو بڑھے"۔

"ہمت کی ہے-----" روشو نے کہا۔

تھوڑی سی اور ہمت کر لو----لو تھوڑی سی۔اور ہمت آجائے گی"۔وہ معنی خیز انداز میں بوتل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔۔"صرف شربت ہے"۔

"نہیں راحیلی----" وہ اور بے تکلف ہو گیا اور راحیلہ سے راحیلی پر آگیا۔"میں صرف پانی

پئیوں گا"۔

"ٹھیک ہے تھوڑی دیر بعد سہی۔ چیئرز"۔ اس نے گلاس روشو کے خالی گلاس کے ساتھ ٹکرایا اور غٹ غٹ کی آواز نے کمرے کی خاموش معطر اور بند فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا۔ اور پھر اس کے ہونٹ، گلاس اور ہاتھ، تیزی سے متحرک ہو گئے۔ وہ شربت انڈیلتی چلی گئی۔ ایک کے بعد ایک۔ اور روشو نے محسوس کیا کہ راحیلہ نے پانی کو چھوا تک نہیں۔ وہ بغیر پانی کے بہت تیز جا رہی تھی۔ روشو کی دیکھ دیکھ کر حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا حلق خشک ہو رہا ہے اور پانی پینے کے لئے جب روشو نے پانی کی بوتل کی جانب ہاتھ بڑھایا تو راحیلہ یہ سمجھی کہ شاید اس کے گلاس میں پانی ڈالنے لگا ہے۔

"پانی ---- نہیں۔" راحیلہ نے اپنے گلاس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ملاوٹ کی تو میں قائل ہی نہیں ہوں اور پانی اگر ملانا ہی ہو تو اس کے لئے دودھ کافی ہے۔" ہی ہی ہی۔--- ۔" وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے رنگ شیشے سے اڑتا گیا اور راحیلہ پر چڑھتا گیا۔ وہ ترنگ میں آ کے گنگنانے لگی۔ پھر ایک تان لگا کے روشو کے مزید قریب ہو کر بولی۔ "کچھ سنو گے --- ۔" روشو نے ایک تان ہی سے محسوس کیا کہ راحیلہ کی آواز بہت سریلی ہے۔

"ہوں ---- " اس نے اپنا اندر کا خوف مٹانے کیلئے آہستہ سے سر ہلایا۔ اور راحیلہ نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو ٹیپ کا بٹن دبایا اور ایک مسحور کن دھن بجنے لگی۔ راحیلہ نے دھن کے ساتھ گانا شروع کیا۔ گاتے گاتے وہ مزید ترنگ میں آئی اور اٹھ کھڑی ہوئی اور موسیقی کے ساتھ آہستہ آہستہ تھرکی اور پھر بڑے دلکش انداز میں رقص کرنے لگی۔ پھر ایک لمحے کیلئے اسنے اپنے تھرکتے جسم کو روکا اور شمس لہر کے پورٹریٹ کو دیکھ کر روشو سے مخاطب ہوئی۔

"پتہ ہے میں آج تک کسی کے سامنے نہیں ناچی ہوں سوائے اس بے وفا کے"۔ وہ شمس لہر کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "نہ کسی کے سامنے گایا ہے میں نے سوائے اس بے وفا کے۔ بڑے بڑے جنرل مینجرز، ایم ڈیز، چئیر مین، سی ایس پی آفیسرز، بڑے بڑے کروڑ پتی سیٹھ تڑپتے اور ترستے رہ گئے کہ ایک مکھڑا سنا دو، ذرا سا رقص دکھا دو۔ میں نے کہا نائیں ----" وہ "نہیں" پر زور دے کر اور گھوم کر بولی۔ "سب کو ٹرخا دیا۔ میں نے ان کے جوتے لگا دیئے ہیں اسی جگہ میں نے کہا مطلب کی بات کرو اور بھاگو ---- البتہ اس بے وفا کے سامنے میں گھنٹوں ناچی اور گھنٹوں گاتی رہی ہوں۔ بس صرف اس کے سامنے اور اب بھی جی چاہتا ہے تو اس کی تصویر کے سامنے ناچ گا لیتی ہوں یا پھر آج تمھارے سامنے ناچ گا رہی ہوں"۔ اس نے پھر ہلکی ہلکی تان کے

ساتھ رقص شروع کیا۔ روشو دم بخود دیکھتا رہا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے لئے روشو کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اس کی معصوم سی تھوڑی کو چھو کر بولی۔ "اتنے اداس کیوں ہو لڑکے۔ ہونہہ ۔۔۔۔ کس بات پر میں نے کچھ کہہ دیا ہے کیا"۔

"نہیں، نہیں۔ نہیں تو ۔۔۔۔" روشو بوکھلاہٹ میں بولا۔

"لہر کی تصویر ہٹا دوں کیا"۔

"نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں"۔ وہ پھر بوکھلایا۔

"تو پھر کوئی بات کرو ۔۔۔۔۔" اس نے مزید فاصلہ سمیٹتے ہوئے کہا۔

"وہ ۔۔۔۔۔ وہ آپ کی گاڑی کا ایک کسٹمر آج آیا تھا"۔ روشو گھبراہٹ میں بولا"۔ میں نے ڈیمانڈ بتائی تھی اس نے آفر ۔۔۔۔۔

"فار گاڈ سیک روشو ۔۔۔۔۔" وہ تڑپی۔ "یہ کیا بزنس ڈسکس کرنے کا وقت ہے۔ لک ایٹ می۔" اس نے اپنے دونوں بازو پھیلائے۔ "انجوائے روشو انجوائے ۔۔۔۔۔۔"

"روشو پر کپکپی طاری تھی۔ جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ راحیلہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی اس نے ہلکی سی جنبش کے ساتھ خود کو بچے کھچے لباس کی قید سے آزاد کر دیا ۔۔۔۔

روشو نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نہ سوچا۔ نہ سمجھا دروازہ کھولا اور سرپٹ بھاگ نکلا اور راحیلہ کے روشو کیلئے کھلے بازو کھلے کے کھلے رہ گئے۔

باہر نکل کر کپکپاتے ہاتھوں سے روشو نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کار ایک سرچ لائٹ کی تیز روشنی کے ساتھ اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ بہت دور تک گاڑی چلاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ راحیلہ کے طلسماتی ماحول سے نکل کر اپنے فلیٹ کی بتیاں بجھائے گھپ اندھیرے میں لیٹا ہوا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ یہ اس نے کیا کیا ہے۔ آیا اس نے کچھ کھویا ہے یا پایا ہے۔ وہ خود کو خوش نصیب سمجھے یا بد نصیب۔ کیا اس نے جو کچھ کیا ہے وہ حماقت تھی بزدلی۔ بے ہمتی ۔۔۔۔ یا جرات اور ظرف ۔۔۔۔ کیا یہ کفران نعمت نہیں تھا!

"لیکن نہیں ۔۔۔۔" اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔ "وہ ایک بڑے گناہ اور گمراہی سے بچ گیا ہے ۔۔۔۔"

وہ فقیروں کی بستی سے گناہ اور گمراہی کیلئے نہیں بھاگا تھا اس کی منزل بڑی روشن تھی اور راحیلہ کا بنایا ہوا راستہ روشو کی منزل کی جانب جانے والا راستہ نہیں تھا۔

اس نے اپنے دل کو سکون اور اطمینان پہنچانے کے لئے سوچا اور صبح تک توبہ استغفار کرتا

۱۹

رات عجیب کشمکش، تذبذب، تاسف، استغفار اور بے خوابی کی کیفیت میں گزارنے کے بعد روشو صبح بہت سویرے اٹھ گیا۔ وہ فلیٹ کے دروازے سے نکل کر مشرق کی جانب کھلنے والی بالکونی میں آیا۔ افق کی جانب اس نے نگاہ دوڑائی تو اسے دور پہاڑوں کے ملگجے سایوں سے طلوع ہونے والے سورج کی آمد کی نوید سنانے والی ہلکی ہلکی نامعلوم سی کرنیں نمودار ہوتی دکھائی دیں۔

سیاہ لکیروں پر دودھیا رنگ کی ایک خوشگوار سفیدی اس کی آنکھوں کو منور کر رہی تھی اور اس کے اندر کا رت جگا اور تکدر خودبخود صاف ہو رہا تھا۔ ہر چند کے وہ دیر سے سونے اور دیر سے اٹھنے والے لوگوں میں سے تھا۔ لیکن آج وہ پہلی دفعہ نور کے اس تڑکے میں بیدار ہوا تھا اور اسے یہ سماں بہت اچھا لگ رہا تھا اسے پہلے کبھی اس سماں کا علم ہی نہیں ہوا تھا یا شاید کبھی اس نے غور سے دیکھا ہی نہیں تھا کہ چوبیس گھنٹوں پر محیط دن اور رات کا یہ سنگم اور یہ نقطہ آغاز در حقیقت اتنا خوبصورت ہے۔

ہوا کے اندر اسے بھینی بھینی خوشبو رچی بسی ہوئی لگ رہی تھی جسے وہ ناک اور منہ کے ذریعے ہلکی ہلکی سانس کے ساتھ اپنے اندر رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ اور اسے اپنے دل اور دماغ کے علاقے میں ایک عجیب دل خوش کن تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ کتنی صاف پاک اور لطیف ہوا تھی۔ روشنی کتنی حسین تھی۔ ماحول کیا خوبصورت اور کثافت سے پاک تھا۔ کوئی شور شرابا اور بے ہنگم آوازیں نہیں تھیں نہ آسیب زدہ خاموشی اور تاریکی تھی۔ طلوع آفتاب کا ایک ایسا منظر تھا جو سچا اور آلودگی سے پاک تھا۔ بسوں، رکشاؤں، ٹیکسیوں اور مشینوں کی چمنیوں کا دھواں ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ابھی لوگ سوئے ہوئے تھے۔ ابھی فتنے بیدار نہیں ہوئے تھے۔ مکر و فریب بھی

سویا ہوا تھا۔ عیاری چالاکی اور منافقت بھی ابھی بیدار نہیں ہوئی تھی۔ ماحول صاف ستھرا سچا اور ملاوٹ سے پاک تھا۔ تھوڑی دیر میں لوگ اٹھ جائیں گے اور پھر جھوٹ شروع ہو جائے گا۔ منافقت کا آغاز ہو جائے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ نمود صبح کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کے اندر سے ایک سچا اور جذبات کی سچائی سے پر شعر تڑپ کر باہر آنا چاہتا تھا لیکن وہ ایک میکینک آدمی تھا اور اس نے شاعری نہیں پڑھی تھی ورنہ اسے جوش کا یہ شعر بے اختیار یاد آتا کہ۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

تاہم وہ صبح کے اس دلگداز منظر سے بالکونی میں کھڑا اس وقت تک لطف اندوز ہوتا رہا جب تک سورج کی کرنیں بہت زیادہ تیز روشنی کے ساتھ نمودار نہ ہو گئیں اور پھر اس نے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی اپنی گزشتہ تمام کوتاہیوں اور گمراہیوں کی تلافی کا ارادہ کر کے ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے دن کا آغاز کیا اور جب نہادھو کے شیو کر کے اور ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے شوروم پر پہنچا تو وہ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو ایک بالکل تر و تازہ اور ہلکا پھلکا انسان محسوس کر رہا تھا جس کے دل کے اندر تمام وسوسے، اندیشے اور خدشے دور ہو چکے تھے اور کوئی کدورت اس کے دل میں باقی نہیں تھی۔

شوروم پہنچ کر پہلے تو اس نے شوروم کے باہر کھڑی ان گاڑیوں کا جائزہ لیا جو مرمت کی خاطر آئی تھیں۔ اس نے ہر گاڑی پر کام کرنے کیلئے کاریگروں کو الگ الگ مامور کیا اور پھر شوروم میں جا کے اس نے کئی دنوں کے بکھیرے ہوئے کاغذات سمیٹے۔ کچھ گاڑیوں کے ٹیکس واجب الادا تھے وہ فارمز نکال کے سامنے رکھے۔ ایک پارٹی کئی دنوں سے ٹیلیفون کر رہی تھی اور روشو اپنی "نجی مصروفیات" کی وجہ سے پارٹی کے ساتھ رابطہ قائم نہیں کر پا رہا تھا لہٰذا اسی پارٹی کو ٹیلیفون کیا۔ کچھ اور ضروری ٹیلیفون کرنے تھے جو کئی دنوں سے لٹکے چلے آ رہے تھے۔ ان نمبروں کو گھمایا کچھ لوگوں کے حسابات تھے اور لین دین کا کھاتہ کئی دنوں سے اس کی توجہ کا منتظر تھا۔ اسے دیکھا وہ صبح صبح تقریباً گھنٹہ بھر تک ہمہ تن مصروف رہا اور جب تھک کے اس نے پیچھے کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی اور لڑکے کو چائے کیلئے بول کر قدرے سستانے لگا تو اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور یہ صبح شوروم میں آنے کے بعد غالباً پہلا ٹیلیفون کھڑکا تھا۔

"ہیلو......" اس نے نارمل طریقے سے ریسیور اٹھا کہ آہستگی سے بات کی لیکن ادھر سے

جواب نارمل نہیں تھا۔

"کاوارڈ------" یہ راحیلہ کی دبی دبی آواز تھی۔ یہ حقارت، نفرت اور ملامت سے پر لہجہ تھا۔ روشو خاموش رہا تو راحیلہ مزید نفرت اور ملامت سے بولی۔

"اسٹوپڈ----ڈل-----لیزی------ان لکی" اس نے ہر لفظ کو نفرت اور حقارت سے چبا چبا کے ادا کیا اور روشو نہایت صبر اور تحمل سے اس کی گالیاں سنتا رہا۔

"دیکھئے راحیلہ بیگم دراصل------ کل رات------" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"ہش ش ش ش-----" راحیلہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ڈونٹ ٹاک اباؤٹ کل رات-----" وہ انگریزی اردو کے ملے جلے لہجے میں بولی۔ "رات کا تذکرہ مت کرو۔ وہ شاید میری بھول تھی۔ پھر اس نے قدرے تصرف کے ساتھ یہ شعر پڑھا------ رات کی بات کا مذکور ہی کیا۔ چھوڑو رات گئی بات گئی----- تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے رات کی بات کا دوبارہ تذکرہ کیا جائے"۔

"تو پھر اب آپ کیا کہنا کیا چاہتی ہیں------" روشو نے قدرے تامل سے استفسار کیا۔

"تم اپنا علاج کراؤ----" راحیلہ نے غصے سے کہا---- "تم اپنا نفسیاتی علاج کراؤ۔ تم ذہنی طور ابھی تک پسماندہ ٹھکرائے ہوئے، غریب، محروم اور احساس کمتری کا شکار فقیروں کی بستی میں بسنے والے لڑکے ہو------" راحیلہ کے لہجے میں نفرت اور حقارت کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ کی گئی توہین کا احساس بھی تھا۔ وہ بولتی جا رہی تھی----- "گٹر کا کیڑا جو ہوتا ہے نا اس کے پر بھی ہوتے ہیں۔ وہ اڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن کھلی فضا میں اڑتا نہیں۔ اگر وہ چاہے تو بھنورے کی طرح ڈال ڈال اور پھول پھول پر بیٹھ سکتا ہے۔ سب کا رس چوس سکتا ہے لیکن ایسا نہیں کرتا کیونکہ اسے کھلی ہوا، فضا اور مہک راس نہیں آتی۔ اسے صرف گٹر راس آتا ہے"۔

نفرت کے بھرپور اظہار کے بعد راحیلہ نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ روشو کی طبیعت خاصی مضمحل ہو گئی جیسے راحیلہ بیگم نے اسے گالی دے دی ہو۔ وہ شدید قسم کی توہین محسوس کرنے لگا تھا---اس نے ریسیور رکھا اور پتہ نہیں کیا سوچنے لگا لیکن اسے زیادہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا اچانک راحیلہ کا ڈرائیور اندر آیا۔

"اسلام علیکم سر-----" ڈرائیور نے مودبانہ سلام کیا۔

"جی-----؟" روشو نے سر اٹھا کے سوالیہ انداز میں ڈرائیور کی جانب دیکھا۔

"بیگم صاحبہ نے اپنی گاڑی منگوائی ہے سر----" ڈرائیور نے کہا۔

"ضرور----" روشو نے دراز سے چابی نکال کے ڈرائیور کے سپرد کی اور جب ڈرائیور نے راحیلہ کی گاڑی شوروم سے نکالی تو روشو نے محسوس کیا کہ راحیلہ سے اس کا آخری رابطہ بھی ٹوٹ گیا ہے۔اس نے ایک جھٹکا سا محسوس کیا لیکن ساتھ ہی پتہ نہیں کیوں وہ ہلکا پھلکا بھی محسوس کرنے لگا جیسے اس کے سر پر رکھا الجھن، مصیبت اور غالباً گناہوں کا پہاڑ بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہو۔ جیسے اس کے پاؤں میں پڑی ہوئی کوئی ان دیکھی زنجیر خود بخود ٹوٹ گئی ہو اور وہ ایک دم آزاد ہو گیا ہو۔

اس دن وہ شام کو شوروم بند ہونے سے پہلے ہی گاڑی لے کر ایک لانگ ڈرائیو پر نکل گیا۔ وہ اپنے ذہن کو، اپنے دل و دماغ کو انتشار اور خلفشار سے مکمل طور پر آزاد کر دینا چاہتا تھا لیکن کئی باتیں خود بخود اس کے دماغ میں جبراً در آئی تھیں۔ راحیلہ بیگم نے اس کی مردانگی کو للکارا تھا۔ اس کی شدید توہین کی تھی۔

"کیا شرافت بزدلی ہوتی ہے ------" اس نے ایک لمحے کیلئے سوچا اور غصے میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

"ایسی باتوں سے راحیلہ بیگم کیا چاہتی ہے ----" روشو نے سوچا۔ "یہی نا کہ میں اس کے طعنے کی تردید کر دوں۔ عملی طور پر -----"

ظاہر ہے روشو کی جگہ اگر کوئی اور نوجوان ہوتا تو وہ بھی اس للکار کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اس کا جی چاہا کہ وہ فوراً ابھی لوٹ کر جائے اور راحیلہ پر ثابت کر دے کہ وہ ایک مکمل مرد ہے۔

"لیکن نہیں ------" اس کی سوچ کی راہ میں پھر ایک رکاوٹ جیسے پیدا ہو گئی اور اسے استاد کی ایک نصیحت یاد آ گئی -----

"یاد رکھنا روشو اپنے اعصاب کا کنٹرول ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھنا ----" استاد نے ایک بار اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا۔ "کرنا وہی جو تم کرنا چاہتے ہو۔ اگر کسی نے تمہیں اشتعال دلا دیا اور تم نے وہ کر دیا جو اشتعال دلانے والا یا اشتعال دلانے والی چاہتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تمہارے جذبات بھی دوسرے کے ہاتھ میں چلے گئے ہیں لہذا یاد رکھنا کبھی اپنے اعصاب کا کنٹرول کسی دوسرے کے ہاتھ میں مت دینا ---" یہ استاد کی نصیحت تھی جو روشو کے انتقام اور غصے کے طوفان کے آگے دیوار بن گئی تھی اور اس نے راحیلہ کے چیلنج کو سر سے جھٹک دیا۔ وہ شام سیدھا ساحل سمندر کی طرف چلا گیا اور ایک الگ تھلگ جگہ گاڑی روک کر سمندر کی تیز موجوں کی جانب سے آتی ہوئی ٹھنڈی اور سرد ہواؤں کے تھپیڑوں سے اپنے سراپے کو نم آلود کرتا رہا اور جب کافی رات گئے وہ ساحل سے لوٹا تو سمندری ہواؤں کی نمی سے اگرچہ اس کا وجود چپچپا سا ہو رہا تھا

لیکن اس کے سر کے اندر اب کوئی فتور نہیں تھا جیسے وہ تمام غبار سمندر کی موجوں کے حوالے کر کے نئی زندگی کے عزم کے ساتھ واپس لوٹا ہو۔ اس ارادے کے ساتھ کہ اس نے صرف بزنس نہیں کرنا، صرف پیسہ نہیں کمانا لکھنا پڑھنا بھی ہے اور کوئی ایسا کام بھی کرنا ہے جس سے اس کے دل کو تسکین ملے اور دوسروں کیلئے مشعل راہ ثابت ہو۔

وہ راحیلہ کو قطعی طور پر بھول گیا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں تھی۔

○

علم حاصل کرنے کی لگن ایک دفعہ پھر روشو کے اندر آگ کی طرح دہکی جو راکھ کے نیچے انگاروں کی شکل میں دبی ہوتی ہے اور راکھ کے کریدتے ہی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دہک کر پھر بھڑک اٹھتی ہے۔ اس نے اپنے پرانے بریف کیس کو کھولا اور اس میں سے وہ کتابیں نکالیں جو اسے شاہینہ نے پڑھائی تھیں اور ان اسباق کو دیکھا جن پر شاہینہ نے اپنے ہاتھ سے نشان لگائے تھے اور آگے پڑھنے کی سخت تاکید کی تھی لیکن وہ اسباق تو روشو نے بہت پیچھے چھوڑ دیئے تھے۔ اس نے زمانہ سوارات کے اسکول میں داخلہ لے کر پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا پھر نصاب سے ہٹ کر بھی اس نے اردو اور انگریزی کی متعدد کتابیں پڑھ رکھی تھیں اور اب بھی پڑھتا رہتا تھا لیکن یہ پڑھائی اس نے کسی سسٹم کے تحت نہیں کی تھی بس جو کتاب جو رسالہ جس طرح ہاتھ لگا خرید کر پڑھنا شروع کر دیا لیکن اب حصول علم کی ایک طلب اور پیاس اس کے اندر بھڑک اٹھی تھی۔ وہ کسی نظام کے تحت پڑھنا چاہتا تھا تاکہ اس کے پاس تعلیمی ادارے کی کوئی سند ہو۔ وہ گریجویٹ کہلائے۔ ایم اے کر لے۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری ہو اس کے پاس...... کیونکہ اپنے تجربے کی روشنی میں اس نے محسوس کیا تھا کہ دنیاداری کے حساب سے اپنے آپ کو منوانے اور آگے بڑھنے کے لئے سندوں اور ڈگریوں کا حصول ضروری ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ لوگ، انسان کو نہیں مانتے بلکہ اس کے پاس دولت کی مقدار کے حساب سے اس کی حیثیت کو مانتے ہیں۔ اس کی ڈگری، سند اور ڈپلومے کو مانتے ہیں۔ اس کے گریڈ اور گروپ کو مانتے ہیں۔ اس کے کندھے اور شانے پر لگے ہوئے پھولوں کو، پتیوں کو، تاجوں کو مانتے ہیں۔ روشو کو ذاتی طور پر یہ سب چیزیں ایسی ہی لگتی تھیں جیسے چیڑ، صنوبر اور برگد کے درختوں پر لگے ہوئے اوپر کی سطح کے سوکھے ہوئے اور اکھڑے ہوئے چھلکے جن کے ہونے نہ ہونے سے درخت کی قد و قامت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن انسانوں کے معاملے میں یہ بات بڑی معنی خیز تھی کہ اگر انسان کے اوپر سے یہ چھلکے یعنی یہ پھول،

یہ پتیاں، یہ کراؤن، یہ طمغے اگر ہٹالئے جائیں تو ان کی قدو قامت ختم ہوجاتی ہے اور وہ ہوا نکلے غبارے کی طرح بے وزنی کی کیفیت میں ٹھس ہو کر زمین پر آجاتے ہیں۔ لہٰذا وہ مزید وقت ضائع کئے بغیر آگے پڑھنا چاہتا تھا لیکن اس کے کاروباری معاملات اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ کسی کالج میں ایک ریگولر اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے داخلہ لے۔

"ایک کام کرو برخوردار کسی ادارہ علوم مشرقی میں داخلہ لے لو۔۔۔۔اور پھر ادیب فاضل وغیرہ پاس کرنے کے بعد انگریزی کا ایک پرائیویٹ امتحان دے کر بی اے کی ڈگری لے لو"۔ ایک دن قاضی صاحب نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ملک کے بڑے بڑے ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں نے جنہیں باقاعدگی سے کالجوں میں داخلہ لینے کی استطاعت نہیں اسی طرح پڑھ کر تعلیمی اداروں سے سندیں حاصل کی ہیں"۔

"مجھے راستہ بتائیں قاضی صاحب۔۔۔۔" روشو نے قاضی صاحب سے استدعا کی اور قاضی صاحب کے بتانے ہوئے راستے کے مطابق اس نے مشرقی علوم کے ایک شبینہ کالج میں ادیب فاضل کی سند حاصل کرنے کیلئے داخلہ لے لیا۔ اتفاق سے قاضی محمد ابراہیم اس ادارے کے سربراہ تھے اور قاضی صاحب کی صورت میں روشو کو صحیح معنوں میں ایک صحیح عالم اور معلم میسر آگیا تھا۔

قاضی صاحب حال ہی میں روشو کے برابر والے فلیٹ میں منتقل ہوئے تھے۔ یہاں پہلے ایک ٹیلر ماسٹر کا خاندان رہتا تھا۔ ان کے لڑکوں وغیرہ کی شادیاں ہوگئیں تو فلیٹ تنگ پڑنے لگا لہٰذا انہوں نے فلیٹ جو پگڑی پر دیا تو قاضی صاحب نے لے لیا۔ قاضی صاحب نے یہاں منتقل ہونے سے پہلے فلیٹ کی صفائی کی رنگ و روغن کرایا اور بہت ہی مختصر ساز و سامان کے ساتھ لیکن انتہائی سلیقے سے رہنے لگے۔

قاضی صاحب کا خاندان صرف دو افراد پر مشتمل تھا۔ قاضی صاحب اور ان کی صاحبزادی فرحانہ۔۔۔۔

فرحانہ سے روشو کی کبھی مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کہ قاضی صاحب کے یہاں مشرقی علوم، مشرقی فنون، مشرقی طرز کا رہن سہن اور مشرقی طور طریقوں اور رسم و رواج کی بدولت پردے کا اگر نہیں تو فاصلہ رکھنے کا خاص اہتمام تھا لیکن قاضی صاحب سے روشو کا ہر وقت آمنا سامنا رہتا۔ فلیٹ کے برآمدے سے جو پہلا کمرہ اندر کھلتا تھا وہ قاضی صاحب کا ڈرائنگ روم یا دیوان خانہ بھی اور لائبریری بھی تھا قاضی صاحب کے کمرے میں جو سب سے نمایاں چیزیں دکھائی دیتی تھیں

وہ قاضی صاحب کی اردو فارسی اور عربی کی کتابیں تھیں اور روشو صبح جب شوروم جاتا تو اس وقت بھی قاضی صاحب مطالعہ میں مصروف ہوتے اور جب وہ شام کو شوروم سے لوٹتا اس وقت بھی قاضی صاحب کو مطالعہ ہی دکھائی دیتے یا پھر زیادہ سے زیادہ وہ نماز کے وقت کہیں ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔ قاضی صاحب کا لباس بھی بہت منفرد تھا وہ شیروانی زیب تن کئے رکھتے جس کے تمام بٹن بند ہوتے۔ سفید پاجامہ، سلیم شاہی جوتا، سر پر قراقلی ٹوپی، نورانی اور پروقار چہرہ خشخشی داڑھی جو نہ سفید تھی نہ کالی، داڑھی کے بڑے خوشنما گہرے اور کھچڑی بال تھے پھر اوپر سے ان کی شائستہ، مہذب اور پر علم گفتگو نے ان کی شخصیت کو اور زیادہ پر کشش بنادیا تھا اور روشو نے جب ادارہ مشرقی علوم میں شام کے وقت داخلہ لے کر قاضی صاحب کے پاس پڑھنا شروع کیا تو اسے محسوس ہوا کہ قاضی صاحب کی شخصیت اس سے بہت مختلف اور پر کشش ہے جو بظاہر دکھائی دیتی ہے۔ وہ علم کا ایک خاموش، پر سکون لیکن رواں دواں دریا تھے۔ اس ادارے میں آ کے روشو کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ادب انسان کی روح کیلئے کتنا بڑا سرمایہ ہے۔

ادیب فاضل کی کلاس میں روشو کے ساتھ تقریباً پچیس تیس کے قریب مزید لڑکے اور لڑکیاں تھے اور یہ سب کم و بیش ایسے ہی اسٹوڈنٹس تھے جو روشو کی طرح کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے دن کے کالجوں میں ریگولر داخلہ نہ لے سکے تھے ان میں زیادہ تر لڑکے ملازمت پیشہ تھے جو دن میں نوکریاں کرتے اور رات کو ڈگری حاصل کرنے کیلئے پڑھتے تھے تاکہ تنخواہ اور گریڈ میں اضافہ کر سکیں۔

ادیب فاضل ایک خالص ادبی اور روشو کیلئے بالکل نیا اور دلچسپ میدان تھا۔ جس میں تاریخ اردو ادب، قواعد، شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ، ناول اور دوسرے فنون لطیفہ سے متعلق مضامین تھے۔ اس ادارے میں ہر مضمون کے الگ الگ اساتذہ تھے اور قاضی ابراہیم صاحب انتظامی امور کی نگرانی کے علاوہ ادب و شاعری کا مضمون بذات خود پڑھاتے تھے۔ ادب اور خصوصی طور پر شاعری پڑھتے ہوئے روشو کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ جیسے وہ اب تک نابینا تھا۔ ایسا نابینا جس نے رنگ و نور کو دیکھا ہی نہ ہو اور اب ادب پڑھنے سے اس کی آنکھوں میں ڈھیرے ڈھیرے بینائی آ رہی ہو۔ وہ رنگوں کی ایک دھنک محسوس کر رہا تھا اور یہ بینائی قاضی صاحب کے احسانات، ان کی قابلیت اور صلاحیت کی مرہون منت تھی۔ وہ لفظوں کے جادو گر اور طلسم ہوشربا کے ماسٹر تھے۔ ان کی زبان سے الفاظ پھول کی پتیوں کی طرح نرم رو انداز میں مہک بکھیرتے ہوئے نکلتے تھے۔ دھیما ٹھنڈا میٹھا اور ایسا متاثر کن لہجہ روشو نے پہلے کسی استاد سے نہیں سنا تھا۔

اور وہ دوسرے پڑھے لکھے عالموں کی طرح بات کو گھما پھرا کے کہنے کے عادی نہیں تھے بلکہ بہتے آبشار کی طرح صاف اور واضح انداز میں سادہ لفظوں کے ساتھ اس طرح بیان کرتے تھے کہ طالب علم بغیر کسی دشواری کے مفہوم کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اقبال کا یہ شعر روشو ایک زمانہ سے پڑھتا اور سنتا آرہا تھا لیکن قاضی صاحب کے سامنے جب یہ شعر آیا تو پہلی بار روشو کو اس شعر کی صحیح تشریح معلوم ہوئی۔ پورا ایک پیریڈ قاضی صاحب نے صرف اسی ایک شعر کا مفہوم بیان کرنے پر صرف کیا تھا اور پہلی مرتبہ روشو کو معلوم ہوا کہ ہیرا کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کی سختی کیا ہے۔ اس کی نرمی کیا ہے اور پھول کی پتی کا حسن اور نرم روی اپنی جگہ اور اس کی قوت کی کاٹ اور وزن اپنی جگہ ہے اور مرد ناداں کی تعریف بھی روشو نے جو پہلی مرتبہ قاضی صاحب سے سنی وہ اسے معلوم نہیں تھی۔ روشو کو قاضی صاحب کی صحبت، قربت اور شاگردی میں پیسے کی قیمت کم اور علم کی قیمت زیادہ معلوم ہونے لگی اور پھر جب اس نے قاضی صاحب کے پاس غالب کو پڑھنا شروع کیا تو روشو کی جیسے دنیا ہی بدل گئی اور وہ محسوس کرنے لگا کہ جس نے غالب کو نہیں پڑھا اس نے کچھ پڑھا ہی نہیں۔

جانے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

غالب کا یہ مصرع پہلے بھی اس نے کئی بار پڑھا اور سنا تھا۔ اس کے استاد جمیل بھی کبھی کبھی یہ مصرع پڑھ دیتے تھے۔ ساجدہ بیگم کے منہ سے بھی یہ مصرع روشو نے سنا تھا اور بھی کئی لوگوں نے دہرایا تھا لیکن ایسے ہی تفنن طبع کیلئے یا بر سبیل تذکرہ لیکن روشو نے جب ایک طالب علم کی حیثیت سے باقاعدہ دیوان غالب کو سامنے رکھ کے قاضی صاحب سے یہ شعر پڑھا تو اس وقت قاضی صاحب کی شرح کی روشنی میں قاضی صاحب کی صلاحیت کا اور غالب کی قد و قامت کا بھی روشو کو پہلی بار علم ہوا۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
جانے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یہ پورا شعر روشو نے قاضی صاحب کی وساطت سے پہلی مرتبہ دیوان غالب میں معنی و مفہوم کے ساتھ پڑھا۔ قاضی صاحب نے پورا ایک دن صرف کر کے پہلے تو دام، موج، اور حلقہ صد کام کے معنی بتائے۔ نہنگ کا مفہوم بتایا کہ مگرمچھ نما شارک اور وہیل کی طرح بڑی مچھلی ہے جو بادبانی

جہاز کو بھی اپنی طاقت سے الٹ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے پھر انہوں نے "گہر ہونے تک" کے مفہوم کو واضح کیا کہ سمندر کے اندر موتی بننے کا قدرتی عمل کیا ہے۔ قاضی صاحب کی شرح کے مطابق ایک قسم کی بہت ہلکی پھوار نما بارش ایک خاص مہینے اور موسم میں ہوتی ہے جسے رومی اور ترکی لوگ ابر نمیساں کہتے ہیں۔

ساحل سمندر یا سمندر کی موج کے اوپر سیپ منہ کھولے نمیساں کی بارش کے صرف ایک قطرے کی مدتوں منتظر اور طلبگار ہوتی ہے۔۔یہ قطرہ جب کھلے منہ کی سیپ کے بطن میں پڑتا ہے تو سیپ اس قطرے کو لے کر سمندر کی موج کے بہاؤ پر اپنے سفر کو روانہ ہو جاتی ہے۔ اس سفر کا ایک مخصوص دورانیہ ہوتا ہے لیکن قطرے کیلئے موتی بننے کی اولین شرط یہ ہوتی کہ یہ قطرہ خالص رہے اور اس میں سمندر کے پانی کی کوئی آمیزش نہ ہو۔ اگر سمندر کے پانی کا ایک چھینٹا بھی چھو جائے تو موتی زائل ہو جانے کا سو فیصد امکان ہوتا ہے لہذا سیپ کیلئے یہ سفر بہت نازک، بہت مشکل اور بہت ہی دشوار ہوتا ہے اور جب سیپ کا یہ دشوار گزار سفر بخیریت طے ہو جاتا ہے تو پھر سیپ اپنا منہ بند کر لیتی ہے اور پھر اس کے بعد سیپ کے اندر موتی بننے کا بقیہ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس پر غالب کہتا ہے۔

جانے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

روشو اس شعر کے مفہوم کو سمجھنے اور جاننے کے بعد ایک طلسماتی کیفیت میں کھو گیا اور سوچنے لگا کیا غالب اتنا بڑا اور پڑھا لکھا تھا۔ ایسی گہری نگاہ تھی اس کی، قدرت کی صناعی پر۔۔۔۔ اور کیا شعر ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اندر ایسے ایسے گہرے مفہوم پنہاں رکھتے ہیں اور کیا قاضی محمد ابراہیم سلیمانی اتنے پڑھے لکھے آدمی ہیں جو محض ایک شعر کے اندر سے اتنے مفہوم کا ایک دریا ایک سمندر باہر نکال لاتے ہیں۔ روشو قاضی صاحب سے بے انتہا متاثر ہوا اور اس بات پر فخر کرنے لگا کہ قاضی صاحب نہ صرف اس کے استاد ہیں بلکہ پڑوسی بھی ہیں۔ اسے قاضی صاحب سے انتہائی دلی لگاؤ اور عقیدت پیدا ہو گئی ہے اور روشو نے محسوس کیا کہ پڑوسی ہونے کے ناتے سے قطع نظر وہ قاضی صاحب کا فیورٹ اور چہیتا شاگرد بنتا جا رہا ہے۔

"کبھی کبھی آجایا کرو۔۔۔۔" اس دن جب فلیٹ کے برآمدے میں گھر کے اندر جاتے ہوئے اس کی قاضی صاحب سے مڈ بھیڑ ہوئی تو قاضی صاحب نے اسے بظاہر سرسری طور پر لیکن مخلصانہ دعوت دی۔

"میں تو حاضر ہونا چاہتا ہوں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ آپ کا وقت۔۔۔۔۔" روشو نے ہچکچاتے ہوئے کہا تو قاضی صاحب اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا وقت میرے طالب علموں کیلئے ہر وقت حاضر ہے"۔ قاضی صاحب بڑی فراخدلی سے بولے۔ "اور پھر تم پر تو دہرا حق ہے۔ پڑوسی بھی ہو اور شاگرد بھی۔۔۔۔۔" پھر قدرے توقف سے بولے۔ "ذہین اور باصلاحیت شاگرد ایسا شاگرد جس پر کوئی بھی استاد فخر کر سکتا ہے"۔

"بہت بہت شکریہ سر۔۔۔۔۔آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ میں تو اس قابل نہیں"۔ روشو انکساری سے بولا۔

"اپنی قابلیت سے آدمی خود آگاہ نہیں ہوتا۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے جواب دیا۔

"تمہارے اندر جو ایک لو، ایک اسپارک ہے، وہ ہمیں دکھائی دیتا ہے روشن میاں۔" انہوں مزید سراہتے ہوئے کہا۔

"اگر کوئی چیز میرے اندر ہے سر تو وہ آپ کی رہنمائی میں پیدا ہوئی ہے۔" وہ مزید انکساری سے سے بولا۔

"خیر جانے دو اس بات کو۔۔۔۔" وہ کسر نفسی کے مضمون کو بدلتے ہوئے بولے اور روشو سے پوچھا۔۔۔"کل چھٹی ہے نا؟"

"جی سر۔۔۔۔" روشو نے کہا۔

"کل شام کو چائے اکھٹے پی لیں گے۔۔۔۔" اور پھر توقف سے پوچھا۔۔۔۔۔" تمہارے کام میں کوئی حرج تو نہیں ہوگا"۔

"نہیں سر۔۔۔" وہ ہچکچاہٹ اور ممنونیت سے بولا۔۔۔۔ "یہ تو عزت افزائی ہے۔۔۔۔"

"میں انتظار کروں گا۔۔۔۔" قاضی صاحب نے کہا۔۔۔۔"یہی کوئی پانچ بجے کے قریب" وہ گھڑی دیکھ کر بولے اور اندر چلے گئے۔

اگلے دن ٹھیک پانچ بجے روشو نے دستک دی تو قاضی صاحب نے فوراً ہی دروازہ کھولا جیسے وہ دروازے کے پیچھے کھڑے روشو کا انتظار کر رہے ہوں۔

"آداب۔۔۔۔" روشو نے سلام کا نیا اور مؤدب طریقہ قاضی صاحب سے ہی سیکھا تھا۔

"جیتے رہو۔۔۔۔" قاضی صاحب نے دعا دی اور روشو کی اندر آمد کیلئے مکمل دروازہ کھول دیا۔

"بیٹھو-----" قاضی صاحب نے کتابوں سے گھرے ڈرائنگ روم کے صوفے پر روشو کو بیٹھنے کی دعوت دی لیکن روشو اس وقت تک نہیں بیٹھا جب تک قاضی صاحب خود نہیں بیٹھ گئے۔
اس وقت ڈرائنگ روم کی سینٹرل ٹیبل پر کھلی کتاب پڑی تھی۔ انہوں نے غالباً کتاب کو پڑھتے پڑھتے روشو کیلئے دروازہ کھولا تھا کیونکہ کتاب کے اندر پنسل رکھی ہوئی تھی اور قاضی صاحب نے اشعار پر خط لگادیئے تھے۔

"فرحانہ بیٹے" انہوں نے اندر کی طرف منہ کر کے آہستگی سے پکارا۔ یہ غالباً چائے کیلئے اشارہ تھا۔

"جی ابا حضور-----" اندر سے ایک بہت نازک اور شائستہ آواز آئی اور روشو کے کان میں جیسے ستار کی ایک ہلکی سی آواز چھو گئی۔ اس سے آگے فرحانہ نے بھی کچھ نہیں کہا----- جیسے دونوں جانب پیغام پہنچ گیا تھا۔

"سر آپ کیا پڑھ رہے تھے-----؟ روشو نے ٹیبل پر پڑی کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"مثنوی مولانا روم-----" قاضی صاحب نے مثنوی اٹھا کر روشو کی طرف بڑھائی۔ روشو نے کھلی کتاب کو اسی جگہ سے دیکھا جہاں قاضی صاحب نے نشان لگا رکھا تھا اور اپنے قلم سے حاشیہ پر "دانہ و دام" لکھ کر خط کشیدہ کر دیا تھا۔

"یہ محض یاددہانی کیلئے ہے------" قاضی صاحب نے خط کشیدہ دانہ و دام کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"سر کیا ہے دانہ و دام------؟" روشو نے ازراہ معلومات پوچھا۔

"دانہ و دام تو ابتدا ہے روشن میاں انسان کے جنت سے نکالے جانے کی-----" قاضی صاحب نے کہا----- لیکن یہاں رومی دانہ کو علامت بناتا ہے مرغ یا پرندے کو سامنے رکھ کر--- ۔ وہ کہتا کہ دانہ پھینکا گیا ہے ایک لالچ ایک طلب کیلئے تاکہ پرندے کیلئے دانے میں کشش پیدا ہو اور وہ اسے چگے لیکن شاعر کا کہنا ہے کہ دانہ تو پرندہ بعد میں کھائے گا فریب وہ پہلے کھا گیا ہے۔ سمجھے ہو کہ نہیں-----" وہ آخر میں براہ راست روشو سے مخاطب ہوئے۔

"جی-----" اس نے عقیدت سے سر ہلایا اور قاضی صاحب مزید بولنے لگے۔

"دانہ علامت ہے ہماری روٹی کی۔ یہ روٹی جس کیلئے انسان کی تمام جدو جہد ہے۔ جھوٹ سچ

اسی روٹی کے گرد گھومتا ہے۔ تمام فریب اسی روٹی کیلئے آدمی دیتا اور اسی کیلئے فریب کھاتا ہے۔ دانہ و دام کی اصطلاح نے انسان کے اسی نظام الاوقات سے جنم لیا ہے۔"

"لیکن سر" روشو کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں ہاں کہو-----" قاضی صاحب نے کہا۔

"کہو جو کچھ کہنا چاہتے ہو۔ کھل کر بات کرنی چاہئے۔ پھر آدھی بات تو ویسے بھی نہیں کہنی چاہئے۔ شاباش بولو۔" قاضی صاحب نے حوصلہ افزائی کی۔

"سر میں یہ کہنا چاہتا تھا۔" روشو نے ہمت کر کے قاضی صاحب سے بحث کے لہجے میں کہا----"روٹی کیلئے جدو جہد آج کے زمانے میں محض ایک کتابی اور لفظی یا پھر اصطلاحی بات ہو کے رہ گئی ہے۔ عملی زندگی میں تو پیٹ بھر کے روٹی کھانا انسان کیلئے کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ روٹی ہر فرد کو مل رہی ہے۔ فقیر بھی------" فقیر کا نام بے دھیانی سے روشو کے منہ سے نکل گیا جیسے لفظ پھسل گیا ہو۔

"کہو کہو فقیر کی کیا بات کر رہے تھے-----" قاضی صاحب نے لقمہ دیتے ہوئے پوچھا---۔ "بات کو مکمل کرو۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ روٹی تو اب فقیر کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ اسے آپ روٹی دیں نہیں لے گا۔ پیسہ مانگے گا وہ"۔ روشو نے نہایت وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"صحیح کہتے ہو تم-----اس وقت بظاہر پاکستان کا یا اور کھاتے پیتے ملکوں کا مسئلہ روٹی نہیں ہے لیکن یہ کلیہ نہیں ایک سطحی نظریہ ہے۔ بادی النظر میں اگر دیکھا جائے تو پاکستانیوں کا پیٹ بھرا ہوا ہے اور روٹی ان کا مسئلہ نہیں۔ مسئلہ روٹی سے آگے کا ہے۔ مسئلہ مکان کا ہے اگر چھوٹا مکان ہے تو پھر بڑا مکان چاہئے۔ مکان کی آسائش و آرائش ہے۔ مسئلہ ٹی وی، وی سی آر، کپڑے دھونے کی مشین اور ڈیک کا ہے"۔ قاضی صاحب رکے اور پھر بولنے لگے۔ "مسئلہ کار کا ہے۔ پھر اچھی اور نئی کار کا ہے۔ پھر مسئلہ مہنگی کار کا ہے۔ مرسڈیز اور پجیرو کا پھر شاید ہیلی کاپٹر کی طرف بھی نگاہ جاتی ہے۔ بچوں کیلئے سوئمنگ پول بہت لازمی ہو جاتا ہے۔ سوئمنگ پول کے بغیر بچے زندہ رہ نہیں سکتے۔ لیکن برخوردار روشن-------" قاضی صاحب نے بولتے بولتے پھر توقف کیا، سانس لیا اور دوبارہ روشو سے مخاطب ہو کر کہنے لگے-------"لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے جب پیٹ میں روٹی ہو۔ بجلی کے بغیر آدمی نے پوری تاریخ گزار دی ہے۔ پجیرو اور مرسڈیز کے بغیر آپ پوری زندگی گزار سکتے ہیں۔ ٹی وی اور وی سی آر کے وجود میں آنے سے پہلے بھی لوگ زندہ تھے

لیکن روٹی کے بغیر کوئی ایک دن زندہ رہ سکتا ہے دو دن گزار لے گا تیسرے دن مر جائے گا۔ پندرہ سولہ گھنٹے کا روزہ رکھنے کے بعد افطاری کے وقت تو اکثر لوگوں پر نزع کا عالم طاری ہوتا ہے۔ ہم نے قحط کے زمانے میں سونے کی پوٹلیوں کے بدلے ایک روٹی مانگتے لوگوں کو دیکھا ہے۔ خوش نصیب لوگ ہو کہ تم نے قحط نہیں دیکھا، سو بات ہو رہی تھی دانہ و دام کی۔" قاضی صاحب نے بولتے بولتے ذرا دم لیا۔ روشو سراپا گوش تھا۔

"چائے ابا حضور۔۔۔۔۔۔" اچانک چائے کی ٹرے اور کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر فرحانہ وارد ہوئی۔ قاضی صاحب نے اپنی گفتگو کو توڑا اور چائے کے منتظر ہوئے۔ فرحانہ نے ٹیبل پر ٹرے رکھی پھر بڑے سلیقے سے ٹرے خالی کر کے چائے دانی، چائے کے کپ اور کھانے کی چیزوں کی پلیٹیں میز پر قرینے سے رکھیں پھر پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ کے اس نے قاضی صاحب کے لئے چائے بنائی۔ چینی قاضی صاحب کے حساب سے اس نے ڈالی۔ پھر دوسرا کپ روشو کیلئے بنایا اور پھر نفاست سے کپ روشو کی جانب آگے بڑھایا۔ روشو بہت شرافت اور لجاجت کے ساتھ سر جھکائے بیٹھا تھا اور اس نے ایک نگاہ بھی فرحانہ کے وجود یا چہرے کی طرف نہیں اٹھائی تھی۔ کچھ تو اس کا اپنے مزاج کا شرمیلا پن تھا کچھ قاضی صاحب کی صاحبزادی ہونے کے ناتے ادب و احترام مانع تھا لیکن جب چائے کے کپ کے ساتھ ٹرے فرحانہ نے آگے بڑھائی تو فرحانہ کے دونوں ہاتھ روشو کی آنکھ کے کیمرے کے فوکس میں آئے۔ دونوں ہاتھوں کے کلوز شاٹ پر اس کی نگاہ لمحے بھر کیلئے مرکوز ہو گئی۔ نازک لانبے ہاتھ مخروطی انگلیاں پہلی رات کے چاند کی طرح ہلالی ناخن جن کا حسن کسی نیل پالش کا مرہون منت نہیں تھا۔ ہاتھوں کو دیکھنے کے انداز میں اس کی کسی بد نیتی کو دخل نہیں تھا بلکہ وہ خود بخود قدرتی طور پر اس کے زاویہ نگاہ میں آئے تھے اور ظاہر ہے وہ آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا۔

"چینی۔۔۔۔۔۔؟" آہستہ سے فرحانہ کے لب ہلے روشو ذرا سا چونکا۔ آواز روشو کے چہرے کی سطح سے قدرے اونچی تھی۔

"ایک چمچہ۔۔۔۔" روشو نے ایک لمحے کیلئے نگاہ اوپر فرحانہ کے چہرے کی طرف اٹھائی۔

"سبحان اللہ۔۔۔۔" بے اختیار اس کے اندر سے داد و تحسین کی ایک صدا نکلی لیکن اندر ہی تحلیل ہو گئی اس کے لبوں تک نہ آسکی۔

روشو نے سنا تھا کہ کسی مصور نے کسی شہزادی کا ہاتھ دیکھ کر ہو بہو اس کا ویسا ہی چہرہ

بنادیا تھا۔ فرحانہ کو بھی روشو نے ویسا ہی پایا جیسا تصور اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر چہرے کا بنتا تھا۔ کسی حد تک مناسب بیضوی چہرہ، بادامی طرز کی آنکھیں، اور آنکھوں میں سورج کی روشنی پڑتی موجوں کی طرح چمکدار لہریں، جو دو طرفہ لمبی گھنیری اور خمیدہ پلکوں میں گھری ہوئی تھیں۔ گھنیرے لمبے بال، درمیان سے نکلی ہوئی مانگ۔ روشو نے محسوس کیا کہ فرحانہ ایک مشرقی لڑکی کی مکمل اور جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں قاضی صاحب کی مہذب شخصیت کا بھرپور پرتو جھلک رہا ہے۔ روشو کی نگاہ اٹھتے ہی پلک جھپکنے کی تیزی کے ساتھ دونوں کی نگاہیں اسی طرح ملیں جیسے بجلی کا ایک کوندا سا لپکتا ہے۔ ایک ان کہا رابطہ دونوں جانب محسوس ہوا لیکن روشو نے دوسرے ہی لمحے نگاہ جھکا دی اور فرحانہ نے بھی دوسرے ہی لمحے چینی دان کی طرف نظر گھمائی اور چینی ایک چمچہ روشو کے کپ میں ڈال دی۔

"بس بیٹے اب آپ جائیں-----؟" قاضی صاحب نے نرمی کے انداز میں فرحانہ سے کہا اور فرحانہ فرمانبرداری سے دو قدم پیچھے ہٹی۔ کلائیوں کی حرکت سے چوڑیوں کی ہلکی سی چھنک پیدا ہوئی اور پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"ہم گھر میں کل دو ہی افراد ہیں۔ میں اور میری بیٹی!" فرحانہ کے جانے کے بعد قاضی صاحب نے وضاحت کی۔

"جی----" روشو آہستہ سے بولا لیکن اس میں ہمت نہ پڑ سکی کہ وہ فرحانہ کی ماں کے بارے میں پوچھے۔ قاضی صاحب نے بھی آگے کچھ نہ کہا۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ذہن پر زور دے کر کہنے لگے۔

"ہاں تو بات ہو رہی تھی دانہ و دام کی-----"

"جی-----" روشو نے پھر آہستہ سے کہا اور قاضی صاحب اس شام بہت دیر تک روشو کو دانہ و دام کے فلسفے پر ہلکا پھلکا لیکچر دیتے رہے۔

O

اگلے دن قاضی صاحب کی روشو سے پھر برآمدے ہی میں مڈ بھیڑ ہو گئی۔ روشو سلام کر کے گزر رہا تھا کہ قاضی صاحب نے روکا۔

"روشن میاں" انہوں نے آہستہ سے پکارا۔

"جی سر-----" روشو رکا۔

"روشن میاں میں نے کچھ اسٹوڈنٹس کے علاوہ ایک آدھ اور جگہ آپ کے گھر کا ٹیلیفون نمبر دے دیا ہے ------" قاضی صاحب نے کہا۔ میرا ٹیلیفون آجانے تو مجھے بلانے یا پیغام دینے میں کوئی قباحت تو نہیں ہوگی"۔

"شرمندہ کرتے ہیں آپ قاضی صاحب ------ آپ کا گھر اور آپ کا ٹیلیفون ہے۔" روشو نہایت انکساری سے بولا ----- "آپ حکم کریں تو میں انسٹرومنٹ اٹھا کے آپ کے یہاں رکھ دوں۔

"نہیں نہیں اتنا ہی کافی ہے کہ پیغام لے لیں۔ یا زحمت نہ ہو تو مجھے بلا لیں۔" قاضی صاحب نے تکلفاً کہا۔

"سر اگر میرے ہوتے ہوئے ٹیلیفون آگیا تو میں ایک لمحے کی کوتاہی نہیں کروں گا"۔ روشو نے ایک خادم کی طرح جواب دیا ----- "لیکن دن بھر تو فلیٹ بند ہوتا ہے"۔ اس نے ایک دشواری ظاہر کی۔

"مجھے معلوم ہے -----" قاضی صاحب بولے ---- "میں نے اسی لئے احتیاطاً صبح شام فون کرنے کیلئے کہا ہے" وہ پیش بندی کے طور پر بولے۔

"قاضی صاحب آپ فلیٹ کی چابی کیوں نہیں پاس رکھ لیتے -----" روشو نے جیب سے ایک چابی نکال کر قاضی صاحب کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب -----" قاضی صاحب نے قدرے حیرانگی ظاہر کی۔

"میرا مطلب ہے ٹیلیفون باہر والے کمرے میں ہی ہے۔ میری غیر موجودگی میں اگر گھنٹی کی آواز آجانے تو آپ دروازہ کھول کر خود ٹیلیفون سن سکتے ہیں۔" روشو نے تجویز پیش کی۔" میرے پاس گھر کی ڈپلی کیٹ چابی ہے ---- بلکہ اور سہولت ہو جائے گی کہ میرا کوئی ٹیلیفون بھی -----"

"نہ، نہ، نہ، نہ میاں ------ چابی کی ذمہ داری میں نہیں لیتا۔" وہ انکار کرتے ہوئے بولے "نہیں برخوردار -----"

"قاضی صاحب اس کا مطلب ہے کہ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں یا مجھے آپ پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔" وہ قدرے دل شکستہ ہو کر بولا۔

"یہ بات نہیں روشن میاں ---- دراصل ----"

"اور کیا بات ہے قاضی صاحب -----" روشو قاضی صاحب کی بات کاٹ کر بولا۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ اس گھر کے اندر سونا چاندی، روپیہ پیسہ وغیرہ قسم کی ایسی کوئی چیز نہیں جس کی وجہ سے گھر پر لوگ تالے ڈالتے ہیں۔"

"تو پھر کیوں تالا ڈالتے ہو۔۔۔۔" قاضی صاحب مسکرانے۔

"بس ایک رسم پوری کرتا ہوں سر۔۔۔۔" وہ بھی ہنسا۔

"اگر یہ بات ہے تو پہلے مجھے اندر سے اپنا گھر دکھادو۔۔۔۔۔۔" قاضی صاحب بے تکلفی کے موڈ میں تھے۔ "میں اپنی آنکھ سے دیکھ لوں کہ کہیں گھر میں روپیہ پیسہ سونا چاندی وغیرہ تو نہیں ہے۔۔۔۔" وہ ہنسے اور پھر کہنے لگے۔۔۔۔ "اور ٹیلیفون بھی دیکھ لوں کہ کہاں رکھا ہے"۔

"زہے نصیب۔۔۔۔" روشو انتہائی خوش ہو کر کورنش بجالایا اور قاضی صاحب کو اپنے گھر کے اندر لے گیا۔ اور جب قاضی صاحب گھر کے اندر گئے تو ڈائننگ روم اور بیڈ روم کی حالت دیکھ کر خاصے پریشان سے ہوئے۔ گھر کیا تھا ایک کباڑ خانہ تھا۔ ڈرائنگ روم کے فرنیچر پر گرد و غبار کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ فرنیچر الٹا پلٹا پڑا تھا۔ کپڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ بیڈ روم کی چادریں کہیں اور تکیہ کہیں جارہا تھا۔ کتابیں تاش کے پتوں کی طرح زمین پر پھیلی ہوئی تھیں۔

"دراصل گھر کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ آپ کو اندر آنے کی زحمت دی جاتی۔" وہ قدرے لجاجت اور ندامت سے بولا۔

"میرا خیال ہے گھر کی حالت ایسی ہے کہ آپ کو ضرور کسی نہ کسی کو اندر بلانا چاہئے تھا۔" وہ قدرے معنی خیز انداز میں بولے "اب مجھے آپ سے چابی لینا ہی پڑے گی۔۔۔۔ لائیے چابی"۔ وہ چابی مٹھی میں دباتے ہوئے مسکرا کر بولے۔۔۔۔۔۔ "اب آپ جائیے"

روشو چلا گیا اور شام کو جب گھر لوٹا اور اس نے ڈپلی کیٹ چابی سے مکان کا دروازہ کھولا تو دروازے کے ساتھ ساتھ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کا گھر لش لش کر رہا تھا۔ جیسے آئینہ ہو۔ فرنیچر پر گرد و غبار کا نشان تک نہیں تھا۔ دیواروں، دروازوں، کھڑکیوں اور روشن دان تک صاف کئے گئے تھے غسل خانے کو فینائل سے دھویا گیا تھا۔ کمروں میں مچھروں کو مارنے کے تیل کا اسپرے کیا گیا تھا۔ بکھرے ہوئے کپڑے تہہ کر کے وارڈروب میں ہینگروں پر لٹکا کر رکھے گئے تھے۔ بیڈ روم کے بستر اور چادر کو بہت سلیقے سے بچھایا گیا تھا۔ کارنس پر تازہ پھولوں کا ایک بڑا گلدستہ تھا جس سے پورا بیڈ روم مہک رہا تھا۔

روشو کی آنکھیں جیسے چکا چوند ہوگئیں۔ جیسے وہ کسی اور گھر میں آگیا ہو۔ وہ انہیں قدموں دروازہ کھلا چھوڑ کے باہر نکلا۔ قاضی صاحب کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ قاضی صاحب نمودار ہوئے۔

"تشریف لائیے۔۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے دروازہ وا کرتے ہوئے کہا۔ وہ دروازے میں ہی کھڑا رہا اور کھڑے کھڑے بولا۔ "سر یہ گھر کس نے سیٹ کیا ہے؟"

"فرحانہ نے۔۔۔۔۔۔" قاضی صاحب زیر لب بولے۔

(۲۰)

روشو بڑی شرمندگی سی محسوس کرنے لگا۔ بڑی ہچکچاہٹ اور پس و پیش کے ساتھ ہاتھوں کو بے وزنی کی کیفیت میں ہلاتے ہوئے فقط اتنا بولا۔ "سر۔۔۔۔ سر میں کیا عرض کروں۔۔۔۔ بڑی زحمت کی ہے فرحانہ نے۔۔۔۔"

"نہیں یہ کوئی زحمت نہیں۔ لڑکیوں کے تو یہی کام ہوتے ہیں امور خانہ داری۔۔۔۔" قاضی صاحب بڑے سکون سے بولے اور کہنے لگے۔ "دراصل تمہارے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ گھر بے ترتیب اور بکھرا ہوا ہے تو میں نے فرحانہ کو آواز دی اور اسے چابی دے کے آگیا تھا کہ گھر کو سیٹ کر دے۔"

"وہ جی دراصل۔۔۔۔!" روشو نے کچھ کہنا چاہا۔

"دراصل تم نے چابی میرے حوالے کر کے مجھ پر اعتماد کیا۔" قاضی صاحب روشو کی بات میں مداخلت کر کے بولے۔ "اور میں نے وہی اعتماد اپنی بیٹی کے سپرد کر دیا"۔

قاضی صاحب کچھ روانی میں کہہ گئے اور روشو دروازے میں کھڑا شش و پنج میں پڑ گیا۔

"اندر آجاؤ روشن میاں۔ دروازے میں کیوں کھڑے ہو؟" معاً قاضی صاحب کو خیال آیا ساری گفتگو تو دروازے میں کھڑے کھڑے ہی ہو رہی ہے۔ انہوں نے بڑھ کر پورا دروازہ کھول دیا اور روشو اندر آگیا۔

"بیٹھو۔۔۔۔" انہوں نے بیٹھنے کی دعوت دی۔

"دراصل میں چھٹی کے دن تھوڑی بہت صفائی کر لیتا ہوں۔" روشو بیٹھتے ہوئے قدرے ندامت سے بولا۔ "میرے گھر کی حالت واقعی ایسی ہوتی ہے کہ۔۔۔۔"

"یہ کوئی عجیب بات نہیں-----" قاضی صاحب نے بات کاٹی اور روشو کی خفت دور کرتے ہوئے بولے۔ "مجرد زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہم نے بھی اپنی جوانی میں مجرد زندگی گزاری ہے۔ بہت ہی منتشر اور بے ترتیب زندگی تھی ہماری۔ مجرد زندگی اور بے ترتیبی لازم و ملزوم ہیں۔"

"درست-----" روشو سر جھکائے اعترافاً بولا۔ "لیکن میں کچھ زیادہ ہی بے ترتیب ہو گیا ہوں شاید۔"

"درست-----" قاضی صاحب بھی روشو کے لہجے میں بولے۔ "بے ترتیبی اگر نہ ہوتی تو ترتیب کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ بے ترتیبی اسی لئے معرض وجود میں آتی ہے کہ اسے ترتیب دیا جائے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولے جس سے ایک علمی مباحثے کی سی صورت پیدا ہو گئی لیکن روشو قاضی صاحب کی بات سے بات پیدا کرنے یا بحث کرنے کی جرات نہیں کر سکا۔ بس سر جھکائے بیٹھا رہا پھر فوراً ہی ایک نقرئی آواز اس کے کان میں گونجی۔

"چائے ابا جی-----" یہ فرحانہ کی آواز تھی جو ٹرے میں چائے لے کر اچانک وارد ہوئی۔

"شکریہ بیٹے-----" قاضی صاحب نے چائے کا کپ ٹرے سے اٹھاتے ہوئے کہا اور روشن کو قاضی صاحب کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر اپنی اولاد کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے ٹرے روشو کے سامنے تھی اور فرحانہ کے مخروطی انگلیوں والے لانبے مصورانہ ہاتھ جیسے نقش چغتائی کا شاہکار ہوں اس کی نگاہوں کے فوکس میں تھے۔

"سو یہ وہ نازک ہاتھ تھے جنہوں نے دن بھر اس کے کمرے کی گرد جھاڑی۔" روشو ہاتھوں کے حسن کو دیکھ کر سوچنے لگا۔

"ان ہاتھوں نے اس کا بیڈ روم ترتیب دیا۔ کپڑوں کو سلیقے سے تہہ کر کے وارڈ روب میں رکھا۔ انہی نازک مخروطی انگلیوں سے اس نے کچن میں پڑے جھوٹے برتن مانجھے ہیں۔ باتھ روم کو دھویا اور بیڈ روم کی کارنس پر رکھا خوبصورت گلدستہ۔"

"چائے-----" فرحانہ نے روشو کو خیالات سے جیسے باہر نکالا۔ وہ ایک دم چونکا اور تھوڑی سی خفت محسوس کی شاید اس نے ٹرے سے کپ اٹھانے میں محض اس وجہ سے کچھ تاخیر کر دی تھی کہ وہ خیالات میں کھو گیا تھا۔

"شکریہ-----" روشو نے کپ ٹرے سے اٹھایا اور اظہار تشکر کیلئے اس کی ایک غیر ارادی سی نگاہ فرحانہ کے شگفتہ اور روشن چہرے کی طرف گئی۔ وہ اس چاند چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔

"بیٹے چینی ۔۔۔۔" قاضی صاحب نے چائے کا کپ اٹھانے سے پہلے پوچھا۔

"چینی میں نے ملادی ہے ابا جی۔۔۔۔"آپ کے کپ میں دوران کے کپ میں ایک چچ

"وہ بڑی نزاکت سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

" ٹھیک ہے بیٹے ۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے پھر ایک مرتبہ بیٹی کا شکریہ ادا کیا اور فرحانہ حسب عادت دو قدم پیٹھ کئے بغیر احتراماً پیچھے ہٹی اور پھر پلٹ کر چوڑیوں کی چھنکار کے ساتھ اندر چلی گئی۔

" چائے کا کیوں آپ نے تکلف کیا سر۔۔۔۔" فرحانہ کے جانے کے بعد ایک لمحے کی خاموشی توڑتے ہوئے روشو نے کہا۔

" میں نے چائے کیلئے نہیں کہا روشن میاں۔۔۔۔۔" وہ مسکرا کر بولے ۔ "چائے فرحانہ خود بخود لائی ہے ۔" پھر وہ توقف سے بولے۔ " ہمارے گھر کی روایت ہے مہمان جب گھر میں آئے تو پانی کا گھونٹ پی کر جانا ہے چاہے وہ چائے کی صورت میں ہو یا مشروب۔"

"لیکن سر میں تو مہمان نہیں ہوں۔۔۔۔" روشو انکساری سے بولا۔

" مجھ سے کہنے میں غلطی ہوئی۔۔۔۔" قاضی صاحب اعترافاً بولے ۔ " تم واقعی مہمان نہیں ہو۔"

" میں ایک ادنی سا شاگرد ہوں آپ کا۔۔۔" روشو بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

" یہ بھی درست نہیں۔۔۔" قاضی صاحب نے جواب دیا۔ " تم ادنی نہیں ایک اعلیٰ شاگرد ہو اور پھر تم صرف شاگرد ہی نہیں اپنے آپ کو اس گھر کا فرد سمجھو۔۔۔۔۔" وہ پھر معنی خیز انداز میں بولے۔

اس وقت اظہار تشکر کے طور پر بے اختیار روشو کی نگاہ قاضی صاحب کے چہرے کی طرف اٹھی اور قاضی صاحب کے کندھوں سے نکلتی ہوئی عقب میں کھڑکی کی طرف گئی جہاں فرحانہ کھڑکی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ روشو کی نگاہ پڑتے ہی وہ ایک دم سے اوٹ میں چلی گئی۔ روشو بھی چائے پینے کے بعد زیادہ دیر قاضی صاحب کے پاس نہیں بیٹھا۔ یا اس نے بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔

O

پھر تو یہ معمول ہی بن گیا۔

روشو جب شام کو گھر لوٹتا تو اس کے گھر میں ایک عجیب نکھار آیا ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ روشو کے جاتے ہی فرحانہ فلیٹ کا تالا کھول کر اندر آجاتی ہے اور پھر گھر کی جھاڑ پونچھ اور صفائی میں ہمہ تن مصروف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ شام کو جب روشو گھر آتا تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوتا۔ سارے

فلیٹ میں ہر کمرے کے اندر جھاڑو لگی ہوئی بالکونیاں تک صاف ہوتیں کپڑے سلیقے سے رکھے ہوتے۔ سامان قرینے سے سجایا ہوتا۔ کتابیں ترتیب سے الماریوں میں رکھی ہوتیں۔ کچن اور باتھ روم کی موریاں تک فنائل وغیرہ سے صاف کی گئی ہوتیں۔ یہاں تک ایک دن روشو کے جوتے پالش سے اس طرح لش لش کر رہے تھے کہ چہرہ دکھائی دیتا تھا اور اس پوری کیفیت سے جہاں روشو قاضی صاحب اور فرحانہ کے احسانات کا زیر بار تھا وہاں اسے سخت شرمندگی محسوس ہوتی تھی اور وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ شاید قاضی صاحب کے احسانات کا مزید بوجھ اٹھانے کا وہ متحمل نہیں ہو سکے گا لیکن نہ جانے کیوں آہستہ آہستہ وہ اس بوجھ کا عادی سا ہو گیا کہ رفتہ رفتہ قاضی صاحب اور روشو کے درمیان پڑوسی اور استادی شاگردی کا رشتہ بھی قریب سے قریب تر ہو گیا تھا اور وہ قاضی صاحب کے مسائل کو بھی زیادہ نہ سہی کچھ نہ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ پھر قاضی صاحب کی فکر مندی کی ایک صورت روشو کے سامنے آئی۔

اس شام وہ گھر میں ہی تھا جب قاضی صاحب کیلئے کسی کا ٹیلیفون آیا اور جب قاضی صاحب ٹیلیفون سننے کیلئے آئے تو روشو دوسرے کمرے میں چلا گیا اور قاضی صاحب کی گفتگو اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ جسے وہ سننا نہیں چاہتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں غیر ارادی طور پر روشو کیلئے قاضی صاحب کی گفتگو میں دلچسپی پیدا ہو گئی روشو نے محسوس کیا کہ ٹیلیفون پر گفتگو فرحانہ کے رشتے ناتے ہی سے متعلق تھی۔ قاضی صاحب کہہ رہے تھے۔

"دیکھئے مسز صمدانی نے لڑکی کے بارے میں جو کوائف آپ کو بتائے ہیں وہ سب درست ہیں۔ مسز صمدانی ایک بہت ذمہ دار خاتون ہیں۔ غلط بیانی سے نہ وہ کام لیں گی نہ ہمارا شیوہ ہے ......لڑکی کی عمر تعلیمی صلاحیت سب کچھ آپ کو بتا دی گئی ہے۔ تصویر آپ نے دیکھ لی۔ آپ خود تشریف لانا چاہتے ہیں تو بسرو چشم۔" پھر کچھ دیر بعد ٹیلی فون پر خاموشی رہی جیسے قاضی صاحب دوسری طرف کی گفتگو سن رہے ہوں پھر وہ قدرے توقف سے بولے...."لڑکی نے انٹر کیا ہے۔ بی اے میں اسے خود پڑھا رہا ہوں۔ پرائیویٹ....جی مختلف جوہات ہیں کالج نہ جانے کی۔ جی ہاں۔ ویسے بائی دی وے لڑکا کیا کرتا ہے.....جی وہ تو ٹھیک ہے دھن دولت جائداد پراپرٹی اپنی جگہ لیکن تعلیمی قابلیت بھی ضروری ہے۔ شرافت بھی ایک صلاحیت ہوتی ہے۔ لڑکے کا پروفیشن بھی ایک ضرورت کا تقاضا ہے......" قاضی صاحب کچھ دیر کیلئے خاموش ہوئے اور آخر میں کہنے۔ "آپ کب تشریف لا رہے ہیں......کتنے بجے....ٹھیک ہے کل پانچ بجے میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ خدا حافظ۔"

قاضی صاحب نے ٹیلیفون بند کیا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنے خیالات میں مگن کمرے سے باہر نکل گئے۔ دوسرے کمرے میں روشو جو قاضی صاحب کی گفتگو سن رہا تھا وہ بھی گم صم سا ہو گیا۔ اور اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ قاضی صاحب علم و فضل کا دریا ہی نہیں دکھ درد کی ایک لے بھی ہیں۔ ایک جوان بیٹی کے باپ بھی ہیں اور ایک جوان بیٹی کی ماں کا کردار بھی ادا کر رہے ہیں اور اس کے رشتے کیلئے اسی طرح فکر مند ہیں جس طرح ماں فکر مند ہوتی ہے اور اسی طرح تگ و دو کر رہے ہیں جس طرح ماں تگ و دو کرتی ہے۔ لیکن علم پھر علم ہوتا ہے عالم اپنے سارے ذاتی انفرادی غموں کو اپنی سوچ کے اجتماعی غموں میں چھپا لیتا ہے۔ اور روشو محسوس کر رہا تھا کہ قاضی صاحب نے اپنے تمام ذاتی اور انفرادی غموں کو اپنی اجتماعی فکر میں سے چھپا کر رکھا ہے۔

اگلے دن پھر اتفاق سے روشو کے سامنے ہی قاضی صاحب کا ٹیلیفون آگیا۔ قاضی صاحب یونہی روشو کو دیکھ کر شام کے وقت روشو کے کمرے میں آ گئے۔ روشو اس وقت دیوان غالب سامنے رکھے بیٹھا ایک شعر کی نفسیاتی کیفیت میں الجھا ہوا تھا۔ قاضی صاحب کی آمد پر وہ کچن کی طرف چائے بنانے کیلئے لپکا تو قاضی صاحب نے روک دیا۔

"چائے آجائے گی۔۔۔۔۔ میں فرحانہ کو بول آیا ہوں۔" قاضی صاحب نے کہا۔ "شعر بتاؤ کیا ہے جس میں تم الجھے ہوئے ہو"۔

"شعر تو بہت آسان ہے گدا سمجھ کے وہ۔۔۔۔۔"

"وہ ابھی اتنی ہی بات کہہ پایا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی مہذبانہ دستک کے ساتھ فرحانہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے چائے کی ٹرے اٹھا کر رکھی تھی جس میں دو کپ تھے۔ ایک مرتبہ اس نے ٹرے قاضی صاحب کے سامنے کی۔ پھر دوسرا کپ روشو کو پیش کیا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ روشو نے بظاہر غیر ارادی طور پر لیکن ارادتاً ایک ہلکی سی جنبش آنکھوں کو دے کر فرحانہ کی طرف دیکھا لیکن خلاف معمول فرحانہ کا چہرہ اداس سنجیدہ اور نگاہیں نیچی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے کچھ ہو گیا ہے۔ قاضی صاحب کے ٹیلیفون کی روشنی میں گزشتہ روز کچھ لوگ فرحانہ کے رشتے کے سلسلے میں آنے والے تھے وہ یقیناً آئے ہوں گے یقیناً کوئی ناخوشگوار تاثر چھوڑ کر گئے ہوں گے اور ظاہر ہے قاضی صاحب جیسے عالم اور مضبوط قوت ارادی کا شخص اس تاثر کو پی گیا جبکہ فرحانہ جیسی حساس اور نازک اندام لڑکی اس تاثر کو اپنے چہرے سے عیاں ہونے سے نہیں بچا سکی۔ فرحانہ چپ چاپ ایک اداس چھب کے ساتھ چلی گئی۔

"جی۔۔۔۔" قاضی صاحب نے فرحانہ کے جانے کے بعد سلسلہ تکلم جوڑا۔ "کیا کہہ رہے

تھے تم؟"

"میں عرض کر رہا تھا۔۔۔۔۔" روشو مخاطب ہوا۔ لیکن فوراً ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ "ایک منٹ سر۔۔۔۔۔"

"روشو قاضی صاحب سے اجازت لے کر ٹیبل پر رکھے ٹیلیفون کی طرف بڑھا۔

"ہیلو۔" اس نے رسیور اٹھایا اور پھر کہنے لگا۔ "جی ہولڈ کریں۔" پھر اس نے رسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور قاضی صاحب سے مخاطب ہوا۔

"سر آپ کا ٹیلیفون ہے۔"

یہ محض اتفاق تھا کہ قاضی صاحب کی موجودگی میں ان کا ٹیلیفون آیا یا پھر وہ واقعی اس وقت کسی ٹیلیفون کا انتظار کر رہے تھے اور اسی بہانے روشو کے کمرے میں داخل ہو گئے تھے تاہم روشو کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آگئی تھی کہ قاضی صاحب نے فرحانہ کے کوائف کسی میرج بیورو کو دے رکھے ہیں اور انہیں اسی حوالے سے ٹیلیفونوں کا انتظار رہتا ہے۔

"ہیلو۔" قاضی صاحب نے ریسیور اٹھایا۔ "جی میں بول رہا ہوں۔ وعلیکم اسلام۔ جی جی میں سمجھ گیا ہوں۔۔۔۔۔"

اسی دوران روشو اپنی کرسی سے اٹھا اور اٹھ کر اندر جانے لگا تاکہ وہ قاضی صاحب کو کھل کر گفتگو کرنے کیلئے مکمل پرائیویسی فراہم کرے۔

"ایک منٹ ہولڈ کریں۔" قاضی صاحب نے ریسیور پر کہا اور پھر روشو کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کی ہدایت کی اور پھر ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر روشو سے کہنے لگے۔

"جب ہم آپ کو گھر کا ایک فرد سمجھتے ہیں تو پھر آپ سے کیا پردہ"۔ قاضی صاحب کی یہ بات سن کر روشو پھر بیٹھ گیا اور چائے پینے لگا۔ قاضی صاحب ٹیلیفون کی طرف متوجہ ہوئے۔

"جی۔۔۔۔۔" انہوں نے رسیور پر کہا اور کچھ دیر توجہ سے ٹیلیفون سننے لگے اور پھر اس طرف کی بات کاٹ کر بولے۔۔۔۔۔

"دیکھئے جناب۔ ہم برا نہیں مانتے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ موجودہ سوسائٹی جو ہے وہ ایک بازار ہے۔ اور اس بازار کے اندر وہ گھر جہاں بیٹیاں ہیں جواہرات کی ایک دکان کی طرح ہیں اور اس میں بسنے والی یا پرورش پانے والی بیٹی ہیرے جواہر موتی یا پتھر کی طرح ہے۔ اس دکان میں جس کا جی چاہے خریدار بن کر آسکتا ہے۔ اور دکاندار پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ شوکیس یا تجوری میں

رکھے ہوئے ہیروں کی گاہک کی مرضی اور خواہش کے مطابق اس کے سامنے نمائش کرے ۔۔۔۔۔"
روشو نے محسوس کیا کہ قاضی صاحب بولتے بولتے بہت سنجیدہ جذباتی اور آزردہ ہو گئے تھے ۔۔۔۔۔ وہ بولتے جارہے تھے ۔
"اور یہ بھی گاہک کی منشا پر ہے کہ وہ ان ہیروں کو کوہیرے ماننے سے ہی انکار کر دے محض پتھر کے ٹکڑے یا مٹی کہہ کر مسترد کر دے ۔ یا یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ہیرے خریدنے ہی کیلئے دکان میں آیا ہو وہ محض دل خوش کرنے والا ایک سیر بین بھی ہو سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔"
وہ کچھ دیر رکے ۔ توقف کیا اور پھر بہت گھمبیر لہجے میں بولے ۔ " نہیں نہیں جناب ۔ ناراض ہونے کی بات نہیں ہے ۔ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے دوبارہ یاد کیا ۔ اپنی رائے کا اظہار کیا ورنہ آپ پر کوئی فرض تو نہیں تھا کہ آپ فون کر کے معذرت بھی کرتے ۔۔۔۔۔ شکریہ" ۔
انہوں نے آہستہ سے فون بند کر دیا اور تھوڑی دیر کیلئے جیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے روشو کو دیکھنے لگے روشو قاضی صاحب کی نظروں کی تاب نہ لاسکا اور دوسری طرف مڑ گیا قاضی صاحب نے فوراً اپنے حواس کو قابو میں کیا اور بہت نارمل انداز میں روشو سے مخاطب ہوئے ۔
" جی کیا شعر تھا غالب کا ۔۔۔۔۔" انہوں نے دوبارہ سے مکمل علمی اور شاعرانہ ماحول پیدا کرتے ہوئے کہا ۔
" کچھ نہیں سر ۔۔۔۔ شاید میں پتہ نہیں کیا پوچھنا چاہتا تھا" ۔ روشو ابھی تک پریشانی کے عالم میں تھا ۔
" اوہ کم آن ۔۔۔۔" قاضی صاحب نے پہلی مرتبہ روشو کے ساتھ انگریزی لہجہ اختیار کیا شاید وہ اس طرح روشو کے موڈ کو جلدی تبدیل کر سکتے تھے ۔ پھر وہ خود ہی ذہن پر زور دے کر بولے غالباً تم پوچھ رہے تھے کہ

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

" جی جی یہی شعر تھا ۔۔۔۔" روشو نے کہا ۔
"اس میں کونسی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے" ۔ قاضی صاحب نے پوچھا ۔
"شعر تو آسان ہے سر ۔۔۔۔۔۔۔" روشو نے جواب دیا ۔
"تو پھر ۔۔۔۔"
" میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ غالب کے یہاں اس قدر مایوسی، قنوطیت یا احساس کمتری کیوں

ہے "۔ روشو نے بہت تجسس سے پوچھا۔
" محض ایک شعر کی وجہ سے تم نے یہ رائے قائم کی ہے "۔ قاضی صاحب نے سوال کیا۔
" نہیں سر اکثر غالب کا لہجہ ایسے ہی ہے۔ مثلاً مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام۔
یا پھر وہ کہ۔۔۔ جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا۔ یا وہ شعر لے لیجئے۔۔۔۔ بیٹھے ہیں راہ گزر پہ
ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں۔ یا پھر ابھی ایک غزل میرے سامنے ہے "۔ روشو نے کھلے دیوان پر
نگاہ ڈال کر شعر پڑھا۔۔۔۔ کر دیا ضعف نے عاجز غالب، ننگ پیری ہے جوانی میری"۔
قاضی صاحب روشو کے اس استفسار پر خوش ہوئے اور مسکرا کر بولے۔" اچھی بات ہے۔
تم نے ایک اچھا زاویہ نگاہ غالب کی شاعری سے نکالا ہے۔ لیکن یہ چند اشعار کا انتخاب غالب کا رنگ
نہیں ہے۔ وہ ایک ہمہ رنگ اور ہمہ صفت شاعر ہے۔ اور وہ شعر کہنے کیلئے اس وقت کے کسی ریڈیو یا
ٹیلی وژن کا محتاج نہیں تھا اور نہ اس کے اوپر کوئی پالیسی مسلط تھی۔ وہ ہر فطری شاعر کی طرح موڈ کا
شاعر ہے۔ جس طرح آج ایک موسم ہے کل دوسرا جیسے آج شام ہے کل صبح ہوگی اس وقت ایک
تاریخ ہے کل دوسری ہوگی۔ ایسے ہی شاعر کا بھی ایک وقت ایک موڈ دوسرے وقت میں
دوسرا موڈ ہوتا ہے غالب احساس کمتری کا شکار نہیں ہے وہ تو دنیا کو اس بلندی سے دیکھتا ہے
جہاں تک ہم جیسے کوتاہ بین کی نگاہ نہیں جا سکتی۔"
ایسا لگتا ہے کہ جیسے قاضی صاحب روشو کی بات سے جھلا گئے ہوں وہ ایک جلال کی سی
کیفیت میں آ کے بولے۔" تمہارے اعتراض کے جواب میں غالب کی ایک ہی غزل سے دیتا ہوں سنو
لہجہ سنو۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

یہ غزل کا ایک شعر ہے روشن میاں مگر پوری غزل اسی لہجے میں ہے۔۔۔۔ ان اشعار میں
غالب ہمالیہ کی چوٹی سے بھی بلند سطح پر کھڑا ہے۔ جو شخص اتنی طویل قد و قامت کا مالک ہو اسے
احساس کمتری کا شکار کہنے کا یہ مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔۔"
پتہ نہیں اس کے آگے قاضی صاحب نے کیا کہا لیکن وہ ایک جوش غصے اور جلال کی کیفیت
میں بولتے بولتے دروازے سے نکل گئے۔ اور غالباً باقی بات انہوں نے دروازہ بند کرنے کے بعد
باہر برآمدے میں یا اپنے فلیٹ میں جا کے پوری کی اور روشو اپنے استفسار پر بہت نادم ہونے کے
باوجود اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ قاضی صاحب کی برہمی کا باعث روشو نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو

اگلے دن فرحانہ کو دیکھنے آئے تھے اور اب جن کے ٹیلیفون نے قاضی صاحب کے تحت الشعور میں میں یقیناً ایک ہلچل مچادی تھی۔

اس دن اتفاق سے روشو دوپہر سے پہلے ہی گھر آگیا۔ معلوم نہیں کچھ کام تھا یا تحت الشعور میں کوئی ان دیکھا جذبہ کھینچ لایا تھا۔ بہرحال جب وہ گھر پہنچا تو اسے فلیٹ کا تالا کھولنے کی نوبت نہیں آئی۔ دروازہ کھلا تھا اپنا گھر ہونے کے ناتے اس نے دستک بھی نہیں دی۔ اور چپ چاپ دبے قدموں اندر داخل ہوگیا۔ وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر اندر کامن روم میں جب پہنچا جسے وہ ٹی وی لاؤنج کے طور پر استعمال کرتا تھا تو وہ ایک دم ٹھٹھک گیا۔ اس کے قدم رک گئے فرحانہ سر کے بالوں کو نیپکن سے باندھے دیوار پر ٹنگی قد آدم سے کچھ اونچی تصویر کی گرد صاف کرنے میں مصروف تھی۔ اس کی پشت روشو کی جانب تھی اور تصویر اونچی ہونے کے سبب وہ پنجوں کے بل کافی اونچی ہو کر تصویر کو چھونے اور پونچھنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس طرح بازوؤں کو لمبا کرنے سے ---اس کے جسم میں وقفے وقفے سے ایک بل پڑتا اور ایک بل نکلتا تھا۔ روشو کچھ دیر رکا اور پھر وہ ہلکا سا کھنکارا۔

فرحانہ نے ایک دم گھبرا کے پیچھے دیکھا۔ وہ ہڑبڑا سی گئی۔ وہ پتہ نہیں کب سے گھر کے اندر گرد و غبار صاف کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی روشو نے گرد کی ہلکی ہلکی تہہ سی دیکھی۔ روشو کی موجودگی سے وہ ہڑبڑا گئی۔ فرحانہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ رکے یا ایک دم بھاگ جائے۔

"سوری میں کچھ سامان بھول گیا تھا۔ مجھے لوٹ کر آنا پڑا-----" روشو نے اپنے ہی گھر میں واپس آجانے کی معذرت کی۔

فرحانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پریشانی میں اندر کچن کی طرف گئی اور ڈسٹر ایک طرف رکھ کر جلدی سے ہاتھ دھونے اور تولیہ سے پونچھے بغیر کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف گئی تاکہ مرکزی دروازے سے باہر چلی جائے تو روشو نے آہستہ سے پکارا۔

"سنیئے-----" وہ انہی قدموں پیچھے پلٹے بغیر رک گئی۔

"آپ بہت زحمت کرتی ہیں میرے لئے-----" روشو نے رک رک کر کہا۔ اور فرحانہ نے ایک ہلکی سی نگاہ سے روشو کو دیکھا اور چل پڑی۔

"سنیئے------" اس نے پھر پکارا۔ وہ پھر ایک لمحے کو رکی۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا مجھے کیا کہنا چاہئیے" روشو نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں ۔۔۔۔" وہ آہستگی سے بولی اور تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ روشو نے اندر جاکر دیکھا تو بیڈ روم میں گلدستہ تازہ تھا اور اس کے اندر کم و بیش ہر رنگ کا ایک پھول موجود تھا۔

اس کے بعد روشو نے اپنا معمول تو نہیں بنایا لیکن وہ گاہے گاہے صبح کے وقت کسی نہ کسی کام کے بہانے تھوڑی دیر کیلئے شو روم سے لوٹ آتا۔ کبھی اس کا چشمہ رہ جاتا۔ کبھی شو روم کی کسی دراز کی چابی وہ گھر بھول جاتا۔ کبھی کسی اوزار کی ضرورت پیش آجاتی۔ کبھی کسی کتاب کے بہانے لوٹ آتا اور ہر مرتبہ اسے فلیٹ کھلا ملتا اور فرحانہ اس کے گھر کو سلیقے اور قرینے سے ترتیب دینے میں مصروف ہوتی اور روشو کو دیکھ کر انہی قدموں سے لوٹنے لگتی لیکن وہ ایسا نہیں ہونے دیتا وہ خود تھوڑی دیر رکتا۔ شو روم سے واپس آنے کا عذر بتاتا اور پیشتر اس کے کہ فرحانہ اپنے فلیٹ میں چلی جاتی وہ خود گھر سے نکل جاتا۔

وہ فرحانہ پر کسی قسم کا غلط تاثر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ اس کے اس طرح بار بار لوٹ آنے سے کہیں فرحانہ اس کی شرافت کو مشکوک نہ سمجھنے لگے تاہم اس کے اندر ایک بے چینی ضرور تھی۔ وہ فرحانہ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا کوئی بھی گفتگو۔ کسی بھی موضوع پر لیکن فرحانہ کی آنکھوں میں اور ہونٹوں پر حیا کے دبیز پردے چھائے رہتے۔ وہ روشو کی کسی بات کا ہوں ہاں ۔۔ زیادہ جواب نہیں دیتی۔ تاہم ایک دن اس کی پکار پر جب فرحانہ پیٹھ موڑ کر رک گئی تو روشو نے جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو ہر چیز نکھر گئی ہے لیکن اس گلدستے نے پورے گھر کو مہکا دیا ہے"۔ فرحانہ نے اسی وقت تازہ پانی ڈال کر نیا گلدستہ گل دان میں رکھا تھا۔ "بہت خوبصورت پھول ہیں"۔

"شکریہ ۔۔۔۔" فرحانہ مختصر جواب دیتے ہوئے بولی۔

"ایک بات بتائیے ۔۔۔۔" جب فرحانہ رکی رہی تو روشو نے دوسرا سوال پوچھا۔ "یہ آپ گلدستے میں اتنے مختلف رنگ کیوں جمع کر دیتی ہیں"۔

"کیونکہ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو کونسا رنگ پسند ہے۔ اس لئے میں ہر رنگ کا پھول اس میں ڈال دیتی ہوں۔" فرحانہ نے پہلی بار ایک مکمل فقرہ بولا لیکن وہ روشو کی جانب مڑی نہیں۔ روشو کی جانب مڑ کر اس نے پہلی بات اسی دن کہی جب روشو نے یکے بعد دیگرے دو تین سوال کئے اور فرحانہ کچھ نہ بولی تو اس وقت روشو نے اسے پہلی بار اس کے نام سے پکارا۔

"فرحانہ ۔۔۔۔۔"

"فرحانہ دہلیز پار کرتے ہوئے رکی تو روشو نے پوچھا۔ "کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے"۔

اس وقت فرحانہ نے کھڑے کھڑے ایک لمحہ توقف کیا آہستہ سے پلٹ کر روشو کی جانب دیکھا اور دھیمے سے پر سوز لہجے میں بولی۔ "خاموشی کی بھی ایک زبان ہوتی ہے روشن صاحب"۔ اور پھر تیز تیز ڈگ بھرتی اپنے فلیٹ کی طرف چلی گئی۔ روشو فرحانہ کی اس بات سے جیسے ہل سا گیا اور اسے پہلی مرتبہ شدت سے احساس ہوا کہ فرحانہ اس کو بہت زیادہ سنجیدگی سے چاہتی ہے۔ لیکن کیا اس کے دل میں بھی فرحانہ کیلئے ایک نرم گوشہ ہے؟"۔

روشو نے خود سے سوال کیا اور اس کے اندر سے بے اختیار جواب اثبات میں نکلا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کیوں اس میں دلچسپی لینے لگتا۔ کیوں اس کے بارے میں اتنی سنجیدگی سے سوچتا۔ کیوں وقت بے وقت کسی نہ کسی چیز کی تلاش میں دانستہ گھر لوٹ آتا کہ شاید فرحانہ سے ملاقات ہو جائے اور پھر ایسے ایسے عجیب و غریب قسم کے سوالات فرحانہ سے کیوں پوچھتا جو پہلے اس نے کسی لڑکی سے نہیں پوچھے تھے اور پھر وہ اس کے لائے ہوئے گلدستے کو ایسی نظروں سے کیوں دیکھتا جیسی نظروں سے اس نے کبھی پھولوں کو نہیں دیکھا تھا اور ان پھولوں کی مہک کو اپنی سانسوں کے ذریعے کیوں اپنے پورے وجود میں جذب کرنے کی کوشش کرتا تھا تاہم اس کے بعد اس نے فرحانہ سے کسی قسم کا سوال نہیں کیا۔ کوئی بات نہیں پوچھی اور نہ فرحانہ نے ہی اپنی زبان کھولی۔ زبان کھولی تو قاضی صاحب نے کھولی۔

"دیکھو روشن میاں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہماری مشرقی تہذیب میں صرف بزرگوں کے کرنے کی ہوتی ہیں۔ یا ایسی باتوں کا آغاز بزرگ کرتے ہیں"۔ ایک شام کے وقت وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے موقع پا کر دھیمے دھیمے لہجے میں روشو سے مخاطب ہوئے۔ "سمجھ رہے ہو ناں میری بات"

"جی سر" وہ سر جھکائے آہستہ سے بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم بھی مجھے سر کے بجائے ابا جی کہو۔" قاضی صاحب براہ راست حرف مدعا پر آ گئے۔ روشو ایک دم سے چونک گیا اور جھٹکے کے ساتھ سر اٹھا کے قاضی صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ قاضی صاحب کی گفتگو کے آغاز کا مطلب تو سمجھ رہا تھا لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ قاضی صاحب بات بیان کرنے کیلئے اتنا مختصر راستہ اختیار کریں گے۔

"ویسے اگر ابا جی نہیں کہنا چاہتے تو انکل، چچا یا خالو جان کہہ سکتے ہو جو تخاطب تمہیں مناسب

لگے "۔ وہ بات کو مزید نرم کرتے ہوئے بولے۔
"سر میں سوچ کر جواب دوں گا۔۔۔۔۔" وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔
"کیا تمہیں کسی سے مشورہ کرنا ہے"۔ قاضی صاحب نے پوچھا۔
"نہیں سر۔۔۔۔۔۔ مجھے اگر کوئی مشورہ کرنا ہوگا تو میں آپ سے کروں گا۔ لیکن میرے راستے میں ایک دشواری ہے"۔ روشو نے کہا۔
"بتادو مجھے۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے اپنائیت سے بولے۔ "کھل کر بات کرو مجھ سے"۔
"ایک رکاوٹ ہے سر۔۔۔۔۔" روشو نے مزید گتھی کھولی۔
"وہ کیا۔۔۔" قاضی صاحب نے سلجھانے کے لہجے میں کہا۔
"میری محبت۔ میری بچپن کی محبت جو میرے پاؤں میں ایک ان دیکھی لوہے کی زنجیر بن گئی ہے"۔ روشو بے بسی اور مجبوری سے بولا۔
اور پھر قاضی صاحب کے اصرار پر اسنے شاہینہ سے متعلق اپنی جذباتی وابستگی کی پوری داستان سنادی۔
"ایک بات بتادو۔۔۔" قاضی صاحب نے روشو کی داستان سننے کے بعد انتہائی سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے شاہینہ تمہیں مل جائے گی"۔
"نہیں سر۔۔۔۔۔" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر مایوس لہجے میں بولا۔
"کیا مایوس ہو۔۔۔۔" قاضی صاحب نے پوچھا
"نہیں سر۔۔۔۔" روشو کے لہجے میں ہلکی سی امید کی کرن تھی۔
"تو میں انکار سمجھوں۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے پھر پوچھا۔
"نہیں سر۔۔۔۔۔" وہ گومگو کے عالم میں بولا۔
"تو پھر کیا اقرار ہے تمہارا۔۔۔۔" قاضی صاحب بھی سخت اضطراب میں تھے۔
"نہیں سر۔۔۔۔" روشو شدید ذہنی الجھن کا شکار ہو کر بولا۔ "سر مجھے تھوڑا وقت دے دیں مجھے سوچ لینے دیں۔"
"ٹھیک ہے روشن میاں۔ تم سوچ لو۔" قاضی صاحب نے کہا اور پھر روشو کئی روز تک سوچ میں ڈوبا رہا۔
وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اس کے بھرپور شباب کا عالم ہے اس سے آگے شباب نہیں ہوگا جب سورج نصف النہار پر ہوتا ہے پھر ڈھلان کی طرف رخ کرتا ہے۔ شادی کرنے کی یہی عمر ہوتی ہے۔

یااور دو چار سال بعد سہی۔ لیکن اگر کوئی معقول وجہ ہو تو وہ مزید دس برس بھی انتظار کر سکتا ہے۔ زندگی بھر کا بھی انتظار کرتے ہیں لوگ لیکن انتظار کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اور اس کے پاس ایک ہی وجہ ہے شاہینہ۔۔۔۔ جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی گزارنے کا عہد کیا تھا لیکن یہ عہد اس نے خود کے ساتھ کیا اس میں شاہینہ شامل نہیں تھی لیکن شاہینہ اگر اس عہد میں شامل ہوتی بھی تو اب شاہینہ کہاں ہے۔ کیا وہ کبھی آئے گی۔ کیا ملے گی اسے شاہینہ تو اب محض ایک واہمہ ایک خیال ایک تصور ہے اور اس نے خود کو محض ایک تصور کا قیدی بنا رکھا ہے۔ کیا پوری زندگی محض ایک تصور کے سہارے گزاری جا سکتی ہے۔ قاضی صاحب ایک شفیق استاد ہیں جو باپ کی طرح شفقت رکھتے ہیں اور فرحانہ ایک خوبصورت لڑکی ہے خوب سیرت بھی ہے جس میں بھرپور نسوانیت ہے جو مشرقی حسن اور تہذیب کا مکمل نمونہ ہے۔ جس کے اندر شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور جو اسے بے پناہ چاہتی ہے اور جس کو وہ بھی۔۔۔۔" وہ سوچتے سوچتے رکا اور پھر سوچنے لگا کہ یقیناً وہ بھی اسے پسند کرتا ہے۔ تو پھر قاضی صاحب کے پرپوزل کو منظور نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

" میرا خیال ہے مجھے قاضی صاحب ہی کو اپنا بزرگ بنا کے فیصلہ انہی کے سپرد کر دینا چاہئے۔۔۔۔۔" معاً خیال کی ایک لہر اس کے ذہن میں آئی اور وہ ایک دم سے اٹھا اور دروازہ کھول کے قاضی صاحب کے مکان کی طرف چلا گیا۔

" ٹھک ٹھک۔۔۔۔" اس نے آہستہ سے دستک دی لیکن اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اتنے زور سے اس کا دل کبھی پہلے نہیں دھڑکا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے جا رہا تھا۔ یا شاید اس نے پہلی مرتبہ شاہینہ کے انتظار کے دروازہ کو بند کرنے کی ٹھانی تھی۔

" فرمائیے۔۔۔۔" قاضی صاحب کا دروازہ تھوڑا سا کھلا اور ایک کھردرے چہرے والا شخص اپنی مونچھ کو انگلی کی پور سے دباتا ہوا نمودار ہوا۔ روشو نے اس اجنبی کو پہلی بار قاضی صاحب کے گھر میں دیکھا تھا۔

" قاضی صاحب ہیں۔۔۔۔" روشو نے پوچھا۔

" جی ہاں تشریف لائیے "۔ اجنبی نے جواب دیا اور مزید دروازہ کھول دیا۔ لیکن روشو جب اندر گیا تو جیسے اس کی روح فنا ہو گئی۔ اندر کا منظر ہی عجیب تھا۔ قاضی صاحب کرسی سے بندھے ہوئے تھے۔ فرحانہ کے منہ میں دوپٹہ دے کر اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا اور وہ ڈری سہمی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اور دو مسلح ڈاکوؤں نے گھر پر قبضہ کر رکھا تھا جن میں سے ایک وہ اجنبی تھا جس نے

روشو کے لئے دروازہ کھولا تھا۔ پہلے ڈاکو نے روشو کے اندر داخل ہوتے ہی فوراً دروازہ بند کر کے کنڈی لگادی اور کلاشنکوف کی نالی سے روشو کو چپ چاپ کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"چپ چاپ بیٹھے رہو۔ اگر آواز نکالی تو گولی مار دوں گا۔" پہلے ڈاکو نے کلاشنکوف دکھا کر دھمکی دی۔

"کون ہے یہ-----" دوسرے نے روشو کے بارے میں قاضی صاحب سے پوچھا۔

"یہ میرے پڑوسی ہیں۔ شاگرد بھی"۔ قاضی صاحب نے کہا۔

"سمجھ گیا-----" پہلا بولا۔ "کیا کرتے ہو تم۔" اس نے روشو سے پوچھا۔

"کاروں کا شوروم ہے میرا------" روشو نے صاف گوئی سے بتایا۔

"ہونہہ------روشن آلوز----" پہلے نے کہا۔ "ٹھیک ٹھاک مال ہے اس کے پاس بھی"۔

"پہلے پروفیسر سے نمٹ لو-----" دوسرے نے کہا۔

"پروفیسر ہم تمہاری بیٹی کو لے جارہے ہیں---ڈیمانڈ ہم تمہیں بعد میں بتادیں گے۔ پہلے نے گن گھمائی اور چوکس ہو کر کہا۔

"نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے-----" قاضی صاحب تڑپے اور روشو اپنی جگہ سے اٹھا لیکن اسکے اٹھنے سے پہلے ہی ایک زور دار بٹ پہلے ڈاکو نے روشو کی گردن پر ماری اور روشو دھم سے کرسی کے اندر دھنس گیا اور درد سے گردن سہلانے لگا۔ فرحانہ سہم کر سمٹ سکڑسی گئی۔

"کون ہمیں روک سکتا ہے-----؟ پہلے ڈاکو نے پھر ایک دفعہ کلاشنکوف گھمائی۔ کندھے پر رکھی چادر کو درست کیا اور تن کر بولا۔

"دیکھئے یہ کسی سرمایہ دار کا نہیں ایک پڑھے لکھے عالم فاضل آدمی کا گھر ہے۔" روشو اپنی گردن سہلاتے ہوئے انتہائی درد کی کیفیت میں بولا۔

"ہم جانتے ہیں-----" پہلے ڈاکو نے کہا۔ "یہ بہت پڑھا لکھا اور اسکالر آدمی ہے۔"

"تو پھر آپ نے ڈاکے کیلئے اس گھر کا انتخاب کیوں کیا ہے۔" روشو نے دریافت کیا۔

"یہ ہماری انتقامی کاروائی ہے اسکے دوسرے ڈاکو نے جواب دیا۔

"کیسی انتقامی کاراوئی۔" روشو چونکا

"یہ تم اس پڑھے لکھے عالم فاضل سے ہی پوچھو-----" پہلے نے انتہائی نفرت اور حقارت سے کہا۔

"کیا بات ہے قاضی صاحب------" اب کے روشو قاضی صاحب سے مخاطب ہوا۔ قاضی

صاحب کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے۔
"میں جہاں پہلے رہتا تھا وہاں میرے پڑوس میں ڈاکہ پڑ گیا تھا۔" قاضی صاحب خاصے خوفزدہ تھے۔ "میں نے اپنے گھر کی کھڑکی سے ڈاکوؤں کو اندر جاتے دیکھ لیا تھا۔"
"پھر ------" روشو نے پوچھا۔ لیکن قاضی چپ رہے کچھ نہیں بولے۔ ایک سوچ میں ڈوب گئے۔
"پھر انہوں نے چپکے سے پولیس کو ٹیلیفون کر دیا۔" پہلے ڈاکو نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پولیس کی ایک بڑی گارڈ نے بنگلے کو گھیرے میں لے لیا فائرنگ شروع ہو گئی اور اسی پولیس مقابلے میں ہمارا نوجوان ساتھی، ہمارا جگر، ہمارا یار مارا گیا ------"
پہلے ڈاکو کی آنکھ میں آنسو آ گئے تھے۔ "وہ بھی اپنے ماں باپ کا واحد سہارا تھا اور اکلوتا بیٹا تھا پڑھا لکھا خوبصورت شیر جیسا جوان اس بوڑھے کتابوں کے کیڑے کی وجہ سے مارا گیا۔" اس نے تھوکنے کے انداز میں قاضی صاحب کی طرف نفرت سے دیکھ کر کہا۔
"لیکن میری اس نوجوان سے کوئی پرخاش نہیں تھی، نہ آپ سے ہے، نہ بنگلے والے سے مجھے کوئی ہمدردی تھی۔" قاضی صاحب دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔ "میں نے تو ایک شہری کی حیثیت سے قانون کی مدد کی تھی۔"
"قانون ہاہاہاہا-----" معاً ایک تیسرا ڈاکو اندر کے کمرے سے باہر ڈرائنگ روم میں آیا اس نے منہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور وہ اتنی دیر سے غالباً عقبی کھڑکی یا بالکونی میں کھڑا اس کار کی نگرانی کر رہا تھا جو نیچے سڑک کے کنارے ان کے انتظار میں کھڑی تھی جس میں ان کا چوتھا ساتھی بیٹھا تھا۔ تیسرا ڈاکو بہت خوفناک اور جھنایا ہوا وارد ہوا تھا۔
"میں سچ کہتا ہوں۔ میری کسی سے ذاتی ہمدردی یا رنجش نہیں تھی۔ میں نے قانون کی مدد کی تھی------" قاضی صاحب نے سہم کر کہا۔
"کس قانون کی پروفیسر-----؟" ڈھاٹا باندھے ڈاکو نے نفرت سے کہا۔ "اس قانون کی جو جنگل کا قانون ہے۔ مارشل لا کہتے ہو جسے جو نظریہ ضرورت کے تحت جبری سرجری سے پیدا کیا جاتا ہے۔ جس میں ایک بندہ جو کچھ بولتا جاتا ہے وہ قانون بنتا جاتا ہے ہیں بولو کون سے قانون کی بات کرتے ہو۔" ڈھاٹا باندھے ڈاکو نے نفرت سے ڈھاٹے کے اندر ہی تھوک دیا۔
"میرا اس قانون سے کوئی واسطہ نہیں۔" قاضی صاحب پھر سہمے لہجے میں بولے۔ "میں تو ایک پرامن شہری ہوں، جمہوریت پر یقین رکھنے والا------"

"کون سی جمہوریت پروفیسر ـ ـ ـ ـ" ڈھاٹا باندھے ڈاکو پھر نفرت سے بولا۔ "ملکوں، چوہدریوں، خانوں، سرداروں، وڈیروں کی جمہوریت۔ جہاں جمہوریت بریف کیسوں میں بکتی ہے اور منڈی لگتی ہیں ممبروں کی اور لاٹریوں کے ذریعے عوام کے مسائل ڈھونڈے جاتے ہیں۔ نہیں نہیں نہیں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں، نہ تمہاری ڈکٹیٹرشپ سے، نہ تمہاری جمہوریت سے۔ تم نے ہمارا ایک ساتھی مروادیا ہے۔ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ لے چلو اسے"۔ وہ زور سے بولا۔

"اسے نہیں۔ اس کی بیٹی کو لے چلو۔" پہلا ڈاکو بولا۔

"جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ سڑک پر پیٹرولنگ ہو رہی ہے۔" ڈھاٹا باندھے ہوئے ڈاکو قدرے تشویش سے بولا۔

دوسرے ڈاکو نے فرحانہ کو بازو سے کھینچ کر اٹھایا۔ قاضی صاحب نے لپکنے کی کوشش کی تو پہلے ڈاکو نے ایک بٹ قاضی صاحب کو مارا وہ بے ہوش ہو کر کرسی سمیت پرے جا گرے۔ فرحانہ نے چیخنے کی کوشش کی لیکن چیخ اس کے حلق میں پھنس گئی۔ ڈاکوؤں نے جلدی سے قاضی صاحب کے منہ پر بھی کپڑا باندھ دیا تاکہ وہ بول نہ سکیں۔

"اگر تم نے آواز نکالی تو تمہیں بھی اور تمہارے باپ کو بھی گولی مار دی جائے گی۔" دوسرے ڈاکو نے فرحانہ کو دھمکی دے کر جب بازو سے کھینچا تو روشو بجلی کی سی پھرتی سے ڈاکو کی طرف لپکا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ دوسرے ڈاکو کو پر جھپٹتا ڈھاٹا باندھے ڈاکو نے ایک زوردار ہاتھ روشو کی گردن پر مارا لیکن روشو نے بھی ہمت کر کے ڈاکو کے ڈھاٹے کو کھینچ لیا اور ڈاکو کا منہ اور سر ننگا ہو گیا۔ اس کے سر پر ٹنڈ تھی اور چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ روشو اسے دیکھ کر ایک دم چونک سا گیا۔ جیسے ایک زوردار دھچکا لگا ہے اور وہ ہچکولے کھاتا پیچھے اور پیچھے ماضی کی طرف اس جیل میں پہنچ گیا جسے بچوں کا "اصلاح گھر" کہتے تھے۔ ڈاکو بھی پھٹی پھٹی حیرت زدہ نظروں سے روشو کو دیکھ رہا تھا جیسے وہ بھی پہچان گیا ہو یا پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ دونوں ایک لمحے کیلئے سناٹے میں آ گئے۔

"روڈے ـ ـ ـ ـ" روشو نے جیسے کسی طلسماتی وادی سے چونک کر پکارا۔ روڈا کچھ نہ بولا ٹکر ٹکر روشو کو دیکھتا رہا۔

"مجھے دیکھو روڈے ـ ـ ـ ـ" روشو جذباتی انداز میں بولا۔ "میں نے تمہیں بہت یاد کیا ہے روڈے۔"

"کون روڈا ـ ـ ـ ـ" وہ اس طرح بولا جیسے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو۔ جیسے روشو کی

زبان ہی نہ سمجھ رہا ہو۔

"مجھے پہچانو روڈے ..... "روشو پھر بولا۔

"چلو جلدی کرو..... "کسی خطرے سے دوچار نہ ہو جائیں۔" پہلے ڈاکو نے پکارا اور فرحانہ کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر اسے گھسیٹا۔

"روڈے ...... ایسا مت کرو..... میں تمہارا دوست ہوں روشو..... مجھے غور سے دیکھو۔" وہ گڑگڑایا۔

"کون روشو..... روڈا پھر کسی دوسرے سیارے کی مخلوق کی طرح اجنبی لہجے میں بولا اور روشو کو گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ اسی طاقت کے ساتھ روڈے کی جس طاقت کا مظاہر روشو جیل میں دیکھ چکا تھا پھر کسی بچے یا کھلونے کی طرح اس نے روشو کو اٹھا کے اونچی سی میز پر بٹھایا اور انتہائی قہر و غضب کے عالم میں چہرہ اس کے چہرے کے قریب لے جاکر روشو کو غور سے دیکھنے لگا۔

"روڈے" روشو نے ڈرے سہمے لہجے میں پھر آہستہ سے پکارا

"روشو....." روڈے نے اس طرح زیر لب آواز نکالی کہ ہونٹ ہلتے ہوئے معلوم نہیں ہوئے پھر اس کے لبوں پر ایک نامعلوم سی مسکراہٹ پھیلی اور اس نے روشو کو ایک ہلکی سی آنکھ ماردی۔ ایسی آنکھ جس میں پہچان اور اپنائیت تھی۔

"میں تمہیں نہیں جانتا کہ تم کون ہو؟" روڈا پیچھے ہٹ کر کڑک کر بولا۔

اس کے بعد کیا ہوا روشو کو کچھ پتہ نہیں چلا۔

اچانک کسی ڈاکو نے ایک زور دار ضرب روشو کے سر پر لگائی اور وہ بے ہوش ہو گیا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو قاضی صاحب ابھی تک بے ہوش تھے اور ڈاکو فرحانہ کو لے گئے تھے

(۲۱)

روشو اس طرح دھیرے دھیرے ہوش میں آیا جیسے وہ کسی ڈراؤنے خواب کے دوران دلدل سے باہر آیا ہو۔ اس نے گردن کا وہ حصہ سہلاتے ہوئے آنکھ کھولی جہاں اسے ضرب لگی تھی پھر اس نے گھبرا کر ادھر ادھر جو دیکھا تو قاضی صاحب کرسی پر بندھے ہوئے اور بے ہوش پڑے تھے۔ ڈاکو جا چکے تھے اور فرحانہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"قاضی صاحب۔۔۔۔ قاضی صاحب۔۔۔۔" اس نے بے اختیار قاضی صاحب کو پکارا لیکن قاضی صاحب کی سماعت اور حواس تک اس کی آواز نہ پہنچ پائی۔ ایسا لگتا تھا کہ قاضی صاحب کے سر پر شدید ضرب لگی ہے یا پھر ڈاکوؤں نے جاتے جاتے انہیں کچھ سنگھا دیا ہے روشو کو فرحانہ کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ تیزی سے اندر کے کمرے کی طرف لپکا۔ وہ بھی خالی تھا فرحانہ کے بیڈ روم میں جھانکا عقبی بالکونی کا جائزہ لیا لیکن فرحانہ کی موجودگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ اسے معاً خیال آیا کہ وہ اپنا فلیٹ کھلا ہی چھوڑ کر اس طرف آنکلا تھا شاید فرحانہ ڈاکوؤں سے اپنی جان بچانے کیلئے اس کے فلیٹ میں پناہ لینے چلی گئی۔ وہ لپک کر اپنے فلیٹ میں گیا لیکن فرحانہ وہاں بھی نہیں تھی۔ اور اب فرحانہ کے اغوا ہو جانے میں اسے کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ اسے ایک شدید دھچکا لگا لیکن وہ صبر اور حوصلے سے کام لے رہا تھا۔ اسے اس بات سے شدید صدمہ ہوا کہ ڈاکوؤں میں سے ایک ڈاکو روڈا بھی تھا لیکن یہی بات اس کیلئے ہمت اور حوصلے کا باعث بھی بن رہی تھی کہ روڈا غنڈہ ہونے کے باوجود اصولوں کا آدمی ہے وہ یقیناً دوستی نبھائے گا اور فرحانہ کو نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔ اس نے جلدی سے اپنا فلیٹ بند کیا اور دوبارہ قاضی صاحب کے فلیٹ میں آیا اس وقت تک قاضی صاحب کے جسم میں معمولی جنبش ہونے لگی تھی۔ روشو کو خیال آیا کہ وہ گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ

میں قاضی صاحب کو رسیوں سے آزاد کرنا ہی بھول گیا تھا اس نے جلدی جلدی قاضی صاحب کو کھولا اور قاضی صاحب کو کھولتے ہوئے روشو نے محسوس کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں میں کپکپی طاری ہے۔

"فرحانہ اغوا ہو گئی ۔۔۔۔۔ اف میرے خدایا۔" وہ اس تصور سے ہی کانپ گیا جیسے اصل بات اب اس کی سمجھ میں آئی ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ فوری طور پر کیا کرے وہ گھبراہٹ میں بے اختیار کبھی اندر جاتا۔ کبھی باہر بھاگتا کہ واویلا مچا کر پڑوسیوں کو جمع کرے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا تھا قاضی صاحب کے مشورے سے کرنا چاہتا تھا۔ پھر اچانک اس کی نگاہ میز پر پڑے ایک کھلے خط پر پڑی جس کے اوپر ایک چھوٹا پیپر ویٹ رکھ کر اسے اڑنے سے بچایا گیا تھا۔ وہ خط پر جھپٹ پڑا۔ ڈاکو کھلا خط قاضی صاحب کے نام چھوڑ کر گئے تھے۔ روشو نے جلدی جلدی خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

"پروفیسر تم نے ہم سے چھپ کر یہاں رہائش اختیار کی تھی۔ لیکن ہم سے کوئی چھپ نہیں سکتا ہم تمہاری بیٹی کو لے جا رہے ہیں۔ ہمارے رد عمل کا انتظار کرنا۔ ہم بہت جلد تم سے رابطہ قائم کریں گے۔ لیکن یاد رکھنا پولیس میں جانے کی غلطی نہ کرنا۔ یہ ہمارا مشورہ ہے۔ اس پر عمل کرو گے تو فائدے میں رہو گے۔ ورنہ بے شک ہمارا یہ خط پولیس کے حوالے کر دو اور خمیازہ بھگتنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ پہلے ہم نے خمیازہ بھگتا تھا اب تم بھگتو گے۔"

خط پڑھ کر روشو کرسی پر ڈھیر سا ہو گیا۔ جیسے اس کے جسم کے ایک ایک انگ سے جان نکل گئی ہو۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ قاضی صاحب کے جسم میں کچھ ہل جل ہو رہی ہے جیسے وہ واپس ہوش میں آرہے ہوں۔ روشو لپک کر پانی کا ایک ٹھنڈا گلاس فریج میں سے لایا اور ہلکے سے دو چار چھینٹے قاضی صاحب کے منہ پر مارے۔ قاضی صاحب نے چونک کر ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ جیسے وہ کبھی کسی ڈراؤنے خواب سے بیدار ہو رہے ہوں۔ لیکن لگتا تھا وہ مکمل ہوش میں نہیں ہیں جیسے انہیں ابھی تک احساس نہ ہوا ہو کہ وہ کہاں پر ہیں اور کیا ہو گیا ہے۔ وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کے عجیب نظروں سے ادھر ادھر اور پھر روشو کی جانب دیکھنے لگے جیسے پہچان رہے ہوں۔

"پانی پی لیں تھوڑا سا۔۔۔۔" روشو نے پانی کا گلاس آگے بڑھایا۔ قاضی صاحب نے بے دھیانی کی سی کیفیت میں اس طرح پانی پیا جیسے دوا پی رہے ہوں اور پھر جیسے ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے جیسے کچھ اچانک یاد آگیا ہو۔

"فرحانہ------" وہ دیوانگی کے عالم میں پکارے اور بے اختیار اٹھ کر دوڑنے لگے۔
"حوصلے سے کام لیں سر-----" روشو نے قاضی صاحب کے کندھوں کو اپنے بازوؤں میں تھاما اور سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ قاضی صاحب کی سانس ایک دم پھولنے لگی۔
"فرحانہ کہاں ہے----؟" وہ اپنی سانس کو قابو میں کرتے ہوئے بولے۔ "بولو فرحانہ کہاں ہے۔" وہ پھر اٹھ کر اندر کی طرف گئے اور اندر کے کمروں کو خالی دیکھ کر انتہائی تشویش کے لہجے میں پوچھا۔ ان پر گھبراہٹ طاری تھی۔
"قاضی صاحب------" وہ قاضی صاحب کو پھر ایک صوفے پر آرام سے بٹھاتے ہوئے بولا۔ "آپ ایک عالم آدمی ہیں اور عالم کا مطلب صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنا علم دوسروں تک پہنچائے بلکہ عالم ایک بہادر آدمی بھی ہوتا ہے اور وہ آڑے وقت میں بہادری اور جرات کی مثال بھی قائم کرتا ہے۔"
"کھل کر بات کرو------" قاضی صاحب چلائے اور اپنے نڈھال جسم کو جھٹکا دے کر اٹھے۔ "فرحانہ کہاں ہے؟"
"فرحانہ اغوا ہو گئی ہے!" روشو گردن جھکائے زیر لب بولا اور قاضی صاحب ایک بے جان جسم کی طرح صوفے پر ڈھیر ہو گئے۔ پھر قاضی صاحب نے دھیرے دھیرے اپنے حواس کو قابو کیا اور۔ جسم میں قہر و غضب کی ایک لہر سی دوڑی۔ اپنے بے قابو جذبات کے دباؤ سے مٹھیاں بھینچ لیں اور تیزی سے باہر کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر جب وہ دروازے کی طرف جا رہے تھے تو روشو نے روکا۔
"ایک منٹ سر-----" وہ ہانپتے ہوئے رکے پلٹ کر روشو کو دیکھا تو روشو نے پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہیں سر؟"
پولیس اسٹیشن------" قاضی صاحب لرزتے ہوئے لہجے میں بولے۔
"یہ ایک خط ہے-----ڈاکو چھوڑ گئے ہیں------" روشو نے پیپر ویٹ کے نیچے سے خط اٹھا کر قاضی صاحب کو دکھایا۔ "پہلے یہ خط پڑھ لیں۔" وہ خط پر جھپٹ پڑے خط مختصر اور صاف لفظوں میں لکھا ہوا تھا۔ قاضی صاحب خط پڑھ کر جیسے زمین سے لگ گئے۔
"اف میرے خدایا----" ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ "نہیں، نہیں، میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔" وہ پھر ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "کیا کر رہے ہیں آپ---؟" روشو بھی ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ "کہاں جائیں گے؟"

"پولیس----مجھے پولیس کو اطلاع کرنی پڑے گی۔" وہ بے چینی سے بولے۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے سر------" روشو نے تحمل سے جواب دیا۔ "لیکن آپ خط کو غور سے پڑھ لیں۔ انہوں نے صاف دھمکی دی ہے کہ اگر پولیس سے رابطہ قائم کیا گیا تو فرحانہ..."

"نہیں---- نہیں روشن میاں نہیں---- میں اپنی جان دے دوں گا لیکن میں فرحانہ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔" انہوں نے دیوانگی کے عالم میں روشو کے کندھے پکڑے اور جنجھوڑ کر کہا۔

"میری زندگی کا کل اثاثہ کل کائنات میری فرحانہ ہے۔ اگر میں اسے نہیں بچاؤں گا تو کون بچائے گا۔ اس کا میرے سوا ہے ہی کون دنیا میں۔"

"میں"---روشو کے ہونٹوں سے آہستہ سے ایک لفظ پھسل گیا۔ "میں فرحانہ کا ہوں قاضی صاحب۔" وہ بہت جذباتی لہجے میں بولا۔ "آپ کو نہیں معلوم میں یہی اقرار کرنے کیلئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ مجھے آپ اپنی فرزندی میں لے لیں۔" وہ رقت آمیز لہجے میں بولا اور قاضی صاحب بے اختیار اسے گلے لگا کر آنسوؤں کے ساتھ رونے لگ گئے۔ لیکن پھر فوراً ہی انہوں نے اپنے آنسوؤں کو روکا اور ہمت اور استقلال کے لہجے میں بولے۔ "تم نے ٹھیک کہا ہے کہ علم جرات اور ہمت بھی ہے۔" پھر وہ زبردستی اپنا سینہ تان کر بولے۔ "پہلے میں اکیلا تھا اب ہم دو ہیں---- مجھے مشورہ دو۔ کیا کرنا چاہئے۔ میرے پاس جتنے پیسے ہیں وہ لے لیں۔ فرحانہ کی ماں کا جتنا زیور ہے وہ ان کے سپرد کر دوں گا۔ فرحانہ کیلئے جمع کیا ہوا جہیز ان کے حوالے کر دوں گا اور جو کچھ میرے بس میں ہے یا میرے بس میں نہیں ہے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ فرحانہ کو گزند نہ پہنچے۔"

"مجھے یقین ہے۔ اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ فرحانہ کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ ہمت سے کام لیں۔" روشو نے قاضی صاحب کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا۔ "ان میں ایک ڈاکو ایسا ہے جس کو میں جانتا ہوں اور وہ کبھی فرحانہ کو نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔" روشو امید افزا لہجے میں بولا۔

"بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے-----" وہ انتہائی اضطراب کی کیفیت میں پوچھنے لگے۔

"انتظار-----" روشو نے جواب دیا۔ "جب انہوں نے کہا ہے تو وہ ضرور رابطہ قائم کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے تم کہتے ہو-----" وہ نڈھال اور مردہ ہو کے صوفے میں دھنس گئے۔

O

"ٹھک----"

روشو کے دروازے پر بہت ہلکی اور نامعلوم سی دستک ہوئی۔ ایسی دستک جسے عام حالات

میں آدمی سن بھی نہ پائے یا سن کر توجہ ہی نہ دے نظر انداز کر ڈالے یہ ایسی ہی آواز تھی جیسے کوئی بہت ہی معصوم پرندہ دروازے پر ذرا سی چونچ لگا دے۔ روشو ایک دم چوکس اور چوکنا ہو گیا۔

"کون ہو سکتا ہے-----؟" اس نے سوچا۔ قاضی صاحب کو تو وہ ابھی ابھی ان کے فلیٹ پر چھوڑ کر آیا تھا اور انہیں پلنگ پر لٹا کے اعصاب کو کنٹرول کرنے والی اور خواب آور گولی کھلا کر آیا تھا جس کے بعد اب تک انہیں مکمل طور پر سو جانا چاہئے۔ ان کا سو جانا ضروری ہو گیا تھا ورنہ ان کا ذہن یہ صدمہ آسانی سے برداشت نہ کر سکتا تھا۔ جب سے یہ سانحہ ہوا تھا اس وقت سے روشو دیکھ رہا تھا کہ قاضی صاحب کی حالت قابل رحم ہوتی جا رہی ہے اور ان کا تمام تدبر، بردباری اور تحمل پارہ پارہ ہو چکا تھا اور ان کے اعصاب اس قدر جواب دے گئے تھے کہ اگر اس وقت روشو ان کی غم خواری کیلئے ان کے پاس نہ ہوتا تو وہ مدد کیلئے بے بس ہو کر یا تو تھانے میں دراز ہوتے یا پھر اسپتال کی ایمرجنسی میں اور روشو نے ماں کی ممتا اگر دیکھی نہیں تھی تو ممتا کی کہانیاں سنی ضرور تھیں لیکن باپ کی محبت اور شفقت کا ایسا مظاہرہ روشو کے تصور میں نہیں تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ ایک اس کا باپ شیرو تھا جو اپنی اولاد کے چہرے پر چوہوں کے حملے سے چہرے کے مسخ ہو جانے پر اس لئے خوش تھا کہ اسے زیادہ بھیک ملے گی اور روشو کو اپنے اوپر کئے گئے مظالم یاد آتے تھے کہ اس کا باپ صرف اس لئے اس کی جانوروں کی طرح پٹائی کرتا تھا کہ روشو کے اچھے خیالات تھے اور وہ بھیک کو برا سمجھتا تھا۔ روشو کو یاد نہیں آیا کہ اس کے باپ نے کبھی اسے گود میں اٹھا کے پیار کیا ہو۔ کبھی سوتے جاگتے اس کا ماتھا چوما ہو۔

"لیکن نہیں-----" باپ کے بارے میں منفی خیالات میں پھر ایک رکاوٹ پیدا ہوئی اور اس نے سوچا ہو سکتا ہے شیرو نے بھی اس کے فرار کے بعد اس کی جدائی کو محسوس کیا ہو۔ قاضی صاحب والی شدت نہ ہو گی لیکن کچھ نہ کچھ تڑپ اور اولاد کا غم شیرو کے دل میں ضرور پیدا ہوا ہو گا۔ تاہم اس نے شیرو کے قاضی صاحب کے ساتھ موازنہ کو ایک بے معنی سی بات سمجھ کر اپنے دماغ سے جھٹک دیا۔

"ٹھک-----" روشو نے جب دروازہ کھولنے میں تھوڑا سا توقف کیا تو تقریباً اسی وزن اور نامعلوم سی آواز کی ہلکی سی دستک پھر دروازے پر ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے دبے قدموں دروازے کی جانب گیا۔ آہستگی سے چٹخنی کھولی تھوڑا سا دروازہ وا کیا تو ڈاکوؤں میں سے ایک ڈاکو ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا۔ جو دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا۔

"روڈے-----" روشو چونکا۔

"روشو۔۔۔۔۔اس نے ڈھاٹا کھولا اور بے اختیار روشو سے لپٹ گیا اور پھر دونوں نے بہت دیر تک ایک دوسرے کو بھینچے رکھا اور ایک دوسرے کو اپنے زور محبت کے ساتھ زمین سے اوپر اٹھاتے رہے۔

"اندر کوئی ہے تو نہیں۔۔۔۔۔۔" روڈا پھر ایک دم محتاط اور چوکس ہو کر بولا۔

"نہیں کوئی نہیں۔۔۔۔" روشو نے اطمینان دلایا۔

"کنڈی لگا دو۔۔۔۔" روڈے نے کہا اور روشو نے جلدی سے کنڈی لگا دی اور پھر دونوں نظروں ہی نظروں میں بے چینی اور بے تابی سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور "اور سناؤ اور سناؤ" پوچھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"یہ بتاؤ واردات کی اطلاع پولیس کو تو نہیں ملی۔" روڈے نے بیٹھتے ہی ایک اضطرابی کیفیت سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔۔۔۔" روشو نے حتمی جواب دیا اور پھر تشویش سے پوچھا۔ "فرحانہ کہاں ہے روڈے؟"

"فرحانہ کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں وہ خیریت سے ہے۔" روڈے نے روشو کو تسلی دیتے ہوئے کہا اور دوبارہ پوچھا۔ "یہ بتاؤ پولیس کو اطلاع تو نہیں کی۔"

"روڈے۔۔۔۔۔" روشو قدرے تاسف سے بولا۔ "یار تم وہ لڑکے تھے جو جیل کے اندر محض لڑکے کا چہرہ دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ مجرم ہے یا بے گناہ پھنسا ہے۔ میں اب بھی وہی روشو ہوں روڈے۔۔۔۔ میری بات کا یقین کر لو کہ پولیس بے خبر ہے۔"

"یقیناً تم وہی روشو ہو لیکن میں تمہارے استاد قاضی کو زیادہ نہیں جانتا۔ پھر یہ عالم لوگ۔ ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکا۔

"تم نے تو کہا تھا کہ علم آدمی کو باکردار اور بہادر بنا دیتا ہے۔ قاضی صاحب بھی بہت بڑے عالم ہیں۔" روشو نے کہا۔

"اس کا انحصار علم پر ہے روشو کہ کس کے پاس کیسا علم ہے۔ سچا عشق بھی آدمی کو بہادر بنا دیتا ہے۔ لیکن بزدل عاشق پولیس کے چھاپے پر اپنے کپڑے چھوڑ کر بھاگتے ہیں ہاہاہا۔۔ ۔۔۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔

"ایک بات بتاؤ روڈے۔۔۔۔۔" روشو ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔ "تم تو دوسروں کو راستے دکھاتے تھے خود کیسے اس راہ پر چل نکلے۔"

"دیکھ روشو۔۔۔۔۔" روڈا اپنے مخصوص فلسفیانہ لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ سوسائٹی جو ہے نا یہ ایک راؤنڈا باؤٹ ہے جس کے اندر ہم سب بھیڑوں کی طرح کھڑے اپنے اپنے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ جس راستے پر بھی چلوگے یا وہ راستہ آگے جا کر کہیں نہ کہیں بھٹک جاتا ہے۔ یہاں مجرم بنانے کی فیکٹریاں لگی ہوئی ہیں۔ کسی اور میدان میں نہ سہی لیکن ہمارا ملک جرائم سازی میں خود کفیل ہے۔ اتنا خود کفیل ہے۔ اتنا خود کفیل ہے کہ سرپلس ہے اسٹاک۔ گوداموں میں جگہ نہیں بلکہ ہم تو باہر کے ملکوں کو وافر مقدار میں فراڈ، دھوکے، بے ایمانیاں، جھوٹ، مکر و فریب، ریا کاریاں، دوسروں کو نقصان اور خود کو نفع پہنچانے کی مہارتیں، منافقتیں، غیبتیں، کدورتیں، رنجشیں اور بے شمار ایسی لغویات ایکسپورٹ کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔" وہ ایک ہی رو میں بھرپور غصے کے انداز میں بولتے بولتے چپ ہوا اور پھر کہنے لگا۔ "اور پتہ ہے جن لوگوں کو ہم لوٹ رہے ہیں، جہاں ڈاکے مار رہے ہیں اور جن کو یرغمال بنا کے تاوان کے طور پر دس بیس پچاس لاکھ کروڑ یا دو کروڑ مانگتے ہیں وہ غریب تو نہیں ہیں۔ ان کی مالی حیثیت دیکھ کر ان سے ڈیمانڈ کی جاتی ہے۔۔۔۔ کہاں سے لائے ہیں یہ اتنا پیسہ۔ محنت سے؟"

"تم قاضی صاحب کا شمار ایسے لوگوں میں کب سے کرنے لگے ہو؟" روشو دھیمے لہجے میں بولا۔

"تمہیں بتایا جا چکا ہے کہ قاضی صاحب انتقام کا نشانہ بنے ہیں؟" روڈے نے قدرے دکھ کے ساتھ کہا۔ "تمہیں معلوم ہے جہاں ڈاکہ پڑ رہا تھا اور قاضی صاحب نے مخبری کی تھی۔ وہ کون آدمی تھا جس کے یہاں ڈاکہ ڈالا جا رہا تھا"۔

"کون تھا۔۔۔۔" روشو نے پوچھا۔

"وہ اس ملک کے بڑے اسمگلروں میں سے ایک تھا۔" روڈا بولا۔ "پڑو ملین ڈالرز کا مالک جس کی کرنسی اور ہیروئن پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور جس نے اپنی تجوری کو گرم کرنے کیلئے پوری دنیا کے نوجوانوں کو منشیات کا عادی بنا کے ان گنت سہاگنوں کا سہاگ لوٹا اور ماؤں کی آنکھیں بے نور کر دیں۔ ایسے آدمی کو بچانے کیلئے تمہارے قاضی صاحب نے پولیس کو اطلاع کر دی اور اس۔۔۔۔۔۔ گینگ کا ایک قابل فخر بہادر نڈر اور جری نوجوان جو اپنی فیملی کا واحد سہارا تھا مارا گیا اور جس کے پاس اس کی اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں تھیں اور جس کے بارے میں اگلے دن اخبارات میں یہ سرخی چھپی تھی کہ ایک ڈاکو پولیس مقابلے میں مارا گیا اور غالباً پولیس کے کچھ لوگوں کی ترقی بھی ہو گئی تھی۔"

"تم تو بہت پر امید رہنے والے آدمی تھے تمہارے لہجے میں اب جھنجھلاہٹ اور مایوسی آگئی ہے روڈے ۔۔۔۔" روشو نے اس کی بحث کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

"میں اب بھی پر امید ہوں روشو۔۔۔۔" روڈا پر امید لہجے میں بولا۔ "حالات بگڑ رہے ہیں ان کو بگڑ جانے دو۔ یہ ابھی اور بگڑیں گے۔"

"یہ تو پر امید ہونا نہ ہوا۔۔۔ حالات اور بگڑیں گے تو پھر کیا ہوگا۔" روشو نے کہا۔

"پھر یہ ہوگا کہ حالات اچھے ہو جائیں گے؟" وہ مزید پر امید لہجے میں بولا۔

"وہ کیسے۔۔۔؟" روشو نے قدرے تجسس سے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ ایک وقت آتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی بلڈنگ کو انتہائی مخدوش سمجھ کر لوگ اپنے ہاتھوں سے گرا دیتے ہیں اور پھر اس کے پلاٹ پر نیا ڈیزائن تیار کر کے نئی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔" وہ کہتے کہتے جذباتی ہو گیا اور پھر رک کر بولا۔ "یہ ہمارا خوبصورت ملک ہے اور ہماری آنے والی نسل چوروں، بلیک مارکیٹوں، منشیات فروشوں، ظالموں، بے انصافوں، منافقوں اور موقع پرستوں کا خاتمہ کر کے اس پلاٹ کے اوپر ایک خوبصورت ڈیزائن کے مطابق صاف ستھری عمارت تعمیر کرے گی۔ ایسی عمارت جس کا نقشہ قائداعظم کے ذہن میں تھا پھر اس عمارت میں آنے والی نسلیں انصاف، یقین عزت اور تحفظ کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کر سکیں گی۔"

"یہ فلسفہ اپنی جگہ پر روڈے ۔۔۔" روشو بہت سنجیدگی سے روڈے کی گفتگو سن رہا تھا پھر موضوع بدل کر بولا۔ "لیکن فرحانہ کو اغواء کر کے تم نے اچھا نہیں کیا۔ وہ ایک بہت باعزت اور معصوم لڑکی ہے۔ اس نے تو کوئی گناہ نہیں کیا تھا"۔

"فرحانہ کے اغواء میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے"۔ روڈے بولا۔ "نہ یہ ڈاکہ میرا ہے"۔

"کیا مطلب۔۔۔۔؟" روشو نے پوچھا۔

"یہ دوسرا گینگ ہے"۔ روڈے نے جواب دیا ایک بار ان لوگوں نے ہماری مدد کی تھی۔ آج ان کے ساتھ میں آگیا۔ ان لوگوں کی درخواست پر۔ یہ لوگ قاضی صاحب سے تاوان لے کر لڑکی چھوڑ دیں گے"۔

"لیکن قاضی صاحب پیسے والے آدمی نہیں ہیں"۔ روشو نے کہا۔

"ان سے پیسہ ان کی حیثیت کے مطابق ہی وہ لوگ مانگیں گے"۔ روڈے نے جواب دیا۔ اور پھر وہ ایک دم چوکس سا ہو گیا۔ وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف گیا اور باہر سڑک پر ایک نگاہ ڈالی۔ اسے باہر کی نقل و حرکت کچھ مشتبہ سی نظر آئی جیسے پولیس کی گاڑی آس پاس گھوم رہی ہو۔

"روشو۔۔۔۔" روڈا چونکا۔ "میں تو صرف دوست سمجھ کے تم سے ملنے آیا تھا۔ کیا تم نے پولیس کو۔۔۔۔۔" اس نے چوکس ہو کر پوچھا۔

"نہیں نہیں روڈے۔ یقین کرنا ایسی کوئی بات نہیں"۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ "روٹین چیک اپ ہو گا"۔

"رب راکھا۔۔۔۔" روڈا تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ اسے کچھ تشویش سی ہو رہی تھی۔

"روڈے۔۔۔۔۔" روشو نے عقب سے اس کے بازو کو آہستہ سے چھو کر پکارا۔ وہ اضطراب کی سی کیفیت میں رکا اور پلٹ کر دیکھا۔

"فرحانہ۔۔۔۔۔" روشو کی زبان سے آہستگی کے ساتھ فرحانہ کا نام پھسلا۔ "وہ میری ہے روڈے۔ میں اس کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔ اسے نقصان۔۔۔۔۔؟"

"مبارک ہو روشو مبارک ہو"۔ اس نے تپاک سے روشو کو گلے لگایا اور پھر کہنے لگا۔ "تم فکر نہ کرو روشو میں زندہ ہوں تو فرحانہ کو نقصان نہیں پہنچے گا"۔ اس نے تسلی آمیز لہجے میں روشو سے کہا۔ "یقین کرنا تم سے دوبارہ مل کر مجھے واقعی خوشی ہوئی۔ میں خوش ہوں کہ تم اچھی زندگی گزار رہے ہو"۔ اس نے روشو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جذباتی وابستگی سے کہا اور نہ جانے کیوں آبدیدہ سا ہو گیا۔۔۔۔۔۔ خدا تمہیں اپنی پناہ میں رکھے۔۔۔۔۔۔" روڈے نے روشو کے کندھوں کو چھوا اور دعا دیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بھی۔۔۔۔۔۔" روشو نے جواباً کہا۔

"پروفیسر کو بھی تسلی دینا"۔ روڈا جاتے جاتے کہنے لگا"۔ ان سے کہنا کہ میرے ہوتے ہوئے فرحانہ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

"شکریہ روڈے۔۔۔۔۔۔" روشو نے اظہار تشکر کے طور پر کہا۔

"خدا حافظ۔۔۔۔۔۔ روڈے نے سر کی جنبش سے الوداع کہا اور باہر جانے کے لئے تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔ لیکن ابھی اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا نہیں تھا کہ کھڑاک سے ایک دھماکے کی سی آواز کے ساتھ دروازے کی کنڈی ٹوٹی، دروازہ ٹوٹنے کے انداز میں کھلا اور پولیس کی گارڈ دندناتی اندر داخل ہوئی۔

"خبردار۔۔۔۔" ایک سب انسپکٹر پستول روڈے پر تان کر چوکس انداز میں بولا۔ اپنی جگہ سے ہلنا نہیں ورنہ بھون دوں گا"۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا تھا کہ انتہائی چوکس اور تیار روڈے کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ اس

لاٹھی روڈے کی گردن پر ماری۔ روڈے نے ہلکی سی "ہائے" کی لیکن سہہ گیا۔
"بول اوئے ----- بولتا ہے کہ نہیں" ۔اس نے لاٹھی مارتے ہوئے کہا۔ "بول کتنے ڈاکے مارے ہیں پہلے۔ کون کون ہے تیرے ساتھ اور لڑکی کہاں ہے۔"
"مجھے کچھ پتہ نہیں-----" وہ لاٹھیوں، مکوں اور ٹھڈوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کی ڈھال سے بچاتے ہوئے بولا۔
"تجھے سب کچھ پتہ ہے"۔ تھانیدار نے ایک اور لگاتے ہوئے کہا۔
"بتاؤں گا نہیں-----" وہ ڈھیٹ پن سے بولا۔ "تو کچھ بھی کر لے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے پوری زندگی پولیس ہی دیکھی ہے اور جنہوں نے مجھے دیکھا ہے وہ تمہیں بتادیں گے کہ یہ کچھ بتانے گا نہیں"۔
"نہیں بتانے گا-----" تھانیدار نے پوری قوت کے ساتھ لاٹھی گھما کے روڈے کے سر پر دے ماری۔ لیکن روڈے نے بجلی کی سی سرعت سے اپنا سر بچایا اور لاٹھی کو ایک ہاتھ کی مٹھی میں پکڑ لیا۔ تھانیدار نے زور لگا کر لاٹھی کھینچی لاٹھی روڈے کی مٹھی میں اس طرح جکڑ گئی جیسے ویلڈ ہو گئی ہو۔ لاٹھی ہل کر نہیں دی۔
"چھوڑ لاٹھی-----" تھانیدار نے زور لگا کے جھٹکا دیا۔
"چھڑا-----" روڈے نے مٹھی بھینچ کر جیسے چیلنج کر دیا۔ تھانیدار نے پوری قوت کا مظاہرہ کیا تمام زور لگایا لیکن دونوں کی عمر اور طاقت میں بڑا فرق تھا۔ لاٹھی روڈے کی مٹھی میں جام ہو گئی۔
"سر وہ پریس فوٹو گرافر آئے ہیں۔ فوٹو بنانا چاہتے ہیں"۔ ایک اے ایس آئی نے تیزی سے آکر خبر دی۔
"بلاؤ ان کو----- بنواؤ اس کی فوٹو اور بولو دے دیں کل کے اخبار میں"۔ تھانیدار نے مٹھی میں پھنسی لاٹھی کو ہلاتے ہوئے کہا۔
"یس سر---" اے ایس آئی حکم کی بجاآوری کر کے پلٹا لیکن ابھی ایک قدم ہی چلا تھا کہ روڈے نے پکارا۔
"ٹھہرو"۔ اے ایس آئی رک گیا اور تھانیدار کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن روڈا اب کے تھانیدار سے مخاطب ہو کر بولا "سوچ لو تھانیدار صاحب اگر میری فوٹو چھپ گئی تو میرا کوئی نقصان نہیں ہو گا"۔ لاٹھی ابھی تک روڈے کی مٹھی میں پھنسی ہوئی تھی۔

"توکس کا نقصان ہوگا اوئے ----" تھانیدار نے پھر لاٹھی کو غصے سے ہلایا لیکن لاٹھی روڈے کی مٹھی سے نکلی نہیں۔

"آپ کا ------" روڈا دھیرے سے بولا۔

"میرا -----" تھانیدار ازراہ حیرت بولا وہ کیسے کھوتی کے پتر۔"

"اگر میری فوٹو چھپ گئی تو میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ آپ معطل ہو جائیں گے"۔ اس نے دھمکی کے انداز میں کہا۔

"کیا بکواس کرتے ہو؟" تھانیدار نے برہم لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے بلاؤ فوٹو گرافروں کو اور بناؤ میری فوٹو ------" اس نے ہنس کر اے ایس آئی سے کہا اور پھر تھانیدار سے مخاطب ہوا۔ "یہ پھول جو ساری زندگی کی دوڑ دھوپ کر کے آپ نے لگائے ہیں صرف ایک جھٹکے میں اتر جائیں گے اور پھر یہ سنتری بھی سلوٹ نہیں کرے گا۔" وہ ہنسا اور گردن اٹھا کے اے ایس آئی سے بولا۔ بلا کے لا فوٹو گرافر کو"۔ اس نے اس طرح سر اٹھایا جیسے فوٹو کے پوز دے رہا ہو۔ اے ایس آئی جانے لگا تو تھانیدار کے چہرے پر دو تین رنگ آئے اور نکل گئے۔ وہ قدرے متوحش ہوا۔

"او کس کا رعب دیتا ہے تو"۔ وہ بے اعتنائی سے پوچھنے لگا"۔ کون ہے تیرا جو مجھے معطل کرائے گا۔ ہیں -----"۔

"فوٹو چھپواؤ معلوم ہو جائے گا"۔ روڈا بے نیازی سے بولا۔ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے"۔

"او محمد نواز ----" تھانیدار نے اے ایس آئی کو پھر پکارا۔ "بلا لا فوٹو گرافروں کو، پر پہلے تو اس کے منہ پر توبڑا ڈال دے -----" اس نے حکم دیا اور روڈے کی تصویر بننے سے پہلے اس کے منہ کو توبڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔ روڈے نے مٹھی کھولی اور لاٹھی چھوڑ دی"۔ اور ہنس کر بولا "جا چھوڑ دیا۔"

O

"قاضی صاحب آپ ہمت سے کام لیں -----" روشو نے قاضی صاحب کو سہارا دے کر صوفے پر بٹھانے کی کوشش کی۔ وہ برآمدے سے انہیں اپنے کمرے میں ہی لے آیا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید ڈاکو روشو کے ٹیلیفون پر ہی قاضی صاحب یا روشو سے رابطہ قائم کریں۔ وہ روشو کا ٹیلیفون نمبر تو نہیں لے گئے تھے لیکن فرحانہ ان کے قبضے میں تھی اگر فرحانہ سے پوچھیں گے تو وہ یقیناً روشو ہی کا نمبر رابطے کے لئے بتائے گی۔۔ اس لئے قاضی صاحب روشو کے ڈرائنگ روم

میں نہایت اضطراب کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ ان کا جسم پسینے میں شرابور تھا اور ٹھنڈے پسینوں سے بدن برف کی طرح یخ ہو رہا تھا۔

ان کی جسمانی اور ذہنی کیفیت سے اندازہ لگتا تھا کہ ان کے اعصاب کسی بھی وقت جواب دے جائیں گے۔ وہ مسلسل کپکپا رہے تھے۔ جیسے اندر ہی اندر ان پر ایک زلزلہ طاری ہو۔

"قاضی صاحب حوصلہ کریں۔۔۔۔۔" روشو نے پھر رام کرنے کے لہجے میں قاضی صاحب سے کہا۔ "آپ نے ہمت و استقلال کے ساتھ اس مشکل کا مقابلہ بھی کرنا ہے اور اسے حل بھی کرنا ہے۔

"قاضی صاحب جواب میں پھٹی پھٹی نظروں سے روشو کو دیکھنے لگے اور ایک دم بدک جانے کے انداز میں بولے۔ "تھانے میں ٹیلیفون ملاؤ۔۔۔۔۔"

"کیوں۔۔۔۔۔۔۔ ابھی تو بات ہوئی ہے تھانے میں"۔ روشو نے کہا۔

"پھر ملاؤ۔۔۔۔ میں انچارج سے بات کرنا چاہتا ہو"۔ وہ دیوانگی کے عالم میں بولے۔

روشو نے بلا تامل ڈائیل گھمایا اور تھانے میں تھانیدار سے لائن ملادی۔

"ہیلو۔۔۔۔" وہ بے چینی سے بولے۔ "میں قاضی محمد ابراہیم سلیمانی بول رہا ہوں۔ جی گزارش یہ تھی کہ کچھ پیش رفت ہوئی۔۔۔۔۔۔ دیکھیں کچھ کریں ڈاکو آپ کے قبضے میں ہے۔۔۔۔۔۔ کیسے نہیں بولتا ہے۔ جی پولیس کے سامنے تو وہ بھی بول جاتا ہے جس نے کچھ نہیں کیا ہوتا۔ یہ تو مجرم ہے اور پکڑا گیا ہے۔ اس کی مشکیں باندھیں۔۔۔۔۔ کچھ بھی کریں میری بیٹی کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ ۔۔۔ جی۔ جی۔۔۔۔۔ جی۔ جی۔۔۔۔ میں آپ کا بہت۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے انتہائی مایوسی کے عالم میں ٹیلی فون بند کر دیا۔ شاید تھانیدار مزید گفتگو کے موڈ میں نہیں تھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں؟" روشو نے پوچھا۔

"ڈاکو کچھ نہیں بول رہا ہے۔۔۔۔۔" وہ بے جان بجھے ہوئے لہجے میں بولے"۔ اگر یہ رات میری بیٹی نے باہر گزاری نا۔۔۔۔ تو میں۔۔۔۔" وہ ہانپنے لگ گئے۔ "تو میں مر جاؤں گا۔" انہوں نے روشو کا گریبان پکڑ لیا اور آبدیدہ ہو گئے۔

"کچھ کرو روشو۔ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔" وہ گڑگڑانے لگے۔ التجا کرنے لگے۔

"کاش میں کچھ کر سکتا قاضی صاحب۔۔۔۔" روشو دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "وہ اگر جان کے بدلے میں جان مانگتے ہیں تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ میں اس بات کے لئے بھی تیار

ہوں کہ وہ فرحانہ کے بجائے مجھے یرغمال بنالیں اور میری رہائی کے بدلے میں مجھ سے سب کچھ لے لیں میرا پیسہ، میرا شوروم۔۔۔۔۔ جو کچھ میرا پاس ہے۔ لیکن ان کی طرف سے اشارہ ملے تو "۔ وہ کہتے کہتے رکا اور پھر تاسف کے انداز میں کہنے لگا۔ "جس ڈاکو سے امید تھی کہ وہ فرحانہ کی حفاظت کرے گا اس کو آپ نے۔۔۔۔۔"

"مجھ سے غلطی ہو گئی۔۔۔۔۔" وہ پچھتاوے سے بولے۔ "اسے پکڑوانے سے پہلے مجھے تم سے مشورہ کر لینا چاہئے تھا۔ لیکن اب جو ہونا تھا سو ہو گیا لیکن اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے "۔ ان کے لہجے میں امید کی کرن پیدا ہوئی۔

"یہ ڈاکو جو پکڑا گیا ہے کیا نام بتاتے ہو اس کا۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے پوچھا۔

"روڈا۔۔۔۔۔" روشو بولا

"کسی بڑے باپ کا بیٹا ہے یہ کیا۔۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے سوال کیا۔

"شاید۔۔۔۔۔۔ لیکن بہت بگڑ گیا ہے "۔ روشو ازراہ افسوس بولا۔ "بہت ذہین پڑھا لکھا اور باشعور لیکن تقدیر۔۔۔۔۔

"تم بتا رہے تھے کہ وہ جیل میں تمہارا دوست تھا۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے مزید کہا۔

"صرف میرا ہی نہیں جیل میں ہر لڑکے کا دوست تھا لیکن میرے ساتھ کچھ زیادہ ہی ہمدردی تھی اسے۔ "روشو اپنے ماضی کی یاد کریدتے ہوئے بولا۔ "کچھ کہہ نہیں سکتا کہ اب۔۔۔۔۔ لیکن اب بھی وہ میرے پاس آیا تھا اسے۔۔۔۔۔

"اب تم اس کے پاس چلو روشو۔۔۔۔۔۔"۔ قاضی صاحب روشو کے کندھے جھنجھوڑ کر بولے۔ "اس کو پتہ ہے ہماری بیٹی کہاں ہے۔ وہ مدد کر سکتا ہے ہماری۔۔۔۔" قاضی صاحب التجا کرنے لگے۔

"لیکن۔۔۔۔۔۔۔"۔

"لیکن کیا۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے روشو کو بولنے کا موقع نہیں دیا۔ "ہم سے غلطی ہو گئی غلطی انسان سے ہوتی ہے۔ ہم اس سے معافی مانگ لیں گے۔ تم اس سے معافی مانگ لو اگر مجھے نہیں تو تمہیں معاف کر دے گا وہ۔۔۔۔۔ جیسا کہ تم بتا رہے ہو کہ وہ جیل میں سب کا ہمدرد تھا۔ ہم بھی ہمدردی کے طالب ہیں روشو، ہم سے زیادہ مظلوم اس وقت کون ہے۔۔۔۔۔"

"لیکن قاضی صاحب وہ اس وقت پولیس کی حراست میں ہے آزاد نہیں ہے"۔ روشو نے مشکل بتائی اور پولیس سے تعاون نہیں کر رہا ہے"۔

"وہ میں مانتا ہوں۔۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے مجبوری کا اقرار کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس سے بات تو کریں اور جیسا کہ تم کہتے ہو وہ سختی سے نہیں مانتا نرمی سے پیار محبت سے التجا سے مان جانے شاید۔۔۔۔۔ اور پھر تھانیدار سے بات کر کے دیکھتے ہیں شاید وہ ضمانت پر چھوڑ دے شخصی ضمانت پر۔۔۔۔۔۔"

"بات کر لیتے ہیں۔" روشو نے جواب دیا۔ "بات کرنے میں کوئی حرج نہیں"۔ روشو بھی کچھ پرامید سا ہوا۔

○

"میں آپ کی پوری بات سمجھ گیا ہوں"۔ قاضی صاحب اور روشو کے ساتھ تفصیلی گفتگو کے بعد تھانیدار تحمل سے بولا۔ لیکن اس کی ضمانت نہیں۔۔۔۔۔۔۔ ہو سکتی۔ کم از کم میں تو ضمانت کا تصور بھی نہیں کر سکتا"۔

"کون کر سکتا ہے ضمانت اس کی"۔ قاضی صاحب تشویش کے لہجے میں بولے۔

"کوئی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں آئی جی کی سطح پر بھی ایسے خطرناک ڈاکو کو کسی مصلحت کی بنا پر بھی کوئی ضمانت پر رہا نہیں کر سکتا"۔ تھانیدار اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

"ہم کیش ضمانت۔۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے کہنا چاہا۔

"مشکل ہے سر۔۔۔۔۔۔۔ تھانیدار نے بات کاٹی۔ "یہ ضمانت کا کیس ہی نہیں ہے"۔

"ہمیں ملاقات کرنے دیں۔ شاید ہمیں وہ بتا دے کہ لڑکی کہاں ہو سکتی ہے"۔ روشو نے تجویز پیش کی۔

"یہ میں کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔" تھانیدار نے کہا پھر اس نے ایک سپاہی کو آواز دی اور حکم دیا۔

"عالم خان سے کہو ان کی ملاقات کرا دے۔۔۔۔۔"

"جی سر۔۔۔۔" سپاہی نے حکم کی بجاآوری میں سلوٹ کیا۔

"لیکن سر۔۔۔۔" روشو نے اٹھتے اٹھتے کہا۔ "اس کے ساتھ بات ہم تنہائی میں کرنا چاہتے ہیں"۔

"سچو۔۔۔۔ تھانیدار نے پھر آواز دی اور سپاہی رکا۔ کہنا علیحدگی میں بات کریں گے۔ تم لوگ باہر ٹھہرنا"۔

"جی سر۔۔۔" سپاہی نے پھر سلیوٹ کیا اور قاضی صاحب اور روشو سپاہی کے ساتھ چلتے

ہوئے روڈے سے ملنے حوالات کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ جہاں وہ چاروں طرف پہروں میں گھرا ہوا تھا۔

روڈے نے پہلے تو ملنے سے انکار کر دیا۔ پھر بصد اصرار وہ رضامند ہوا اور انتہائی نفرت اور حقارت کے ساتھ روشو کو بات کرنے کی اجازت دی۔ اس وقت کمرے میں روشو، قاضی صاحب اور روڈے کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پولیس جالی دار دروازے کے باہر چوکس انداز میں پہرہ دینے میں مصروف تھی۔

"دیکھو روڈے تم ایک پڑھے لکھے اور باشعور نوجوان ہو"۔ روشو نے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ "اور باپ کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہو اور یہ بھی سمجھ سکتے ہو جس باپ کی بیٹی اغوا ہو جائے وہ ہوش و حواس میں نہیں رہتا اور غلطی بھی کر سکتا ہے اور قاضی صاحب نے اپنی بزرگی کے باوجود تم سے معافی مانگی ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے"۔

"تو گویا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ پولیس کو اطلاع کرنے میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں تھا"۔ روڈے نے کہا

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم چہرے دیکھ کر لوگوں کے جرم اور بے گناہی کا فیصلہ دے دیتے تھے۔" روشو نے کہا۔ "کیا میرے چہرے سے تمہیں اندازہ نہیں ہو رہا ہے۔" پھر روشو نے اپنا سیدھا ہاتھ بلند کیا اور حلفیہ کہنے لگا۔ "روڈے میں اپنے خدا اور اپنے ضمیر کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ پولیس کو اطلاع کرنے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں، نہ مجھے اس کا علم تھا"۔ پھر وہ توقف سے بولا "اور میں تمہیں تمہارے خدا اور تمہارے ضمیر کا واسطہ دیتا ہوں کہ فرحانہ کی بازیابی کے لئے ہماری مدد کرو۔۔۔۔۔۔۔"

"میری ضمانت کراؤ۔۔۔۔" وہ انتہائی تیز لیکن سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "جبھی میں کچھ کر سکتا ہوں"۔

"ناممکن ہے۔ ہم نے بہت کوشش کر دیکھی۔ وہ کسی قیمت پر تمہاری ضمانت نہیں کریں گے"۔ روشو نے کہا

"تو پھر میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں"۔۔۔۔۔۔ وہ انکار کرتے ہوئے بولا۔ "میں حراست میں ہوں"۔

" پلیز روڈے ......" روشو نے دونوں ہاتھ روڈے کے آگے جوڑے اور انتہائی رقت آمیز لہجے میں کہنے لگا" میں نے جب فقیروں کی بستی چھوڑی تھی تو اس دن عہد کیا تھا کہ اب ہاتھ کسی کے آگے نہیں جوڑوں گا۔ آج میں یہ عہد توڑ کر تمہارے آگے ہاتھ جوڑ کر بھیک مانگ رہا ہوں۔ روڈے مجھے بھیک دیدو"۔

" بس روشو......" روڈا بھی جذباتی ہوگیا"۔ اس نے روشو کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھ کھولے " مت مانگو بھیک"۔

اس نے قدرے توقف کیا اور پھر نہایت سنجیدگی سے اور اعتماد کے لئے میں بولا تھانیدار کو یقین دلا دو کہ میں بھاگوں گا نہیں مجھے ایک رات کے لے ضمانت پر چھوڑ دے۔ میں لڑکی کو آزاد کرا کے صبح خود گرفتاری دے دوں گا"۔

"وہ نہیں مانے گا"۔ روشو نے مایوسی سے کہا۔

روڈے نے ادھر ادھر بڑی تیز اور تیکھی نظریں دوڑا کر باہر کھڑے محافظوں کو دیکھا اور پھر قاضی صاحب کی شیروانی کی اوپر والی جیب میں رکھا ہوا قلم بجلی کی سی پھرتی سے نکالا اور انتہائی تیزی کے ساتھ نامعلوم انداز میں روشو کی ہتھیلی پر کچھ لکھ دیا۔

" تم دوبارہ ضمانت کی بات کر کے دیکھو۔" روڈے نے کہا۔ " اور اگر نہیں مانتے ہیں تو میں نے تمہاری ہتھیلی پر لکھ دیا ہے۔ جہاں میرے خیال میں اس وقت لڑکی ہو سکتی ہے۔ اپنے طور پر ان لوگوں سے سودے بازی کر کے لڑکی کو رہا کرالو......"۔

وہ عجیب نظروں سے روشو کو دیکھنے لگا اس کے چہرے کے بھی عجیب تاثرات تھے جیسے اس نے روشو کے ساتھ ہمدردی کر کے نیکی بھی کی ہو اور اپنے ساتھیوں کا پتہ بتا کے غداری بھی۔

"اب تم جاؤ یہاں سے ......" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

قاضی صاحب اور روشو چپ چاپ باہر نکل آئے اور جب تھانیدار کے کمرے میں پہنچے تو تھانیدار نے پوچھا۔

"کچھ بتایا اس نے......؟"

" سر وہ کہتا ہے مجھے صرف ایک رات کے لئے ضمانت پر چھوڑ دو میں لڑکی برآمد کر کے صبح خود بخود گرفتاری دے دوں گا"۔ اس سے پیشتر کہ قاضی صاحب کچھ بولتے روشو کھٹ سے بول پڑا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" تھانیدار نے مشینی انداز میں سر کو نفی میں ہلایا۔ "ضمانت کا

تو آپ تصور ہی نہ کریں"۔

"آئیے قاضی صاحب چلیں"۔ روشو نے قاضی صاحب کا بازو تھاما اسے پھر تشویش پیدا ہو گئی تھی کہ قاضی صاحب جذبات سے بے قابو ہو کر اس کی ہتھیلی پر لکھے ہوئے پتے کی نشاندہی نہ کر ڈالیں۔ لیکن ابھی قاضی صاحب سیٹ سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ باہر تڑاخ تڑاخ فائرنگ کی آواز آئی اور ایک بے ہنگم شور بپا ہوا اور ایک سپاہی واویلا مچاتا ہوا اندر آیا۔

"سر غضب ہو گیا۔ ڈاکو حوالات سے فرار ہو گیا ہے۔ ڈی ایس پی صاحب۔۔۔۔ پر فائرنگ ہو گئی ہے"۔

باہر کا شور شرابا اور ہنگامہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا تھا جیسے گاڑیاں دوڑنے لگی ہوں۔ سائرن کی آوازیں بلند ہوئیں۔ تھانیدار بھی بے اختیار کمرے سے باہر دوڑا۔

لیکن اس تمام ہنگامے کے باوجود قاضی صاحب اور روشو سناٹے میں آ گئے۔

فائرنگ ڈی ایس پی پر نہیں ہوئی تھی بلکہ فائرنگ پولیس نے فرار ہوتے ہوئے روڈے پر کی تھی۔ روڈے کا حوالات سے فرار بھی بہت سنسنی خیز اور ڈرامائی تھا۔ ہوا یوں کہ جب روشو اور قاضی صاحب روڈے سے مذاکرت کر کے باہر نکلے تو دروازے کے باہر کھڑے چوکس پہرے داروں نے فوراً جالی دار دروازہ بند کر کے باہر سے مقفل کر دیا تھا۔ پھر جب روشو اور قاضی صاحب تھانیدار کے کمرے میں بیٹھے تھانیدار کے سامنے روڈے سے اپنی پرائیویٹ ملاقات کا احوال بیان کر رہے تھے تو عین اسی وقت ڈی ایس پی کی جیپ تھانے کے احاطے میں داخل ہوئی ڈی ایس پی جو روڈے کی گرفتاری کی خبر سن کر آیا تھا بڑی تیزی کے ساتھ جیپ سے اترا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر سیدھا حوالات کی طرف چلا گیا۔ پہرے داروں نے ڈی ایس پی کی رفتار اور حوفتار کا رخ دیکھ کر ٹھاک ٹھاک سلیوٹ کئے اور کھٹاک سے حوالات کا دروازہ غیر مقفل کر کے حوالات کے پٹ کھول دیئے تاکہ ڈی ایس پی اپنی رفتار کو برقرار رکھتے ہوئے اندر داخل ہو سکے۔ روڈے کی تیز عقابی نظروں نے اندر ہی سے ڈی ایس پی کو اپنی جانب آتے دیکھ لیا تھا وہ فوراً ہی چوکس ہو گیا اور دروازہ کھلنے پر جوں ہی ڈی ایس پی نے حوالات میں داخل ہونے کے لئے قدم اندر رکھا تو اچانک جیسے بجلی چمکی۔ ڈی ایس پی ادھ کھلے دروازے میں ہی تھا کہ روڈا جو بچپن ہی سے جوڈو کراٹے اور مارشل آرٹ کا ماہر تھا پلک جھپکنے میں اچھلا، ایک ہوائی چھلانگ لگائی۔ ڈی ایس پی کی توقع کے برعکس ایک باڈی پش دیا۔ ڈی ایس پی بے وزنی کی کیفیت میں باہر جا گرا لیکن گرتے گرتے فوراً ہی سنبھل کے روڈے کے تعاقب میں تابڑ توڑ فائر کئے۔ ساتھ ہی پولیس نے بھی فائر کھول دیئے۔ اوپر نیچے گولیاں چلیں۔ پکڑو، پکڑو۔ دوڑو، دوڑو کی آوازیں، ایک شور ایک ہنگامہ بپا ہو گیا لیکن روڈا اس تمام

ہنگامے اور گولیوں کی برسات سے بچ نکلا۔ وہ گیند کی طرح برآمدے سے اچھل کر احاطے میں آیا اور احاطے سے اچھلا تو سامنے کھڑی جیپ کی فرنٹ سیٹ پر جا دبکا۔ جہاں اس نے بجلی کی سی سرعت سے ڈرائیور کو دھکیل باہر پھینکا اور جیپ اسٹارٹ کر کے لے بھاگا۔

سائرن بجاتی جیپ تھانے سے نکلی اور رات کی ہلکی ہلکی ٹریفک میں کھلی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ پیچھے ہی پولیس کی ایک گاڑی تعاقب میں دوڑ پڑی جس کے اندر خود ڈی ایس پی، تھانیدار، اور چند پولیس والے تھے۔ سائرن آگے والی جیپ میں بھی بج رہا تھا جو روڈا چلا رہا تھا اور سائرن پیچھے والی گاڑی میں بھی بج رہا تھا جو روڈے کی جیپ کے تعاقب میں تھی۔ ایسا لگتا تھا دونوں گاڑیاں پولیس کی ہیں جو کسی اور گاڑی کا تعاقب کر رہی ہیں یا علاقے میں کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے اور پولیس جلد از جلد جائے واردات پر پہنچنا چاہتی ہے۔

سائرن مسلسل بج رہے تھے روڈا جیسے جیپ پر نہیں ہوائی گھوڑے پر سوار تھا۔ جیپ دوڑتی ہوئی ایک چوک پر آئی جہاں سگنل کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں لیکن ٹریفک کا سپاہی چوک کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اس نے اس وقت روڈے کی سمت ٹریفک کو روک رکھا تھا لیکن جیپ کی رفتار، آواز اور انداز دیکھ کر سپاہی نے فوراً ہاتھ بدلا اور جیپ کو راستہ دے دیا۔ ساتھ ہی پولیس کی دوسری گاڑی بھی نکل گئی۔ دونوں گاڑیاں فراٹے بھرتی مین روڈ پر ایک دوسرے کے تعاقب میں تھیں۔

پھر ایک بغلی سڑک سے روڈے نے اچانک ٹرن لیا اور گاڑی ڈیفنس کی جانب نسبتاً ایک زیادہ خالی سڑک کی طرف موڑ دی۔ پچھلی گاڑی چونکہ ٹرن کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے اس کی بریکوں سے رات کی خاموش فضا میں سمع خراش چیخیں بلند ہوئیں اور یوں تعاقب کرنے والی وین بھی روڈے کی جیپ کے پیچھے بغلی گلی میں مڑ گئی۔ سڑک پر ٹریفک بھی کم تھی۔ رات کے راہگیر بھی اکا دکا چل رہے تھے۔ روڈے کے اسٹیئرنگ اور پیڈل ورک سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ گاڑی اس کی اپنی نہیں ہے۔ وہ کسی بہت ہی ماہر ڈرائیور کی طرح جیپ اڑاتا جا رہا تھا اور تعاقب کرنے والی گاڑی سے اس کا فاصلہ بتدریج زیادہ دور ہوتا جا رہا تھا پھر جب یہ فاصلہ مزید بڑھا تو روڈے نے محسوس کیا کہ پچھلی گاڑی سے فائرنگ شروع ہوگئی ہے۔ ایک گولی دھائیں سے آئی اور اندر سے اس کے منہ کے آگے ونڈ اسکرین پر لگی اور ونڈ اسکرین کو چھیدتی ہوئی اور اس میں دراڑیں ڈال کر نکل گئی پھر ایک گولی اس کے کان کے قریب سے گزری ایک گولی نے اس کے بغلی شیشے کو چھناکے سے اڑا دیا۔ لیکن وہ قدرتی طور پر بچتا ہوا گاڑی بھگا رہا تھا اور اس کی تیز رفتاری پچھلی گاڑی کو بہت پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔ اس دوران راستے میں کئی گاڑیوں کو اس نے اوور ٹیک کیا۔ کئی گاڑیوں کو اس طرح تیزی

سے کراس کیا کہ ٹکراتے ٹکراتے بچا لیکن وہ بچتا بچاتا کافی دور نکل گیا۔ اور پھر جب اسے پچھلی گاڑی
کی زد سے بچ جانے کی امید پیدا ہو چکی تو عین اس وقت اس نے دیکھا کہ سامنے ایک بڑا بگڑا ہوا ٹرک
کھڑا ہے اور ٹرک کی رکاوٹ کے پاس جو گزر جانے کا راستہ تھا اس پر ایک بہت ہی ضعیف اور
غریب بوڑھا ہاتھ میں لمبی لاٹھی لئے عین سڑک کے وسط میں کھڑا تھا۔ بوڑھے نے موٹے اور دبیز
فریم کا معمولی سا نگاہ کا چشمہ لگا رکھا تھا اور چشمے کے ایک شیشے کے اوپر ہرے رنگ کے کپڑے کا
چھوٹا سا فلیپ تھا جو اس بات کا پتہ دے رہا تھا کہ بوڑھے نے حال ہی میں آپریشن کرایا ہے۔
بوڑھا سڑک کے عین وسط میں ایسی جگہ کھڑا ہو گیا تھا کہ نہ وہ آگے جا سکتا تھا اور نہ پیچھے ہٹنے کی
پوزیشن میں تھا اور اس نے نہایت ملتجیانہ انداز میں ہاتھ بلند کر رکھا تھا جس میں آنے والی
گاڑیوں سے رک جانے کی درد مندانہ اپیل تھی۔

"یا میرے خدا اس ۔۔۔ اس بوڑھے کو ہٹا دے سامنے سے" ۔ روڈے کے اندر سے
ایک دعا اور فریاد نکلی۔ لیکن بوڑھا بہت اطمینان سے ہاتھ کے اشارے سے جیپ کو رکنے کے لئے
کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا اس امید پر کہ جیپ رک کر اسے گزرنے کا موقع دے گی۔۔۔۔۔۔

"او کمبخت بڈھے ۔۔۔۔۔۔" وہ چلایا۔ سائرن بج رہا تھا۔ اس نے ہارن دیا بوڑھا ٹس سے
مس نہیں ہوا۔ "کیا وہ اسے کچل دے۔۔۔۔۔" ایک لمحے کے لئے روڈے کے اندر خیال پیدا ہوا۔
لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے"۔ اس نے خود ہی جواب دیا اس نے تو آج تک کبھی کسی بے گناہ کو نہیں
مارا ہے۔ اس نے جب مارشل آرٹ سیکھا تو اسے پہلا سبق صبر کا دیا گیا تھا اور دوسرے سے
زندگی کا حق نہ چھیننے کا۔ اور پھر اس وقت تو وہ ویسے بھی اپنے دوست روشو کی محبوبہ یا منگیتر جو کچھ
بھی ہو اس کی جان بچانے کے لئے بھاگنے سے فرار ہوا ہے۔ کسی کی جان لینے کے لئے نہیں۔ بلکہ
وہ اگر روشو کی منگیتر نہ بھی ہوتی تو بھی ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی ہے۔ ایک انسان ہے جس کی
زندگی بچانے کے لئے وہ جیپ بھگا رہا ہے۔ لہذا وہ بوڑھے راہ گیر کو کیسے کچل سکتا ہے۔ اس طرح
کے کئی خیال چند لمحوں ہی کے اندر اس کے ذہن میں آئے۔ اس کے پاس وقت بالکل نہیں تھا
پلک جھپکتے ہی گاڑی بوڑھے کے قریب پہنچ گئی۔ اور روڈا جس تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا اسی
تیزی کے ساتھ اس نے ایمرجنسی بریک لگائی۔ بریک سے ایک دلخراش چیخ فضا میں بلند ہوئی جیپ
ایک بالشت آگے نہیں بڑھی لیکن بریک کے زور سے جیپ اپنی جگہ گھوم گئی۔ بوڑھے نے ہاتھوں
کے اشارے سے شکریہ ادا کیا اور آرام آرام سے سڑک عبور کرنے لگا۔ لیکن وقت کے لمحے اتنے کم
اور اہم تھے کہ تعاقب کرنے والی پولیس وین بھی عین جیپ کے پیچھے ٹکرانے کے سے انداز میں

آن رکی۔ پولیس کی چوکس گارڈ محاذ جنگ کے سپاہیوں کی طرح چوکس انداز میں چھلانگیں لگاتی نیچے اتری۔ لیکن روڈا بھی فٹ بال کی طرح اچھلا۔ ایک زور دار چھلانگ لگا کر سڑک کے اس پار اندھیرے میں دوڑ پڑا۔ پولیس بھی اندھیرے میں ان کے پیچھے بھاگی۔

فائر بھی آنے لیکن اندھیرے میں ادھر ادھر جا ٹکرانے۔ اور وہ بچتا بچاتا نکل گیا۔ معاً آگے ریلوے لائن آگئی وہ پھاٹک سے اندر بھاگا۔ پٹری کے اس طرف کھلا میدان اور کچھ جھگیاں نالے وغیرہ تھے۔ لیکن اس نے جونہی پٹری پر قدم رکھا پھاٹک اچانک بند ہوگیا۔ پھاٹک کے بند ہوتے ہی وہ پٹری کی جانب بھاگا اس دوران منٹوں سیکنڈوں میں ٹرین آگئی۔ ریل کے ساتھ ہی پولیس بھی چھلانگتی پھلانگتی ہوئی پھاٹک سے اندر آگئی۔ ریل بڑی تیزی سے گزر رہی تھی۔ پولیس ریل کے گزرنے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پولیس والے بھاگتے پہیوں کے بیچ میں سے دوسری جانب تانک جھانک کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ ریل زیادہ سے زیادہ ایک منٹ میں گزر گئی۔ پولیس کی پوری گارڈ چوکس تھی۔ "بھاگو بھاگو"۔ پکڑو پکڑو، ادھر دوڑو، ادھر دیکھو" کا شور بلند ہوا ساتھ ہی ہوائی فائر بھی ہو رہے تھے۔ پولیس کے سپاہی بھاگ بھاگ کے جھگی نالوں میں میدان میں دور تک دیکھ آنے لیکن روڈا ندارد۔ اس کا کہیں نشان تک نہیں تھا۔ وہ پولیس کی نظروں میں دھول جھونک کر حیدرآباد کی طرف جانے والی تیز گام کے ساتھ لٹک گیا تھا شاید پولیس کا کوئی سپاہی بھی ساتھ لٹک گیا ہو۔

O

"میرا دل بیٹھ بیٹھ جاتا ہے روشو۔ میں اپنے بس میں نہیں ہوں"۔ قاضی صاحب نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ قاضی صاحب اور روشو ابھی ابھی اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچے تھے۔ تھانے میں جونہی روڈے کے فرار ہونے کا شور بلند ہوا اور تھانیدار کمرہ خالی چھوڑ کر باہر بھاگا تو روشو بھی قاضی صاحب کو لے کر سیدھا اپنے اپارٹمنٹ میں آگیا۔ حالانکہ قاضی صاحب یہ رات گھر کی بجائے تھانے میں گزارنا چاہتے تھے تاکہ پولیس کی مدد کا سہارا مل جانے لیکن روشو کو چونکہ روڈے کی جانب سے ممکنہ پتے کا اشارہ مل گیا تھا اس لئے وہ قاضی صاحب کو فوری طور پر تھانے سے باہر نکال لایا لیکن قاضی صاحب کی ہمت لحظہ بہ لحظہ جواب دے رہی تھی۔

"اس وقت آپ کو حوصلے سے کام لینا ہے قاضی صاحب۔۔۔۔۔" روشو نے پھر ہمت دلانے کی کوشش کی۔ ہمیں روڈے کی جانب سے اس جگہ کا ایڈریس مل چکا ہے جہاں اس وقت

فرحانہ ہو سکتی ہے۔ یہ دیکھئے۔۔۔۔" اس نے اپنی ہتھیلی دکھائی جس پر روڈے نے اپنے ہاتھ سے پتہ لکھا تھا۔ روشو نے کاغذ کی چٹ پر جلدی سے یہ ایڈریس لکھ کر محفوظ کر لیا۔

"تو پھر چلو جلدی چلو۔ وقت ضائع نہ کرو" ۔ وہ اضطرابی کیفیت میں اٹھے۔

اور چند لمحوں بعد روشو اور قاضی صاحب کی کار مطلوبہ پتے کی طرف جا رہی تھی جس کا فاصلہ وہاں سے کم و بیش آٹھ دس میل تھا۔ راستے بھر قاضی صاحب کا دل دھڑکتا رہا اور وہ ٹوٹ کر فرحانہ کی سلامتی کی دعائیں کرتے رہے۔

مارس ٹاور کے آس پاس شاید دن کے وقت رونق رہتی ہو لیکن اس وقت مکمل ویرانی اور سناٹا تھا۔ یہ ایک دس منزلہ بڑی عمارت شہر سے دور دراز علاقے میں تعمیر کی گئی تھی اور روڈے کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق اس کی دسویں اور آخری منزل پر ڈاکوؤں نے فرحانہ کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔

روشو اور قاضی صاحب لفٹ کی طرف گئے۔ لفٹ سے نکلتے ہی ان کی جس فلیٹ پر نظر پڑی اس پر جلی حروف میں نمبر 3 لکھا تھا۔ قاضی صاحب اور روشو دونوں کی نگاہ ایک ساتھ فلیٹ کے نمبر پر پڑی۔

"یہی ہے تین نمبر۔۔۔۔" قاضی صاحب چونکے"۔ پھر معاً دروازہ کھلا اور قمیض شلوار میں ملبوس ایک نوجوان تیزی سے باہر نکلا قاضی صاحب اور روشو کو کوری ڈور میں دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا اور الٹے قدموں واپس اندر چلا گیا۔

پھر قاضی صاحب اور روشو دونوں دھیرے دھیرے دروازے کے قریب گئے اور روشو نے ہلکی سی دستک دی۔ دستک پر اس شخص نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور متجسس نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگا اور اس سے پیشتر کہ قاضی صاحب اور روشو کچھ بولتے اس نے خود ہی کہا۔

"اندر آجاؤ۔۔۔۔" اس نے دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔ اور قاضی صاحب اور روشو ڈرے سہمے اندر داخل ہوئے۔ اندر ایک بے ترتیب سا ڈرائنگ روم تھا جس میں تقریباً سات آدمی موجود تھے جو روشو اور قاضی صاحب کو دیکھ کر چونک سے گئے۔

"میرا نام۔۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے تعارف کرنا چاہا۔

"تعارف کی ضرورت نہیں۔۔۔۔" پہلے آدمی نے قاضی صاحب کی بات کاٹ کر کہا۔ " اور اس کو بھی ہم جانتے ہیں"۔ اس نے روشو کی طرف اشارہ کیا پھر اس نے کمرے میں موجود افراد کو سر کی جنبش سے کوئی اشارہ کیا تو کمرے سے پانچ افراد اٹھ کر باہر چلے گئے۔ صرف دو کمرے میں رہ

گئے۔ یہ دونوں وہی تھے جو روڈے کے ہمراہ قاضی صاحب کے مکان پر گئے تھے اور فرحانہ کو اٹھا لائے تھے۔

"یہاں کیسے پہنچے ہو۔۔۔۔" پہلے ڈاکو نے تشویش سے پوچھا۔

"روڈے نے یہاں کا پتہ بتایا تھا"۔ روشو نے جواب دیا۔

"روڈے نے۔۔۔۔۔؟" پہلا ڈاکو چونکا، دوسرا بھی پریشان ہوگیا۔

"میری بیٹی کہاں ہے" پروفیسر صاحب اضطراب کی کیفیت میں بولے۔ "حوصلہ رکھو پروفیسر" پہلے ڈاکو نے قاضی صاحب کا کندھا دبا کر انہیں صوفے پر بٹھا دیا۔ "روڈے نے یہاں کا پتہ کیسے بتا دیا ہے۔ وہ تو پولیس کے قبضے میں ہے۔" ڈاکو سخت تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔

"ہم روڈے سے ملاقات کرنے گئے تھے۔" روشو نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے پولیس کو بھی یہ ایڈریس معلوم ہوگیا ہوگا۔" دوسرا ڈاکو پریشانی سے بولا۔

"نہیں پولیس کچھ نہیں جانتی۔ اس نے پولیس سے چھپا کر یہ پتہ بتایا ہے۔ روڈا میرا دوست ہے"۔ روشو نے کہا۔

"اور تم نے خوب دوستی نبھائی ہے پولیس سے مخبری کر کے"۔ دوسرا ڈاکو بولا۔ "پھنسوا دیا اسے یہ دوستی کا صلہ دیا"۔

"وہ روشو کا نہیں میرا قصور، میری کوتاہی تھی۔" قاضی صاحب بول پڑے۔ "اور اس کے لئے میں نے روڈے صاحب سے معافی مانگی ہے"۔

"ان لوگوں کے یہاں آنے سے مجھے اندیشہ پیدا ہوگیا ہے۔ ٹونی۔ یہاں سے نکل چلو۔ اب لگتا ہے روڈا بھی۔۔۔۔۔" پہلے نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"روڈا پولیس کی حراست سے فرار ہوگیا ہے"۔ روشو نے انکشاف کیا اور دونوں ڈاکوؤں کے کان کھڑے ہوگئے۔

"اس کا مطلب ہے روڈا یہاں پہنچنے والا ہوگا"۔

"اگر وہ پولیس فائرنگ سے مارا نہ گیا تو ضرور یہاں پہنچے گا۔" روشو نے امید ظاہر کی۔

"اور اس کے پیچھے پیچھے پولیس بھی۔۔۔۔" دوسرے نے کہا۔ "یہاں سے بھاگ چلو"۔

"میری بیٹی کہاں ہے"۔

"بہت جلدی مت کرو پروفیسر۔۔۔۔۔" پہلے ڈاکو نے پھر قاضی صاحب کو دبا کر بٹھا دیا۔

"ہم قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں"۔ قاضی صاحب نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"کس کی قیمت۔۔۔۔۔" دوسرے ڈاکو نے پوچھا۔ "اپنی بیٹی کی یا اس نوجوان کی جس کو تم نے پولیس مقابلے میں مروایا تھا"۔

"وہ میں کہہ چکا ہوں میری بھول تھی"۔ قاضی صاحب گڑگڑائے۔ "اب اسی کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ میری بیٹی میرے حوالے کردو۔۔۔۔۔ خدا کے لئے بتادو وہ کہاں ہے؟"

"ابھی نہیں۔ تم دونوں بہت مشکوک حالات میں یہاں آئے ہو۔ فی الحال تمہیں حراست میں رکھا جائے گا۔" دوسرے نے پستول نکال کے قاضی صاحب اور روشو پر تانتے ہوئے کہا۔

اچانک دستک ہوئی۔ اور دونوں ڈاکوؤں کے کان کھڑے ہوگئے۔ اور دونوں نے کلاشنکوف اٹھائیں۔ اور پہلے نے سب کو انگلی کے اشارے سے چپ رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے دروازے کی "کی ہول" سے باہر دیکھا اور پھر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے دوسرے سے کہا۔

"کھول دو دروازہ۔" دوسرے نے دروازہ کھولا اور ایک زور کے ساتھ روڈا اندر داخل ہوا۔

روڈے کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ بڑے زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

"اوہ روڈے۔۔۔۔۔ کیسے ہو تم؟" پہلا ڈاکو روڈے سے بغلگیر ہوا۔

"ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔" روڈا سانس کو قابو میں کرتے ہوئے بولا۔

"بڑی ہمت کی تم نے۔۔۔۔۔" دوسرے نے کہا۔ "پولیس تو نہیں ہے تمہارے پیچھے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں ٹرین سے لٹک گیا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی ٹرین پر چڑھ گیا ہے تو ہم ٹریس ہوسکتے ہیں"۔ روڈے نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "خطرہ بہر حال یہاں موجود ہے۔ یہ جگہ خالی کردو"۔

"میری بیٹی۔۔۔۔۔" قاضی صاحب پھر تڑپے۔

"وہ تو ابھی نہیں ملے گی پروفیسر"۔ ڈاکو حتمی طور پر بولا۔

"لڑکی ان کے حوالے کردو۔۔۔۔۔" روڈے نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"نہیں روڈے۔۔۔۔۔ ابھی نہیں"۔ دوسرا قدرے رازداری سے بولا۔ "ابھی تو ہم نے تاوان طے نہیں کیا ہے"۔

"میں نے کہا لڑکی ان کے سپرد کردو، بخیر و عافیت اور جو کچھ لین دین کرنا ہے وہ میرے کھاتے میں ڈال دو"۔ روڈا سخت لہجے میں بولا۔

"روڈے تم سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔" پہلے نے کچھ کہنا چاہا۔

بھلا تنگ لگاتا۔ ڈاکو نے پورا برسٹ کھول دیا اور دیکھتے دیکھتے روڈا خون میں نہا گیا۔ لیکن وہ گرا نہیں اس نے جھپٹ کر اس ڈاکو کو بھی اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔

" میں بغیر ہتھیار کے تجھے ماروں گا کتے " ۔ اس نے آخری زور لگا کر ڈاکو کے نرخرے سے موت کی آوازیں نکالیں۔ اور ڈاکو کی ابھی آخری سانسیں چل رہی تھیں کہ معاً ادھر سے دروازہ کھلا۔ پولیس اندر داخل ہوئی"۔

" خبردار ------"

لیکن اس وقت تک دونوں ڈاکو ٹھنڈے ہو چکے تھے ۔ اور روڈا نزع کے عالم میں زمین پر گر پڑا۔ روشو نے اسے گرتے گرتے پکڑنے کی کوشش کی اور اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

" یہ تم نے کیا کر دیا روڈے --------- روشو تڑپ کر بولا۔

" مجھے معاف کر دو روشو۔ میں تیرے لئے کچھ نہیں کر سکا۔۔ وہ مرتے مرتے بولا۔

" تم نے میرے لئے اتنا کچھ کیا ہے روڈے کہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔۔ روشو نے اس کی خون آلود لاش چھاتی سے لگالی۔

" تم مجھے معاف کر دو کہ میرے لئے ایسی بھرپور جوانی میں مر گئے ہو' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پولیس نے روشو کو روڈے کی لاش سے الگ کیا۔ وہ نڈھال سا ہو کے قاضی صاحب کی طرف بڑھا۔ قاضی صاحب زمین پر بیٹھے کپکپا رہے تھے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اندر جا کر اپنی بیٹی کو دیکھتے کہ وہ کس حال میں ہے ----- لیکن وہ آنے ہی فرحانہ کی بازیابی کے لئے تھے۔ دونوں نے ہمت کی، ایک دوسرے کو سہارا دیا اور اندر اس کمرے میں چلے گئے جہاں فرحانہ تھی۔

" کس حال میں تھی؟ یہ ان میں سے کسی کو نہیں معلوم تھا ۔"

O

فرحانہ کو چپ لگ گئی۔ ایک تو وہ ویسے ہی کم سخن اور حساس تھی لیکن اس دن کی واردات کے بعد اس کی زبان پر مہر لگ گئی۔ ایک لفظ بول کے نہیں دیا۔ کمرے کے اندر بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے پلکیں جھپکانے بغیر ٹکٹکی باندھے ایک دیوار سے دوسری دیوار تک اس طرح دیکھتی رہتی جیسے افق کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کے اس پار دیکھ رہی ہو۔

قاضی صاحب نے اس سانحہ کو پولیس کیس نہیں بننے دیا تھا نہ فرحانہ کا طبی معائنہ کرانے

دیا۔ اب اس سے حاصل کچھ نہیں تھا۔ ڈاکو مارے جا چکے تھے۔ آگے مزید رسوائی کے سوا کچھ نہ ملتا۔ وہ سب کچھ اپنے اوپر سہہ گئے۔ روشو بھی ضبط کر گیا لیکن فرحانہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ اس کے ذہن پر شدید اثر پڑا تھا۔ ڈاکٹر گھر پر آتا، تفصیلی معائنہ، دوا دارو سب کچھ ہوتا ایک نیند کا انجکشن صبح ایک شام لگا کے جاتا جس سے فرحانہ کو کچھ غنودگی سی آتی اور وہ آنکھیں موندے پڑی رہتی لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں تھا۔ روشو اور قاضی صاحب اس جدوجہد میں مصروف تھے کہ فرحانہ کسی طرح بولے کوئی بات کرے۔ بولتی نہیں ہے تو روئے یا چیخیں مارے لیکن وہ پتھر کی ہو گئی تھی۔ پھر ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ اس کا غنودگی میں رہنا صحیح نہیں ہے۔ اسے جاگتے رہنا چاہئے اور اس کے منہ سے لفظ اگلوانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔

"دیکھو فرحانہ ------ حادثہ، واقعہ، سانحہ یہ سب چیزیں بھی زندہ انسانوں کے ساتھ پیش آتی ہیں۔۔ ایک دن روشو نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ صوفے پر ٹیک لگائے اپنی پتھرائی ہوئی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ "کبھی مردوں کے ساتھ کوئی حادثہ، کوئی سانحہ کوئی واقعہ پیش نہیں آتا ہے فرحانہ ------ یہ سب چیزیں زندگی کا حصہ ہیں۔" روشو صوفے پر اس کے قدموں کے پاس قالین پر بیٹھ گیا۔

قاضی صاحب جو اسی صوفے پر ایک مردہ لاش کی طرح بیٹھے تھے۔ دھیرے دھیرے اٹھے اور روشو کا کندھا نہایت شفقت سے دبایا۔ "شاباش بیٹے۔ کوشش کر دیکھو۔ اب تم ہی اسے ہمت دلا سکتے ہو۔" وہ آبدیدہ ہو کر بولے اور دونوں کو تنہائی میں چھوڑ کر باہر چلے گئے تاکہ روشو زیادہ کھل کر بات کر سکے۔

"فرحانہ میرے ایک استاد کہا کرتے تھے۔ زندگی آگے دیکھ کر گزرتی ہے پیچھے نہیں۔ پیچھے ماضی ہے جو گزرا گزر گیا، بھول جاؤ اسے، میری طرف دیکھو۔۔۔ دیکھو میری طرف پلیز ------"

روشو نے اس کے دونوں پاؤں کے پنجوں کو اپنے ہاتھوں کی گرمی سے چھوا اور نہایت وارفتگی سے بولا۔ "دیکھو ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھو۔ تم نے کہا تھا کہ خاموشی کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ اب جو تمہاری خاموشی کی زبان ہے ناں وہ میں سمجھ رہا ہوں۔ اور تمہارا دکھ بانٹنا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں مل کر یہ بوجھ اٹھانا چاہتے ہیں۔ جو تم اکیلی سہہ رہی ہو۔ شاباش دیکھو میری طرف ------"

اور روشو نے پہلی بار محسوس کیا کہ فرحانہ کی پتلیوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی جیسے دور افق سے ہٹ کر وہ نزدیک اپنے قدموں میں بیٹھے روشو کو دیکھنا چاہتی ہو۔

"اوہ، سویٹ گرل ------- وہ بے اختیار اس کے قدموں سے اٹھ کر اس کے برابر

صوفے پر بالکل اسی کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی ٹھوڑی کو نہایت آہستگی سے، نہایت ملائمت سے چھو کر دھیرے دھیرے اپنی طرف موڑا۔

"دیکھو فرحانہ بنیادی طور پر میں ایک میکینک ہوں اور اسی انداز میں بات کرنے کا عادی ہوں۔ یہ جو زندگی کے راستے ہیں ناں! یہ اس طرح نہیں ہوتے سیدھے ناک کی سیدھ جانے والے سپرہائی وے کی طرح، سپرہائی وے میں بھی اچانک کوئی بڑا خطرناک اور پر پیچ موڑ آجاتا ہے۔ کبھی کبھی وہاں گاڑی اور انسان ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری گاڑی اس پر پیچ موڑ سے نکل گئی ہے۔ ہم پھر زندہ ہیں۔ آگے جانے کے لئے۔..........وہ بولتے بولتے لمحہ بھر چپ ہوا اس نے محسوس کیا کہ فرحانہ اس کی باتیں سن رہی اور فرحانہ کی آنکھ میں زندگی کی ایک چمک سی پیدا ہو رہی ہے۔

"پتہ ہے اس دن میں قاضی صاحب سے کیا کہنے آیا تھا۔ میں قاضی صاحب سے یہ کہنے آیا تھا کہ ازراہ مہربانی میرے سر پر اپنی شفقت کا ہاتھ رکھیں۔ مجھے اپنی فرزندی میں لے لیں"۔ فرحانہ کے اندر ایک جھری جھری سی پیدا ہوئی۔ وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کے روشو کو دیکھنے لگی۔ "ہاں فرحانہ ----- میں وہی بات آج پھر دہرا رہا ہوں۔ تم مجھے اپنے سر کا تاج بنا لو۔ یا میرے دل کی ملکہ بن جاؤ اس بات کو بھول جاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں تمہیں شادی کا پروپوزل دے رہا ہوں۔ تم ہاں کرو تو قاضی صاحب سے باقی بات کر کے بات کو آگے بڑھاؤں۔ یہ میں کسی ہمدردی میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے.......۔ روشو نے دیکھا فرحانہ کی آنکھ میں پہلی مرتبہ آنسوؤں کے موتی سے ظاہر ہونے۔ پتہ نہیں وہ آنسوؤں کو روک رہی تھی یا بہانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر ایک دم جیسے کوئی جوار بھاٹا، کوئی موج اس کے اندر امڈی اور آنسوؤں کے بند ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"رو لو.......بہت دنوں سے تم نے آنسو روک رکھے ہیں۔۔ روشو نے اس کے آنسوؤں کو انگلی کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ اور وہ بہت دیر تک روتی رہی۔

"روشو بہت دیر کی تم نے ------۔ وہ روتے روتے اٹک اٹک کر بولی۔

"نہیں۔۔ روشو نے حوصلہ افزاء لہجے میں کہا۔ " نہیں ابھی کچھ نہیں بگڑا------۔

وہ بڑی ممنونیت سے روشو کو دیکھنے لگی اور پھر اپنا سر آہستہ سے روشو کے کندھے پر رکھ دیا۔

"مجھے تھوڑا سا پانی پلا دیں.......۔ فرحانہ نے چار دن اور چار راتوں کے بعد پہلی مرتبہ کچھ

کھانے پینے کو مانگا۔ روشو لپک کے فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کے لایا۔ قاضی صاحب کو بھی فرحانہ کی واپسی کا مژدہ سنایا۔ قاضی صاحب بھی تیزی سے اندر آئے۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ روشو نے قاضی صاحب کی موجودگی ہی میں فرحانہ کے قریب بیٹھ کر اس کے سر کو اپنے بازو میں لے کر اپنے ہاتھ سے پانی پلادیا۔

"ابا جی ۔۔۔۔۔" پانی کا نصف گلاس اس نے پیا اور باپ سے کچھ کہنے لگی۔ لیکن کہتے کہتے اچھو سا ہو گیا، بات ادھوری رہ گئی۔

"ہم سے پھر بات ہو جائے گی۔ بیٹے ۔۔۔۔۔" قاضی صاحب نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "فی الحال روشن میاں سے باتیں کرو ۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر قاضی صاحب باہر چلے گئے۔ لیکن فرحانہ نے روشو سے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ شاید کچھ دواؤں کا اثر تھا کچھ ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا مختصر سی بات چیت کے دوران اسے پُر سکون نیند آگئی اور وہ روشو کے کندھے سے لگ کر سو گئی۔

زندگی کچھ دن کے بعد پھر معمول کے مطابق ہوتی نظر آئی۔ قاضی صاحب بالکل بجھ گئے تھے ان کے چہرے پر پھر زندگی کی علامات نظر آنے لگیں۔ پڑھانے میں انہوں نے دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ ان سے پڑھایا نہیں جارہا تھا۔ شعر کچھ ہوتا تشریح کچھ کرتے تھے لیکن اب پھر درس گاہ جانے اور پڑھانے لگ گئے تھے۔ فرحانہ کے چہرے پر بھی اگرچہ تازگی اور چمک دمک نہیں رہی تھی لیکن روشو کے رویئے اور دلجوئی سے اسے بڑا حوصلہ ملا تھا اور زندگی بڑی تیزی سے معمول پر آنے لگی تھی۔ روشو کا گھر جو حادثے کے بعد سے پھر بے ترتیب سا ہو گیا تھا۔ اس میں از سر نو ایک ترتیب اور تزئین آگئی تھی۔ روشو کے شو روم جانے کے بعد فرحانہ جھپک مار کر آتی اور اس کے گھر کی صفائی ستھرائی کر کے تالا لگا دیتی۔ لیکن ایک حوصلہ شکن بات جو روشو نے شدت سے محسوس کی تھی اور جو اس کے اندر نیزے کی طرح کھب سی گئی تھی۔ وہ یہ تھی کہ فرحانہ نے اب ڈرائنگ روم کے گلدان میں تازہ گلدستہ رکھنا یا پرانے گلدستے میں پانی دینا چھوڑ دیا تھا۔ اس میں وہی پرانے پھول رکھے ہوئے جواب اس قدر مرجھا گئے تھے کہ خزاں زدہ سوکھے پتوں کی طرح لگ رہے تھے۔ لیکن روشو اتنے بڑے سانحے سے گزرنے کے بعد فرحانہ کے اس رویے کو قدرتی سا عمل سمجھ رہا تھا۔

"روشو میاں تاخیر آپ کی طرف سے ہے یا ہماری طرف سے؟" ایک دن موقع پا کر قاضی صاحب نے روشو سے شادی کے بارے میں حتمی طور پر دریافت کر ہی لیا۔

"استاد مکرم۔ میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں" ۔۔۔۔ روشو نے ایک فرمانبردار شاگرد اور

فرزند کی طرح کہا "آپ تاریخ مقرر کریں۔۔۔۔ میری طرف سے لبیک ہے"۔

"تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ خوشی کا وہ کام جس کی انجام دہی مقدس فریضہ بھی ہو اس میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے"۔ قاضی صاحب نے ایک فرض شناس ذمہ دار محتاط باپ کی طرح کہا۔

"محرم کا مہینہ ختم ہو رہا ہے صفر کے چاند کے دس دن اور چھوڑ دیتے ہیں"۔ انہوں نے دیوار سے ایک اسلامی کیلنڈر اتار کر کہا اور پھر ایک جمعہ کی نشاندہی کرتے ہوئے بولے۔

"17 تاریخ کو جمعہ کا مبارک دن ہے۔ کیا خیال ہے اس تاریخ کے بارے میں"۔

"بہت نیک سر۔۔۔۔ روشو فرمانبرداری سے بولا۔

"تو پھر اپنے ہاتھ سے 17 تاریخ کے اطراف دائرہ لگا دو"۔ قاضی صاحب مسکرانے۔

"زہے نصیب"۔ روشو نے قلم اٹھایا اور سترہ تاریخ کے اطراف دائرہ کھینچ دیا۔

"مبارک ہو"۔ قاضی صاحب نے اٹھ کر روشو کے سر پر دست شفقت رکھا۔

"میری خوش نصیبی ہے۔۔۔۔ کہ مجھے فرحانہ جیسی رفیقہ زندگی اور آپ جیسا شفیق باپ مل گیا ہے"۔ روشو نے فرط عقیدت و احترام سے سر جھکا دیا۔ اتنے میں فرحانہ چائے کا کپ لے کر اندر آئی۔ وہ شاید گفتگو سن رہی تھی۔ جب جانے لگی تو قاضی صاحب نے بہت شفقت سے پکارا۔

"فرحانہ بیٹے"۔

"جی ابا حضور۔۔۔۔ وہ اپنی مخصوص شائستگی سے بولی۔

"بیٹے کیلنڈر کے اوپر صفر کی 17 تاریخ کو ہم نے انڈر لائن کیا ہے۔ میں نے اور روشو نے مل کر"۔ وہ مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولے۔۔۔۔ "سمجھتی ہو بیٹے یہ کیسی تاریخ ہے"۔ انہوں نے فرحانہ سے پوچھا۔ فرحانہ نے ہلکی سی نگاہ اٹھا کے قاضی صاحب کو اور پھر روشو کو دیکھا اور پھر کیلنڈر کی تاریخ پر نظر مرکوز کی۔

"بیٹے یہ میری زندگی کی تمہاری زندگی کی اور روشو کی زندگی کی اہم ترین تاریخ ہے"۔ وہ انتہائی جذباتی ہو کر بولے اور اٹھ کر فرحانہ کے سر پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ روشو بھی فرحانہ کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔

"جاؤ تیاری کرو"۔ انہوں نے آہستہ سے ماں کے لہجے میں کہا اور فرحانہ شرما کر سر جھکائے تیزی سے اندر چلی گئی اور گھر کے اندر ایک بار پھر خوشی کی نئی لہر دوڑ گئی۔

"روشو نے ایک نئے کامپلکس میں نیا لگژری اپارٹمنٹ بک کرایا۔ نئے فرنیچر وغیرہ کا آرڈر

دے دیا۔ قاضی صاحب نے فرحانہ کا کم و بیش تمام جہیز تیار کر رکھا تھا۔ خود فرحانہ کی ماں ہی اپنی زندگی میں بہت کچھ بنا گئی تھی جو کمی رہ گئی تھی وہ قاضی صاحب نے پوری کرنی شروع کر دی۔ فرحانہ کو بھی اس پروگرام میں شامل کیا کہ وہ شرمائے بغیر بلا تکلف بیان کرے کہ اسے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب پوری کریں گے۔

لیکن پھر ایک عجیب بات ہو گئی کہ فرحانہ ایک بار پھر بجھ گئی۔ پھر اس کے اوپر ایک خاموشی کا دور آ گیا۔ وہ ہوں ہاں سے زیادہ کوئی بات نہ کرتی اور ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہنے لگی قاضی صاحب یا روشو کوئی بات پوچھتے تو اتنی دیر سے اور بے معنی سا جواب دیتی جیسے بہت دور گئی ہو۔ اس کی اس پژمردہ کیفیت سے گھر کے اندر آئی ہوئی رونق پھر اجڑ گئی۔ اور قاضی صاحب اور روشو دونوں پریشان ہو گئے۔

"کیا بات ہے بیٹے۔۔۔" قاضی صاحب اسے اداس اور ویران دیکھ کر پوچھتے۔

"جی۔۔۔۔ جی کچھ نہیں۔۔۔۔۔" وہ کھوئی ہوئی کیفیت سے چونک کر جواب دیتی۔

"مجھے بھی کچھ بتاؤ گی۔۔۔۔۔۔ میں تمھارا جیون ساتھی بننے والا ہوں۔" روشو پوچھتا۔ "بولو کیا بات ہے کیوں اداس رہتی ہو۔۔۔۔۔۔ کیا میں پسند نہیں ہوں۔" وہ ازراہ مذاق کہتا۔ اور وہ روہانسی سی ہو کر چپ ہو جاتی پھر قاضی نے محسوس کیا کہ اس کی نقل و حرکت کچھ مشکوک سی ہوتی جا رہی ہے۔ انہوں نے کوئی بھی بات روشو سے چھپانا مناسب نہ سمجھا اور اسے اعتماد میں لے کر ایک دن کہنے لگے۔

"بیٹے کچھ دنوں سے یہ چپ چاپ اکیلی کہیں باہر جاتی ہے۔ اور کچھ وقت لگا کر واپس آتی ہے۔ کہاں جاتی ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔" ایک دن انہوں نے روشو سے کہا۔

قاضی صاحب! فرحانہ ایک باشعور لڑکی ہے اگر اکیلی چلی جاتی ہے تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔" روشو نے جواب دیا۔ "شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے اپنی مرضی سے کچھ ایسی چیزیں خرید رہی ہو جن کا ذکر آپ سے کرنا مناسب نہ سمجھتی ہو۔" اس نے دلیل پیش کی۔

"ایسی بات نہیں ہے بیٹے۔۔۔۔۔ وہ کچھ نہیں خرید رہی ہے۔ وہ کسی دکھ میں ہے۔" وہ خود ایک دکھ کے ساتھ بولنے۔ اور پھر اس دکھ کا انکشاف ان پر اس دن ہوا جب انہوں نے روشو کے ہمراہ ایک دن فرحانہ کا تعاقب کیا۔ وہ ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک میں گئی تھی جہاں اس نے کافی وقت لگایا۔ اگلے دن روشو اور قاضی صاحب معاملے کی نوعیت تک پہنچنے کے لئے علیحدگی میں لیڈی ڈاکٹر سے ملے تو لیڈی ڈاکٹر نے وضاحت کی۔

"جی میں اس کا چیک اپ کر رہی ہوں۔۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا "اس کا ٹیسٹ کیا تھا جس کی کل رپورٹ آگئی ہے۔۔ اور میں نے فرحانہ کو بتا دیا ہے۔۔

"ٹیسٹ ۔۔۔۔۔۔ قاضی صاحب بوکھلاہٹ میں بولے۔ "کیا تھا ٹیسٹ ۔۔۔۔۔ کیا رپورٹ آئی ہے۔ وہ حواس باختگی سے بولے۔

"آپ پریشان نہ ہوں ۔۔۔۔۔ "لیڈی ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ غالباً فرحانہ کے والد ہیں۔۔ اس نے استفسار کیا۔

"جی جی ۔۔۔۔۔۔ " قاضی صاحب نے سر ہلایا۔ روشو اس تمام صورت حال سے سخت پریشان ہو گیا تھا۔

"اور آپ شوہر ہوں گے ۔۔۔۔۔۔۔ وہ روشو سے مخاطب ہوئی روشو پر مزید گھبراہٹ طاری ہو گئی وہ کچھ بولنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر مزید گویا ہوئی۔ "بہر حال پریشان ہونے کی بات نہیں ہے رپورٹ پازیٹو ہے وہ ماں بننے والی ہے۔۔

"اوہ ۔۔۔۔۔۔ قاضی صاحب کے اندر ہی اندر ایک ہوک اٹھی لگتا تھا وہ گرنے لگے ہیں لیکن روشو نے انہیں گرتے گرتے سہارا دیا۔ حالانکہ ڈاکٹر سے خبر سن کر اس کی اپنی کیفیت بھی تقریباً گرنے والی ہو گئی تھی لیکن اس نے ہمت سے کام لیا اور قاضی صاحب کو حوصلہ دے کر گھر پہنچایا۔

اس شام قاضی صاحب کا گھر ایک قبرستان کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ جہاں ابھی ابھی قبر کھود کر انہیں اور ان کی بیٹی کو تمام خوشیوں، تمناؤں اور آرزؤں سمیت دفن کر دیا گیا ہو۔ یہ زندگی اور موت دونوں کی بیک وقت خبر تھی اور دونوں خبریں قاضی صاحب کے لئے موت کی خبریں بن گئی تھیں جیسے ان کے گھر کے اندر کے قبرستان میں دو تازہ قبریں کھدی ہوں اور جو پھول انہوں نے ڈولی اور سہرے کے لئے رکھے تھے وہ ان قبروں پر ڈال دئے ہوں۔

"اب کیا ہو گا روشن میاں ۔۔۔۔۔۔۔ اس ویران شام کو وہ نڈھال ہو کے روشو کے گلے لگے اور آبدیدہ ہو کر پوچھنے لگے۔

"کچھ نہیں ہو گا ابا جی ۔۔۔۔ ہمت سے کام لیں۔۔ روشو نے اپنے اندر کسی قسم کی منفی تبدیلی پیدا کئے بغیر ایک فرمانبردار فرزند کی طرح کہا۔ "ایک ظلم تھا جس سے ہم سب اور فرحانہ ایک ساتھ گزرے ہیں۔۔ اس نے قاضی صاحب کو تسلی دینے کے لہجے میں کہا۔ "اور جو اثرات نمودار ہوئے ہیں یہ سب اس ظلم کا ردعمل ہے جو ہم سب پر اور فرحانہ پر ہوا ہے۔ فرحانہ اکیلی کو ہم اس

اذیت سے نہیں گزرنے دیں گے۔ قاضی صاحب وہ اکیلی اذیت برداشت نہیں کرے گی۔ ہم فرحانہ کے ساتھ ہیں۔ کم از کم میں اس دکھ اس کرب میں فرحانہ کے ساتھ ہوں۔۔ وہ نہایت جذباتی انداز میں بولا۔ "جو ہونا تھا ہو گیا فرحانہ جو کچھ بھی ہے جیسی بھی ہے میری ہے اس کا غم میرا غم ہے۔ قاضی صاحب۔۔ روشو کی باتوں سے جیسے قاضی صاحب کے مردہ جسم میں پھر ایک روح سی پڑ گئی انہوں نے ایک ٹھنڈی لمبی اور زندگی آمیز سانس لے کر کہا۔

"تم بہت عظیم آدمی ہو روشن میاں۔۔۔ تم نے میرے سر سے پہاڑ اٹھا کے اپنے سر پر رکھ لیا ہے۔۔

"ایسی بات نہ سوچیں۔۔۔۔۔۔ روشو نے بہت اپنائیت سے کہا۔ "جب آپ نے باپ بن کر شفقت کا ہاتھ میرے سر پر رکھا ہے تو مجھے بھی بیٹا بن کر اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے دیں۔۔۔۔۔۔

وہ جذباتی انداز میں بولا اور اس نے اچانک محسوس کیا کہ فرحانہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ان کی باتیں سن رہی ہے لیکن روشو نے فرحانہ کی طرف توجہ نہیں دی اچانک قاضی صاحب سے مخاطب ہوا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں فرحانہ کو پکاروں۔۔۔۔۔۔"

"کیوں نہیں بیٹے۔۔۔۔۔۔ اس میں تکلف کیسا۔۔ پھر انہوں نے خود ہی فرحانہ کو آواز دی "فرحانہ بیٹے۔"

"جی ابا حضور۔۔۔۔۔۔ فرحانہ جو دروازے کی اوٹ ہی میں کھڑی تھی نہایت مغموم چہرے کے ساتھ سامنے آئی۔

"بیٹے روشن میاں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔۔ قاضی صاحب نے کہا۔

"جی۔۔۔۔ وہ روشو کی طرف مڑی لیکن چہرہ ویسا ہی سنجیدہ اداس اور مضمحل تھا۔

"دو گذارشات ہیں ہماری۔۔۔۔۔۔ روشو بالکل نارمل انداز میں اور کسی حد تک کھلنڈرے پن سے بولا۔ "ایک تو ہم بہت دیر سے چائے کے لئے بیٹھے ہیں۔۔

"میں ابھی لاتی ہوں۔۔۔۔۔۔ وہ پلٹی۔

"اوں ہوں۔۔۔۔۔۔۔ روشو نے روکا۔ "دوسری اور اہم گزارش تو ہم نے بیان ہی نہیں کی۔ فرحانہ سوالیہ انداز میں سننے کے لئے رکی تو روشو قاضی صاحب کی موجودگی کا احساس کئے بغیر بہت محبت اور وارفتگی سے بولا۔ "چائے پینے کی شرط یہ ہے کہ آپ ذرا سا مسکرا دیں۔۔۔۔۔۔

وہ چپ کھڑی رہی۔

"پلیز چائے کے لئے سر پھٹا جا رہا ہے مسکرا دیجئے ذرا سا بھئی ایسی بھی کیا کنجوسی ہے

مسکرادیں وہ قطعی طور پر قاضی صاحب کی موجودگی کو نظرانداز کر گیا تھا۔ "مسکرائیں گی نہیں تو ہم بغیر چائے پیئے جارہے ہیں۔" روشو نے حتمی طور پر کہا اور فرحانہ کے ہونٹوں پر نامعلوم سی مسکراہٹ تھی جسے روشو نے غنیمت سمجھا۔

"سویٹ گرل۔" روشو بولا۔ "ہر چند کہ یہ بہت تھوڑی مسکراہٹ ہے لیکن ہے مونا لیزا والی۔" قاضی صاحب روشو کی اس بات پر کھلکھلا کے ہنس پڑے لیکن یہ بھی جبری ہنسی تھی۔ اور فرحانہ چائے بنانے کے لئے اندر چلی گئی۔ چائے بنانے میں اس نے زیادہ وقت نہیں لگایا وہ فوراً چائے لے آئی لیکن اس کے چہرے کی سنجیدگی اور گمبھیرتا میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ چائے کے کپ سنٹرل ٹیبل پر رکھ کر فوراً اندر والے کمرے میں چلی گئی۔

آپ فکر نہ کریں دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کے جانے کے بعد روشو زیر لب قاضی صاحب سے مخاطب ہوئے۔ "بس آپ شادی کی تیاری جاری رکھیں۔ شادی کے بعد میں سب سنبھال لوں گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بیٹے.... ٹھیک کہتے ہو۔" وہ سرہلا کے بولے اور پھر کہنے لگے۔

"میں سوچتا ہوں کہ اگر سب لوگ تم جیسے ہو جائیں تو یہ دنیا ایک جنت بن جائے۔"

"نہیں نہیں قاضی صاحب۔ میں ایک بہت کمتر اور ادنیٰ سا آدمی ہوں۔" وہ انکساری سے بولا۔ تھوڑا بہت جو ادب سیکھا ہے وہ آپ کی بدولت........" وہ کہتے کہتے اچانک چپ ہو گیا۔ قاضی صاحب کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ نیچے سڑک پر کچھ معمول کے خلاف شور تھا۔

"یہ نیچے سڑک پر شور کیسا ہو رہا ہے۔" قاضی صاحب چونک کر بولے۔

"معلوم نہیں...... بہت زیادہ شور ہے۔" روشو نے کہا۔ اسے بھی [illegible] نے لگی

"فرحانہ..... فرحانہ بیٹے یہ کیسا شور ہے۔ نیچے ذرا دیکھو تو......"

"فرحانہ...... فرحانہ بیٹے......" قاضی صاحب نے اندر مڑ کر فرحانہ کو آوازیں دیں۔ لیکن کوئی جواب نہ آنے پر وہ تیزی سے اندر گئے۔ روشو بھی ان کے تعاقب میں گیا ایک ان دیکھا سا دھچکا دونوں نے محسوس کیا تھا۔ فرحانہ اندر کمرے میں نہیں تھی اور عقبی کھڑکی جو نیچے سڑک پر کھلتی تھی..... کھلی ہوئی تھی۔

"اوہ میرے خدا!......" قاضی صاحب کو دھڑکا لگا انہوں نے کھڑکی سے نیچے سڑک پر جھانکا۔ پھر روشو نے بھی دیکھا۔ سڑک پر ایک ہجوم تھا اور بے ہنگم شور بلند ہو رہا تھا۔ لوگ اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ فرحانہ چوتھی منزل سے نیچے کود گئی تھی..... اور اس کی لاش اوپر سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔

قاضی صاحب اور روشو جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے بے جان مجسموں کی طرح۔

(۲۳)

جب تک قاضی صاحب اور روشو نیچے سڑک پر پہنچے تو فرحانہ کی لاش ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ خون کے لوتھڑے کچھ تو اس کے آس پاس تھے کچھ دھبے برابر میں کھڑی ہوئی کسی نئی رنگ شدہ کار پر پڑے ہوئے تھے۔ فرحانہ کے کپڑے اسی طرح خون آلود ہو گئے تھے جیسے سفید کپڑوں پر سرخ چھینٹے لگے ہوں۔ لوگ دیکھ بھی رہے تھے لیکن یہ دلدوز منظر دیکھنے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے۔ قاضی صاحب بمشکل ایک نگاہ دیکھ کر روشو سے لپٹ گئے اور مجمع میں موجود کسی شخص نے فوراً اپنے کندھے سے چادر اٹھا کر لاش کو ڈھانپ دیا۔

پھر چند روز میں کیس بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ کچھ دن پولیس نے تفتیش کی۔ کچھ قاضی صاحب سے پوچھ گچھ کی۔ کچھ روشو سے دریافت کیا۔ اس لیڈی ڈاکٹر کا بیان لیا جس کے پاس فرحانہ چیک اپ کیلئے جاتی تھی۔ پھر پولیس کی اپنی فائلوں پر فرحانہ کے اغوا اس کے ساتھ کی گئی زیادتی اور واپسی کا پورا ریکارڈ موجود تھا۔ لہذا تھوڑی سی خانہ پری کے بعد واردات کو خالص خودکشی کا معاملہ قرار دے کر بات کو رفع دفع کر دیا گیا لیکن قاضی صاحب اور روشو کیلئے بات اتنی معمولی نہیں تھی کہ فائل بند ہونے کے ساتھ رفع دفع ہو جاتی۔ روشو نے فرحانہ کی خودکشی کے صدمے کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا اور قاضی صاحب تو بالکل ہی اپنے ہوش و حواس جیسے کھو بیٹھے تھے اور حواس باختگی کے عالم میں کبھی خود سے اور کبھی روشو سے بار بار یہ سوال پوچھتے۔

"فرحانہ کی خودکشی کا ذمہ دار کون ہے؟"

کیا وہ خود فرحانہ کی خودکشی کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی جانب سے تربیت میں ضرور کوئی ایسی کسر رہ گئی ہوگی کہ فرحانہ خودکشی پر مجبور ہو گئی۔ اگر وہ ڈکیتی کی خبر پولیس کو نہ دیتے تو پولیس مقابلے

میں ڈاکو نہ مارا جاتا اور ان کی دشمنی ڈاکوؤں سے نہ ہوتی۔ لیکن اس کے مجرم تو ڈاکو تھے جنہوں نے ان کی معصوم اور بے گناہ بیٹی کو اغوا کیا اور اس پر اتنے ظلم کئے کہ وہ چوتھی منزل سے کود جانے پر مجبور ہوئی۔

کیا اس خودکشی کا ذمہ دار روشو ہے ------" وہ کسی نہ کسی حوالے سے روشو کو بھی اس جرم میں شریک ٹھہراتے اور روشو خود بھی فرحانہ کی موت سے ایک احساس جرم کا شکار ہو کر بالکل بجھ سا گیا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ شاید وہ فرحانہ کی محبت کا جواب فرحانہ کی طرح محبت سے نہیں دے سکا ہے اور فرحانہ کے ساتھ پیش آنے والے سانحہ کے بعد اسے یقین نہیں دلا سکا کہ اس نے فرحانہ کو بہرحال قبول کرلیا ہے ورنہ فرحانہ کبھی اپنی جان نہ گنواتی۔ لیکن پھر وہ سوچتا تھا کہ اصل مجرم تو یہ ڈاکو ہیں اور ان ڈاکوؤں سے زیادہ مجرم یہ سوسائٹی ہے جس نے یہ ڈاکو اور حالات پیدا کئے ہیں جس نے لوگوں کو اپنے گھروں کی چار دیواری میں غیر محفوظ کر دیا ہے۔ لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اصل دکھ اور غم کی بات یہ تھی کہ فرحانہ جیسی شریف شائستہ اور معصوم لڑکی کی خودکشی نے پورے علاقے پر ایک لرزہ طاری کر دیا تھا اور قاضی صاحب کا گھر ایک اجڑا ہو ویران قبرستان بن گیا تھا۔

پھر اس دن اچانک ان کی اپنے لیٹر پیڈ کے اندر ایک خط پر نظر پڑی جو نہ جانے کیوں ہفتے بھر تک قاضی صاحب کی نگاہ سے اوجھل رہا تھا۔ خط بہت مختصر تھا جو بہت عجلت اور غالباً خودکشی سے چند لمحے قبل لکھا گیا تھا اور جو عجلت کی وجہ سے لیٹر پیڈ سے الگ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ لکھا تھا۔

" ابا جی ------ اب میں روشن صاحب کے قابل نہیں رہی وہ بہت عظیم انسان ہیں۔ لیکن میں عمر بھر احساس جرم کے ساتھ زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے معاف فرما دیں۔ میں نے آپ کو بہت دکھ دیئے ہیں۔ فرحانہ "۔

اسی روز شام کو حسب معمول جب روشو قاضی صاحب کے پاس تھوڑی دیر بیٹھنے اور ان کا دکھ بانٹنے کیلئے آیا تو قاضی صاحب نے خط روشو کی طرف بڑھا دیا اور خط پڑھتے ہوئے روشو کی آنکھ سے خون کی طرح گرم گرم آنسو ٹپکتے رہے۔

○

وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ پھر ایک دن قاضی صاحب اپنی تمام قوت ارادی کو یکجا کر کے بہت صبر و استقلال کے ساتھ روشو سے کہنے لگے۔

" روشن میاں۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ فرحانہ کی موت پر زندگی ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ زندگی کا

قائلہ ہمیشہ رواں دواں اور چلتا رہتا ہے۔ جو بات تم فرحانہ سے کہتے تھے نا وہی میں تم سے اب کہہ رہا ہوں کہ زندگی آگے کی طرف دیکھ کر گزارنی چاہئے۔ پیچھے کی طرف دیکھ کر نہیں۔ تمہاری زندگی اب آگے ہے۔ آگے دیکھو۔"

قاضی صاحب کے لہجے میں جرات اور ہمت تھی جس نے روشو کو بھی حوصلہ دیا اور پھر دوسرے تیسرے دن اچانک روشو نے دیکھا کہ قاضی صاحب کے گھر کا سامان ٹرک پر لادا جا رہا ہے اور وہ بھی روشو کو خدا حافظ کہہ کر کوچ کر گئے۔ کہاں گئے؟ روشو کو کچھ بتا کر نہیں گئے۔ انہوں نے درس گاہ بھی چھوڑ دی اور پھر روشو کے پڑوس میں قاضی صاحب والے فلیٹ کے اندر ایک نئی فیملی آ گئی۔ یہ ایک عورت اور دو بچیوں پر مشتمل تھی۔ عورت کا نام اللہ بچائی تھا۔ صحت مند جسم سرخ و سفید رنگت۔ سر سے پلو غائب رہتا اور آستین کہنیوں سے اوپر تک چڑھا کے رکھتی۔ سر کے بال بہت لمبے اور گھنیرے تھے جنہیں وہ کبھی جوڑے میں باندھ دیتی اور کبھی کھول کے چوٹی بنا لیتی۔ اس کی دو بچیاں تھیں ایک آٹھ سال کی اور دوسری تقریباً پانچ برس کی ہوگی۔ وہ سودا سلف لینے کیلئے بچیوں کو بازار بھیجتی اور ان کے دیر سویر سے آنے پر کبھی اندر کے برآمدے سے کبھی عقبی کھڑکی سے بہ آواز بلند سعدیہ اور عابدہ پکارتی۔ اس کی آواز میں بھی بڑی گونج اور سریلا پن تھا۔ وہ بے تکان بے تکلف اور بلا جھجھک بغیر اوڑھنی کے لپک جھپک کر باہر آتی۔ ادھر جھانکا، ادھر جھانکا۔ سعدیہ کو آواز دی۔ عابدہ کو پکارا اور اندر چلی گئی۔ ایک چھلاوا تھی جو ہر وقت مکان کے باہر دکھائی دینے والے حصے میں دکھائی دیتی تھی۔

اللہ بچائی کے آتے ہی اس کے بارے میں مختلف کہانیاں مشہور ہو گئیں۔ کسی نے کہا بیوہ ہے۔ کسی نے کہا میاں کو ہلاک کر کے آئی ہے۔ کسی نے کہا طلاق لیکر آئی ہے۔ ایک دہشت ناک کہانی یہ بھی تھی کہ کسی آشنا کو قتل کر کے بھاگی ہے۔ اس کے علاوہ محلے والوں نے اور بہت کچھ کہنا شروع کیا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن جو خاص بات ہوئی وہ یہ کہ محلے میں ہلچل مچ گئی اور بڑے بڑے مستقل مزاج شریف اور نظریں نیچی کر کے چلنے والے مردوں کی نگاہیں ترچھی اور قدم ٹیڑھے ہو گئے۔

اللہ بچائی کی محلے کے جس مرد کے ساتھ راستے میں مڈ بھیڑ ہوتی تو وہ بلا تکلف رک کر ٹھہر کر اس طرح سلام دعا کرتی جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

عورتوں نے جب محسوس کیا کہ اللہ بچائی کے آنے سے پورے محلے کے مردوں میں ہلچل پیدا ہو گئی تو پھر بیویوں نے کانا پھوسیاں شروع کر دیں اور پورے محلے میں چہ میگوئیاں ہونے

لگیں۔ لیکن روشو ان تمام چیزوں سے بے نیاز تھا۔ اسے اللہ بچائی کی تانک جھانک، شور پکار اور غمزہ وادا سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ صبح صبح اپنے شوروم چلا جاتا اور شام کو لوٹ آتا۔ مرد ہونے کے ناتے اس کی نگاہ بھی آتے جاتے کبھی کبھی اللہ بچائی پر پڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا کہ بلاشبہ اللہ بچائی ایک پرکشش مضبوط توانا اور مرد مار قسم کی دبنگ عورت ہے۔ جو مردوں سے اور عورتوں سے یکساں انداز میں بے تکلف طریقے سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ روشو کا مسئلہ نہیں تھا اور نہ اسے دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی عادت تھی۔ اس کا اپنا ذاتی غم بڑا شدید تھا۔ اس نے شاہینہ سے ناامید ہونے کے بعد پہلی مرتبہ کسی کیلئے اپنے دل کا دروازہ کھولا تھا۔ فرحانہ سے شادی کے ارادے کے ساتھ ہی اس نے ایک پوش علاقے میں لگژری اپارٹمنٹ بک کرالیا تھا اور ایڈوانس رقم بھی ادا کر دی تھی تاکہ جلد از جلد فلیٹ مکمل کر کے اس کے حوالے کر دیا جائے۔

اس نے ایک انگریزی میگزین سے امریکن کچن کا ڈیزائن نکال کے پہلے خود پسند کیا تھا۔ پھر فرحانہ کی منظوری لی۔ فرحانہ نے بہت اچھی تجاویز اور ردو بدل کے ساتھ کچن کا ڈیزائن منظور کیا تھا۔ لیکن سب کچھ تقدیر نے الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ فرحانہ اس طرح اچانک اور دھماکہ خیز انداز میں داغ مفارقت دے گئی کہ روشو کا اپنا وجود اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ اللہ بچائی کون ہے۔ کہاں سے آئی اور کیا کرتی ہے۔ آیا وہ بد چلن ہے یا نیک چلن ہے۔ محلے میں اس کی آمد سے کیوں ہلچل ہے اور مرد اور خصوصاً شوہر حضرات کیوں اکھاڑ پچھاڑ کے شکار ہو گئے ہیں اور راتوں رات کیوں اللہ بچائی موضوع سخن بن گئی ہے۔ ان باتوں سے روشو کا واسطہ نہیں تھا۔

اس کے اندر جو توڑ پھوڑ ہو گئی تھی وہ اسی سے نکلنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر شیو کرتا منہ ہاتھ دھو کے نہا کے ڈریس اپ ہو کے سیدھا شوروم چلا جاتا وہ صبح کا ناشتہ بھی شوروم میں ہی منگوا کے کرتا۔ دوپہر کا کھانا بھی ہوٹل سے شوروم میں آجاتا اور شام کو جب اس کے شوروم بند کرنے کا وقت ہوتا تو اس کے دو چار گہرے اور روز کے آنے والے دوست آجاتے اور سب مل کے لانگ ڈرائیو پر ساحل سمندر کی طرف نکل جاتے یا پھر کسی اچھے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے کھانا کھاتے دنیا بھر کی گپ ہانکی جاتی اور اس طرح وہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ باہر گزار کر رات بارہ بجے کے قریب یا اس کے بعد اپنے فلیٹ پر پہنچ جاتا۔ اسے اللہ بچائی کے گھر کے اندر کسی نہ کسی کمرے میں ہر وقت روشنی دکھائی دیتی۔ ہر چند کہ یہ روشنی اور رات جگا محلے والوں

کیلئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن روشو نے کبھی اس کا خاص نوٹس نہیں لیا۔ وہ تھکاہارا اپنے بیڈ روم میں پڑ کے بے خبر سو جاتا اور معمول کے مطابق سویرے گھر سے نکل جاتا۔ کیونکہ اب وہ جتنا زیادہ اس محلے میں اس بلڈنگ میں یا اس فلیٹ کے اندر رہتا اتنا ہی زیادہ اسے ہول اٹھتا اور گھر کی تنہائی اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔

○

پھر اچانک روشو کی زندگی میں ایک نیا انقلاب آگیا۔ ایسا انقلاب جس کی نہ تو اسے توقع تھی اور نہ اس کی توقع کے برعکس تھا۔ ایسی بات جو نہ ہونے والی تھی اور نہ انہونی تھی۔ ہوا یوں کہ فرحانہ کے اندوہناک موت کے بعد اس نے خود کو زیادہ سے زیادہ کام میں مصروف کر دیا تاکہ وہ انتشار کا شکار نہ ہو۔ اور اس کا دل بہلا رہے۔ شوروم کے اندر اپنے کیبن میں بیٹھے رہنے سے ایئر کنڈیشنگ کے باوجود اس کا دم گھٹنے لگتا تھا کبھی کوئی ٹیلیفون سن لیا۔ کوئی کھاتا کوئی کتاب دیکھ لی یا کوئی خاص کسٹمر آگیا جو سیلز مین کے بس کا نہ ہوا تو سیلز مین آ کے اندر پوچھ لیتا۔ کچھ مشورہ کرتا یا کبھی روشو خود کیبن سے باہر نکل کر گاہک سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتا لیکن گاڑیوں کے شوروم کوئی جنرل اسٹورز تو ہوتے نہیں ہیں۔ جہاں گاہکوں کا تانتا بندھا رہے۔ کبھی کبھار کوئی گاہک آگیا تو آگیا اور لگ گیا گاہک تو ایک ہی جھٹکے میں کما لیا نہیں تو سارا دن بیٹھے ہیں۔ لیکن روشو سے اب بیکار بیٹھا نہیں جا رہا تھا وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھتا تو اس کے دماغ میں ایک انتشار اور خلفشار پیدا ہونے لگتا لہٰذا فرحانہ کی موت کے بعد اس نے جین اور جیکٹ پہن لی اور شوروم کے باہر اپنے گیراج میں مصروف ہو گیا جو اس نے کچھ عرصہ سے مکمل طور پر اپنے میکنیکوں کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ ہر گاڑی کو خود چیک کرتا اور بڑی دلجمعی سے ایک کل وقتی میکنیک کی طرح ہمہ تن مصروف ہو کے گاڑی پر کام کرتا۔

اس دن اس نے ایک گاڑی کا بونٹ اٹھایا ہوا تھا اور انجن کھول کے بہت انہماک سے کام میں مصروف تھا۔ گاڑی کا نقص اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور اس کے دو تین کاریگر اس کے پاس چوکس کھڑے اس کے کام کرتے متحرک ہاتھوں کو بہت دلچسپی اور انہماک سے دیکھ رہے تھے اور روشو کی ہدایت کے مطابق ساتھ ساتھ مدد بھی کر رہے تھے۔ گاڑی کے آس پاس جہاں روشو کام میں مصروف تھا۔ وہاں مکمل خاموشی طاری تھی۔ کاریگر لڑکے بھی اگر کوئی بات کرتے تو بڑی خاموشی سرگوشی یا راز داری کے ساتھ صرف اوزار کے ٹکرانے کی آواز نمایاں تھی۔ اسی مکمل خاموشی کے دوران اچانک ایک نوجوان خاتون کا سایہ سا کار کے بونٹ کے اوپر آیا اور ایک

نہایت سریلی مدھم لیکن نقرئی سی آواز روشو کے کان میں سنائی دی۔ جیسے یہ کوئی مانوس یا سنی سنائی آواز ہو۔ اپنی بدلی ہوئی شکل و صورت میں۔

"سنیئے ......" سننے کے بعد اسنے تھوڑا سا وقفہ دیا۔ وہ روشو کے پاس کھڑے سب سے بڑے کاریگر لڑکے کموں سے مخاطب تھی جو بظاہر فرصت میں کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

"میری گاڑی راستے میں بند ہو گئی ہے۔ ذرا چل کے اسے دیکھ لیں"۔

تینوں کاریگر لڑکوں نے ایک ساتھ پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ روپ وضع قطع کپڑوں کی جدید فیشن کے مطابق تراش خراش، ریشم کی طرح کندھوں پر بکھرے ہوئے نرم و ملائم ہلکے بھورے بال، کاریگر لڑکے سخت متاثر ہوئے اور لڑکی کے حسن سے رعب کھا گئے لیکن فوراً اپنی توجہ ہٹا کے نظریں پھیریں اور بونٹ کے اندر روشو کے کام کرتے ہاتھوں پر مرکوز کر دیں۔ جیسے انہوں نے لڑکی کو دیکھا ہی نہ ہو۔

"آپ نے سنا میں نے کیا کہا۔ میری گاڑی بند ہو گئی ہے"۔ لڑکی دوبارہ بولی۔ روشو الجھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اسپانر پلاس کھلے ہوئے پرزے اور الجھی ہوئی تاریں تھیں اور سر اس نے بونٹ کے اندر دے رکھا تھا۔ تاہم کھلے ہوئے بونٹ کے اندر سے اس نے خاتون پر نگاہ ڈالی جو اسے مکمل تو دکھائی نہیں دے رہی تھیں تاہم بونٹ کے اندر سے اسے خاتون کا نچلا اور نصف دھڑ دکھائی دے رہا تھا۔ روشو نے کپڑوں کی تراش خراش اور سینڈل کے اندر سے جھلکنے والے سڈول پاؤں پر ایک نظر ڈالی لیکن بونٹ بند نہیں کیا۔

" ذرا استاد فارغ ہو جائیں......" کاریگر لڑکا کموں ملتجیانہ لہجے میں لڑکی سے بولا۔ ظاہر ہے کوئی کاریگر اس طرح روشو کو کام کرتا چھوڑ کر اس کی اجازت کے بغیر جا بھی نہیں سکتا تھا۔

" استاد کب فارغ ہوں گے۔" لڑکی غالباً عجلت اور کچھ پریشانی میں بھی تھی۔ اب اس بات کا جواب کوئی کاریگر تو نہیں دے سکتا تھا لیکن روشو نے یہ بات سنتے ہی جلدی سے گاڑی کے نٹ کس دیئے اور اور ہاتھ ڈسٹر سے پونچھ کر سر بونٹ سے باہر نکالا۔

" جی ......" روشو لڑکی کی طرف دیکھ کر بولا۔ لیکن لڑکی کو ایک نظر دیکھتے ہی جیسے چکرا گیا۔ صرف اس کا حسن خوبصورتی اور دلکشی ہی نہیں کچھ اور دیکھی بھالی بہت قریب کی چیزیں اسے دکھائی دیں جیسے کیمرے کے تیز فلیش، اسے تابڑ توڑ جھٹکوں کے ساتھ پیچھے کی طرف دھکیلنے لگے۔ اسے اوپر نیچے دھچکے پہ دھچکے لگے۔

" وہ جی........" لڑکی بھی روشو کو دیکھ کر جیسے جھٹکا کھا گئی۔ اور پوری بات کہتے کہتے

رک گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے روشو نے اسے دیکھ کر جھٹکا سا محسوس کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے نظریں نہیں دو بجلیاں آپس میں ٹکرا رہی ہوں۔ جیسے یادوں کی چنگاریاں یادوں کے شعلے دونوں جانب سے نکل کر ایک دوسرے سے لپٹ کر گڈ مڈ ہو گئے ہوں۔

"شاہینہ۔۔۔۔۔"

"روشو۔۔۔۔۔۔"

دونوں جانب سے بیک وقت اور بے اختیار آواز نکلی۔ اور اس کے بعد وہ بھول گیا کہ اس کے ہاتھ اور کپڑے گریس اور موبل آئل سے اَٹے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی بھول گیا کہ وہ تنہا اور کسی جزیرے میں نہیں ہے۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کسی موٹر پر کام کر رہا تھا اور اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کے تین چار کاریگر لڑکے اس کے ساتھ موجود ہیں۔ اور شاہینہ بھی سب کچھ بھول گئی کہ وہ اب کہاں اور کس جگہ کھڑی ہے۔ ایک مقناطیسی کشش اور قوت دونوں طرف حرکت میں آگئی۔ ایک خواب حقیقت بن گیا۔ خوابوں کے جزیروں میں برسوں سے بچھڑے ہوئے دو بچپن کے ساتھیوں دو ہمجولیوں کا ایک موٹر کار کی خرابی سے ملاپ کا بہانہ بن گیا جیسے افق کے دو کنارے آپس میں مل گئے

O

انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ سرِ راہ کھڑے ہیں لہٰذا چند ہی لمحوں کے بعد وہ دونوں شو روم کے اندر تھے۔ وہ روشو کے کیبن میں روشو کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی اور ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر دونوں کی نظریں بھر نہیں رہی تھیں۔

"او روشو۔ روشو، روشو۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ تم ہو"۔ وہ پُر تجسس لہجے میں بولی۔

"اور کیا میں نے یقین کر لیا ہے۔" روشو ایک طلسماتی کیفیت میں بولا۔ "نہیں شاہینہ۔۔۔۔ مجھے بھی یقین نہیں۔ نہ تم سے بچھڑنے کا یقین تھا نہ تم سے ملنے کا یقین آرہا ہے"۔

"لیکن یہ سب کچھ ہو گیا ہے روشو۔۔۔۔۔۔" وہ جذبات سے پُر لہجے میں بولی۔ "تم نے مجھے چھوڑ دیا تھا اور میں نے تمہیں۔۔۔۔۔۔"

"پالیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔" روشو جملہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "مطلب یہ ہے کہ ہم مل گئے ہیں شاہینہ۔ کبھی نہ بچھڑنے کیلئے ہم مل گئے ہیں"۔

"پتہ نہیں۔۔۔۔۔" وہ غیر یقینی لہجے میں بولی۔ "بہت وقت گزر گیا ہے۔ پتہ نہیں مجھ پر کیا

بیا بیتی۔۔۔۔۔۔۔۔ تم پر کیا کیا بیت گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں شاہینہ جو وقت میں نے تمہارے بغیر گزارا ہے"۔ وہ بہت ہی جذباتی ہو کر بولا۔ "میں نے ہر سانس میں تمہاری خوشبو کو محسوس کیا۔ ہر لمحہ میں نے تمہاری یاد میں گزارا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں اور صرف تمہارے بارے میں سچائی اور خلوص کے ساتھ سوچا ہے۔ میں نے تمہارا انتظار کیا ہے شاہینہ"۔

"یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے روشو۔۔۔۔۔۔"شاہینہ بھی ایک طلسماتی کیفیت میں تھی اس نے حیرت سے استفسار کیا۔ "کیا تم نے پوری زندگی ایسی خوبصورت جوانی صرف میرے انتظار میں گزاری ہے"۔ وہ ازراہ حیرت بولی۔ "تمام عمر صرف میرا انتظار کیا ہے تم نے؟"

"ہاں!" روشو بولا۔

تمام عمر ترا انتظار تم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

روشو شاہینہ کے استفسار پر بے اختیار یہ شعر پڑھ گیا جو اس کے ادبی ذوق کی بھی نشاندہی کرتا تھا جو اس نے قاضی صاحب کی مختصر سی رہنمائی میں پایا تھا اور شعر میں روشو کی زندگی میں بے ضرر طریقے سے آنے والی خواتین کی ایک ہلکی سی جھلک بھی تھی۔

"ماشاءاللہ۔۔۔۔۔۔"شاہینہ متاثر ہو کر بولی۔ "لگتا ہے خوب پڑھ لکھ لیا ہے"۔

"تھوڑا بہت۔۔۔۔۔"روشو نے جواب دیا۔ "تم نے نصیحت جو کی تھی پڑھنے کی"۔

"یہ بتاؤ کیسی گزری۔۔۔۔"اس نے دیدے پھاڑ کے روشو کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایسی بھی نہیں گزری کہ اتنی جلدی سنادوں"۔ وہ بے اختیار بولا اور جی بھر کے شاہینہ کو دیکھنے لگا۔ "اف میرے خدایا۔ ویسی ہی خوبصورت ہو تم۔۔۔۔۔۔۔"

اور تم۔۔۔۔"شاہینہ بولی۔ "تم اور زیادہ خوبصورت ہو گئے ہو"۔

"اب لڑنا نہیں روشو۔۔۔۔"وہ دونوں ایک لمحے کیلئے ماضی میں کھو گئے۔ جب دونوں اس بات پر لڑ پڑے تھے۔ آئینے میں وہ دونوں ایک دوسرے کی خوبصورت کا موازنہ کر رہے تھے اور جھگڑا اس بات پر ہوا تھا کہ شاہینہ روشو کو زیادہ خوبصورت قرار دے رہی تھی اور روشو کے نزدیک شاہینہ زیادہ خوبصورت تھی اور روشو نے بے دھیانی میں کہہ دیا تھا۔ "بھلا نوکر مالک سے زیادہ خوبصورت کیسے ہو سکتا ہے اور اس بات پر شاہینہ غصے سے بے قابو ہو کر روشو پر برس پڑی تھی اور

بڑی مشکل سے روشو نے اسے راضی کیا تھا۔
"یاد ہے وہ لڑائی روشو۔۔۔۔" شاہینہ نے پوچھا۔
"میں بھولا ہی کیا ہوں شاہینہ۔۔۔۔" روشو نے بے ساختہ کہا۔ "تمہارے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ میرے ذہن پر نقش ہو کے رہ گیا ہے"۔
"کیوں روشو کیوں۔ تم وہاں سے فرار کیوں ہوئے تھے۔ کیوں چھوڑ دیا تھا تم نے مجھے۔" وہ تڑپ کر بولی۔
"اب ہم مل گئے ہیں شاہینہ۔۔۔۔۔" روشو نے کہا۔ "ان باتوں کیلئے بہت وقت ہے ہمارے پاس۔ شکوے شکایت سب کچھ ہوگا۔" وہ ابھی تک ایک جادوئی کیفیت سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔ "پہلے اچھی طرح دیکھ لیں ایک دوسرے کو۔ یقین کریں کہ ہم دونوں پھر مل گئے ہیں"۔
"ہاں روشو یہ واقعی بڑی غیر یقینی سی اور بڑی ڈرامائی بات ہے"۔ اس نے پہلی مرتبہ سر اٹھا کر روشو کے علاوہ ادھر ادھر شیشوں کے اس پار شوروم کی چھت دیواروں اور شوروم کے اندر کھڑی کاروں کو دیکھا۔
"کس کا ہے یہ شوروم۔۔۔" شاہینہ نے بر سبیل تذکرہ پوچھا۔
"یہ تمہارا شوروم ہے شاہینہ۔۔۔۔۔" وہ وارفتگی کے عالم میں بولا اور پھر دراز سے ایک کارڈ نکال کر شاہینہ کو پیش کیا۔
"روشن آٹوز۔۔۔۔۔" شاہینہ نے بہت فخر و انبساط سے کارڈ پڑھا اور پھر چہک کر بولی۔ "اوہ، روشو، روشو، روشو۔ تم نے بہت ترقی کرلی ہے روشو۔۔۔۔ مجھے یقین تھا تم ایک دن بہت بڑے آدمی بنو گے"۔
"نہیں شاہینہ۔۔۔۔۔" روشو نے فوراً تردید کرتے ہوئے کہا۔ "میں بڑا آدمی نہیں بنا ہوں ابھی۔ کاروں کے شوروم کا مالک بن جانا کوئی بڑا آدمی بن جانا نہیں ہے۔ بڑا آدمی بننے کا خواب تو میں نے تمہارے ساتھ مل کر دیکھا تھا یاد ہے۔۔۔۔" وہ پھر ماضی کے دھندلکوں میں کھو سا گیا "جب امریکہ کا صدر اقتدار سنبھال رہا تھا اور ہم دونوں ٹیلیویژن پر یہ تقریب دیکھ رہے تھے۔۔۔۔۔
"ہونہہ۔۔۔۔۔" شاہینہ کے ہونٹوں پر بھی حسین مسکراہٹ کے ذریعے ماضی کی جھلک نمایاں ہوگئی۔ "کل کی بات ہے جیسے"۔
"مجھے آج کی بات لگتی ہے"۔ اس نے بے پناہ اپنائیت سے نظریں شاہینہ کے دلکش

چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔
"پتہ ہے میں نے اس وقت اپنے آپ کو امریکہ کے صدر اور تمہیں فرسٹ لیڈی کے روپ میں دیکھا تھا"۔
- کتنے خوبصورت دن تھے وہ...... "شاہینہ ماضی کے خوبصورت جزیروں میں کھو سی گئی
"آنے والے دن اور زیادہ خوبصورت ہوں گے شاہینہ...... "وہ پر امید لہجے میں بولا۔
"یقیناً ...... "شاہینہ چونک کر ماضی کے جزیروں سے باہر نکلی۔ پھر ہڑبڑا کر کہنے لگی۔
"کیا ہم ساری باتیں اس ایک ہی ملاقات میں ختم کر دیں گے۔"
"خدا نہ کرے .... "روشو ٹھٹھکا۔" ہم کوئی ایک ہی بار ملنے کیلئے تو نہیں ملے ہیں۔ باتیں تو اتنی ہیں ہمارے پاس کہ پوری زندگی ختم نہیں ہونگی۔"
"لیکن وہ بات تو میں بھول ہی گئی جو بات ہماری ملاقات کا بہانہ بنی ہے۔ "شاہینہ چونک کر بولی۔"
"تمہاری کار.....؟"روشو بھی ماضی کے جھروکوں سے باہر نکل کر بولا۔"کیا ہوا ہے"۔
پتہ نہیں۔ چلتے چلتے بند ہو گئی ہے"۔ وہ بے نیازی سے بولی۔"اب میں میکینک تو ہوں نہیں کہ معلوم کرتی کیا ہوا ہے۔ ایسا کرو کسی میکینک کو میرے ساتھ کر دو....."
"ایک ادنیٰ سا میکینک میں بھی ہوں..... "روشو شاہینہ کی بات کاٹ کر بولا۔
"تم تو استاد ہو۔"اس نے برجستہ جواب دیا اور دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔ اس دوران ٹیلیفون کی گھنٹی بجی لیکن روشو نے انٹر کام پر اپنے بندے سے کہہ دیا کہ وہ خود ہی ٹیلیفون سنے اور خود ہی نمٹ لے۔
"پتہ ہے میں نے کیا سوچا تھا..... "شاہینہ کچھ سوچ کر بولی۔" میں نے سوچا تھا کہ تم کسی کالج کے کسی جامعہ کے استاد بن جاؤ گے۔"
"اور میں گاڑیوں کا استاد بن گیا ہوں۔"اس کے لہجے میں تاسف نہیں تھا۔" میرا خیال ہے میرے موجودہ پروفیشن سے تمہیں بھی خوش ہونا چاہئے۔"
"تمہیں دیکھ میں صرف خوش ہی نہیں ہوئی میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا ہے روشو۔ تم ایک سیلف میڈ آدمی ہو۔"شاہینہ افتخار سے بولی۔" تمہارے کپڑوں پر لگے ہوئے موبل آئل اور گریس کے دھبے تمہاری عظمت کا نشان ہیں روشو۔ تم نے کچھ کر کے دکھایا ہے۔"
"کچھ بھی نہیں..... "روشو انکساری سے بولا۔" ابھی ہم نے بہت کچھ کرنا ہے میں نے

اور تم نے مل کر میں نے اب تک محنت ہی کی ہے بزنس ہی کیا ہے لیکن کوئی بڑا کام شاید اسی لئے نہیں کیا ہے کہ مجھے تمھارے جیسے ایک گائیڈ ایک لائف پارٹنر کا انتظار تھا"۔ اس نے پر عزم لہجے میں کہا اب تم آگئی ہو تو اب سب کچھ ہو جائیگا اب وہ خواب پورا ہو گا جسے پورا کرنے کیلئے میں فقیروں کی بستی۔۔۔۔۔"

"ہش ش ش ش۔۔۔۔۔" فقیروں کے نام پر شاہینہ نے آہستہ سے اپنی انگلیوں کی پوروں کے ساتھ روشو کے ہونٹوں کو دبا دیا۔" بار بار اتنا پیچھے مت جاؤ۔۔۔۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔" زندگی کوئی جیومیٹری نہیں ہے روشو کہ آدمی جس طرح اسے فرض کرلے اسی طرح ثابت بھی کرلے۔" وہ فلسفیانہ لہجے میں کہنے لگی۔" زندگی میں آدمی سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔ نقشہ آدمی ایک بناتا ہے بلڈنگ دوسری تعمیر ہوتی ہے تم نے کیا سوچا تھا کہ کل تم کاروں کے میکینک یا شوروم کے مالک بنو گے۔ تم تو۔۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔۔۔۔" روشو بات کاٹ کر بولا یہ سب کچھ میں نے نہیں سوچا تھا لیکن ابھی تو میں راستے میں ہوں۔ میرا سفر تو ادھورا ہے ابھی۔۔۔۔"

"کیا ہم چل کر پہلے اپنی کار نہ لے آئیں۔۔۔۔۔" شاہینہ ہنسی اور موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"ضرور روشو بھی ہنسا۔" اصل کام تو ہم بار بار بھول رہے ہیں۔ کس جگہ ہے کار"۔

" سپرہائی وے پر۔۔۔۔" شاہینہ نے کہا اور پھر روشو نے اپنی کار نکالی اور تھوڑی دیر بعد شاہینہ روشو کے ساتھ اس کی کار میں سپرہائی وے کی طرف جارہی تھی اور دونوں کو یہ عجیب اور پراسرار قسم کا طلسماتی سفر لگ رہا تھا۔ دونوں چپ چاپ اور خاموش ہو گئے تھے۔ دونوں کی نظریں لمبے کھلے سپرہائی وے پر تھیں بس کبھی کبھار دونوں چونک کر اچانک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور پھر سڑک کی طرف دیکھنے لگتے۔

"شاہینہ۔۔۔۔" اس نے اچانک پکارا۔

"ہونہہ۔۔۔۔" شاہینہ بھی دھیرے سے جیسے خواب میں بولی۔

"ایک کام کرو۔۔۔۔۔"

"کیا شاہینہ نے پوچھا۔

"یہ لائٹر پکڑو۔۔۔۔۔" اس نے کار کا لائٹر گرم کرکے شاہینہ کو تھمایا۔" اب اسے میرے بازو پر لگاؤ"۔ اس نے کلائی شاہینہ کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"یقیناً تم خواب نہیں دیکھ رہے ہو روشو۔" شاہینہ کسی گہری سوچ میں ڈوب کر بولی۔" یہ لمحہ

اس وقت جو کچھ بھی ہے یہ ایک حقیقت ہے روشو۔" اور یہ کہہ کر اس نے سلگتا ہوا لائٹر ایک لمحے کیلئے روشو کی کلائی سے لگا دیا۔ نا معلوم انداز میں۔

"اوہ۔۔۔۔" اس نے ہلکی سی جلن محسوس کی۔

"ہے نا حقیقت۔۔۔" شاہینہ نے کہا۔

"ہوں۔۔۔۔" روشو نے کہا "سو فیصد۔" اور شاہینہ وفور جذبات سے آبدیدہ ہو گئی۔

"میری کار وہ کھڑی ہے"۔ اس نے اچانک ویران سی سڑک کے کنارے ایک کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور آنسو پونچھ لئے۔ روشو نے اپنی کار شاہینہ کی کار کے قریب روک دی۔

"تم تنہا تھیں کیا۔۔۔" روشو نے محل وقوع کی ویرانی دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔ میں حیدر آباد سے آ رہی ہوں۔"

"تنہا۔۔۔" روشو نے دوبارہ پوچھا۔

"ظاہر ہے شاہینہ نے کہا اور پھر فوراً ہی بولی۔ "اب مزید سوال کرنے سے پہلے کار کو دیکھو کیا ہوا ہے اسے۔"

"اس کے ایکسی لیٹر کی کیبل ٹوٹ گئی ہے۔" روشو نے کار کا مختصر سا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"اب کیا ہو گا۔" شاہینہ قدرے تشویش سے بولی۔

"کچھ نہ کچھ ہو جائیگا۔ گھبرا کیوں رہی ہوں۔" روشو ہنسا اور اپنی ڈکی سے تار کا ایک ٹکڑا نکال کے شاہینہ کے ایکسی لیٹر کی تار میں عارضی جوڑ لگا دیا اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔

"یہ سارا عارضی انتظام ہے۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"مستقل کب ہو گا۔" شاہینہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"اس کا انحصار تم پر ہے۔" روشو نے بھی معنی خیز انداز میں جواب دیا اور پھر فوراً ہی بات بدلتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب ہے تمہیں اس کی پوری ایکسی لیٹر کیبل بدلنی ہوگی۔ ورنہ دوبارہ کسی بھی وقت ٹوٹ جائیگی۔"

"تو پھر بدل دو۔ یہ اب تمہارے ہاتھ کا کھیل ہے۔" شاہینہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی۔

"زہے نصیب۔۔۔۔۔" اس نے قاضی صاحب کی تربیت میں حاصل کئے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر اپنی گاڑی کی چابی شاہینہ کے حوالے کرتے ہوئے بولا تم میری گاڑی چلاؤ۔۔۔۔ میں اسے

دھیرے دھیرے گیرج میں پہنچاتا ہوں۔ میرے پیچھے پیچھے آنا۔"
شاہینہ نے روشو کی گاڑی اسٹارٹ کی اور دھیرے دھیرے روشو کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے روشو کے گیرج تک پہنچ گئی۔ کاریگر لڑکے جنہوں نے روشو اور شاہینہ کا ڈرامائی ملاپ دیکھا تھا ایک بار پھر دونوں کو دیکھ کر دم بخود ہو گئے لیکن اس طرح نظریں جھکائے کام میں مصروف رہے جیسے انہوں نے نہ کچھ دیکھا نہ سمجھا ہو۔
"او کموں ادھر آ۔۔۔" روشو نے ایک کاریگر لڑکے کو بلایا اور پانچ سو کا نوٹ اسے دے کر کہنے لگا۔ "اس ٹویوٹا کیلئے ایکسی لیٹر کی ایک نئی کیبل لے آ اور فٹ کر دے۔ شاباش بیٹے جلدی جا۔"
"استاد کوئی گاڑی لے جاؤں کیبل لینے کے لئے۔" شاگرد نے پوچھا۔
"لے جا بیٹے۔ وہ پک اپ لے جا پر احتیاط سے جانا۔" اس نے کسی گاہک کی آئی ہوئی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"کتنا وقت لگے گا۔" شاہینہ نے پوچھا اور گھڑی دیکھنے لگی۔
"میں نے پوری زندگی تمہارا انتظار کیا ہے تھوڑا سا انتظار تمہیں بھی کرنا ہوگا۔" روشو فلسفیانہ لہجے میں بولا پھر خود ہی کہنے لگا۔ "غالباً ایک گھنٹہ تو لگ ہی جائیگا جب تک ہم کیوں نہ کچھ دیر کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے کافی پی لیں۔"
"ضرور" روشو کی پیشکش پر وہ بہت خوش ہوئی۔
"میں کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔" روشو تیزی سے اندر شوروم میں گیا اور منہ ہاتھ دھو کے نئی جین اور جیکٹ پہن کے جب باہر نکلا تو لگتا تھا کہ کوئی اطالوی ٹورسٹ آگیا ہے۔
تھوڑی دیر بعد دونوں ایک بہت اچھے پوش ریسٹورنٹ کے کارنر میں بیٹھے تھے۔ ریسٹورنٹ کے اسپیکرز پر ہلکی ہلکی مسحور کن دھنوں نے ماحول کو انتہائی رومان پرور بنا دیا تھا۔ اس وقت ریسٹورنٹ میں خاموشی اور تنہائی تھی روشو اور شاہینہ ہی کی طرح دو تین مزید جوڑے ادھر ادھر دور دور فاصلوں پر سر جوڑے بیٹھے تھے شاہینہ اور روشو بھی اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے جیسے وہ ریسٹورنٹ میں نہیں کسی جادو کے قالین پر بیٹھے پریوں کے دیس میں اڑ رہے ہوں۔
"کچھ سناؤ اپنے بارے میں کچھ سناؤ۔" شاہینہ رومان پرور فضا اور ماحول سے باہر نکلتے ہوئے کافی کا ایک پر لطف گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔
"کہاں سے شروع کروں۔۔۔۔" روشو نے پوچھا۔
"اس دن سے جب میں نے تمہارے پاؤں میں اپنی محبت کی فولادی زنجیریں ڈال کر تمہیں

روکنے کی کوشش کی تھی۔" شاہینہ نے جذبات کی شدت سے کہا۔" لیکن تم نے تنکوں کی طرح ان زنجیروں کو توڑ دیا اور مجھے روتا تڑپتا چھوڑ کر آ گئے تھے۔ میرا کوئی آنسو تمہارے دل کو موم نہیں کر سکا تھا۔۔۔۔۔" شاہینہ کے لہجے میں طنز شکایت اور شکوے کی بھٹی میں بجھے ہوئے تیر تھے۔" اس دن سے سناؤ۔"

" لیکن اس سے پہلے بھی مجھ پر بہت کچھ بیت گئی تھی۔ جیل کے اندر۔" روشو کے لہجے میں بھی شکایت تھی۔

" مجھے احساس ہے روشو۔ وہ جیل تمہیں اس گھر ہی سے ملی تھی۔" شاہینہ اعترافاً بولی۔

" نہیں ایسی بات نہیں ہے۔" روشو نے کہا۔" مجھے اس گھر سے صرف جیل ہی نہیں ملی اس گھر نے مجھے پناہ بھی دی تھی۔ اس گھر میں پہلی دفعہ مجھے پتہ چلا کہ محبت کس کو کہتے ہیں۔۔۔۔"

وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا اور پھر اس کی آنکھ سے شبنمی قطرے نیکے اور بھیگے ہوئے لہجے میں بولا۔

" اس گھر کے اندر میں نے پہلی دفعہ محبت کی خوبصورت ننھی سی دیوی کا مجسمہ دیکھا اور وہ مجسمہ تم ہو شاہینہ اس گھر سے نکلنے کے بعد میں نے پوری زندگی تمہاری محبت کی یادوں کے سائے میں گزاری ہے۔" وہ بولتے بولتے پھر چپ ہوا اور اپنی آواز اپنے آنسو اور جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

" جب تمہیں کوٹھی کے باہر آبدیدہ چھوڑ کر میں نکلا تو میں ایک کٹی پتنگ کی طرح تھا آگے چوک سے میں نے آخری اسٹاپ کی بس پکڑ لی۔۔۔۔۔۔۔"

اور پھر یوں روشو نے جیسے جیسے اسے اپنے واقعات اور حادثات یاد آتے گئے وہ سناتا گیا۔

اس کا گیراج میں آنا استاد سے ملاقات، کام کا سیکھنا، بانکی کی شفقت ممتا اور محبت۔ راحیلہ کا دام محبت۔ استاد اور بانکی کی اموات پھر قاضی صاحب کا زندگی میں آنا۔ فرحانہ کی زندگی میں دلچسپی لینا اس کا اغوا اور اندوہناک انجام۔ یہ ساری باتیں جس طرح ترتیب سے روشو کو یاد آتی گئیں وہ سناتا چلا گیا اور شاہینہ بہت متاثر ہوئی۔ خاص کر فرحانہ کے دردناک انجام پر وہ بہت آبدیدہ ہو گئی۔

" فرحانہ سے ملاقات کے بعد میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ شادی کے بارے میں سوچا تھا"۔ روشو اپنی پوری داستان سنانے کے بعد سنجیدہ لہجے میں بولا۔" شاید میں تمہاری طرف سے مایوس ہو گیا تھا۔ مجھے مکمل طور پر یقین ہو گیا تھا کہ اب تم کبھی نہیں مل سکو گی۔ اس لئے میں نے فرحانہ سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہیں تھا فرحانہ کا جو دردناک انجام ہوا اس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ لیکن اب تم دوبارہ مل گئی ہو تو میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔" کہتے کہتے اس کا حلق خشک ہوا اس نے تھوک نگل کر حلق کو تر کیا اور پھر کہنے لگا کہ خدائی ذات سے بھی

نا امید نہیں ہونا چاہئے اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کے کام صرف اللہ ہی جانتا ہے اور بعض اوقات کچھ ایسے حادثات بھی جن کے اندر ایک طرف بے انتہا دکھ اور صدمہ ہوتا ہے وہاں خدا کی طرف سے کچھ مصلحت بھی ہوتی ہے جس کا انسان کو علم نہیں ہوتا۔" وہ رک کر قدرے تامل اور کسی حد تک ندامت سے بولا۔ فرحانہ کا سانحہ اپنی جگہ کتنا ہی اندوہناک سہی لیکن خدا کو میری اس کی شادی منظور نہیں تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ نے اس دکھ کے دوسرے رخ میں تمہیں اور مجھے ملوانا تھا اللہ نے کام اللہ ہی جانتا ہے"۔

"ہاں روشو۔۔۔۔ اللہ کے کام اللہ ہی جانتا ہے۔" وہ بھی روشو کی باتیں سنتے سنتے بہت جذباتی ہو گئی تھی اور اس کی آنکھ سے بھی گرم گرم آنسو ٹپک پڑے تھے۔ کافی دونوں کے کپ میں پڑے پڑے ٹھنڈی برف ہو گئی تھی۔ دونوں نے تھوڑی دیر بعد اپنی گفتگو کو توڑا۔ ادھر ادھر ریسٹورنٹ کے ہال میں نگاہ دوڑائی جہاں اب ان کے سوا کوئی اور موجود نہیں تھا اور دور کونے میں کھڑا باوردی ویٹر ایک فاصلہ قائم کئے ان کی جانب ایسے دیکھ رہا تھا جیسے دیکھ نہ رہا ہو۔

"ویٹر۔۔۔۔۔" روشو نے ٹیبل بجا کر ویٹر کو پکارا۔ "کافی اور لے آؤ" ویٹر کے آنے پر روشو نے کافی کا آرڈر دیا اور پھر جب کافی آگئی تو شاہینہ کپ کے اندر کافی ڈال کے اسے چمچ سے خوب پھینٹنے لگ گئی۔ لیکن دونوں ابھی تک ہپناٹائز کیفیت کے اندر موجود تھے۔ بظاہر شاہینہ کافی بنا رہی تھی لیکن اندر ہی اندر نجانے وہ کہاں پہنچی ہوئی تھی۔

"اپنے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا۔" روشو شاہینہ کے بارے میں کچھ جاننے کیلئے بہت جستجو میں تھا۔ "کوٹھی کیا ہوئی چوہدری صاحب ساجدہ بیگم، تم، سب لوگ کہاں۔ چلے گئے تھے کچھ سناؤ۔"

"کہاں سے سناؤں۔۔۔۔" شاہینہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بہت بکھری ہوئی اور بے ترتیب داستان ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے۔"

"ٹکڑے ٹکڑے ہی سناؤ۔" روشو نے کہا۔

"شمسہ جی کا حشر تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ جب تم جیل میں تھے تو وہ اپنے انجام کو پہنچیں" شاہینہ نے سنانا شروع کیا۔ "اس کے بعد چوہدری صاحب زیادہ دن زندہ نہیں رہے ایک دن اچانک ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور ان کے مرنے کے بعد ان کے بزنس، روپیہ، پیسے پر بندر بانٹ پڑ گئی پتہ نہیں کہاں کہاں سے لوگ وارث بن کر آنے۔ جن میں میرے ماموں بھی تھے اور امی۔۔۔۔"

وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی جیسے امی کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کر رہی ہو۔

"امی کا رول بڑا عجیب ہو گیا تھا۔" وہ قدرے دکھ سے بولی۔ "کوٹھی انہوں نے بیچ دی اور اپنے حصے کا پیسہ بینک میں رکھوا کر ایک لگژری اپارٹمنٹ لے لیا جس میں ہم شفٹ ہو گئے ابا جی جیسے بھی تھے ان کی گھر کے اندر ایک دہشت تھی اور کوئی ایرا غیرا کوٹھی کے اندر دم نہیں مار سکتا تھا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" روشو نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ابا جی کے بعد گھر ایک سرائے بن گیا۔ میری اسی اپارٹمنٹ میں نشوونما ہوئی وہیں میں بڑی ہوئی ہوں اسی فلیٹ کے اندر میں نے اپنا گریجویشن مکمل کیا پھر میرے اور امی کے درمیان شدید قسم کے اختلافات ہو گئے۔"

"کیوں۔۔۔۔" روشو نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو جب ایک بیٹی گھر میں جوان ہو تو پھر ماں کے کیلئے سب سے بڑی فکر اس کی بیٹی کا گھر بسانا ہوتا ہے۔" شاہینہ نے انتہائی سنجیدگی سے دنیاواری کے انداز میں کہا۔

"وہ تو درست ہے۔۔۔۔" روشو نے اتفاق کیا۔

"لیکن میری ماں نے ایسا نہیں کیا اس نے ایک دن ایک انتہائی نامعقول قسم کے آدمی سے شادی کر لی۔۔۔" وہ دکھ کے ساتھ بولی۔ "اس آدمی کا اپنا کوئی کاروبار نہیں تھا وہ امی کے پیسوں پر گزارہ کر رہا تھا۔"

"مائی گاڈ۔۔۔۔۔" روشو دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "وہ ایسی تھیں تو نہیں بن گئی ہونگی۔ اب کہاں ہیں امی؟"۔ روشو نے قدرے توقف سے پوچھا۔

"اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا شفٹ ہو گئی ہیں۔" شاہینہ نے کہا۔ "اور سنا ہے شاید طلاق بھی ہو گئی ہے۔"

"تچ تچ۔۔۔۔۔۔" روشو نے اظہار افسوس کیا۔ "اپنے بارے میں بتاؤ۔" روشو قدرے توقف سے بولا۔ "تم کہاں ہو آج کل۔"

"میں اسی اپارٹمنٹ میں رہتی ہوں۔" شاہینہ نے جواب دیا۔

"اکیلی۔۔۔۔۔۔" روشو نے پوچھا اور ایک عجیب تجسس سا اس کے اندر پیدا ہوا۔

"نہیں میرا شوہر ساتھ ہے۔" وہ آہستہ سے دبے ہوئے لہجے میں بولی اور روشو نے محسوس کیا کہ جیسے آسمان سے قیامت خیز دھماکے کے ساتھ بجلی، کڑکی، کوندی، ٹوٹی اور ہوٹل کی چھت پر گر گئی۔

روشو کی آنکھوں کے سامنے بالکل اندھیرا چھا گیا تھا۔

ایک منٹ میں جیسے سب کچھ ختم ہوگیا۔ جیسے صدیوں میں بنایا ہوا آرزوؤں کا محل مسمار ہوگیا۔ روشو کی زندگی میں بس دو اہم چیزیں تھیں ایک ماضی کا وہ داغ محرومی جو شاہینہ کا گھر چھوڑنے سے اس کے دل پر لگا تھا اور ایک مستقبل کی امید کی وہ کرن جب شاہینہ اسے دوبارہ ملے گی۔۔ پتہ نہیں کیوں اس کی چھٹی حس ہمیشہ اسے یہ آس دلائی رہتی تھی کہ شاہینہ اسے ضرور ملے گی لیکن چھٹی حس نے کبھی اسے اس مایوسی کا اشارہ نہیں دیا تھا کہ وہ شاہینہ کو پاکر دوبارہ کھو بیٹھے گا اس نے جب فرحانہ سے شادی کا ارادہ کر کے انتظار کا دروازہ بند کیا تھا تو اس وقت بھی اس نے شاہینہ کو پالینے کی امید کی کوئی نہ کوئی کھڑکی کھلی رکھی تھی اور جب فرحانہ کی خودکشی کے بعد روشو اتنے شدید صدمے سے دوچار ہوا تو اس نے یہی سمجھا کر اپنے آپ کو تسلی دی تھی کہ شاید اللہ کی رضا اسی میں ہے شاہینہ نے دوبارہ کبھی نہ کبھی اس کی زندگی میں آنا ہے اور اب شاہینہ اس کی زندگی میں آئی بھی تو پانی کی ایک لہر صبا کے ایک جھونکے کی طرح آئی اور چلی گئی۔

لیکن وہ ابھی گئی نہیں تھی ایک جملے میں اپنے شادی شدہ ہونے کا انکشاف کر کے روشو کے سامنے چپ چاپ خاموش برف کی سل کی طرح بیٹھی تھی اور برف کی سل ہی کی طرح جیسے پگھل بھی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے دھیرے دھیرے آنسوؤں کی ایک پتلی باریک شبنمی لکیر بہہ رہی تھی۔ روشو بھی خاموش پتھر کا بت بنا اس کے سامنے نظریں جھکائے کسی سلطنت کے ہارے ہوئے وارث کی طرح بیٹھا تھا۔ کافی کے کپ دونوں کے سامنے پڑے پڑے پھر ٹھنڈے برف ہو گئے تھے اور اور ریسٹورنٹ میں مکمل طور پر خاموشی چھا چکی تھی۔

"چلیں۔۔۔۔۔!" ایک طویل خاموشی کے بعد شاہینہ نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ایکسی لیٹر کی کیبل لگ گئی ہوگی"۔ روشو نے اس طرح میکانکی انداز میں جواب دیا جیسے وہ صرف ایکسی لیٹر فٹ ہونے کے انتظار ہی میں یہاں بیٹھے تھے۔ پھر معلوم نہیں کون پہلے اٹھ کھڑا ہوا یا دونوں ایک ساتھ اٹھے اور روشو نے بل پڑھے بغیر بل والی ٹرے کے نیچے سو روپے کا نوٹ رکھا جو کافی کا بل نہیں غالباً یہاں اتنی دیر تک بیٹھنے اور دو بچھڑے ہوئے پریمیوں کے ملنے اور مل کر بچھڑ جانے کی کہانیاں سننے اور سنانے کا کرایہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ بات کئے بغیر چپ چاپ ریسٹورنٹ سے باہر نکلے۔ خاموشی سے کار میں بیٹھے اور کار شوروم کی طرف روانہ ہوگئی۔ راستے بھر نہ روشو نے کچھ کہا، نہ شاہینہ بولی لیکن دونوں کی آنکھیں بول رہی تھیں جن سے اشکوں کی صورت میں چپ چاپ فریاد کی نہریں بہہ رہی تھیں اور پورا مستقبل، شاہینہ کے ایک جملے سے ختم ہوگیا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔

"سر ایکسی لیٹر کی کیبل لگ گئی ہے۔" روشو اور شاہینہ کی گاڑی گیراج میں رکتے ہی لڑکے نے مژدہ سنایا جیسے شاہینہ اور روشو کے لئے یہ سب سے اہم خبر یہی ہو۔۔۔۔۔۔ "آپ چیک کر لیں۔"

"ٹھیک ہے میں دیکھ لیتا ہوں" روشو بھی پیشہ ورانہ انداز میں بولا اور اپنی گاڑی سے نکل کر شاہینہ کی کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر ایکسی لیٹر کو چیک کرنے کیلئے بیٹھ گیا۔ شاہینہ بھی کار سے نیچے اتری اور بڑی اداس اور گھمبیر نظروں سے روشو کو دیکھتی رہی جو کار اسٹارٹ کر کے اس کے پیڈل اور ایکسی لیٹر کی ریسنگ ٹیسٹ کر رہا تھا۔

"ایک راؤنڈ لگا کے دیکھ لیں۔۔۔۔" روشو کار کو پہلے گیئر میں ڈالتے ہوئے شاہینہ سے مخاطب ہوا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔" وہ اتفاق کرتے ہوئے بولی اور روشو نے ہاتھ بڑھا کر کار کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ شاہینہ چپ چاپ بیٹھ گئی کاریگر لڑکے جو اپنے اپنے کام میں مصروف تھے کن اکھیوں سے روشو اور شاہینہ کو کار میں بیٹھے دیکھتے رہ گئے اور کار ایک لمحے میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

پہلے روشو کی کار تھی جس میں دونوں بیٹھ کر ریسٹورنٹ کی طرف گئے تھے اب شاہینہ کی کار تھی جس میں بیٹھ کر کار کا ایکسی لیٹر چیک کرنے نکلے تھے۔ تھوڑی سی دیر میں ماحول کے اندر کتنا فرق پڑ گیا تھا۔ جب پہلے دونوں گئے تھے تو ایسے لگتا جیسے کوئی خوشیوں کی بارات جا رہی ہے اور اب گاڑی میں دونوں اس طرح چپ چاپ اداس نڈھال اور مایوس ہو کر بیٹھے تھے جیسے کسی کو کفنا پہنے

دفنانے کا بندوبست کرنے جا رہے ہوں۔ گاڑی ٹھیک ٹھاک طریقے سے ایک لمبے روڈ پر چل رہی تھی۔

کیبل بھی ٹھیک ٹھاک پڑ گئی تھی ریسنگ بھی بڑی اچھی ہو رہی تھی کوئی فرق کوئی نقص نہیں تھا شاید وہ گاڑی چیک بھی نہیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر اور ساتھ رہنے کا شاید بہانہ تھا لیکن باتوں اور یادوں کے دریا جو برسوں سے ڈھکے اور چھپے ہوئے تھے اور جو بہہ جانے کیلئے عرصہ دراز سے طغیانی میں تھے محض شاہینہ کے انکشاف کے ایک جملے سے جیسے باتوں اور یادوں کے سارے دریا ریگستان کی طرح سوکھ گئے کسی کے پاس بھی کہنے کیلئے کچھ نہیں رہ گیا تھا لیکن دونوں کے پاس کہنے کیلئے بہت کچھ تھا دونوں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن دونوں مصلحتاً چپ تھے۔ پھر روشو نے اچانک ایک سنسان سی جگہ کار درخت کے سائے میں روک دی جہاں سڑک کے کنارے ایک کولڈ ڈرنک اسپاٹ بھی تھا ایک لڑکا دوڑتا ہوا کار کے پاس آیا روشو نے اسے دو بوتلیں لانے کو کہا۔ لڑکا چند ہی لمحوں میں دو بوتلیں دے کر واپس چلا گیا۔

شاہینہ اور روشو نے بوتل کا ایک ایک سپ لے کر اس طرح ہونٹوں سے دور رکھا ہوا تھا جیسے بوتلوں کے اندر زہریلی گیس بھری ہو۔ کار کے اندر ایک مسلسل خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی دونوں بے اختیار ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر پھر سامنے طویل لمبی سڑک پر دیکھنے لگتے جس کی کوئی حد، کوئی سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا اور ادھر ادھر ٹیلے ہی ٹیلے اور کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔

"کیا یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔" ایک طویل خاموشی کے بعد روشو نے سناٹا توڑا۔

"کیوں ------ کیا شادی کے بعد لوگ ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔" شاہینہ نے بھی خاموشی توڑی۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ روشو کچھ بولے تاکہ اندر کے رکے ہوئے سیلاب باہر آئیں۔

"لوگ ملتے ہیں ------" روشو نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "ہم اور تم لوگ نہیں ہیں شاہینہ"

"تم مجھ سے کیا چاہتے تھے روشو ------" شاہینہ جیسے پھٹ پڑی۔ "کیا تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارا انتظار کروں۔ کیا تم نے کہا تھا کہ تم واپس آؤ گے۔ کیا تم نے کہا تھا تم میرے ساتھ شادی کرو گے۔ اس طرح کی کوئی بھی یقین دہانی تم نے کرائی ہوتی تو شاید میں زندگی بھر تمہارا انتظار کرتی رہتی" ۔ وہ آبدیدہ ہو کر بولی۔ "لیکن تم تو مجھے تنہا سڑک کے کنارے بجلی کے گڑے ہوئے کھمبے کی طرح چھوڑ کر چلے گئے تھے۔"

"جب ہم جدا ہوئے تھے شاید اس وقت ہمارا ذہن اتنا پختہ نہیں تھا ------" روشو

نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا" میرا تمہیں چھوڑ کے جانے کا فیصلہ انتہائی جذباتی اور شدید ناراضگی کا تھا"۔ پھر وہ قدرے توقف سے بولا "لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ شعور میں بھی پختگی آتی گئی۔۔۔۔۔ محبت نے اور چھٹی حس نے مجھے یقین دلا دیا کہ تم ایک روز ضرور ملوگی۔"

"اس کے باوجود تم نے فرحانہ سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔۔۔۔۔" شاہینہ ترنت بولی۔

"اس کی کئی وجوہات تھیں۔۔۔۔۔ اور شاید سب سے بڑی وجہ مجبوری تھی"۔ روشو نے جواز بیان کیا۔

"کس کی مجبوری۔۔۔ تمہاری یا فرحانہ کی"۔ شاہینہ نے پوچھا۔

"کسی کی بھی سمجھ لو۔۔۔۔۔۔" روشو نے فوراً جواب دیا۔

"ایسی ہی رعایت تم مجھے بھی دیدو روشو"۔ شاہینہ نے کہا اور روشو خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر تک خاموشی سے ٹکٹکی باندھے شاہینہ کو دیکھتا رہا۔ شاہینہ بھی تھکے تھکے انداز میں اس کی طرف بڑی ملتفت نظروں سے دیکھتی رہی جیسے دونوں ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہوں لیکن دونوں اپنی جگہ سے ذرا بھی آگے نہیں بڑھے۔ احتیاط اور احترام کی ایک دیوار محبت کے درمیان حائل ہوگئی تھی۔ روشو نے شاہینہ سے پوچھے بغیر چپ چاپ گاڑی اسٹارٹ کی، گیئر میں ڈالی اور چلا دی۔ پھر پتہ نہیں کس طرف گاڑی کو لے گیا۔

گھومتے گھماتے اس نے ایک بلڈنگ کے آگے گاڑی روک دی اور کار میں بیٹھے بیٹھے اس نے بلڈنگ کی طرف اشارہ کر کے شاہینہ کو کہا۔

" میں اس بلڈنگ میں رہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ فورتھ فلور پر"۔ اس نے کھڑکی سے اوپر کی طرف نگاہ دوڑائی اور شاہینہ نے بھی سر باہر کی طرف نکال کر بلڈنگ کے اوپر کی طرف دیکھا اور پھر بڑے دکھ کے ساتھ پوچھنے لگی۔

"اسی فورتھ فلور سے فرحانہ کو دی تھی۔۔۔۔۔۔؟"۔

"ہاں۔۔۔۔۔۔" روشو نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ " میں چند روز اور ہوں یہاں۔۔۔۔۔۔ شفٹ ہو جاؤں گا۔ میرا اپارٹمنٹ تقریباً مکمل ہوگیا ہے۔۔۔۔ پھر وہ خود ہی ایک سرد آہ بھر کر بولا "لیکن کیا فائدہ رہنا وہاں بھی مجھے تنہا ہی ہے"۔

" تم یہاں بالکل تنہا رہتے ہو کیا۔۔۔۔۔۔۔؟" شاہینہ نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔۔۔۔۔" وہ احساس محرومی سے بولا اور پھر شاہینہ کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا کہ شاید وہ اس کے ساتھ اوپر چلنے کی خواہش ظاہر کرے لیکن شاہینہ نے گاڑی سے اترنے یا

اوپر چلنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا اور روشو نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کچھ دیر شاہینہ کے رد عمل کا انتظار کیا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"یہاں روک دو روشو۔۔۔۔۔۔۔۔" اس نے ایک لمبی کشادہ سڑک اور خوبصورت بلند قامت پلازہ کے سامنے گاڑی روک دی۔ "میں یہاں رہتی ہوں اس پلازہ میں۔ آٹھویں منزل پر، فلیٹ نمبر چار میں"۔

"خوبصورت پلازہ ہے۔ اچھے اپارٹمنٹس ہیں یہ"۔ روشو نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی بلڈنگ کی تعریف کی۔

"آؤ گے نہیں اوپر۔۔۔۔۔" اوپر اپنے فلیٹ میں آنے کی جو پیشکش روشو نہیں کر سکا تھا وہ شاہینہ نے کی۔

روشو کچھ شش و پنج میں پڑا جیسے جانا بھی چاہتا ہو نہیں بھی جانا چاہتا ہو۔

"دراصل وہ۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ کچھ پس و پیش سے بولا۔

"کیپٹن سے نہیں ملو گے۔۔۔۔۔۔" شاہینہ نے فوراً اس کا پس و پیش دور کرتے ہوئے کہا۔

"کیپٹن۔۔۔۔۔؟" روشو تھوڑا سا چونکا۔

"کیپٹن محمود۔۔۔۔۔ میرا شوہر"۔ شاہینہ نے وضاحت کی۔ "وہ گھر پر ہی ہے"۔

"اوہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔" روشو قدرے سنبھلا۔ "کافی دیر سے ہم لوگ نکلے ہوئے ہیں دیر ہو جائے گی۔ پھر کبھی سہی"۔ روشو نے تامل سے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"چلو پھر کبھی سہی۔۔۔۔"۔ شاہینہ نے بھی اصرار نہیں کیا۔

"تو گویا تم نے فوجی افسر سے شادی کی ہے۔۔۔۔۔" روشو نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"پائلٹ ہے محمود۔۔۔۔۔" شاہینہ نے کہا۔ "فلائنگ آفیسر"۔

"تم ہمیشہ اونچا سوچتی تھیں۔ اور تم نے بلندیوں پر اڑنے والا آدمی پکڑ لیا۔ روشو نے جذباتی لہجے میں کہا اور شاہینہ آبدیدہ سی ہو گئی۔

"یہ گاڑی میں آواز کیسی ہے۔۔۔۔۔"۔ اچانک شاہینہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"اس کا فاؤنڈیشن خراب ہے"۔ روشو نے جواب دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ شاہینہ موضوع تبدیل کرنا چاہتی ہے۔

"یہ کون ٹھیک کرے گا۔۔۔۔"۔ شاہینہ نے پوچھا۔ غالباً وہ اس وقت اپنے ذاتی معاملات

کے بارے میں اور کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اس کے لئے گاڑی ایک دن کے لئے چھوڑنا ہوگی"۔ روشو بھی پیشہ ورانہ انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے کل تو نہیں پرسوں گاڑی تمہارے گیراج میں چھوڑ جاؤں گی"۔ شاہینہ کہا۔۔۔۔ جیسے وہ بھی ایک رابطہ رکھنا چاہتی تھی اور روشو کو بھی شاہینہ کو کھو دینے کے باوجود بڑی ڈھارس سی ہوئی کہ اس کا رابطہ شاہینہ سے ٹوٹا نہیں ہے۔

O

وہ رات سچ مچ روشو پر بڑی بھاری رات تھی۔ گزرنے میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے پہلے بھی کئی راتیں آنکھوں میں گزار دی تھیں۔ کئی راتیں اس نے کروٹ بدلتے ہوئے کاٹ دی تھیں ایک رات اور سہی۔ لیکن یہ ایک رات کا مسئلہ تو نہیں تھا۔ امید پر تو پوری زندگی گزاری جاسکتی ہے لیکن ناامیدی کی ایک رات صدیوں پر بھاری ہوجاتی ہے۔ اسے معلوم تھا شاہینہ اب اسے کبھی نہیں ملے گی۔ لیکن وہ شاہینہ سے وصال کی آس میں زندگی بتاتا رہا۔ پھر شاہینہ اسے مل گئی لیکن کسی اور کی ہوجانے کے بعد۔ اب وہ اسے پرسوں پھر ملنے کا وعدہ کرکے گئی ہے۔ سو کیا ہوجائے گا۔ پرسوں اس کے پاس وہ آنے گی لیکن وہ اس کی شاہینہ نہیں بیگم کیپٹن محمود ہوگی۔ وہ ایک کسٹمر ہوگی جو گاڑی ٹھیک کرانے کے لئے آنے گی۔ شاید اس کے دل میں بھی چور ہوگا۔ میرے دل میں بھی چور ہے ۔۔۔۔ وہ سوچے چلا جارہا تھا اور نیند اس کے پاس سے کوسوں دور جاچکی تھی۔

پھر اچانک کیا ہوا کہ نیند کا نام ونشان بھی نہ رہا۔ اچانک اس کے گھر کے پڑوس میں اللہ بچائی کے مکان کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اللہ بچائی کی آوازیں کسی دوسری عورت کی آوازیں، گالم گلوچ، مردوں کا شور، دوسری عورت کی پکار۔ ایک عجیب بے ہنگم شور تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بتی جلائی دیوار پر لگی گھڑی دیکھی۔ رات تقریباً ڈھائی اور تین کے درمیان کا وقت تھا۔ وہ کھٹ سے دروازہ کھول کے باہر نکلا تو اس نے اللہ بچائی کے گھر سے آدم حسین کو بھاگتے دیکھا جو روشو کا ایک پڑوسی اور اسی بلڈنگ کی تیسری منزل میں رہتا ہے اور جو ایک سرکاری محکمے میں کلاس ٹو افسر ہے لیکن رشوت خوری میں اس نے بڑے بڑے رشوت خوروں کے ریکارڈ توڑ رکھے ہیں۔ آدم حسین اپنے جوتے بغل میں دبا کے اللہ بچائی کے گھر سے بھاگ رہا تھا اور آدم حسین کی بیوی تابڑ توڑ جوتے آدم حسین کے لگا رہی تھی آدم حسین جب بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کے بھاگا تو اس کی بیوی اندر گھس گئی اور اللہ بچائی سے گتھم گتھا ہوگئی لیکن اللہ بچائی اتنی آسانی سے مار کھانے والی کہاں تھی وہ چوٹی سے گھسیٹتی ہوئی آدم حسین کی بیوی کو باہر لائی اور جتنے ہاتھ مار سکتی تھی مارے۔ جتنے جوتے لگا سکتی تھی

اتنے لگانے۔

"دیکھ لیا تم لوگوں نے دیکھے اس جرافہ کے کرتوت۔۔۔۔"۔آدم حسین کی بیوی چلا رہی تھی۔ "یہ یہ ست خصمی کس لئے آئی ہے اس محلے میں۔۔۔۔لوگوں کے گھر اجاڑنے کے لئے "۔وہ اللہ بچائی سے لڑتی جا رہی تھی اور اس سے مار کھاتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔

"ارے سنبھال کے رکھ نا اپنے خصم کو۔۔۔۔"اللہ بچائی نے اسے دو جوتے اور لگاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ آدم حسین کی بیوی کو گھسیٹتی ہوئی زینے تک لے گئی اور وہاں سے نیچے تیسری منزل میں اسے لڑھکا کر واپس آگئی۔ "جا سنبھال اسے"۔

"بڑی کمینی عورت ہے"۔ایک پڑوسی جو اپنے گھر سے باہر نکل آیا تھا چپکے سے روشو کے کان میں بولا۔

"لیکن شریف تو وہ بھی نہیں ہے جو رات کے تین بجے اس کے گھر سے بھاگا ہے۔ "روشو نے بھی دھیرے سے جواب دیا اور پھر سارے محلے کے لوگ چھوٹے بڑے بزرگ، بچے جن کے بھی کان میں شور شرابے کی آواز پڑی گھروں سے باہر نکل آنے اور پورے محلے میں کانا پھوسی شروع ہو گئی۔ جو غالباً بہت دیر تک جاری رہی لیکن روشو نے اس واقعہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ کچھ دیر رکا اور پھر اندر جا کے دروازہ بند کر لیا۔ اس کی اپنی دنیا تھی جس میں ایک انقلاب، ایک مدو جزر آیا ہوا تھا اس کی کشتی بھنور میں پھنس گئی تھی جہاں سے نکلنے کا اب اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات پھر اسی بھنور کے اندر گردش کرتے ہوئے اس نے صبح کر دی۔

صبح جب اس کے بیدار ہونے کا وقت تھا تقریباً اس وقت اس کی آنکھ لگی اور وہ سو گیا اور اس دن وہ صبح بہت دیر تک سویا رہا اور خلاف معمول شوروم پر دیر سے پہنچا۔

آج بظاہر شوروم پر اس کا بہت ہی بور اور اکتا دینے والا دن گزرنا تھا کیونکہ شاہینہ کل اس سے کہہ گئی تھی کہ وہ پرسوں اپنی گاڑی مرمت کے لئے چھوڑ جائے گی لہذا اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی اہم بات نہیں تھی کہ وہ کل کا انتظار کرے۔ لیکن جب وہ شوروم پر پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شاہینہ کی گاڑی اس کے شوروم کے باہر کھڑی تھی اور اس کے پہنچتے ہی لڑکوں نے اسے بتایا کہ اندر اسی کا انتظار ہو رہا ہے۔ وہ گاڑی جلدی میں ایک طرف لگا کر ہوا کی طرح اندر گیا۔ شاہینہ اس کے کیبن میں بیٹھی تھی۔ لیکن آج وہ کل کی طرح نہیں ملے تھے۔ کل اور آج کے درمیان جیسے ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل ہو چکا تھا تاہم ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کے

چہروں پر انار کی سی رنگت اور پھولوں کا سا نکھار آگیا۔ وہ روشو کو دیکھتے ہی بے اختیار اٹھی اور پھر دونوں بے اختیار ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ لیکن فوراً کسی غیر مرئی قوت نے ان کے قدم روک دیئے۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھ گئے۔

"ہمیشہ اتنی دیر سے آتے ہو کیا۔" شاہینہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ آج دیر سے آیا ہوں کیونکہ رات نیند نہیں آئی"۔ وہ سچائی سے بولا۔ "اور پھر تم نے تو پرسوں یعنی کل آنے کو کہا تھا۔ اس لئے آج تمہارا آنا باعث حیرت ہوا۔ مجھے معلوم ہوتا تم آج آرہی ہو تو میں بہت سویرے آجاتا"۔

"وہ جو کہتے ہیں نا کہ آج کا کام کل پر مت چھوڑو"۔ شاہینہ بہت خوشگوار موڈ میں بولی۔ "سو مجھے بھی خیال آیا کہ کل کا کام پرسوں پر کیا چھوڑنا...... اور پھر کار کا فاؤنڈیشن کچھ زیادہ ہی آواز کرنے لگا تھا۔ میں آج ہی لے آئی ..... یہ رہی چابی۔" شاہینہ نے کار کی چابی روشو کے سامنے میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

روشو نے بے نیازی سے چابی اٹھا کے دراز میں ڈال دی جیسے وہ بھی محسوس کر رہا ہو کہ چابی ایک ثانوی بات ہے۔ اسے بھی اس بات سے تقویت ہو رہی تھی کہ اگر وہ رات بھر نہیں سو سکا تو یقیناً شاہینہ کی رات بھی کانٹوں کی سیج پر گزری ہے اور اگر وہ بیقرار اور مضطرب تھا تو وہ بھی ایک دن کا مزید انتظار نہیں کر سکی بلکہ اس نے تو صبح بھی نہیں ہونے دی۔ جاگا میں بھی ہوں اور سوئی وہ بھی نہیں ہے۔ روشو کے چہرے پر اچانک ایک خوشگوار صبح نمودار ہوئی اور چہرہ دمکنے لگا۔ شاہینہ بھی کل شام کے مقابلے میں بہت تروتازہ اور نکھری ہوئی تھی۔ رت جگے کے باوجود دونوں کی تھکان کم ہو گئی تھی۔

"کیا چلے گا---- چائے یا کافی-----" روشو نے بہت خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

"یہاں----؟" وہ ازراہ حیرت۔ بولی۔ کچھ اس انداز میں جیسے وہ کسی عالیشان فائیو اسٹار ہوٹل کے کافی شاپ میں انتہائی پرسکون انداز میں بیٹھ کے چائے، کافی پینے کی خواہشمند ہو۔

"زہے نصیب-------" روشو نے خاص مشرقی انداز میں کہا۔ یہ انداز اس نے قاضی صاحب سے سیکھا تھا۔

O

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک شاندار ہوٹل کے روف گارڈن میں موسیقی کی ہلکی ہلکی دھنوں کے درمیان کافی کے برتن سامنے رکھے بیٹھے محو گفتگو تھے۔

"امی کے پاس آنے والے لوگوں کی تعداد کا کوئی شمار نہیں تھا"۔ شاہینہ اپنی کہانی بیان کر رہی تھی۔ "چوہدری صاحب کے انتقال کے بعد گھر ایک ٹھیک ٹھاک قسم کا چڑیا گھر بن گیا تھا۔ شاید یہ بھی امی کا ایک فرسٹیشن اور برسوں کی گھٹن تھی جسے وہ اس صورت میں نکال رہی تھی"۔ شاہینہ آج خوب بولنے کے موڈ میں تھی اور روشو لگتا تھا آج ایک مکمل سامع بن کر آیا ہے۔ شاہینہ بولتی گئی۔ "ہر قسم کا آدمی شام کو ہمارے گھر آتا۔ ہمارے گھر کی طرف سے مردوں میں صرف ہمارے دو ماموں ہوتے تھے جو خاصے بے حس واقع ہوئے تھے۔

شام کو خوب محفل جمتی تھی۔ میرے ماموں اور امی میزبانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ شراب کا دور چلتا تھا اور لوگ نشے میں بد مست ہو کر اپنے آپے میں نہ رہتے۔ میں اس ماحول سے گھبرا کر اور بیزار ہو کر اپنے کمرے میں جا کے دروازہ بند کر لیتی تھی۔ محفل کے انہی شرکاء میں ایک خوبصورت نوجوان بھی تھا جو پرائیویٹ پائلٹ کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ اور یہ کیپٹن محمود تھا۔ میں جب محفل سے گھبرا کر اپنے کمرے میں بھاگتی تو وہ دبے قدموں میرے پیچھے آتا اور میرے دروازے پر دستک دیتا اور میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا۔

" دیکھو شاہینہ ---- مجھے یہاں آنے والی عورتوں سے یا تمہاری امی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں صرف اور صرف تمہاری خاطر یہاں آتا ہوں۔"

ایک دن وہ مجھے ٹیرس میں تنہا پا کر اوپر آگیا اور نہایت سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔

" تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے ایک دن اس سے پوچھ لیا۔

"شادی-----" وہ لفظ شادی پر زور دیتے ہوئے بولا۔ " میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں شاہینہ۔ مجھے تم سے محبت ہے اور یہ کوئی رسمی جملہ نہیں ہے۔"۔

"لیکن میرا شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے"۔ میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کوئی اور ہے جسے تم پسند کرتی ہو"۔ اس نے براہ راست پوچھا۔

" نہیں ایسا کوئی آدمی نہیں۔ میں دراصل شادی کرنا ہی نہیں چاہتی"۔ میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا۔

" اگر یہ بات ہے تو میں بھی شادی کرنا نہیں چاہتا"۔ کیپٹن محمود نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

" میری وجہ سے"۔ میں نے پوچھا۔

"ہاں-----" وہ بولا۔ "لیکن اگر تم نے کبھی شادی کا ارادہ کیا تو یاد رکھنا پہلا پروپوزل میرا

ہے۔ مجھے نظرانداز نہ کرنا۔" وہ بہت گھمبیر لہجے میں بولا اور پھر نہایت ہی ہمدردانہ انداز میں مخاطب ہوا۔ "اگر مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہو تو مت کرو۔ بے شک مسترد کردو۔ کسی اور اچھے آدمی سے کرلو۔ لیکن کرلو شادی شاہینہ یہ ماحول تمہارے لئے اچھا نہیں ہے"۔ یہ اس کا انتہائی ہمدردانہ مشورہ تھا۔

"اور تم نے اس مشورے پر عمل کرلیا"۔ روشو نے پوچھا۔

"نہیں"۔ میں نے پھر بھی محمود کے مشورہ پر کان نہیں دھرا"۔ شاہینہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "لیکن میری ماں بالکل ہی بدل چکی تھی وہ بالکل وہ ساجدہ بیگم نہیں رہی تھی جس کا تم سے واسطہ پڑا تھا۔ اس نے بغیر سوچے کہ اس کی جوان بیٹی گھر میں موجود ہے پہلے اس کا گھر بسانے کی فکر کرے۔ اس نے اپنی شادی رچالی ایک نہایت ہی بے ہودہ اور آوارہ قسم کے آدمی سے۔" شاہینہ کی آنکھ سے بے اختیار چھم چھم آنسو بہہ نکلے اور وہ روتے روتے بولی۔ "اور میں اپنی ماں کی ممتا میں بالکل غیر محفوظ ہوگئی"۔

"کیا تم نے اس کے گھر پر ڈاکہ ڈالا ہے ؟"۔ شاہینہ نے جواب دیا۔ "وہ خود بھی تم سے ملنے کا مشتاق ہے"۔ شاہینہ معنی خیز انداز میں بولی۔ "میں نے کل اسے بتادیا تھا کہ روشو سے ملاقات ہوئی ہے"۔

"نہیں۔۔۔۔" روشو چونکا۔

"ہاں۔۔۔" وہ کھٹ سے بولی۔ "میں نے اسے تمہارے بارے میں سب کچھ بتارکھا ہے"

"اس کا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔" روشو پھر شش وپنج میں پڑا۔

"اس کا جو بھی مطلب ہے۔ جمعہ کو محمود نے تمہیں کھانے پر بلایا ہے"۔ شاہینہ نے بہت پر تجسس انداز میں روشو کو دعوت دیتے ہوئے کہا۔ اور میں جمعہ کو تمہیں شوروم سے آکر لے جاؤں گی۔ تقریباً شام کے سات بجے۔"

"واقعی۔۔۔۔" روشو حیرانگی کے عالم میں بولا۔ اس کے اندر کچھ ایسی کیفیت تھی جس کا وہ اظہار نہیں کرسکتا تھا۔

○

رات اچانک اس کے مکان پر دستک ہوئی۔ وہ چونکا۔

اس روز رات وہ قدرے تاخیر سے گھر آیا تھا۔ دیر سے تو وہ روز ہی آتا تھا لیکن اس رات اس کا گھر آنے کو زیادہ جی بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ شاہینہ اپنی گاڑی کا فاؤنڈیشن بنوا کے اور جمعہ کے

دن کی کھانے کی دعوت دے کر چلی گئی تھی۔ جمعہ میں ابھی کئی دن باقی تھے۔ اسے یقین تھا اس دوران وہ ضرور چکر لگائے گی۔ لیکن کیا معلوم آئے نہ آئے۔ کسی کی بیوی ہے اور اس کی کچھ بھی نہیں۔ سوائے ماضی کی یادوں کے سرمایہ کے۔ لہٰذا وہ ایک اضطراب کی سی کیفیت میں تھا۔ اور شوروم بند ہونے کے بعد دوستوں کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ باہر ہی اس نے کھانا کھایا گپیں ہانکیں اور بہت دیر سے گھر پہنچا۔ اس وقت محلے والے جاگ رہے تھے۔ سب گھروں میں بتیاں روشن تھیں۔ اندر شاید ٹی وی چل رہے تھے۔ لوگ باتیں بھی کر رہے تھے۔ بچے بھی چہک رہے تھے لیکن سوائے ایک دو محلے داروں کے کسی اور سے اس کی مڈ بھیڑ نہیں ہوئی۔ وہ جب چوتھی منزل پر اپنے فلیٹ کے کوری ڈور میں پہنچا تھا تو اللہ بچائی اس وقت باہر برآمدے ہی میں کھڑی تھی۔ وہ نیچے منہ کر کے گراؤنڈ فلور پر کسی کو پکار رہی تھی۔

"او خوشیا ـ ـ ـ ـ ـ" اس نے اوپر سے آواز دی۔ "بوری رکھ دے ادھر ہی"۔ وہ زور سے بولی اور پھر ایک مضبوط رسا نیچے گراؤنڈ فلور پر پھینکا جس کا دوسرا سرا اس کے اپنے ہاتھ میں تھا۔ "بوری اس رسے میں باندھ دے مضبوطی سے"۔ اس نے پھر اوپر سے زور سے پکارا۔ اتنے میں روشو پاس سے گزرا۔

"کیا حال ہے بابو ٹھیک ہو"۔ وہ خندہ پیشانی کے ساتھ روشو سے مخاطب ہوئی۔

"شکر ہے"۔ روشو نے کہا۔ "کیا ہو رہا ہے نیچے"۔ روشو نے یونہی بائی دی وے پوچھا۔

"چاول کی بوری منگوائی ہے"۔ اللہ بچائی کہنے لگی۔ "یہ بوڑھا آدمی ہے بے چارہ چوتھی منزل پر کہاں چڑھے گا۔ چڑھتے چڑھتے ہی کہیں دم نہ نکل جائے"۔ وہ ازراہ ہمدردی بولی۔ "میں نے کہا رسی باندھ دو میں یہیں سے اوپر کھینچ لوں گی"۔ اس نے اپنی کہنیوں سے آستینیں اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"آنسوؤں کو روکو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں"۔ روشو نے آس پاس نگاہ ڈالی اور اس نے محسوس کیا کہ شاہینہ آس پاس کے ماحول سے قطعی بے نیاز اور بے خبر سی ہو گئی تھی۔ شاہینہ نے ٹیشو پیپر لے کر بڑی احتیاط سے آنسو پونچھے۔ ادھر ادھر دیکھ کے خود کو نارمل کیا ہونٹوں پر ایک ہلکی سی جبری مسکراہٹ لائی اور پھر کہنے لگی۔

"محمود اس وقت تک کیپٹن سلیکٹ ہو گیا تھا اور پرائیویٹ کمپنی کا ایک اسپرے کرنے والا جہاز چلا رہا تھا۔ اس دوران اسے یورپ کی کسی کمپنی سے بحیثیت پائلٹ کے پیشکش آ گئی۔ ادھر میری ماں مجھے آوارہ لوگوں کے جنگل میں چھوڑ کر اپنے نئے خاوند کے ساتھ کینیڈا آباد ہونے جا رہی تھی

اور میں سخت قسم کے دماغی انتشار اور ہیجان میں مبتلا تھی"۔ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی پھر اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے تم بھی یاد آنے روشو۔ میں ہر وقت خدا سے دعا کرتی تھی کہ کہیں سے تم وارد ہو جاؤ۔ میرا جی چاہا میں اخبار میں تمہاری گمشدگی کا اشتہار دے دوں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن پر اعلان کرادوں"۔ شاہینہ کی آواز رندھ گئی۔

"پلیز شاہینہ۔۔۔۔" روشو نے آہستہ سے شاہینہ کا ہاتھ اپنی انگلیوں کی پوروں سے دبایا۔ "ہمت سے کام لو"۔

"ایسے میں محمود نے پھر میری حوصلہ افزائی کی۔ کہنے لگا میں چلا جاؤں گا تم برباد ہو جاؤ گی۔ میں چاہتا ہوں شادی کر کے تمہیں یورپ لے جاؤں۔" وہ مجھ سے بار بار التجا کر رہا تھا۔

"پھر۔۔۔۔۔۔" روشو کا تجسس بڑھ گیا تھا۔

"پھر کیا۔۔۔۔" وہ سر جھکا کر بولی۔ "میرے پاس شادی کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے اور محمود نے شادی کرلی اور ہم دونوں یورپ چلے گئے"۔ وہ کہتے کہتے رکی اور پھر کہنے لگی۔ "تقریباً دس برس ہم نے یورپ میں گزارے۔ وہاں کمرشل سے لے کر ایئر فورس تک ہر قسم کے جہاز محمود اڑاتا رہا"۔

"اب یہاں کیا کر رہا ہے"۔ روشو نے قدرے توقف سے پوچھا۔

"اب وہ یہاں لمبی چھٹی پر ہے۔ ہمارا سارا وقت تقریباً ٹاپ اسٹار پلازہ کے ٹیرس پر گزرتا ہے جہاں بیٹھے ہم سمندر کا نظارہ کرتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ چھٹیاں آرام اور نظارہ"۔

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہیں ایک اچھا شوہر مل گیا ہے۔ چاہنے والا محبت کرنے والا۔۔۔۔ تم لکی ہو"۔ روشو جذبات بھری آواز میں بولا۔

"پتہ نہیں۔۔۔۔۔" اس نے کندھے ہلا دیئے۔

"شاید میں غلط کہہ گیا۔ وہ لکی ہے۔" روشو نے روہانسے انداز میں اپنی بات کی اصلاح کی۔

"پتہ نہیں۔۔۔۔۔" وہ پھر کندھے ہلا کر ایسے لہجے میں بولی جس کے تاثرات واضح نہیں تھے۔ وہ چپ ہو گئی دونوں تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے اور پھر روشو نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیسا آدمی ہے۔ میرا مطلب ہے دوسروں کے ساتھ ملنے جلنے میں"۔ روشو قدرے پس و پیش سے بولا۔

"خوش گفتار، خوش خلق، باتوں کا رسیا۔ تم ملو گے تو خوش ہو گے"۔ شاہینہ قدرے سنجیدگی

سے بولی۔

"کیا مجھے اس سے ملنا چاہئے -----" روشو نے قدرے تامل سے پوچھا۔

" میں مدد کر دوں -----" روشو نے نیچے گراؤنڈ فلور پر جھک کر اور جھانک کر کہا۔ جہاں بوڑھا مزدور چاول کی بوری کے آس پاس رسی کا ایک جال سا بنارہا تھا۔

" اللہ کی مدد چاہئے -------" وہ اطمینان اور اعتماد سے بولی اور پھر نیچے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ " رسی باندھ دی ہے بابا"۔

" جی ----" بوڑھے نے گرہ لگا کے اوپر دیکھا۔

" مضبوط -----" اللہ بچائی نے مٹھی بھینچ کر پوچھا

" جی مضبوط -----" بوڑھا ڈھیلا سا بولا۔

" بس پھر چھوڑ دے -------" اللہ بچائی نے کہا اور پھر بسم اللہ کر کے رسا اوپر کھینچنے لگی چلتے چلتے روشو نے نگاہ پھر نیچے ڈالی تو ایک من کی بوری رسے سے بندھی اوپر اسی طرح آرہی تھی جیسے ایک چھوٹی سی پوٹلی ہو۔ اللہ بچائی بڑی آسانی سے لیکن پوری قوت سے بوری کو اوپر کھینچ رہی تھی۔

"کیسا..." اس نے داد چاہنے کے انداز میں مسکرا کر روشو سے پوچھا۔

" ماشاء اللہ -----" روشو نے داد دیتے ہوئے کہا اور اندر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ بس اتنی سی مڈ بھیڑ اس کی اللہ بچائی سے ہوئی تھی۔

لیکن آج رات فلیٹ کے اندر اس کی نیند پھر غائب تھی لیکن آج وہ پریشان نہیں تھا۔ آج شاہینہ سے ملاقات کا ایک نشہ سا اس پر طاری تھا اور آج ایک عجیب کیفیت میں وہ مبتلا تھا کہ شاہینہ اسے اپنے شوہر کیپٹن محمود کی جانب سے کھانے پر مدعو کر گئی تھی۔ وہ ایسے آدمی کی دعوت پر مدعو تھا جو اس کے خوابوں، خیالوں اور تصوروں کی دیوی کا مالک تھا۔ جس نے اس سے اس کا مستقبل چھین لیا تھا۔ جو اس کے خوابوں کی ملکہ شاہینہ کے حسین سراپے اور اس کی روح کا مالک تھا۔

" روح کا مالک کیا وہ ہے ؟" لیٹے لیٹے ایک خیال روشو کے ذہن میں آیا اور وہ سوچنے لگا کہ روح کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کون کس کی روح کا مالک ہے۔ اگر کیپٹن محمود شاہینہ کی روح کا مالک ہوتا تو پھر شاہینہ دوبارہ اس سے کبھی نہ ملتی اور کبھی اس کے سامنے اپنے دل کی کتاب کھول کے نہ رکھتی۔ روشو اسی قسم کے خیالات کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

"ٹھک ٹھک"۔

کون ہو سکتا ہے؟ یا کون ہو سکتی ہے۔

معاً ایک اور مہمل سا خیال اس کے ذہن میں آیا کیونکہ یہ وقت دستک دینے کا نہیں تھا اور اس وقت کوئی اس کے پاس آتا بھی نہیں تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کھلتے ہی محلے کے پانچ معتبر آدمی السلام علیکم کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"تشریف رکھئے ......" اس نے بیٹھنے کے لئے کرسیاں پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت اتنی دیر سے کیسے زحمت کی"۔ روشو نے پوچھا۔

"بات یہ ہے روشن صاحب ......" ایک معتبر آدمی نے بیٹھتے ہی گفتگو شروع کی۔ "آپ صبح سویرے نکل جاتے ہیں اور رات کو دیر سے آتے ہیں۔ اس لئے دیر سے زحمت دی۔ بے وقت زحمت کے لئے معافی چاہتے ہیں"۔

"کوئی بات نہیں۔ حکم کریں.... کیسے تکلیف کی"۔ روشو نے ازراہ مروت پوچھا۔

"بات یہ ہے جناب کہ اس درخواست پر سب کے دستخط ہو گئے ہیں سوائے آپ کے۔ ازراہ مہربانی اس پر سائن کر دیں"۔ ایک معتبر نے درخواست کا کاغذ روشو کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسی درخواست ہے جناب ......" روشو نے درخواست پڑھے بغیر معتبرین سے پوچھا۔

"جناب یہ آپ کے پڑوس میں جو عورت ہے اللہ بچائی ہم اس کو محلے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ایک معتبر محلے دار نے کہا۔

"کیوں......" روشو کا سوال اچانک تھا۔

"کیا آپ کو پتہ نہیں اس نے محلے کو کتنا گندا کر رکھا ہے۔ ایک آدمی نے ازراہ حیرت روشو سے دریافت کیا۔

"جی نہیں مجھے کچھ پتہ نہیں...."۔ روشو بالکل اجنبی بن کے بولا۔

"کمال کرتے ہیں جناب آپ کو کچھ پتہ نہیں"۔ ایک بندہ حیرت سے بولا"۔ ابھی پرسوں ہی آپ نے نہیں دیکھا رات کے تین بجے کیا سین ہوا......"

"جناب رات تین بجے ......آدم حسین صاحب اس کے گھر پانے گئے تھے۔ وہی نا!" روشو نے معصومیت سے پوچھا۔

"بالکل بالکل۔ اب دیکھنے یہ کوئی شریفوں کا محلہ رہ گیا ہے۔ اس عورت کو یہاں سے نکالنا

بہت ضروری ہوگیا"۔ایک محلے دار نے زور دے کر کہا۔

"لیکن جناب اگر کوئی رات کے تین بجے اللہ بچائی کے گھر میں پایا جائے تو اس کی ذمہ دار اللہ بچائی تو نہ ہوئی"۔روشو نے کسی وکیل کی طرح دلیل دیتے ہوئے کہا۔

"کمال کرتے ہیں جناب۔آپ تو اس کا دفاع کر رہے ہیں"۔ایک آدمی نے حیرت کا اظہار کیا "یہ درخواست کی کاپی ہم آپ کو دے رہے ہیں۔اس میں سب کچھ لکھا ہے۔اس کے کرتوت تو پڑھئے۔

"آپ کو دراصل پتہ نہیں نا۔آپ صبح جاتے ہیں رات کو آتے ہیں۔آپ کو کیا معلوم اس کے کیا لچھن ہیں"۔دوسرے نے کہا۔

"میں واقعی اپنی مصروفیات کی وجہ سے محلے کے حالات سے بے خبر ہوگیا ہوں"۔وہ اعترافاً بولا اور درخواست لے کر پاس رکھتے ہوئے بولا۔"یہ درخواست میرے پاس رکھ دیں میں آج اسے پڑھ لوں گا۔کم از کم مجھے معلوم تو ہوجائے،ہو کیا رہا ہے"۔اس نے جواز پیش کیا۔

"ٹھیک ہے"۔وفد کا لیڈر بے دلی سے بولا۔"آج آپ پڑھ لیں کل بات ہوگی۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی محلے کے دوسرے معتبر بھی اٹھ کر چلے گئے۔روشو نے دروازہ بند کیا اور اللہ بچائی کے خلاف لکھی ہوئی درخواست بغیر پڑھے دراز میں رکھ دی۔ایسا لگتا تھا اسے درخواست اور اس کے مندرجات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی درخواست کئی روز تک اس کے دراز میں پڑی رہی اور وہ محلے والوں سے مختلف حیلے بہانے بنا کے ٹال مٹول کرتا رہا۔اس کے دماغ میں ایک ہی سودا سوار تھا۔شاہینہ۔۔۔۔۔۔۔بس شاہینہ۔۔۔۔۔۔!

O

جمعہ شوروم کی چھٹی کا دن تھا لیکن شاہینہ سے شام سات بجے شوروم پر ہی ملنے کا وقت مقرر ہوا تھا۔شاہینہ نے بھی کبھی اس کے فلیٹ پر گھر آنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی اور روشو نے بھی اس بات کو معیوب سمجھا تھا کہ وہ شاہینہ کو اپنے فلیٹ پر مدعو کرے۔جہاں وہ تنہا رہتا ہے تاہم جمعہ کی شام تک کے دو چار دن اس نے انتہائی بے چینی اور اضطراب سے اور کسی حد تک نروس ہو کر گزارے تھے۔اس روز جب وہ نہا دھو کے اور تیار ہو کے شام کو گھر سے نکلا تو اللہ بچائی اسے برآمدے میں ہی مل گئی۔وہ روشو سے اپنے مخصوص بے تکلفانہ اور چھیڑ چھاڑ کے انداز میں کہنے لگی۔

"اوہو ہو۔۔۔۔آج تو دفعہ تین سو دو میں پکڑے جاؤ گے"۔

"کیوں خیریت۔۔۔۔" روشو نے ہنس کر پوچھا۔
"یہ کس کے قتل کی تیاریاں ہیں" ۔اللہ بچائی نے کہا۔ روشو واقعی بہت ہی بچ رہا تھا۔
"پھر تو تم پر ضرور تین سو دو لگنی چاہئے۔۔۔۔" روشو نے بھی مذاق کیا۔
"تمہیں پتہ نہیں میری پولیس سے دوستی ہے۔ مجھ پر کیسے لگے گی یہ دفعہ۔۔۔۔۔۔" وہ کھکھلا کر ہنس پڑی اور روشو آگے بڑھ گیا۔
شاہینہ کی گاڑی ٹھیک مقررہ وقت پر روشو کے شو روم پر پہنچی۔ لیکن روشو شوروم کے دروازے پر پہلے ہی منتظر کھڑا تھا۔
"دیکھ لو ٹھیک وقت پر آئی ہوں" ۔شاہینہ گاڑی سے نیچے اتر کر مسکرا کر بولی۔
"دیکھ لو میں وقت سے پہلے موجود ہوں۔" وہ مستعد ہو کر بولا۔ کچھ دیر بیٹھیں یا نکالوں گاڑی۔ اس نے مزید پوچھا۔
"نہ گاڑی نکالو اور بیٹھنا ہے" ۔شاہینہ نے ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں تمہیں پک بھی کروں گی اور ڈراپ بھی۔"
روشو کچھ جھینپ سا گیا اور شاہینہ مزید کہنے لگی۔ "اور بیٹھیں گے اس لئے نہیں کہ کیپٹن تمہارا بہت شدت سے انتظار کر رہا ہے" ۔یہ کہہ کر شاہینہ دوبارہ کار میں بیٹھی اور روشو کے لئے گاڑی کی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ روشو چپ چاپ شاہینہ کے برابر میں بیٹھ گیا۔ شاہینہ نے کار ریورس کی اور پھر وہ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ شاہینہ آج بہت خوش اور بہت خوشگوار موڈ میں تھی لیکن اس کے چہرے پر خاصی تھکان دکھائی دے رہی تھی۔
"تم کچھ تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔۔۔۔۔۔" روشو نے شاہینہ کے حسین لیکن قدرے پژمردہ چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔
"پتہ ہے کیوں۔" شاہینہ نے جواب دیا۔
"کیوں۔۔۔۔" روشو نے پوچھا۔
"میں نے تمام ڈشیں آج اپنے ہاتھ سے بنائی ہیں" ۔وہ اترا کر بولی۔
"پھر تو بہت لذیذ ہوں گے کھانے" ۔روشو نے کہا
"کیسے معلوم۔۔۔۔" شاہینہ نے پوچھا۔
"تمہارے ہاتھ کے جو ہیں۔۔۔۔۔۔" روشو نے کہا۔
"تمہیں میرے ہاتھ لگے ہی کب۔۔۔۔۔۔" وہ ازراہ شرارت بولی اور دونوں کھکھلا کر ہنس

پڑے شاہینہ نے ٹیپ آن کر دیا تو کوئی مسحور کن دھن بجنے لگی۔ شاہینہ نے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہوئے روشو کی طرف دیکھا۔ روشو بھی بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

گاڑی جب پورچ میں رکی تو روشو کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ پتہ نہیں جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ اسے لفٹ کے ذریعے اوپر آٹھویں منزل پر جانا تھا اور اس پر اس طرح گھبراہٹ طاری تھی جیسے کیپٹن محمود اسے آٹھویں منزل سے اٹھا کے نیچے پھینک دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

جب وہ لفٹ میں گئے تو شاہینہ نے آٹھویں منزل پر جانے کے لئے لفٹ کا آٹھ نمبر بٹن دبا دیا اور جب لفٹ اوپر کی طرف چلی تو روشو اور شاہینہ لفٹ میں تنہا تھے۔ روشو کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ شاہینہ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت، دلکش اور روح پرور لگ رہی تھی۔

" تم اس قدر نروس کیوں ہو۔۔۔۔" شاہینہ نے روشو کی مضطرب کیفیت کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

" میں۔۔۔۔۔" وہ بڑبڑایا۔ " نہیں تو۔۔۔۔ نروس تو نہیں ہوں میں "۔

" ٹیک اٹ ایزی۔۔۔۔" شاہینہ نے آہستہ سے کہا۔ " کیپٹن بہت نفیس آدمی ہے۔ میں نے کہا ناں تم اس سے مل کر خوش ہو گے۔"

" شیور۔۔۔۔۔" روشو نے تائید کی اور اپنے آپ کو سنبھالا اور اتنے میں آٹھویں منزل آگئی تھی۔ منزل کے آتے ہی لفٹ رکی اور لفٹ کی گھنٹی کی ڈونگ کی آواز آئی اور دروازہ کھلنے پر شاہینہ نے پہلے روشو کو لفٹ سے باہر آنے کی دعوت دی۔ روشو لفٹ سے باہر آیا تو کوری ڈور کا تھوڑا سا ہی فاصلہ طے کر کے شاہینہ اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر تھی۔ اس نے ڈور بیل بجائی تو ملازم نے دروازہ کھولا۔ دروازہ سیدھا ڈرائنگ روم میں ہی کھلتا تھا۔ شاہینہ نے پھر روشو کو پہلے اندر جانے کی دعوت دی۔ روشو ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے شاہینہ تھی۔ بہت ہی سلیقے اور قرینے سے سجا سجایا ڈرائنگ روم تھا۔ مختصر فرنیچر لیکن کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ نہ ہی کوئی چیز فالتو معلوم ہو رہی تھی۔

" صاحب سے کہو روشن صاحب آگئے ہیں۔۔۔۔۔۔" شاہینہ نے ملازم سے کہا۔

" جی بہتر۔۔۔" ملازم ادب سے سر جھکا کے اندر چلا گیا۔

" بیٹھو۔۔۔۔۔" شاہینہ نے روشو کو ایک خوبصورت صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ شاہینہ بالکل اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ " میں یہاں بیٹھوں گی کہ تمہیں دیکھ سکوں اور تم مجھے "۔ شاہینہ نے بے اختیار کہا اور پھر خود ہی کہنے لگی "۔ لیکن تمہاری سیٹ سے ساحل سمندر کا منظر اتنا خوبصورت

معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے کیا دیکھو گے"۔
"منظر کتنا ہی خوبصورت ہو...... میں پھر بھی تمہیں ہی دیکھوں گا"۔ روشو نے بے اختیار کہہ دیا یہ سوچے بغیر کہ وہ صرف شاہینہ سے نہیں ایک شادی شدہ عورت سے مخاطب ہے اور جس کا شوہر کسی بھی لمحے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے والا ہے۔ لیکن زیادہ وقت نہیں لگا کہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور اور ملازم ایک خوبصورت نوجوان کو وہیل چیئر پر بٹھا کے وہیل چیئر دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

جوان کا پورا جسم ہڈیوں کا بے جان اور مختصر مجموعہ تھا۔ جن پر محض چہرہ منڈھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی گردن سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک سارا بدن مفلوج تھا۔ پاؤں وہیل چیئر کے ساتھ چمڑے کے تسموں سے بندھے ہوئے تھے۔ اور بازو بے جان انداز میں نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ صرف اس کے سر اور گردن کے کچھ حصے میں جنبش تھی۔ اور وہ اپنے چہرے سے مکھی اڑانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ تاہم اس مجبوری اور معذوری کے باوجود نوجوان کے چہرے پر ایک تازگی اور زندہ رہنے والی دلاویز مسکراہٹ تھی۔ ملازم کرسی کو دھکیل کر مزید آگے جب روشو اور شاہینہ کے قریب لایا تو شاہینہ اپنی سیٹ پر احتراماً کھڑی ہوئی اور ساتھ ہی رشو بھی اٹھ گیا۔
"آپ سے ملئے روشن...... جنہیں میں روشو کہتی ہوں"۔ شاہینہ نے روشو کا تعارف نوجوان سے کرایا اور پھر نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے روشو سے مخاطب ہوئی۔
"کیپٹن محمود...... میرے شوہر۔
روشو جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

(۲۵)

جب روشو نے اپنے ہوش و حواس قائم کر کے سر کو جھٹکا دیا، آنکھیں کھولیں تو شاہینہ اس کے پاس نہیں تھی وہ اٹھ کر دور ایک ٹیلے کے پاس، بہت اداس اور نڈھال کھڑی تھی یا شدید قسم کے صدمے سے دوچار ---- جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔

روشو دھیرے دھیرے اٹھا اور شاہینہ کی طرف جانے لگا۔ شاہینہ کا رویہ اس کیلئے اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ اپنے منہ پر تھپڑ کی کسک کو بھی بھول گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا شاہینہ کے پاس آیا اور اس نے عقب سے شاہینہ کے کندھے کو چھو کر دھیمے لہجے میں پکارا۔

"شاہینہ ----" اس کی پکار میں التجا، ندامت اور جیسے معافی کی اپیل تھی۔

"ڈونٹ ٹچ می ------" وہ اچھل کر پرے جا کھڑی ہوئی اور تیزی سے ریت پر دوڑتی ہوئی اپنی کھڑی ہوئی گاڑی سے بھی آگے نکل گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے وہ پیدل واپس شہر جانا چاہتی ہو غالباً فوراً اسے خیال آیا کہ گاڑی روشو کی نہیں اس کی ہے وہ دھیرے دھیرے پلٹی اور نڈھال سی ہو کے کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ روشو نے بھی گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا اور چپ چاپ شاہینہ کے برابر بیٹھ گیا۔

"مجھے معاف کر دو شاہینہ ----" روشو ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ "میرا خیال تھا کہ -----"

"تمہارا خیال تھا میں کیپٹن سے طلاق لے کر تم سے شادی کر لوں گی۔" وہ خشم آلود لہجے میں بولی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس قدر گر چکے ہو۔"

"پلیز شاہینہ ----" روشو نے درخواست کرنے کے لہجے میں کہا۔ "ایسا مت کہو۔"

"ٹھیک کہتی ہوں میں۔" وہ مزید برہم لہجے میں بولی اور غصے میں کار کا شیشہ اتار دیا۔

"تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو شاہینہ ۔۔۔۔" وہ مسلسل التجا کر رہا تھا۔
"تمہاری بات کو کیا سمجھوں ۔۔۔۔ تم نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے ہو۔" وہ مسلسل آگ بگولا ہو رہی تھی۔ "تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ایک ایسا آدمی جو اپنے منہ سے مکھی بھی نہیں اڑا سکتا ۔۔ جو آنکھ کی پتلی کے سوا جسم کے کسی حصے کو جنبش نہیں دے سکتا اس کا سہارا چھن گیا تو وہ کیا کرے گا ۔۔۔۔۔۔ کیسے زندہ رہے گا۔"
"کہہ لو جو کچھ تم نے کہنا ہے۔" روشو اس کے غصے کے آگے ہتھیار پھینکتے ہوئے بولا۔
"تم کہہ لو تو پھر میں کچھ کہوں۔"
"مجھے صرف یہ کہنا ہے روشو۔" وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ "کہ کبھی کیپٹن ایک بہت خوبصورت وجیہہ اور صحت مند نوجوان تھا اور اس نے اپنے جہاز کے دھوئیں سے ایک مرتبہ آسمان پر میرے برتھ ڈے کے دن ہپی برتھ ڈے لکھا تھا وہ فضاؤں میں بھی مجھے نہیں بھولتا تھا آج اس کے ساتھ اگر یہ حشر ہو گیا تو کیا میں اسے چھوڑ دوں۔" وہ چپ چاپ گم صم روشو کو دیکھنے لگی اور پھر بولی۔ "میں اسے چھوڑ کر تمہارے ساتھ شادی کر لوں خدا نخواستہ کل تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو جائے جیسا کیپٹن کے ساتھ ہوا ہے تو پھر میں تمہیں بھی چھوڑ دوں اور کسی اور کے ساتھ شادی رچا کے بیٹھ جاؤں تو ایسے میں تم پر کیا بیتے گی۔"
"بولتی جاؤ ۔۔۔۔" روشو نے کہا۔
"اگر میرے ساتھ فرض کرو ایسا ہو جائے اور تم مجھے چھوڑ کر دوسری شادی رچا لو تو میں کیا سوچوں گی؟"۔ دھیرے دھیرے اس کا لہجہ ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ "یہ ظلم اور سفاکی کی انتہا ہے روشو ۔۔۔۔۔ شادی صرف بیڈ روم لائف کا نام نہیں شادی میں میاں بیوی ایک دوسرے کے لائف پارٹنر ہوتے ہیں لائف پارٹنر کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں آنے والی تمام خوشیاں اور تمام غم، تمام نفع اور تمام نقصان میں دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں ۔۔۔ مصیبت میں چھوڑ کر فرار اختیار کرنے کا نام لائف پارٹنر نہیں یہ ایک حادثہ ہے جو کسی بھی وقت کسی کے ساتھ پیش آ سکتا ہے مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا روشو کہ تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ تمہاری زندگی کا مقصد کیا تھا اور کن مقاصد کو لے کر تم اپنے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔" وہ کہتی چلی جا رہی تھی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اپنے مقاصد سے ہٹ کر اتنے سنگدل، ظالم اور بے رحم ہو گئے ہو گے۔"
"اگر تم تھوڑا سا وقفہ دو تو میں کچھ کہوں ۔۔۔۔" روشو نے اس کے ٹھہرنے پر نہایت نرمی اور ندامت سے التجا کی۔

"تمہارے پاس کچھ کہنے کیلئے اگر ابھی اور ہے تو کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔" وہ اپنے تنفس پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"مجھ سے کیپٹن نے کہا تھا ۔۔۔۔۔۔" وہ اچانک اور دو ٹوک الفاظ میں بول پڑا۔

"کیا کہا تھا کیپٹن نے ۔۔۔۔" شاہینہ چونک سی گئی۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے یہ سب کچھ مجھ سے کیپٹن نے کہا تھا۔" اس نے اپنی بات دہرائی۔ "اس نے مجھ سے گڑگڑا کر التجا کی کہ میں تمہیں شادی پر آمادہ کروں تاکہ وہ مجھے طلاق دیدے۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے کہ کیپٹن کے لئے تم اپنی قربانی اور ایثار کے جذبے کے تحت اپنی جوانی تباہ کر رہی ہو ۔۔۔۔ میں کبھی تمہیں پروپوزل نہ دیتا لیکن اس نے مجھے مجبور کیا تھا اور وعدہ لیا تھا کہ میں تم سے یہ بات کہوں گا۔" وہ کہتے کہتے چپ ہوا اور پھر قدرے ندامت سے کہنے لگا۔ "اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی جس نے تم سے ایسی بات کہنے پر مجبور کیا۔"

"کیا ۔۔۔۔" شاہینہ نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ میرا گھٹیا پن تھا۔" روشو نے اعترافاً کہا۔ "میں یہ سمجھا کہ شاید اس پروگرام میں تمہاری منشا بھی شامل ہے یعنی تم نے اور کیپٹن نے مل کر یہ پروگرام بنایا۔"

"کاش تم مجھے ایسا نہ سمجھتے ۔۔۔۔" وہ قدرے تاسف کے لہجے میں بولی۔ "کیپٹن ایک مرد ہے وہ اس معذور جسمانی کیفیت میں بھی ایک بہادر اور حوصلہ مند مرد ہے جب کہ لوگ باڈی بلڈر ہو کر بھی مردانگی سے عاری ہوتے ہیں۔"

"مجھے معاف کر دو۔" وہ پھر التجا کرتے ہوئے بولا۔ "چاہے وجہ کچھ بھی ہو بات غلط تھی ۔۔ ۔۔ میری زندگی کی سب سے گھٹیا اور ہیچ بات۔"

"بھول جاؤ ۔۔۔" وہ معاف کرنے کے انداز میں بے نیازی سے بولی۔ "میرا خیال ہے تم نے جو کچھ کہا ہے اپنے بھولپن میں کہا ہے اور شاید کیپٹن کی باتوں نے تمہیں متاثر کر دیا تھا۔"

"متاثر ہی نہیں کیا ۔۔۔۔۔۔ میں اس کی باتوں کے جال میں پھنس گیا تھا۔" وہ اعتراف کرتے ہوئے بولا ۔۔۔ اور پھر دونوں چپ ہو گئے۔

سمندر کی ہوا بہت تیز چلنے لگی تھی اور شیشوں سے اندر آ کر شاہینہ کے بالوں کو بھی اڑا رہی تھی اور ساتھ ہی ریت اور نمی سے جسموں کو آلودہ کرنے لگی تھی۔

"ہمیں اب واپس چلنا چاہئے ۔۔۔۔" روشو نے کچھ دیر کے بعد خاموشی توڑ دی۔

"نہیں روشو ۔۔۔۔ میں کچھ دیر اور تمہارے ساتھ یہاں رکنا چاہتی ہوں۔" وہ اپنے لہجے کو

نرم اور نارمل کرتے ہوئے بولی۔ "روشو۔۔۔۔" شاہینہ نے دھیرے سے پکارا جیسے ستار کی ہلکی سی تار گونجی ہو۔۔۔۔روشو نے آہستہ سے گردن گھما کر شاہینہ کو دیکھا۔

"مجھ سے ناراض ہو گئے ہو۔" شاہینہ کے لہجے میں ایک تاسف بھی تھا اور پیار کی دعوت بھی۔

"نہیں۔۔۔۔" وہ مختصراً بولا۔

"تو پھر خوش ہو جاؤ روشو۔" شاہینہ نے کہا۔ "میں چاہتی ہوں آج ہم خوش خوش ایک دوسرے سے رخصت ہوں۔"

"رخصت ہوں؟" روشو نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا مطلب۔۔۔۔۔۔؟"۔

"روشو ہماری مزید ملاقاتیں الجھن پیدا کر دیں گی۔۔۔۔اس لئے میں نے سوچا کہ ہمیں آج آخری بار ملنا چاہئے۔" شاہینہ نے عجیب انداز میں کہا۔

"شاہینہ۔۔۔۔۔" وہ بے اختیار شاہینہ کی طرف مڑا۔۔۔۔۔۔ اور حیرت زدہ سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔ "ہاں روشو۔۔۔۔۔" وہ بہت چاہت، وابستگی اور التفات سے بولی۔ آج ہم آخری بار مل رہے ہیں اس کے بعد نہ میں ملوں گی نہ تم ملنا۔"

"لیکن۔۔۔۔۔۔" روشو نے کچھ کہنا چاہا۔

"ہش ش ش۔۔۔۔۔" شاہینہ نے آگے بڑھ کر انگلیوں کی پورے سے اس کے ہونٹ بند کر دیئے اور جذبات کی رو میں ڈوب کر بولی۔ "یہ ساحل، یہ تنہائی، یہ تم، یہ میں، یہ جنم جنم کی دو پیاسی روحیں اور یہ دو روحوں کا ملاپ۔۔۔۔ میرے لئے جتنی محبت تمہارے پاس ہے آج میرے حوالے کر دو تاکہ تمہارے پاس کچھ نہ رہے۔" وہ ایک ہسٹریائی انداز میں بولتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے صدیاں لمحوں میں سمٹ گئیں۔

O

روشو شاہینہ کے اس فیصلے کو محض ایک وقتی اور جذباتی فیصلہ سمجھا تھا بقول اس کے کہ اب وہ کبھی اس سے ملنے نہیں آئے گی اور یہ کہ روشو بھی اس سے ملنے کی کوشش نہ کرے لیکن اگلے دن وہ روشو سے معمول کی ملاقات کرنے نہیں آئی روشو بھی اسپتال نہیں گیا کچھ وہ پرے پرے رہی کچھ یہ کھنچا کھنچا، دو چار دن ہفتہ گزر گیا لیکن شاہینہ نہیں آئی لہذا روشو کی طلب، بے چینی اور اضطراب بڑھتا ہی گیا اور پھر ایک دن اس سے نہ رہا گیا بے اختیار اس نے اپنی انا کے ٹکڑے کر دیئے اور شام کو شوروم چھوڑ کر سیدھا اسپتال پہنچا جہاں کیبن، شاہینہ اور اس کے مداحوں کا مجمع لگا ہوتا تھا لیکن گارڈن میں کوئی نہیں تھا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اندر کمرے میں گیا اور بغیر کسی تامل کے دروازہ دھکیل کے اندر داخل ہو گیا۔

"فرمائیے۔۔۔۔۔" ایک اجنبی مریض نے بستر سے سر اٹھا کے پوچھا۔

"معاف کیجئے گا۔۔۔۔۔یہاں ایک اور مریض ہوتے تھے کیپٹن محمود۔۔۔۔۔" روشو نے معذرت کے انداز میں کہا۔ "وہ معذور تھے۔۔۔۔۔"

"وہ جی چلے گئے ہیں۔" نرس نے جواب دیا۔ "انہیں گئے ہوئے کئی روز ہو گئے۔"

روشو کندھے جھکائے بہت ہی مایوس اور نڈھال سا ہو کر باہر نکل آیا اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے سیدھا شاہینہ کے گھر چلا جائے لیکن ہمت نہ پڑی۔ شاہینہ نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ اس ملنے نہ آئے لہذا انا کی دیوار پھر روشو کے سامنے ایک رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی۔۔اس نے چند روز اور صبر کرنے اور انتظار کرنے کی ٹھانی اور چپ چاپ رات کو گھر چلا گیا۔ محلے میں حسب سابق ایک ہنگامہ تھا۔ محلے والوں نے تھانیدار کے خلاف افسران بالا کے نام درخواست داغ دی تھی کہ وہ اللہ بچائی کے ساتھ مل گیا ہے لہذا اب انکوائری کیلئے ڈی ایس پی کی قیادت میں ایک ٹیم آئی تھی ڈی ایس پی نے محلے والوں کو تسلی دی اور اللہ بچائی کو کیفر کردار تک پہنچانے کا وعدہ کیا لیکن پھر محلے والوں نے دیکھا کہ ڈی ایس پی نے بھی اللہ بچائی کے یہاں ڈیرہ ڈال دیا ہے۔

اس رات جب روشو محلے میں پہنچا تو محلے والے ایک نئی درخواست ڈی ایس پی کے خلاف لکھ رہے تھے اور انہوں نے روشو سے پھر تعاون چاہا لیکن روشو نے اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے پہلے کی طرح بے تعلقی ظاہر کر دی۔

شاہینہ سے آخری ملاقات کے بعد اس کا دماغ بے انتہا پریشانی اور انتشار میں مبتلا ہو گیا تھا اسے ایک لمحے کا سکون میسر نہیں تھا اور آخر کار اس نے ایک دن اپنے ہی ہاتھوں بنائی ہوئی انا کی دیوار کو ایک بار پھر ٹھوکر مار کے گرا دیا اور شاہینہ کے گھر جانے کا ارادہ کر لیا چاہے وہ اس سے بات ہی نہ کرے چاہے وہ اسے دھکے دے کر نکال ہی کیوں نہ دے لیکن ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ شاہینہ انا کی دیوار توڑ کر اور دروازہ کھول کر روشو کے کیبن میں داخل ہوئی۔ روشو جیسے بجلی کے جھٹکے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی۔۔۔۔" روشو نے کہا۔

"مجھے بھی معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گے"۔ شاہینہ نے بھی فوراً جواب دیا۔

"میں اب تمہاری طرف آنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا یہ دیکھو چابی۔" اس نے یقین دلانے کیلئے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کار کی چابی دراز میں ڈالی۔

"مجھے یقین ہے"۔ شاہینہ نے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم اسپتال بھی جا چکے ہو۔"

اب ہم کبھی نہیں بچھڑیں گے شاہینہ۔۔۔۔" وہ بہت جذباتی ہو کر بولا۔ "ساحل سمندر والی ملاقات ہماری آخری ملاقات نہیں ہوگی۔"

"نہیں روشو۔۔۔۔۔۔" وہ انتہائی دکھ کے ساتھ بولی۔ "میں تمہیں خدا حافظ کہنے آئی ہوں۔

"کیا مطلب----؟" وہ چونکا۔
"آج شام سات بجے پین ایم کی فلائٹ سے میں کیپٹن کو لے کر امریکہ جا رہی ہوں۔" اس نے جیسے بم پھینکا۔
"گھومنے کے لئے-----" روشو نے پوچھا۔
"نہیں علاج کے لئے۔" شاہینہ نے جواب دیا۔ "ایک رفاعی ادارے نے کیپٹن کے علاج کیلئے امریکہ کے ایک اسپتال میں کیپٹن کے داخلے کا بندوبست کر دیا ہے---اب جب تک کیپٹن زندہ ہے ہم امریکہ میں رہیں گے۔" وہ آبدیدہ ہو گئی۔
"میری دعا ہے خدا کیپٹن کو صحت دے۔" وہ رقت آمیز لہجے میں بولا۔
"وہ بہت مضبوط دل پاور کا آدمی ہے-----وہ انشاءاللہ ضرور ایک بار پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔" وہ اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہوئے بولی۔
"انشاءاللہ-----" روشو نے کہا۔
"میں چلوں گی۔" شاہینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"لیکن ابھی تو آئی ہو۔" روشو نے بے چینی سے کہا۔
"شام کی فلائٹ ہے پیکنگ کرنی ہے مجھے۔" وہ اضطراب سے بولی۔ روشو کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔
"اپنا خیال رکھنا روشو----- تم بہت زیادہ جذباتی آدمی ہو۔" وہ روشو کے قریب آکر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "دنیا بہت بڑی ہے صرف شاہینہ کو اپنی امیدوں کا مرکز مت بناؤ------ تم بہت کچھ سوچ کر بہت بڑے ارادے لے کر گھر سے نکلے تھے ان ارادوں کی تکمیل کرنے کی کوشش کرو روشو----- بس اب مجھے خدا حافظ کہو--------اٹھو---------اٹھو روشو۔"
"کیا میں ایئرپورٹ پر بھی نہ آؤں۔" روشو نے جیسے التجا کرنے کے انداز میں کہا۔
"نہیں روشو----------- میں خود جو ملنے آگئی ہوں---- یہیں مل لو-----ایئرپورٹ پر نہ آنا۔" شاہینہ نے کہا اور ایک بار پھر جدائی کے طویل فاصلے قربت کے لمحوں میں سمٹ گئے۔
"یہ زندگی ایسی ہی ہے روشو اس میں آدمی ملتا بھی ہے بچھڑتا بھی ہے ہم شاید بچھڑنے ہی کیلئے ملے تھے۔" اس نے کہا اور چلی گئی۔
شام سات بجے روشو، شاہینہ اور کیپٹن کو الوداع کہنے کیلئے ایئرپورٹ پر تو نہیں گیا لیکن وہ اپنے نئے لگژری اپارٹمنٹ کے ٹیرس پر چلا گیا جس کا قبضہ اسے حال ہی میں ملا تھا اور جہاں سے ایئرپورٹ پر آتے جاتے جہاز صاف دکھائی دے رہے تھے اس شام سات بجے پین ایم کے جہاز کو ٹیرس پر کھڑے ہو کر ٹیک آف کرتے ہوئے دیکھا اور اسوقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ فضا میں

اس کی نگاہوں سے او جھل نہیں ہو گیا۔

O

شاہینہ کے چلے جانے کے بعد روشو کی دنیا ہی ویران ہو گئی نہ شوروم، نہ گھر، نہ محلہ، نہ دوست کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی حالانکہ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی عورتیں اس کا شکار کرنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے پھرتی رہیں اور اگر وہ کسی لڑکی کو اپنے رشتہ کا پروپوزل دے کر یہ بھی بتا دے کہ اس کے والدین بھکاری تھے تو پھر بھی اسے کوئی مسترد نہ کرتا کیونکہ وہ نوجوان ہے، پر کشش ہے، شوروم کا مالک ہے، مقدور بھر پیسہ ہے، ایک لگژری فلیٹ ہے جس میں ایک بار وہ فرحانہ کی خاطر اور دوسری بار شاہینہ کے ساتھ شفٹ ہونا چاہتا تھا۔

"تم یہاں سے جا رہے ہو؟" اس نے جب محلہ چھوڑا تو برآمدے میں اللہ بچائی نے اسے روک کر پوچھا۔

"ہاں------ میں اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہو رہا ہوں۔" اس نے قدرے اداس لہجے میں کہا۔

"تم ایک ہی تو کام کے بندے تھے اس محلے میں تم بھی چلے گئے۔" وہ ازراہ تاسف بولی۔

"بس مجھے یہاں سے جانا ہی تھا۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"ایسی جوانی میں ایسے اداس مت رہا کرو----- یہ تو تمہارے کھل کھیلنے کے دن ہیں۔" اللہ بچائی بولی۔ "تمہارا کیس کہاں پہنچا۔" روشو نے جاتے جاتے پوچھا۔

"ہاہاہاہا------" اللہ بچائی کھکھلا کر ہنسی۔ "محلے والوں نے جو تھی درخواست داغی ہے اور اب ایس پی آیا ہے انکوائری کیلئے۔"

"بہت تنگ کر رہی ہو تم محلے والوں کو۔" روشو نے ہنس کر کہا۔ "چلی جاؤ نہ یہاں سے۔"

"میں نے بھی سوچا ہے یہاں سے چلی جاؤں گی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "لیکن ان کی درخواستوں سے نہیں----- اس دن جاؤں گی جس دن یہ سب لوگ ہاتھ جوڑتے ہوئے میرے پاس خود آئیں گے اور گڑ گڑا کر التجا کریں گے------ یہ جھوٹے عزت دار۔"

"میرا خیال ہے وہ دن بھی آنے والا ہے۔" روشو بولا۔ "محلے والے زچ ہو گئے ہیں۔"

"پھر میں بھی جانے میں دیر نہیں لگاؤں گی۔" اللہ بچائی نے جواب دیا۔

"اچھا خدا حافظ۔" روشو نے الوداع کہا۔

"خدا تمہیں اپنی پناہ میں رکھے۔" پتہ نہیں کیوں اللہ بچائی کے منہ سے بے اختیار دعا نکلی۔

O

نئے لگژری اپارٹمنٹ میں روشو نئی اور لگژری لائف گزارنے لگا تھا اس کے دوست اس کا غم ہلکا کرنے کے لئے سر شام ہی اس کے پاس جمع ہونے لگتے۔ جو کام اس نے کبھی نہیں کئے تھے وہ کام اس نے کرنے شروع کردئے ہر روز نئے برانڈ کی ایک اسکاچ وہسکی اس کے پاس آجاتی اس کے دوستوں نے شراب بیچنے والے کسی خفیہ ایجنٹ کا ٹیلی فون نمبر بتادیا تھا روشو اسے ٹیلی فون کردیتا اور سر شام مطلوبہ بوتل یا بوتلیں اس کے پاس آجاتیں پھر پینے پلانے والے احباب کا مجمع لگتا ساتھ میں خشک میوہ، چکن، تکے، چرغے، کباب اور بوٹیاں آتیں اور پھر رات گئے تک محفل جاری رہتی۔

شوروم میں، گیراج میں، گاہکوں میں اور اپنے دوسرے کاموں میں اس کی دلچسپی کم ہوتی جارہی تھی اس کی دولت، شراب، کباب پر صرف ہو رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ خودکشی کرنے کی راہ پر چل رہا ہے شاہینہ اس کے دل و دماغ پر نقش ہو کے رہ گئی تھی اور کسی بھی شراب کا نشہ اس کے دل پر لکھے شاہینہ کے نام کو حذف نہیں کر پارہا تھا۔

پھر ایک رات عجیب واقعہ پیش آیا۔

وہ اس رات پی کے دھت ہو گیا تھا اور اس کے میخوار دوستوں نے اس کے ساتھ عجیب تماشا کیا وہ کہیں سے ایک بازاری عورت کو پکڑ لائے اور اسے روشو کے برابر صوفے پر بٹھادیا۔

"دیکھو روشو یہ کون ہے ------؟" اس کے ایک دوست نے کہا۔ "یار یونہی زندگی برباد کررہے ہو۔" اور پھر تینوں اس عورت کو روشو کے پاس چھوڑ کر باہر والے کمرے میں چلے گئے۔

روشو نے خمار سے بوجھل آنکھیں کھولیں اور برابر میں بیٹھی خاتون کو دیکھا۔ خاتون کیا نو عمر لڑکی تھی دبلی پتلی منحنی سی تیکھے نقوش ہلکے ہلکے چیچک کے نشانات کے باوجود چہرہ پر کشش تھا لیکن چہرے پر وقت کے غموں کی دھول سے بے پناہ پژمردگی اداسی اور زردی چھائی ہوئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا-----" روشو نے بوجھل لہجے میں پوچھا۔

"عصمت-----" لڑکی نے سر جھکائے آہستہ سے جواب دیا۔

"عصمت-----" روشو نے اس کا نام دہرایا۔ "اور وہی تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"نام رکھنے والوں کو کیا معلوم تھا۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "کہ عصمت ہی میرے پاس نہیں ہوگی۔" "بیچ بیچ-----" روشو نے اظہار افسوس کیا اور پھر پوچھا کیا پیو گی۔"

"کچھ نہیں-----" وہ فوراً بولی۔ "میں شراب نہیں پیتی۔"

میں بھی نہیں پیتا ہوں۔" روشو ایک ہچکی لے کر بولا۔ "بس دوستوں نے لت ڈال دی ہے اور اب کبھی کبھی غم غلط کرنے کیلئے ------پی لیتا ہوں---"

"ہاں امیر لوگ غم غلط کرنے کیلئے شراب پی لیتے ہیں۔" عصمت بولی۔

" میں امیر نہیں ہوں۔" وہ فوراً بولا۔ " میں پہلے فقیر ہوتا تھا۔۔۔۔اللہ کے نام پر دے سخی بابا۔" اس نے فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلا کر آواز نکالی۔ " اللہ کے نام پر، معذور ہوں، میرے چھوٹے چھوٹے۔۔۔۔۔۔" اس نے عصمت کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔

"آپ بہت زیادہ نشے میں ہیں"۔ عصمت نے کہا۔

"کیوں کرتی ہو یہ دھندہ۔" روشو نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

" خوشی ہوتی ہے اس لئے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

" سنجیدگی سے جواب دو عصمت۔" وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ " اپنی کہانی سناؤ کس دکھ نے تمہیں اس ذلت کی دلدل میں دھکیلا ہے۔"

" میرے پاس کہانیاں سنانے کیلئے وقت نہیں ہے مجھے فارغ کرو اور جانے دو۔" وہ عجلت میں بولی۔ " نہیں وہ صاف انکار کرتے ہوئے بولا" مجھے اپنا دکھ سناؤ۔"

" میں جو کچھ سناؤں گی وہ سچ نہیں ہو گا۔ کیونکہ ہم سے بہت سے لوگ کہانیاں سنتے ہیں اور ہم ہر ایک کو ایک نئی کہانی سنا دیتے ہیں۔" وہ بے رخی سے بولی۔ " تم خواہ مخواہ اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔"

" کیوں کرتی ہو تم یہ کام۔۔۔۔" اس نے پھر سنجیدگی سے پوچھا۔ اس کا اصرار دیکھ کر بالآخر لڑکی کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

" کوئی عورت خوشی سے اپنی عزت فروخت نہیں کرتی۔۔۔ مجبور ہوں۔۔۔۔ اور کچھ نہیں کر سکتی۔" وہ بے بسی سے بولی۔ " گھر ہے نہیں۔"

" تم جوان ہو۔۔۔۔" روشو بولا۔ " چہرے کی زردی، ویرانی، اداسی اور چیچک کے دھبوں کے باوجود شکل و صورت کی بری نہیں ہو۔ شادی کر سکتی ہو تم۔"

" شادی۔۔۔۔۔۔ہاہاہا۔۔۔۔" وہ زہر خند انداز میں بولی۔ " مجھ جیسی عورت کے ساتھ کون کرے گا شادی۔۔۔۔ہیں۔۔۔۔ ہے کوئی لڑکا تمہاری نظر میں۔" وہ روشو پر طنز کرتے ہوئے بولی۔

" میرے بارے میں کیا خیال ہے۔۔۔۔" روشو نشے کے باوجود انتہائی سنجیدہ ہو کے بولا۔ " اگر مجھے پسند کرو تو میں شادی کرنے کے لئے تیار ہوں"۔

" تم اس وقت پیئے ہوئے ہو۔" وہ بے ساختہ بولی۔

" اس لئے جو بات کروں گا وہ سچی ہوگی۔" روشو نے بھی بے ساختہ جواب دیا۔ " بولو میں نیک دلی اور نیک نیتی کے ساتھ شادی کی دعوت دے رہا ہوں مجھے منظور کرتی ہو؟"

" تم پاگل ہو؟۔۔۔" اس نے کنفیوژ ہو کر کہا۔

"جواب دو ایک پاگل کے ساتھ شادی کرو گی۔" وہ بے انتہا سنجیدہ ہو رہا تھا۔
"مجھے منظور ہے۔" "لیکن اس کا فیصلہ تم کل کرنا۔ جب نشے میں نہیں ہو گے۔" عصمت نے جواب دیا۔ "مجھے منظور ہے۔" روشو بولا اور جیب سے دس ہزار روپے گن کر لڑکی کے حوالے کرتے ہوئے کہا "یہ رکھو"۔
"یہ کیا ہے۔ کیسے پیسے ہیں؟" وہ حیرت سے بولی۔
"کل شام کو شادی کا جوڑا پہن کے ٹھیک پانچ بجے یہاں اسی کمرے میں دلہن بن کے آجانا" وہ انتہائی پیار سے اس کی تھوڑی کو چھوتے ہوئے بولا۔ "میں اس وقت نشے میں نہیں ہوں گا۔"
"مجھے یقین نہیں آرہا۔" وہ اضطرابی کیفیت میں بولی۔
"کل پانچ بجے یقین آجائے گا۔" روشو نے کہا۔
"اس وقت میں کیا کروں۔۔۔۔" وہ تذبذب میں بولی۔ "رکوں یا جاؤں"۔
اس وقت تم ادھر سے جانے کی بجائے چپ چاپ اس پچھلے دروازے سے واپس چلی جاؤ۔ اس نے عصمت کو اپنے دوستوں سے نجات کا راستہ دکھایا۔ لڑکی ڈری سہمی لیکن حیرت زدہ انداز میں اٹھی۔ اسی طرح طلسم زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے روشو کو دیکھنے لگی جیسے کسی دوسری مخلوق سے آیا ہوا کوئی فرشتہ ہو۔ وہ انتہائی ممنونیت اور عقیدت مندی سے روشو کو دیکھتے ہوئے عقبی دروازے سے باہر نکل گئی۔ دروازے سے نکل رہی تھی تو روشو نے پکارا۔
"عصمت۔۔۔۔" وہ رکی تو روشو نے کسی حد تک تنبیہ کے لہجے میں کہا۔ "آجانا ضرور۔۔۔۔ نہیں تو زندگی بھر کا پچھتاوا ہو گا۔"
عصمت نے کچھ جواب نہیں دیا اور دبے قدموں باہر نکل گئی اور اس کے جاتے ہی روشو نے غٹاغٹ جام پر جام چڑھانے شروع کر دیے اور دھت ہوتا چلا گیا۔ جب تقریباً نصف رات ہو گئی تو باہر کے کمرے سے اس کے دوستوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔
"دروازہ کھلا ہے اندر آجاؤ۔" اس نے بیٹھے بیٹھے آواز لگائی اور تینوں دوست دھڑ سے ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ "کہاں گئی۔۔۔۔؟" ایک نے حیرت سے پوچھا۔
"ختم۔۔۔۔" روشو نے خالی بوتل اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔
"ارے ہم بوتل کو نہیں عورت کو پوچھ رہے ہیں۔" دوسرے دوست نے ازراہ حیرت پوچھا اور ادھر ادھر باتھ روم میں جھانکنے لگا
"وہ گئی۔۔۔۔" روشو نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔
"ارے کمبخت کہاں گئی حرام۔۔۔۔۔"

"ہش ش ش ش۔۔۔۔اس نے زور سے پنجہ دوست کے منہ پر گاڑتے ہوئے اسے چپ کرادیا۔" اب اس کا نام عزت سے لینا"۔

"کیوں اب وہ تمہاری بیوی بن گئی ہے کیا؟" ایک دوست نے ازراہ مذاق کہا۔

"بن جائے گی۔۔۔" وہ لہک کر بولا۔ "میں نے اس کو کل شام پانچ بجے بلایا ہے"۔

"شام پانچ بجے جب وہ آئے گی تو اسی وقت نکاح خواں یہاں موجود ہوگا۔" ایک دوست چڑ کر غصے میں طنزیہ بولا۔

"اس وقت تمہیں بہت زیادہ چڑھ گئی ہے روشو۔" ایک اور دوست نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "کل پانچ بجے تم اسے بھول چکے ہوگے۔"

"وہ تو نہیں بھولی ہوگی نا۔" روشو بولا" میں نے اسے شادی کا جوڑا پہن کر آنے کو کہا ہے۔"

"شادی کے جوڑے کے پیسے بھی دیئے ہوں گے۔" ایک نے سنجیدگی سے اندیشہ ظاہر کیا۔

"ہاں۔۔۔۔دس ہزار۔" وہ ہاتھ کی دس انگلیاں بلند کرکے بولا۔

"تم سچ کہتے ہو۔" ایک دوست نے پوچھا۔ اب انہیں کچھ کچھ شبہ اور کچھ کچھ حیرت ہو رہی تھی۔

"میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے۔؟" وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولا۔

تو بس ٹھیک ہے تمہارے دس ہزار گئے۔" ایک دوست نے درشت لہجے میں روشو سے کہا۔

لیکن دس ہزار ضائع نہیں گئے۔ وہ وعدہ کی پکی نکلی۔ اگلے دن ٹھیک پانچ بجے عروسی جوڑا پہن کر ڈری سہمی جھجکتی ہوئی روشو کے مکان پر آئی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک شرابی نے شراب کے نشے میں اس کے ساتھ جیون ساتھی بنے کا جو وعدہ کیا ہے۔ لہٰذا اب یا تو وہ گھر پر ہوگا ہی نہیں یا پھر مکمل ہوش و حواس میں ہوگا اور اسے دھکے دے کر نکلوا دے گا لیکن عصمت کا خیال درست بھی نکلا اور غلط بھی۔ جب وہ روشو کے مکان پر پہنچی تو روشو مکمل طور پھر ہوش و حواس میں تھا لیکن اس نے اسے دھکے دے کر نہیں نکالا بلکہ ایک نکاح خواں اس کا منتظر تھا اور دو شادی کے وکیل بھی۔ عصمت نکاح خواں کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس نے تو محض جوا کھیلا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ لیکن یہ سب کچھ ہوگیا۔

غروب آفتاب سے پہلے پہلے وہ اور روشو میاں بیوی بن چکے تھے۔

O

روشو کی شادی کو چار برس ہوگئے تھے اور وہ چار بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ چھوٹی بیٹی تھی اور تین بڑے بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک نرسری میں تھا اور ایک مونٹیسوری میں اور دو چھوٹے تھے جن کو روشو اور عصمت گھر میں تربیت دے رہے تھے۔

"اللہ کے نام پر بابو۔۔۔۔" ایک دن جب اس کی گاڑی ایک سگنل پر رکی تو ایک فقیر اپنے

بچے کے ساتھ بچے کا ہاتھ آگے بڑھانے گڑ گڑا کر بولا۔ اور روشو پتہ نہیں کیوں اس فقیر کو دیکھ کر سہم سا گیا۔ جیسے وہ فقیر اس کا باپ شیرو ہو اور وہ بچہ خود روشو ہو۔ وہ ایک دم سے ماضی کی لہروں پر ہلکورے کھانے لگا۔

"کیا بات ہے روشو ــــــ" اس کی بیوی نے روشو کے چہرے کی رنگت اور تاثرات دیکھ کر پوچھا۔ "کچھ نہیں عصمو ـــــ" وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "پتہ نہیں کیوں ان فقیروں کے ساتھ بچوں کو دیکھ کر میں پریشان ہو جاتا ہوں۔"

"تم خواہ مخواہ جذباتی ہوتے ہو۔" بیوی نے ڈھارس دی۔ فقیر تو گلی گلی، کوچے کوچے موجود ہیں۔ تم کہاں تک ان کے بارے میں اتنے جذباتی ہوتے رہو گے ـــــ"

"ٹھیک کہتی ہو تم ـــــــ فقیر تو گلی گلی موجود ہیں۔" اس نے بیوی کی بات دہرائی۔ "لیکن فقیروں کو گلی گلی نہیں ہونا چاہئے"۔

"اللہ کے نام پر ــــ فقیر نے پھر بچے کا ہاتھ آگے بڑھایا اور بچے کا بڑھا ہوا ہاتھ دیکھ کر جیسے اسے ایک گولی سی لگی لیکن اتنے میں سگنل کھل گیا اور روشو کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔

"یہ سو گیا ہے؟" اس نے عصمت کی گود میں سوئے بچے کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں ابھی سویا ہے"۔ عصمت نے جواب دیا۔

"بچوں کے اسکول میں ابھی کافی وقت ہے۔ آؤ ذرا آج ایک اور طرف چلیں۔ لمبی ڈرائیو پر۔" اسے معاً کچھ خیال آیا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" عصمت نے رضامندی ظاہر کی۔ اور روشو ایک لمبی ڈرائیو کر کے دور دراز ریلوے پٹڑی کے پاس ایک کھلے میدان میں پہنچا جہاں بلڈوزر، ٹریکٹر، مشینیں، انسان اور دوسرے اوزار زمین کو ہموار کرنے میں مصروف تھے۔ وہ گاڑی سے نیچے اترا اور حد نگاہ تک نظر دوڑا کے جگہ کا جائزہ لینے لگا۔

"یہ تو وہی جگہ ہے ــــــ" اس نے سوچا۔ "کیا بات ہے روشو ــــ" عصمت نے پوچھا۔
"کچھ نہیں جان ــــــ" وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑا کے بولا۔" اور پھر ایک انجینئر نما آدمی سے پوچھا جو پی کیپ پہنے زمین کا سروے کرنے میں مصروف تھا۔

"معاف کیجئے گا۔ یہاں کیا بن رہا ہے"۔ روشو نے دریافت کیا۔

"یہاں جناب اسپورٹس کا مپلیکس بن رہا ہے۔" سروے کرنے والے نے جواب دیا۔

"یہاں پہلے فقیروں کی کی بستی ہوتی تھی؟" اس نے ازراہ معلومات پوچھا۔

"جی ہاں یہ وہی جگہ ہے۔" سرویئر نے جواب دیا۔" وہ بستی کہاں گئی۔" روشو نے پوچھا۔۔

"کوئی فلم وغیرہ بنانی ہے ان پر کیا ـــــ؟" سروے کرنے والے نے ازراہ مذاق پوچھا۔